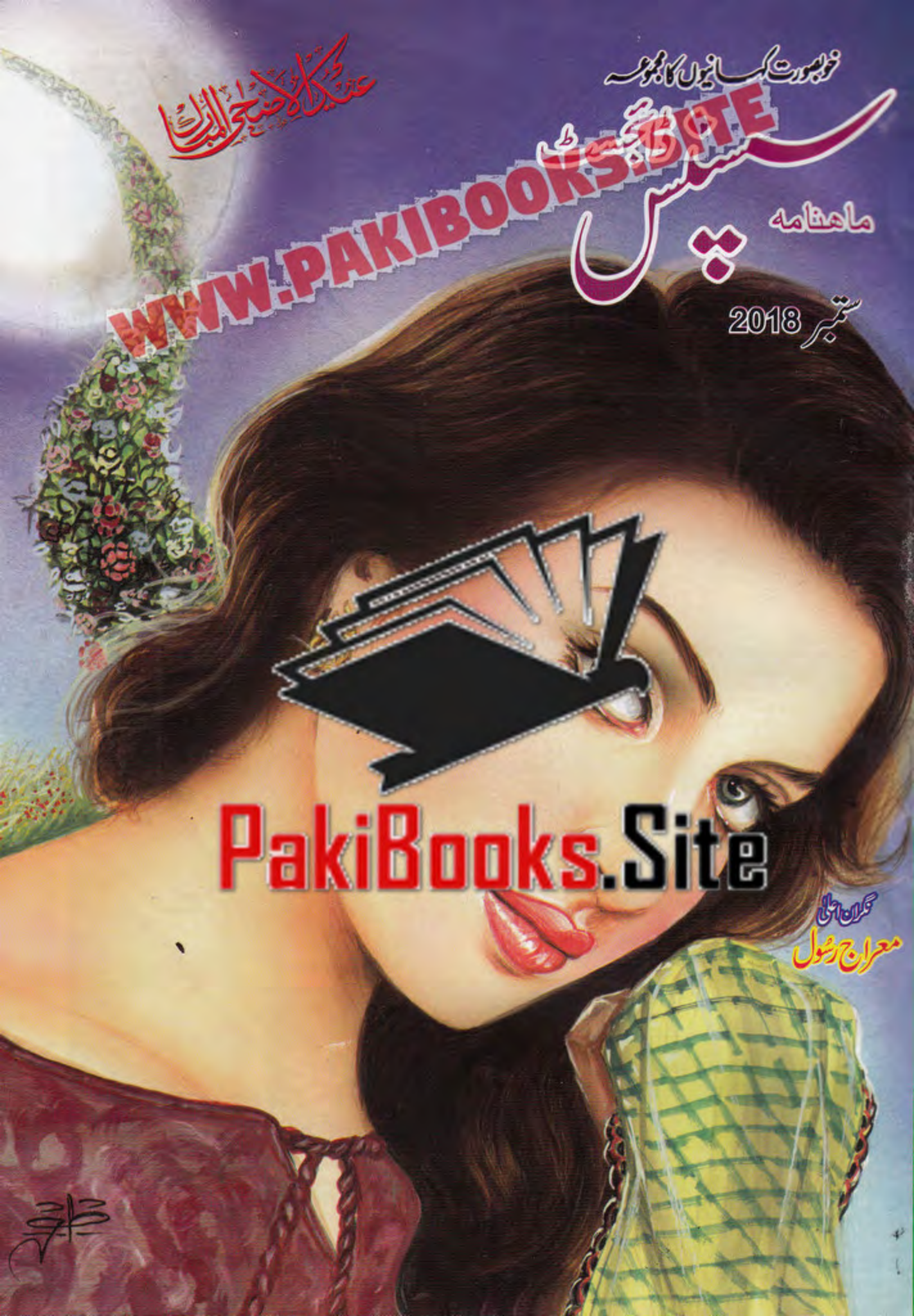

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ
ستمبر 2018
عنیکاہ اضحیٰ البرنا
WWW.PAKIBOOKSITE
PakiBooks.Site
نگران اعلیٰ
معراج رسول

سسپنس ڈائجسٹ

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ یمنیٰ احمد
نائب مدیر اطہر حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285269

06 انشائیہ — جون ایلیا
تلخ سچائیوں پر مبنی لاجواب بیان کی
اپنے مربی سے کڑوی کسیلی گفتگو

سسپنس کلاسک

09 آپ کے خط — مدیر اعلیٰ
سسپنس کی مجلس مشاورت و اراکین کی تعلیم و شیریں باتیں گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

16 معتوبِ وقت — الیاس سیتاپوری
ماضی کا آسیب... اختیار اور بے اختیار افعال کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

49 ہم سفر — تنویر ریاض
ایک کٹھن سفر... مشکل مراحل اور حسن زہرناک کی کارفرمائیاں

60 رنگ آسماں — ا۔ ر راجپوت
مشرق و مغرب کے عجب اسرار اور عجیب و غریب توہمات کے عبرت اثر افسانوں میں لپٹی دلچسپ داستان

85 دوست — ناصر ملک
ایک معمولی بات پر انتہائی غیر معمولی قدم اٹھانے والے حسرت زدہ جوڑے کی کتھا

92 چوہے دان — مرزا امجد بیگ
بیگ صاحب کی ڈائری کے اوراق سے ایک اور دلچسپ واقعہ

117 آسان شکار — محمد طاہر عمیر
شارٹ کٹ اختیار کرنے والے بازی گروں کے خطرناک عزائم

132 محفلِ شعر و سخن — قارئین
آپ کے ہاتھوں بنی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

135 خود غرض — اسما قادری
خونی رشتوں میں محبت اور غرض کے درمیان ہونے والی رسا کشی کا احوال

149 تماشا — منظر امام
بصارت اور بصیرت کے مابین دلچسپ معرکہ آرائی

152 وقت — حسام بٹ
ایک پُرعزم بازی گر کی بازی گری..... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

179 پرانی غلطی — ڈاکٹر شبر شاہ سید
متوازن زندگی میں غیر متوازن صورت حال کا تماشا

183 اداکارہ — ایمل رضا
دوست سے دشمن بن جانے والے شریک زندگی کی بے مثال اداکاری

189 حضرت موسیٰؑ — رضوانہ ساجد
مصر کی سرزمین پر فرعونی سازشیں اور پیغمبر کے معجزات کا احوال

201 پیش گوئی — شاہ زین رضوان
خطرناک منصوبہ سازی اور بے ساختہ پیش گوئی کی حیرت انگیز مماثلت

214 ایک کہانی بڑی پرانی — زویا اعجاز
مفکر دانا لوگوں کی رگوں میں لہو گرماتی اور خوفناک انجام کی نشاندہی کرتی عبرت اثر داستان

** کنٹرینڈس — ادارہ
دنیا بھر کے ادھر ادھر سے لطیفے، چٹکلے، اقتباسات مسکراہٹیں اور قہقہے، سب کچھ آپ کے لیے

جلد 47 • شمارہ 09 ستمبر 2018 • زرِ سالانہ 900 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 70 روپے •
E-mail:jdpgroup@hotmail.com (021) 35895313 :خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

BookBooks.Site

جون ایلیا

تمہارا شکریہ

نشیان، سحر البیان!
تم نے سنا جون ایلیا مر گئے؟
کیا کہا، جون ایلیا مر گئے؟
ہاں، ہاں..... ہاں، جون ایلیا مر گئے۔
لیکن تمہیں یقین کیوں نہیں آ رہا "نشیان، بلیغ البیان!" کیا میں اتنا بڑا اور احمقانہ جھوٹ بول سکتا ہوں؟ کیا میں تم سے ٹھٹھول کر رہا ہوں؟ نہیں نشیان، نہیں۔ نہ یہ ٹھول ہے نہ ٹھٹھول! یہ حقیقت ہے۔ بین اور ٹھوس حقیقت۔ جس سے نہ منہ موڑا جا سکتا ہے اور نہ انکار کیا جا سکتا ہے۔

اچھا! چلو میں تمہاری اس دل پذیر تقریر پر اعتبار کر لیتا ہوں۔ میں مان لیتا ہوں کہ تم سچ بول رہے ہو۔ ممکن ہے کہ تم سچ ہی بول رہے ہو۔ "شاید" تم سچ ہی بول رہے ہو۔ اچھا بھئی، تم یقیناً سچ بول رہے ہو، اب اگر ایسا ہی ہے "یعنی" یہ کہ تم سچ ہی بول رہے ہو تو سنو، ذرا غور سے سنو!

اب تم بول چکو اور میری بات سنو، آج صرف میں بولوں گا، صرف میں۔ اس لیے کہ جون ایلیا تو مر گئے۔ ان کے سامنے تو میں کیا، کوئی بھی بول ہی نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا ان کی موجودگی میں چپ رہنا میرا پیدائشی حق بن چکا ہے۔ میرے اندر ایک آگ لگی ہوئی ہے اور میں..... اور میں آج اس آگ کو بجھا کر ہی دم لوں گا اور اس آگ میں تم کو بھی بھسم کر ہی دم لوں گا۔

اب تم انتہائی خاموشی! جاں گسل خاموشی کے ساتھ سنو۔

تم نے کہا کہ "جون ایلیا مر گئے....." "یہی کہا ہے نا؟ دیکھو، اپنے بیان سے پھر مت جانا کہ آج دنیا کا یہی چلن ہے اور تم..... تم، ہی تو دنیا ہو یا "شاید" دنیا تم ہو۔ بہر صورت تم جو کوئی بھی ہو، بس ہو۔ لہٰذا سنو۔

میں نشیان، سحر البیان پوری دنیا کو، پورے اردو گلوب کو آج یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ جون ایلیا نہیں مرے۔ آج کے بعد کوئی یہ لفظ اپنی لپ لپاتی زبان سے ادا نہ کرے کہ جون ایلیا مر گئے ورنہ گدی سے اس کی زبان کھینچ لی جائے گی۔

کیوں..... نشیان، کیوں؟ آخر اس حقیقت کی حقیقت سے انکار کیوں؟ میرا خیال ہے کہ تم جون ایلیا کی محبت میں جذباتی ہو رہے ہو۔

خاموش! لب کشائی کی جرأت مت کرو۔ دریدہ دہن انسان خاموش!

اگر حوصلہ ہے تو سنو ورنہ دفع ہو جاؤ۔ میں یہ کبھی نہیں مان سکتا کہ جون ایلیا مر گئے۔ اس لیے کہ اگر میں یہ مان لوں تو پھر تمہیں جو کچھ ماننا پڑے گا تم اس کے لیے ہرگز ہرگز تیار نہیں ہو گے۔

کیا کہا؟ تم سب کچھ ماننے کے لیے تیار ہو، اچھا تو پھر سنو۔

اگر میں یہ مان لوں کہ جون ایلیا مر گئے تو پھر تمہیں یہ ماننا پڑے گا کہ آج ایک سقراط مر گیا، ہومر مر گیا، تاسیس ملیٹی! ہاں، وہ بھی گیا۔ ارسطو، وہ بھی۔ ہاں، ہاں..... ہاں! ابن مسکویہ، فارابی، ابن رشد، بوعلی سینا، طوسی، خیام، سعدی، عرفی، رومی، نطشے، برٹرینڈ رسل، برنارڈ شا، ہٹل یہ سب مر گئے۔ ایک پوری کی پوری بستی فنا کے گھاٹ اتر گئی۔

بڑ گئیں نا شکنیں پیشانی پر؟ تو کیا میں ڈر جاؤں گا!

نہیں مرتبی، نہیں۔ میں بہت ڈر لیا۔ اب مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔ جب جون ایلیا مر گئے تو اب مجھے موت کا کیا ڈر۔ سنو، اب تو جہنم ہی سنو!

جون ایلیا مرے نہیں ہیں۔ میں بار بار یہی کہتا رہوں گا کہ جون ایلیا نہیں مرے۔ ہاں، میں یہ مان لوں گا کہ جون ایلیا ہار گئے۔

مرتبی، اب تم پھر ادبی جملہ بولو گے کہ جون ایلیا موت سے ہار گئے لیکن ایسا بالکل نہیں ہے مرتبی!

پیارے نشیان، ذرا دم لے لو، تمہارا سانس پھول چکا ہے۔ اک ذرا دم لے لو۔ یہ لو! یہ دو گھونٹ پانی پی لو۔

میں پانی پی کر بھی آج تمہارا شکریہ ادا نہیں کروں گا۔ اور تمہارا یہ پانی!..... یہ چند گھونٹ میرے لیے، میرے اندر کے جہنم کے لیے قطعاً بے کار اور ناکافی ہیں۔

سنو..... اور صرف سنو! تم نے صرف ایک ہی فن سیکھا ہے اور وہ ہے خوشامد۔ میری خوشامد مت کرو۔ مجھے پانی مت پلاؤ، بس اگر ہو سکے تو صرف سنو!

جون ایلیا زندگی سے نہیں ہارے بلکہ وہ تمہاری دنیا سے ہارے ہیں۔ خوشامد سے ہارے ہیں۔ فریب سے ہارے ہیں۔ دغابازی سے ہارے ہیں۔ نمک حرامی سے ہارے ہیں، احسان فراموشی سے ہارے ہیں۔ وہ تو تم سے ہارے ہیں، مرتبی! تم سے۔

بس چند جملے اور سن لو مرتبی! اور ذرا کلیجے کو تھام لو کہ میں اب ان لوگوں کے نام لینے والا ہوں جن سے جون ایلیا ہار گئے ہیں۔

جون ایلیا! تنہائی اور بے وفائی سے ہارے ہیں۔
جون ایلیا! علمی بونوں سے ہارے ہیں۔
جون ایلیا! اپنے خون سے ہارے ہیں۔
جون ایلیا! اپنی ثقافت سے ہارے ہیں۔
جون ایلیا! اپنی روایت سے ہارے ہیں۔
یہ ہیں جون ایلیا کے قاتل۔

مرتبی، اب اگر تم ان ناموں سے واقف نہیں ہو تو یہ تمہاری کم علمی اور سہل پسندی ہے۔ اک ذرا سی کوشش کرو تو تم ان چہروں سے بھی آشنا ہو جاؤ گے۔

جاؤ مرتبی، جاؤ۔ اپنے اس جہنم میں دفعان ہو جاؤ جو تم نے خود تیار کیا ہے۔ ہو جاؤ مگن دنیا میں..... لیکن یاد رکھو، جون ایلیا کے یادگاری جلسوں میں کہا جانے والا یہ لفظ بے معنی ہے کہ ایک خلا پیدا ہو گیا ہے جو تا برپر نہیں ہو گا۔ کوئی خلا پیدا نہیں ہوا۔ یہ مان لو، نہیں مانتے..... کیا کہا، نہیں مانتے؟ دیکھو، سوچ لو۔ اگر نہیں مانو گے تو پھر تمہیں میرے اس جملے سے مکمل اتفاق کرنا پڑے گا اور یاد رکھو، پھر یہ جملہ تمہارا مقدر ہو جائے گا۔ وہ مقدر جس کو تم بدل نہیں سکو گے۔

اور وہ جملہ یہ ہے کہ آج ادب، تاریخ، فلسفے، منطق اور ذہن و زبان و ثقافت کا ایک مکمل دور ختم ہو گیا ہے۔ خلا..... کیا کہا خلا..... ہاں یاد آیا، مرتبی! تم نے خلا کی بات کی تھی۔ بھائی، تم جس خلا کی بات کر رہے ہو، وہ خلا تو جون ایلیا کی زندگی ہی میں پُر ہو گیا تھا۔

نشیان! پیارے، راج دلارے..... یہ کیسے ممکن ہے، نیند کس نے پُر کیا؟ کیسے ہوا۔ بھلا کیسے؟ یہ انہونی، یہ ناممکن..... ناممکن ہے۔

نہیں مرتبی! نہیں، تمہاری دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے لیکن تم نہیں مانو گے۔ تم کیسے مان سکتے ہو۔ بھلا کہیں انڈرائن کے پیڑ میں بھی انگور کے خوشے لگے ہیں۔ اچھا! تم نہیں مانتے، چلو..... میں مان لیتا ہوں۔ تو پھر سنو کہ یہ خلا تمہارے بونوں نے جون ایلیا کی زندگی ہی میں پُر کر دیا تھا۔

پھر وہی نہیں!

ہاں نشیان! نہیں، نہیں، نہیں.....

اچھا مرتبی! تو پھر آج ہم اور تم اس بات کو آخری فیصلہ قرار دیتے ہیں کہ یہ خلا کبھی، کبھی، کبھی..... پُر نہیں ہو گا۔ کیا تم اس بات سے اتفاق کرتے ہو مرتبی! اگر ہاں تو پھر تمہارا شکریہ مرتبی، ڈھیروں شکریہ!

☆☆☆

PakiBooks.Site

جشنِ آزادی وساون نمبر کی مناسبت سے اگست 2018ء کا خوب صورت پاکیزہ



ماہنامہ پاکیزہ کراچی

شیریں حیدر اور رفعت سراج کے ناول کی چونکا دینے والی اقساط

دردانہ نوشین خان نے چھیڑا اچھوتا موضوع اپنے نئے منی ناول ضفہ میں

حیا بخاری کے پُراثر قلم سے نکلا ایک یادگار ناولٹ..... محبت لفظ ہے لیکن

تہجد.....قیام اللیل

کے موضوع پر پڑھیے..... شمع ہدایت کے سلسلے

میں اختر شجاعت کی زبردست تحقیق

اس کے علاوہ

نامور قلم کاروں کی متاثر کُن تحریریں جن میں رفاقت جاوید، پروین عذرا تشنہ، اسما طاہر، نگہت غفار، افراح سکندر، فرحین اظفر و دیگر شامل ہیں

دلچسپ معلوماتی، تفریحی و اصلاحی مستقل سلسلے جن میں حسن افزا نسخے، مزیدار کھانوں، کی تراکیب و مسحور کُن شاعری بھی شامل ہے اور یہ سب آپ جیسے خوش ذوق قارئین کے لیے ہی تو ہے

عزیزانِ من
السلام علیکم!

لیجیے جناب..... ''ایکشن، سلیکشن اور جوں کے توں مسائل'' کے انبار جیسے سنگِ مراحل سے گزرتے گزرتے بالآخر سال 2018ء کے ستمبر تک تو آ پہنچے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت کے نام پر یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا..... ابھی تو مطالبات اور مکالمات کا بازار گرم ہے۔ اب یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ ان مذاکرات میں کیا کچھ ''طے'' کر کے رکھ دیا گیا اور کیا کیا ''طے'' پا گیا۔ بہرحال پاکستان کی تاریخ کے حوالے سے یہ دفاع کا مہینا کہلاتا ہے لیکن ذرا غور کیا جائے تو احساس ہوگا کہ یہ سلسلہ تو تا حال جاری ہے۔ صرف منظرِ نظر میں تھوڑی تبدیلی آئی ہے..... پہلے نظریات و روایات اور عظیم قومی مقاصد کا دفاع منظورِ نظر تھا..... اب منظورِ نظر کا دفاع ضروری ہوگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے بااختیار اور بااقتدار طبقے کو انصاف کے میزان کی اہمیت اور تقاضوں کو پورا کرنے کی اہلیت و شعور عطا فرمائے (آمین) تاکہ آنے والی تبدیلی صرف نعروں تک ہی محدود نہ رہے بلکہ حقیقتاً اس تبدیلی کا پھل عوام کے حصے میں بھی آجائے تاکہ مہنگائی اور مختلف ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبی یہ قوم تھوڑا سکھ کا سانس لے سکے، ورنہ ان کے ٹیکسوں پر پلنے والے ہی اب تک عیش کرتے آرہے ہیں اور لگتا ہے کہ چین کی بانسری تو ہمارے قانون کے محافظ بھی بجا رہے ہیں تبھی تو آئے دن دل دہلا دینے والی خبریں سننے کو ملتی رہتی ہیں کہ اس ارضِ پاک کے مختلف علاقوں میں کم عمر بچوں کو مختلف حیلوں سے منشیات کا عادی بنایا جارہا ہے..... یقیناً بغیر کسی طاقت کی سرپرستی کے ان معاملات کی حوصلہ افزائی ممکن نہیں ہے..... تو کیا مستقبل کے ان معماروں کے لیے کوئی دفاعی مزاحمت نہیں کی جاسکتی؟ یہ کوئی ایسی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ ارباب اختیار کو اس زہرناکی کا علم ہی نہ ہو۔ ہماری قوم کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ امیری غریبی کے ترازو میں تول کر بچوں کو اچھی تعلیم سے محروم کر کے یا درس گاہوں کو مسمار کر کے منشیات کے اندھیروں میں دھکیل دیا جائے۔ بے شک قیامت نزدیک سہی لیکن..... قیامت سے پہلے تو قیامت بھی ممکن نہیں..... پھر ایسی قیامت خیز تباہی کیوں.....؟ جب بھی گہرائی میں اتر کر سوچا تو سوائے اندھیروں اور مایوسی کے کچھ نظر نہیں آیا مگر امید کی کرن ہمیشہ گہری تاریکی کو بھی اجالے میں بدل دیتی ہے لہٰذا پاکستانی قوم بھی اچھے مستقبل کے خوش کن خیال سے کبھی مایوس نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا امید ہے کہ آنے والی ''نئی حکومت'' ان ''پرانے مسائل'' کو حل کرنے کی پُرخلوص کوشش ضرور کرے گی جو سالوں سے فائلوں میں مکمل مگر عملی طور پر ادھورے پن کا شکار ہیں۔ بہرحال اچھی امیدیں اور خوبصورت خوابوں کی سوغات لیے ذرا ہم بھی چلتے ہیں اپنی بزمِ دوستاں کی جانب جہاں باتوں کی پھلجھڑیاں لیے قارئین ہمارے منتظر ہیں۔

قارئین سے التماس

اخبارات اور رسائل کے لیے اس سال کے آغاز سے ہی مالی مشکلات شروع ہوچکی تھیں۔ لاگت میں عمومی اضافے کے ساتھ نیوز پرنٹ کی گرانی نے مستحکم اشاعتی اداروں کو بھی ہلا کر رکھ دیا اور یہ بحران تا حال جاری ہے۔ ان حالات میں ہمارے ادارے کے لیے تین راستے رہ جاتے ہیں، قیمت میں ناگزیر اضافہ، صفحات میں کمی یا آسیبی بحران میں اشاعت معطل کر کے بہتر وقت کا انتظار۔

ادارے اور معزز قارئین کا تعلق بہت گہرا اور بنیادی ہے۔ قارئین کی سرپرستی نے ہی ہمارے رسائل کو موجودہ مقام عطا کیا ہے۔ ہم آپ کی مشاورت سے ہی فیصلہ کرسکتے ہیں کہ ان تین میں سے کس راہ کا انتخاب ہمارے اور پڑھنے والوں کے لیے سودمند رہے گا۔ ہمیں آپ کی مخلصانہ آرا کا انتظار رہے گا۔

(ادارہ)

✠ چلبلی ہیر، جھنگ سٹی سے محفل میں شریک ہیں ''18 جولائی کو ایک سلم اور اسمارٹ سسپنس ڈائجسٹ ہاتھ میں آیا۔ انشائیہ سلامتی کی راہ بہت زبردست رہا، اچھا لگا۔ بہترین نصیحت تھی۔ اداریہ کے کیا کہنے۔ بہت ہی لاجواب۔ آپ کی دی گئی الیکشن پر مثال بہت بہت پسند آئی کہ ''کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا'' بالکل درست۔ ہر طرف یہی نظر آرہا ہے۔ ساتھ اینٹ اور روڑے کا خطرہ بھی بہت ہے۔ بس دعا ہے کہ اس خداداد مملکت کا جو بھی لیڈر آئے، پاکستان کے ساتھ مخلص ہو۔ سچا لیڈر ہی ہو۔ (آمین) بزمِ دوستاں کی جانب نظر پڑی تو، جناب محمد رفاقت صاحب کی لاٹری لگی ہوئی تھی۔ مبارک باد۔ وعلیکم السلام واہ

PK Books Site

کینٹ۔ ساتھ اداسی سرکار رمضان پاشا بھی وزارت تک پہنچ ہی گئے۔ ریاض بٹ صاحب بھی ایڑیاں اٹھا کر کرسیِ صدارت کو جھانک رہے تھے اور ریاض صاحب میری ٹرین کبھی نہیں چھوٹی کیونکہ میں وقت کی پابند ہوں۔ صدقے جاؤں ایمانے زرا راشاہ۔ اوکھلی میں سر دو سروں کا دیا کرو، اپنا نہیں۔ محفل میں تو ہم صنفِ نازک کا نام بھی ہے اور کمال بھی۔ مزید یہ کہ ہم پاور فل شہزادیاں ہیں۔ ویسے آپ کا تبصرہ لاجواب رہا۔ کچھ سٹریل انکل بھاگ گئے محفل سے۔ میں تو سوچتی ہوں چار دن کی زندگی ہے کچھ کھالے پی لے موج اڑا..... ناہید یوسف جی تو ہمیشہ کاموں کے بوجھ تلے دبی ہوتی ہیں۔ پھر بھی ڈائجسٹ کے لیے ٹائم نکال لیتی ہیں۔ عدنان معین شکوے کے ساتھ حاضر ہوئے۔ محفل میں شکوہ شکایت کرنے والوں کا حال اچھا نہیں ہوتا، آئندہ احتیاط۔ زریان سلطان کو بھی محفل میں آنے کی فرصت مل ہی گئی۔ سکھر کے حسنین ملی اور کوئٹہ کے ناصر خان محفل میں اچھا اضافہ ہیں۔ ناصر خان نے تو آتے ہی شوکی اور رینا کی شادی کی فرمائش کردی۔ بھئی وہ بیچارے جنگل میں پڑے ہیں، ان کی جان کے لالے پڑے ہیں اور آپ کو شادی کی پڑی ہے۔ محمد آذین رضوان نے بھی اچھا تبصرہ کیا۔ کہانیوں پر تبصرہ علی اختر صاحب کی دھو کے باز سے شروع کرتی ہوں۔ علی اختر صاحب تو تاریخ بیانی میں کمال رکھتے ہیں۔ وہ وہ پہلو لکھتے ہیں جن کی ہمیں تلاش بھی، ویلڈن صاحب بہت شکریہ۔ نظر اد ھوکے باز کا انجام بہت برا ہوا ہے۔ کہانیوں کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو سوائے ایک دو کے کوئی مشہور رائٹر نہیں۔ سارے نامی گرامی رائٹرز جاسوسی ڈائجسٹ کو پیارے ہو گئے۔ ہم سسپنس ڈائجسٹ والوں کا کیا قصور ہے بھئی، اس کا جواب چاہیے ہمیں۔ (اگر آپ کو کہانیاں پڑھنے کے لیے اچھی مل رہی ہیں تو نام پر نہ جائیں، کام کو اہمیت دیجیے) ملک صفدر حیات کی انجام بہ شر بہت اچھی اور تجسس سے بھرپور رہی۔ بجلی اور تعلیم بالغاں کا گٹھ جوڑ ہاہاہا..... زبردست۔ محمد الیاس کی نرس بھی پاور فلر رہی۔ کچھ لوگ اپنی سوچ کے مطابق دوسرے پیشوں کو دیکھتے ہیں۔ بیچاری نرس ارم کو اپنا گردہ بیچنا پڑا۔ منظر امام صاحب کی قطعہ کہانی بھی خوب رہی۔ بددعا میں محمد فاروق انجم نے کافی متاثر کیا۔ حسام بٹ کی وقت پر اچھا وقت آیا۔ اسد علی کو ایڈونچر دکھانے کا موقع ملا۔ مگر بیچارہ یخ بستہ بھربھری برف میں دھنس گیا اور اب کلمہ پڑھنے کا وقت آگیا۔ مگر ہمارا ہیرو مر نہیں سکتا، یہ تو ہم جانتے ہیں۔ رنگِ آسماں کا دسواں حصہ اے آر راجپوت جی نے بہترین پیش کیا۔ شوکی، رینا کو بچاریوں کے چنگل سے نکالنے کے لیے ایکشن میں تھا۔ ظفر اقبال ظفری بالآخر..... ثمر عباس جی کی یتیم بھی اچھی اور کامیاب اسٹوریز تھیں۔ آخری صفحات پر سنگین خاتمہ بس ٹائم پاس تھی۔ الجھی سلجھی داستاں تھی جو دو حصوں میں پیش کی گئی۔ حضرت موسیٰ کی داستان بہترین اور سیر حاصل ہے، خدا کہ اللہ رضوانہ ساجد۔ کترنیں بہت زبردست تھیں۔ محفل شعر و سخن بھی بہت رہی۔ سسپنس کلاسک بس ایک بار دے کر قارئین کو توڑ کر دیا۔ شاوشے.....'' (ارے جناب ایسا نہیں ہے۔ اگر زیادہ دینے لگے تو نئی کہانیوں کو جگہ کم ملے گی..... اور آپ لوگوں کو بھی شکوہ ہوگا کہ پرانی کہانی لگادی۔ بہرحال اس بار خوش ہو جایئے کہ سسپنس کلاسک حاضر ہے)

✠ زرین آفریدی کا خط حیدرآباد سے ''اگست کا شمارہ بروقت مل گیا۔ ٹائٹل، انشائیہ اور اداریہ سب صحیح رہے۔ (اچھا جی.....) میں کچھ وجوہات سے سسپنس پورا نہیں پڑھ پائی، اس وجہ سے تبصرہ بھی ممکن نہیں۔ دراصل اللہ کے حکم سے میں اپنی فیملی کے ساتھ 28 جولائی کو حج کی سعادت حاصل کرنے کے لیے روانہ ہو رہی ہوں۔ (بہت بہت مبارک ہو..... اللہ آپ کی عبادات قبول فرمائے) دعا گو ہوں، ہر سچے مسلمان کو یہ سعادت نصیب ہو (آمین)۔ مملکتِ خداداد پاکستان میں الیکشن کی گہما گہمی بھی اختتام پذیر ہوئی اور ایک پارٹی بھی واضح اکثریت سے سامنے آگئی۔ اللہ کرے یہ پارٹی عوام کی توقعات پر پورا اترے (اللہ اس کا ر خیر کو توفیق دے)۔ علی اختر کی دھو کے باز بہترین تاریخی کہانی تھی۔ کافی تسلی بخش انداز میں لکھتے ہیں۔ دونوں سلسلہ وار داستانیں بھی شاندار طریقے سے گامزن ہیں۔ اسد علی کو حسام بٹ صاحب نے برف میں چھینکا۔ اب اس پر کیسا وقت آتا ہے کچھ پتا نہیں۔ رنگِ آسماں میں بھی رینا بچاریوں کے چنگل میں چلی گئی اور شوکی کو کچھ کرنے کا موقع مل گیا۔ ثمر ہادی جی کی سنگین خاتمہ کا خاتمہ اچھا ہوا۔ بس ملے جلے رجحان رکھنے والی داستان تھی۔ کترنیں بہت پسند آئیں۔ محفل شعر و سخن بھی زبردست تھی۔ محمد رفاقت صاحب صدارت کی مبارکباد۔''

✠ خالد شیخ طاہری، جامشورو سے شمارے پر تبصرہ کر رہے ہیں ''سسپنس حسب معمول اپنے ٹائم پر مل گیا۔ باکر اس دفعہ سسپنس آفس میں ہی دے کر چلا گیا۔ سرورق پر نظر دوڑائی۔ یوم آزادی ادارے کو بھی بہت بہت مبارک۔ واقعی ہماری پیاری پاکستان سے ہے۔ حسینہ ہری چڑیا کے ساتھ کس کے انتظار سے تھک ہار کر آنکھیں بند کیے نہ جانے کیا سوچتی نظر آئی۔ سائڈ پر رکھی بجھتی ہوئی موم بتی نے سرورق کو خوب صورت بنا دیا۔ فہرست سے آگے بڑھے تو جون صاحب کی سلامتی کی راہ پر چل نکلے۔ اے شخص! آ..... کہ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر سلامتی کی راہ پر چلیں، پڑھ کر اچھا لگا۔ اپنی محفل ادارے کی طرف سے آزادی کی مبارک باد سمیٹی

سچے جھوٹے وعدوں کے درمیان الیکشن کی گہما گہمی عروج پر ہے..... ملک پاکستان کے لیے نیک خواہشات و تمنائیں۔ محمد رفاقت صاحب اپنے بہترین تبصرے کے ساتھ کرسیِ صدارت پر براجمان..... مبارک باد جناب۔ ریاض بٹ، ایمانے زرا راشاہ، رومی انصاری اور حسنین علی کے تبصرے اچھے لگے۔ یہ محفل اپنے دلچسپ تبصروں سے ہمیشہ سے توجہ کا مرکز رہی ہے۔ سب لوگ بہترین تبصرہ کرتے ہیں۔ جب سسپنس ملا، میں آفس میں ہی تھا۔ اس دن کام بھی نہیں تھا تو پہلے چھوٹی کہانیوں کو پڑھنا شروع کیا۔ پڑھتا گیا پڑھتا گیا، بس ایک گھنٹے کے وقفے کے بعد دوبارہ سسپنس سنبھالا تو چھوٹی تمام کہانیاں پڑھ چکا تھا۔ (واہ ماشاء اللہ کیا اسپیڈ دکھائی آپ نے) چار بجے تک دونوں سلسلے اور صفدر صاحب کی ڈائری ہی بچی تھی۔ منظر امام صاحب نے ایک بار پھر اپنے انداز میں اچھی کہانی پیش کی۔ فاروق انجم کی بددعا دلچسپی سے پڑھی۔ ظفر اقبال صاحب کی بالآخر مزیدار رہی، پڑھ کر اچھا لگا۔ محمد الیاس صاحب کی نرس کو اگر چھوٹی کہانیوں میں ٹاپ پر رکھیں تو اس میں دو رائے نہیں ہو سکتی۔ مظہر سلیم ہاشمی نے اچھی کوشش کی اور قاری کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور فرعونی سازشیں رضوانہ ساجد صاحبہ نے دلچسپ انداز میں قلم بند کیں۔ محفل شعر و سخن میں تمام احباب کے اشعار معیاری اور بہترین انتخاب تھے۔ ترجمہ کہانیوں میں ثمر عباس ٹاپ پر رہے۔ مقدس تصویر دوسرے نمبر پر اور نہلے پہ دہلا تیسرے نمبر پر رہی۔ تحویر یاض غیر اہم میں قابلِ ستائش رہے۔ حسام بٹ صاحب کی وقت نے زبردست کروٹ لی۔ کہانی اب دلچسپ ہوگئی ہے..... بس ایک بات جس کو ہرانا نہیں چاہیے۔ ایک معاشرتی سماجی برائی اور کبیرہ گناہ کی تکرار ذہن میں ایک سوال پیدا کر رہی ہے کہ کیا لکھاری اس کے بغیر کہانی آگے نہیں بڑھا سکتے.....؟ رنگِ آسماں کی بات کی جائے تو راجپوت صاحب کی شاندار منظر نگاری نے کہانی میں جان ڈال رکھی ہے۔ اب تو جنگ بھی شروع ہو چکی ہے، دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔ ایک ساتھ تین کہانیوں کو چلانا راجپوت صاحب کا کمال ہے۔ ملک صفدر صاحب کی ڈائری نے بہت اعلیٰ تحریر پڑھائی، ملک صاحب کی باریک بینی اور بجلی کی روداد پڑھ کر ملک صاحب کو داد دی۔ علی اختر صاحب نے دھو کے باز میں ماضی کے آئینے سے دھول صاف کی اور ماضی کے ان سبق آموز واقعات سے پردہ اٹھایا جس سے ہم ناواقف تھے۔ اس دفعہ چٹکلوں نے اپنے ہونے کا احساس دلایا۔ سبھی چٹکلے مزاح سے بھرپور رہے۔ سب سے آخر میں بات کروں گا، نشور ہادی کی سنگین خاتمہ کی۔ پہلا حصہ پڑھا تھا تو لگا تھا ایک الجھی ہوئی کہانی ہے جو اگلے حصے میں سلجھ جائے گی۔ مگر بہت مایوس کیا دوسرے حصے نے۔ سنگین خاتمہ بالکل بھی پسند نہیں آئی۔ امید ہے نشور ہادی اگلی تحریر شاندار لکھ کر ہمارا شکوہ ختم کردیں گی۔ حاصل جمع لکھوں تو سسپنس اگست کو بہترین اور شاندار کہا جاسکتا ہے۔'' (بہت شکریہ جناب..... آپ کی پسندیدگی ہماری حوصلہ افزائی کا کام کرتی ہے)

✠ رمضان پاشا، گلشن اقبال کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں ''ایک بات آپ سے پوچھنی تھی کہ وہ سسپنس کلاسک کا کیا ہوا، صرف ایک کہانی آخری کیل پڑھنے کو ملی اس کے بعد سسپنس خاموش ہوگیا۔ حالانکہ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ ہر ماہ ایک مرحوم لکھاری کی کہانی شائع ہوگی۔ (ہر ماہ کا وعدہ تو نہیں مگر گاہے گاہے لگانے کا وعدہ کیا تھا جو اس ماہ وفا ہو گیا) دوسری بات یہ کہنی ہے کہ مرحوم کہانی کار کی کہانی جب بھی شائع کریں تو فہرست میں اور کہانی کے عنوان کے تحت سسپنس کلاسک ضرور لکھیے۔ تیسرا پہ دہلا پڑھ کر مزہ آگیا بلکہ بہت ہی مزہ آگیا۔ انجام بہ شر اس بار ملک صاحب کی کہانی زوردار تھی لیکن انجام مایوس کن تھا۔ ماسٹر عنایت اور بجلی کی گرفتاری کا منظر بیان ہونا چاہیے تھا۔ سرسری طور پر کہانی ختم کردی۔ مزہ کرکرا کردیا۔ رنگِ آسماں، مندر والوں اور مہاراجی اور اس کے دو نمبر عاشق کا تیا پانچا ہو جائے تو پھر اس کہانی پر تبصرہ کروں گا۔ نرس کہانی اچھی تھی۔ مقدس تصویر سمجھ میں نہیں آئی، تبصرہ کیا کروں؟ رائگاں پڑھ کر اس کا لطف رائگاں گیا، یعنی اچھی نہیں لگی۔ طبع زاد کہانیوں میں بددعا اچھی کہانی تھی۔ غیر اہم اور قطعہ کہانی پسند نہیں آئی۔ وقت، ہائے کیسا وقت آگیا کہ حسام صاحب کو وقت پر قلم اٹھانا پڑا۔ بالآخر کہانی پر لطف تھی۔ سنگین خاتمہ اس میں غیر حقیقی باتوں اور اتفاقات کی بھرمار ہے اس وجہ سے کہانی میں لطف کے بجائے بوریت محسوس ہوئی۔''

✠ محمد رفاقت، واہ کینٹ سے چلے آرہے ہیں ''میری طرف سے آپ سب کو یوم آزادی مبارک ہو۔ ہم سب کی پہچان پاکستان ہے۔ اس میں ہم آزادی سے سانس لیتے ہیں اور اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ اس لیے ہم سب کو چاہیے کہ اس نعمت کی قدر کریں اور اپنے پاکستان کی حفاظت کریں۔ انشائیہ میں جون ایلیا نے بھی سچ کہا ہے کہ ہم سب اپنے دشمنوں کی سازشوں کو ناکام بنائیں اور اردگرد کے ماحول پر نظر رکھیں تاکہ تاریکیاں ہماری بستیوں سے دور ہوں اور روشنیاں ہمارے قریوں کو جگمگائیں، ویرانیوں کو موت آئے اور آبادیاں زندگی لبھائیں۔ سسپنس نے اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے محترم علی اختر صاحب کی کہانی دھو کے باز پیش کی۔ یہ کہانی ماضی کا آئینہ ہم سب کے لیے ہے تاکہ ہم ماضی کو بھی یاد رکھیں۔ رنگِ آسماں اور وقت سلسلے وار کہانیاں ہیں، اچھی جارہی ہیں۔ اسی طرح ایمان افروز قصے حضرت موسیٰ میں فرعونی سازشوں کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ محفل شعر و سخن میں

اچھے شعر پڑھنے کو ملے۔ ادارہ مبارک باد کا مستحق ہے۔ باقی دوسری کہانیاں جن میں یتیم بھی اچھی کہانی ہے اللہ پاک یتیم نرین میں کسی کو بھی نہ بٹھائے۔ قطعہ کہانی میں رائٹر نے کیا بات بتانی چاہی ہے، مجھے سمجھ میں نہیں آئی۔ نرس چھوٹی اور بہت خوبصورت کہانی ہے، مجھے پسند آئی۔ باقی کہانیاں بھی تعریف کے قابل ہیں۔ میری طرف سے تمام لکھنے والوں کو بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔ خط بھی خوب ہیں جو رسالے کے بارے میں کافی تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ رمضان پاشا، ریاض بٹ، محمد شاہد نواز، ایمانے زار اشاہ، عبدالجبار رومی انصاری صاحب (جناب آپ کا بہت بہت شکریہ) ناہید یوسف، عدنان معین، زریان سلطان، حسنین علی، محمد آذین رضوان، ناصر خان۔ ان سب حضرات نے اپنی اچھی رائے کا اظہار کیا ہے۔ سب کو بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔ سب کو آزادی مبارک ہو۔'' (خیر مبارک)

✻ ریاض بٹ، حسن ابدال سے اپنے خیالات کا اظہار کررہے ہیں ''انتظار کی گھڑیاں اس وقت اختتام پذیر ہوئیں جب اپنا دل پسند ماہنامہ (سسپنس) نگاہوں کے سامنے آیا۔ لگتا ہے، سرورق کی حسینہ کوئی حسین خواب دیکھ رہی ہے۔ نئے پاکستان کا خواب ہمیں ہر الیکشن میں دکھایا ہی جاتا ہے لیکن..... خیر جانے دیں۔ خطوط کی محفل میں مدیرہ صاحبہ جو کچھ بتانے کی کوشش کررہی ہیں، وہ ہماری سمجھ میں آگیا ہے۔ جب میں یہ خط لکھ رہا ہوں تو الیکشن صرف دو تین دن کی دوری پر رہ گئے ہیں..... ہمیں بھی لگ رہا ہے کہ آنے والی حکومت کس چاٹ کا شاخسانہ ہوگی۔ کیونکہ اب عوام ہوشیار اور ذہین ہوچکے ہیں..... جو سرسوں کو ہاتھ پہ جمانے کا کہہ رہے ہیں اور ایسے دعوے کر رہے ہیں جو کبھی پورے نہیں ہوسکتے..... اس سلسلے میں صرف اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ہانڈی میں جتنا سالن ہوگا، اس سے زیادہ پلیٹ میں نکالنا کیسے ممکن ہے؟ بہرحال محفل میں سب سے پہلا خط ہے جناب محمد رفاقت صاحب کا۔ کرسی صدارت مبارک ہو۔ اب آپ ریگولر اور توجہ سے لکھنے والوں میں شامل ہوگئے ہیں۔ رمضان پاشا بھائی بھی دلجمعی اور باقاعدگی سے حاضر محفل ہوتے ہیں۔ اچھا لگتا ہے۔ محمد شاہد نواز کا تبصرہ بھی دل کو بھا گیا۔ ایمانے زار اشاہ آپ کا تبصرہ بھی مدلل اور سیر حاصل ہے۔ تقریباً ہر کہانی پر تبصرہ کیا ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ..... عبدالجبار رومی انصاری بورے والا سے حسب معمول جاندار اور گہرائی لیے ہوئے تبصرے کے ساتھ محفل کی شان بڑھا رہے ہیں۔ ناہید یوسف، عدنان معین، زریان سلطان، حسنین علی، محمد آذین رضوان، ناصر خان کے تبصرے بھی محفل کی جان ہیں۔ کہانیوں پر اظہار خیال کرنے سے پہلے جون ایلیا کے انشائیے کی بات ہوجائے۔ انشائیہ سوچ کے دروا کررہا ہے۔ واقعی اپنی آنکھ میں شہتیر رکھ کر دوسرے کی آنکھ کا تنکا نکالنے کے متعلق کہنا کسی طرح بھی قابل قدر نہیں ہے۔ پہلے اپنے گریبان میں سر جھانک لینا چاہیے۔ اب بڑھتے ہیں، کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے تاریخی کہانی جو کہ اس بار علی اختر نے لکھی ہے۔ ماضی کے واقعات سے آگاہی ہوئی اور دھوکے بازوں کے متعلق جان کر یہ مان لینا پڑا کہ ایسے انسان ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ ملک صفدر حیات کی انجام بہ شر حسب معمول تجسس اور سسپنس سے بھرپور کہانی ہے..... ماسٹر نے خوب کام دکھایا۔ بالغوں کو تعلیم دیتے دیتے بچی کو تاڑ لیا اور اس شمل کی اندھی نے جذبات میں ماں باپ کی عزت کو پامال کردیا اور آخر دونوں ملک صاحب کے لقمے چڑھ گئے۔ رنگ آسماں نے رنگ بھی اس بار خوب ہوتی ہے۔ قطعہ کہانی منظر امام نے ہلکے پھلکے انداز میں لکھی لیکن بہت کچھ سمجھا گئی۔ عشق کا شوگر، لپا خوب نام ہے۔ دیری گڈ..... محمد فاروق انجم اس بار ولایتی ادب کے بجائے دیسی ادب کی کہانی لے کر آئے اور خوب لے کر آئے۔ واقعی قبولیت کی گھڑی کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کب آجائے۔ ویسے ایک قول ہے کہ معاف کردینا سب سے بہترین انتقام ہے۔ ظفر اقبال ظفری کی بالآخر ایک سبق آموز اور اچھوتی کہانی ہے۔ واقعی جب انسان کو اپنے سامنے موت ناچتی نظر آتی ہے تو وہ دوبارہ زندگی کی طرف لوٹنے کے لیے ہر برائی چھوڑ دیتا ہے۔ شہاب غوری نے بھی لکھی کیا۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ اشعار کی محفل بھی اس دفعہ نمبرون ہے۔''

✻ ایمانے زار اشاہ، اسلام آباد سے تشریف لائی ہیں ''آزادی کا سرسبز مہینا مبارک۔ (خیر مبارک) اگست کا شمارہ جیسے ہی ملا سیاسی گرما گرمی کی بدولت پڑھنے کا موڈ نہیں تھا لیکن پھر اپنی آرا بھی تو دینی ہوتی ہیں تو فیک 25 جولائی کو ووٹ کاسٹ کرنے کے بعد آتے ہی پڑھنا شروع کیا..... اب سے زیادہ انتظار وقت کا ہوتا ہے اور یہ ہمیں مایوس بھی نہیں کرتی۔ کہانی بہت مزے کی ہوتی جارہی ہے۔ راس آئی لینڈ کی منجمد کرنے والی ٹھنڈک اتنی گرمی میں بھی ہمیں محسوس ہورہی ہے..... اور علی کی حاضر دماغی ایک مرتبہ پھر عروج پر رہی..... قسط کا اختتامی موڑ پر اسرار رہا..... لیٹس سی ان نیکسٹ ایپی سوڈ! رنگ آسماں کی دو بدو جنگ مانسی میں لے گئی، اس دور میں یہ پڑھ کر عجیب سا لگتا ہے..... رینا کا انوائرنگ پوائنٹ ثابت ہوگا اور شوکت کی وجہ سے اب سب کچھ ایکسپوز ہوگا شاید..... میرا خیال ہے رنگ آسماں اب اختتامی لمحات کے قریب تر ہے۔ نشور ہادی کی سنگین خاتمہ کی یہ قسط مکمل ہونے کے باوجود ادھوری سی لگی۔ زید کی اتنی انٹنس بیماری کی ہسٹری سے آگاہ کرنا چاہیے تھا کہ آیا ایسی کیا وجہ ہوئی جس سے اس کے دماغ میں یہ چیز آگئی اور اسے قاتل بنا دیا..... مجموعی طور پر

کہانی اچھی رہی۔ آخری سین پرفیکٹ تھا..... ریما کا اپنے ہاتھوں سے گولی مارنا، بیچاری کو تاعمر کے لیے پچھتاوے میں ڈال گیا۔ اگر شادی کرتے وقت نیلم کی بات سن لیتی تو کیا جاتا..... !بالآخر میں جیسے شہاب کو اس کے چاہنے والوں نے سدھارا کاش اس طرح سب ہی سدھر سکتے ہوں..... ویسے کہانی میں کسی موڑ پر ایسا نہیں لگا کہ یہ سب ڈراما ہے..... بالکل حقیقت سے قریب تر تھا۔ سچ ہے اللہ کی پکڑ کا خوف صرف موت کے ڈسے آتا ہے..... صحت مندانہ زندگی میں پتا نہیں کیوں نہیں آتا..... !راگاں از مظہر سلیم ہاشمی اتنی مختصر سی؟ جیسے ہی شروع کی اور ختم..... اور یہ کیوں قتل کرتا پھر رہا تھا یہ نہیں بتایا گیا! چلو امانو ئیل کی ہم نام ہونے سے بچت ہوگئی..... گڈ ون! دیگر کہانیوں میں قطعہ کہانی، نرس اور بددعا اچھی لگیں۔''

✻ محمد زبیر ساگر، گوجرہ سے لکھ رہے ہیں ''جون کے سسپنس میں آپ نے میرا خط شائع کیا، مہربانی۔ اگست کا خوب صورت سسپنس میرے ہاتھوں میں ہے۔ میں تو حیران ہوں کس طرح سے اس کی تعریف کروں۔ ٹائٹل کی حسینہ کی کیا تعریف کروں۔ ایک خوب صورت دوشیزہ جان لینے والی اداؤں سے دل چرا لے گئی۔ پری جیسا چہرہ، آنکھیں بند، ٹھوڑی پر خوب صورت ہاتھ رکھ کر ہمیں دیوانہ بنانے والی حسینہ بہت خوب صورت لگی۔ دل کو بہت مدہوش کرگئی۔ اگست کا شمارہ بہت ہی پیارا لگا۔ اس کی تعریف کرنے کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اس لیے میں جب بھی خط لکھتا ہوں، سسپنس کو دعائیں دیتا ہوں۔ (آپ کی دعائیں ہمارا قیمتی سرمایہ ہیں۔ بہت شکریہ جناب) سلسلے وار کہانیاں وقت اور رنگ آسماں بہت خوبصورتی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ دونوں سلسلے اچھے ہیں۔ سسپنس ڈائجسٹ ایک معیاری رسالہ ہے۔ اس میں ہر کہانی سبق آموز ہوتی ہے۔ سسپنس کی ہر کہانی بہت اچھی ہوتی ہے۔ اب تو سسپنس ہماری جان بن گیا ہے۔ ہم اس کے بغیر رہ نہیں سکتے۔''

✻ ناہید یوسف کا خط اسلام آباد سے ''اس دفعہ کے سسپنس پر نظر پڑی تو بے اختیار ہوگئے۔ بس یہی جلدی تھی کہ کب ٹائم ملے اور ہم فرصت سے بیٹھ کر اس کا مطالعہ کریں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فہرست میں دو تین ناموں نے ہمیں اتنا بے چین کیا۔ سب سے پہلے تو ہم سب چھوڑ چھاڑ منظر امام کی قطعہ کہانی پر جا پہنچے۔ کیا کہنے منظر صاحب کے۔ عشق کے مارے نوجوان کا حال بیان کیا۔ پھر محمد الیاس کی نرس پڑھی۔ یقین جانیے مختصر سی کہانی میں بہت کچھ تھا۔ کہانی نے غمزدہ کردیا۔ واقعی ہمارے معاشرے میں نوکری پیشہ عورت کو غلط نگاہ سے دیکھا جاتا یا اس کے بارے میں غلط رائے قائم کرنا عام ہوگیا ہے۔ حالانکہ ضرورت انسان کو گھر کی دہلیز سے باہر نکلنے پر مجبور کرتی ہے۔ اللہ ہمیں مثبت انداز میں سوچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ زبیر حسین کی نیلے پہ دہلا فغانستک کہانی تھی۔ فن مصوری کو جاننے والے تتلی تصویر منہ مانگے داموں خرید بیٹھے۔ واقعی سیر کو سوا سیر مل گیا۔ پھر آئے سلسلہ وار کہانیوں کی طرف۔ پہلے اے آر راجپوت کی رنگ آسماں کا مطالعہ کیا۔ معذرت کے ساتھ موجودہ کہانی کا کوئی مقصد سمجھ نہیں آرہا۔ بھی مندر تو بھی انگریز فوج..... کہانی اسی دائرے میں گھومے جارہی ہے اور کوئی منزل نظر نہیں آرہی۔ کہانی میں دلچسپی کا فقدان ہے۔ پھر وقت کی طرف بڑھے۔ وقت نے بھی ہمیں بہت مایوس کیا۔ رائٹر صاحب ایک منظر پر اٹکتے ہیں تو اسے ربڑ کی طرح کھینچ کر لمبا کردیتے ہیں جس سے مطالعے میں بوریت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ راس آئی لینڈ پر پہنچ کر بھی ہیرو صاحب کوئی کارنامہ دکھانے میں ناکام ہیں۔ کہانی بس چلے جارہی ہے، اس میں صرف لفاظی ہی لفاظی ہے، ایکشن کی حد درجہ کمی ہے۔ رائٹر صاحب سے گزارش ہے کہ کہانی کو تیز کریں اور مختصر لفظوں میں منظر کو قلمبند کرکے روانی کو بہتر کریں اور ہیرو صاحب کے مشن کو واضح کرکے انہیں اس پر عملدرآمد کرتا ہوا دکھائیں۔ یہ ہماری ذاتی رائے ہے، ضروری نہیں کہ سب اس سے اتفاق کریں۔ ہمیں جو محسوس ہوا، ہم نے لفظوں کا سہارا لے کر کہہ دیا۔ علی اختر کی دھوکے باز پیچیدہ کہانی تھی۔ اس لیے نو تبصرہ۔ بہرحال کہانی میں دلچسپی برقرار رہی۔ تنویر ریاض کی غیر اہم بس ٹھیک لگی۔ مظہر سلیم ہاشمی کی راگاں اچھی کہانی تھی۔ آدم خور بھیڑیوں کا آئیڈیا اور کہانی کا اینڈ کلاسک تھا۔ زبردست کہانی تھی۔ ویلڈن مظہر صاحب۔ مقدس تصویر کچھ خاص متاثر نہ کرسکی۔ ملک صفدر حیات کی انجام بہ شر میں وہی آنکھ مچولی۔ بہرحال کہانی بہتر تھی۔ ظفر اقبال ظفری کی بالآخر کہانی بہت اچھی تھی۔ شرابی شخص کو خوب نصیحت دی۔ آئیڈیا شاندار تھا۔ یتیم کہانی ٹھیک رہی۔ حضرت موسیٰ کا قصہ پڑھ کر یقین جانیے روح تک سرشار ہوگئی۔ ویلڈن رضوانہ ساجد۔ ننگ کہانی نے کچھ خاص مزہ نہ دیا۔ نشور ہادی کی سنگین خاتمہ میں کچھ واقعات حقیقت سے دور لگے۔ بددعا کہانی بہتر تھی۔ مجموعی طور پر رسالے میں چھوٹی کہانیاں زیادہ اچھی لگیں۔''

✻ شاہانہ سلطان کی کھٹی میٹھی باتیں جامع کلاتھ کراچی سے ''بھئی واہ..... واہ واہ..... کافی مدت بعد سسپنس کا سرورق اتنا حسین لگا۔ کیا دوشیزہ کا انداز ہے اوپر سے کپڑوں کا ڈیزائن اور کلر کنٹراسٹ زبردست۔ دل خوش کردیا۔ ذرا آگے بڑھے تو جون صاحب کا انشائیہ سلامتی کی راہ پڑھا۔ کچی..... ہر سطر پر فکر لگی۔ اللہ نے واقعی جون ایلیا کو گفتگو کا ڈھنگ اور لفظوں کی ہم آہنگی کا ہنر بہت خوب عطا کیا تھا۔ تاریخی صفحات پر علی اختر کی کہانی دھوکے باز پڑھی۔ اس بار نہ صرف انداز بلکہ موضوع بھی انتہائی مختلف اور مشکل تھا۔ ملک فارس کی تاریخ نے تو ہمیں چونکا دیا۔ کتنی جلدی جلدی تبدیلی اور پھر ہر تبدیلی کے مختلف نتائج..... اف توبہ! بہت مشکل کہانی تھی، بہرحال اچھی تھی۔

ویلڈن علی اختر صاحب۔ نیر اہم تحویر ریاض کی کہانی نے بھی چونکا دیا۔ کیس کو کس طرح ہینڈل کیا گیا..... یہ سارا منظر نامہ بہت دلچسپ لگا۔ رائگاں مظہر سلیم ہاشمی نے نئے رائٹر ہونے کے باوجود اچھی کوشش کی۔ رنگ آسماں تو اے آر راجپوت کے قلم کا جادو بنتی جارہی ہے جناب..... کئی سمت میں رواں یہ داستان اپنے رنگ جماتی جارہی ہے۔ کبھی شاہ زمان کا رومان کبھی مندر میں قید رینا کی بے بسی اور اس پر شوکی کا حوصلہ جو اپنی ہمت اور بساط سے بڑھ کر رینا کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا ہے مگر کچھ کر نہیں پاتا۔ اس ماہ کی مختصر کہانیوں میں سب سے اچھی پہلے پہ دہلا لگی۔ واہ زبیر حسین ویلڈن۔ کیا بات دی ہے اس نے اپنی ننھی تصویر سے۔ ملک صفدر حیات کی انجام بہ شر نے بھی خوب لطف دیا بلکہ کافی دیر تک بیٹھی سوچتی رہی کہ دنیا میں کیسے کیسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے انجام سے بے خبر بس اوروں کے لیے اذیت کا سبب بنتے رہتے ہیں۔ شاہ زین رضوان بھی خوب لکھتے ہیں۔ مقدس تصویر بھی بہت دلچسپ لگی۔ فادر نے بھی کیا خوب گیم کھیلا۔ اس قیمتی تصویر کو سرے سے غائب ہی کر دیا۔ فادر سائمن جیسے لوگ بھلا کیا کسی کو اچھی ترغیب دیں گے جب اپنے نفس پر ہی قابو نہ ہو تو۔ محمد الیاس کی کہانی نرس نے بھی سوچنے پر مجبور کر دیا۔ جنہیں ہم برا سمجھتے ہیں، خاص طور پر پیشے کے لحاظ سے ضروری نہیں کہ وہ ویسا ہی ثابت ہو۔ وہ جو نرس تھی اور بدنامی کا داغ لیے جی رہی تھی، آخر میں اس کے مضبوط کردار اور بہترین اخلاق و قربانی نے سارے داغ مٹا دیے۔ منظر امام کی قطعہ کہانی نے بھی کافی متاثر کیا۔ بھلا جب سولہ سال کی عمر میں بیٹے کو شادی کی سوجھ جائے تو ایسے میں والدین کو کیا کرنا چاہیے۔ اشعار کی محفل کا ہر شعر نگینہ لگا۔ محمد فاروق انجم کی بددعا کچھ عجیب سی لگی۔ ماما کہ دل کبھی بھی کسی بھی عمر میں کسی پر عاشق ہو سکتا ہے مگر جہاں اتنا پیار اور اپنائیت ہو وہاں اتنی چالبازیاں چلنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی اور پھر اتنی شدت سے نہ کوئی بددعا کرتا ہے۔ بہرحال بس سو سو رہی اسنوری تو۔ حسام بٹ کی وقت اگرچہ اچھی تو ہے مگر ایک بات ہم نے شدت سے نوٹ کی ہے کہ صرف ایک ہی بات کو بار بار پوری قسط میں دہرایا جاتا ہے جس سے کہانی ٹھہری ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ نہ تو ماحول بدلتا ہے نہ منظر نامہ۔ پلیز اس طرف بھی تھوڑی توجہ دیجیے۔ ظفر اقبال ظفر کی کہانی بالآخر نے بھی کچھ زیادہ متاثر نہیں کیا۔ ثمر عباس کی کہانی یتیم بھی اچھی لگی جس سے مغربی معاشرے میں یتیم خانوں کے اصول و ضوابط کا ادراک ہوا۔ حضرت موسیٰ کا قصہ اور اس کا تسلسل ہمیں اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔ ان واقعات کو جتنی بار بھی پڑھ لیا جائے، ہر بار اپنا اثر ضرور چھوڑ جاتے ہیں۔ سبحان اللہ رضوانہ ساجد صاحبہ، بہت خوب لکھ رہی ہیں۔ بابرا عوان کی شک کچھ خاص نہیں لگی۔ آخری صفحات پر نشور ہادی کی داستان سنگین خاتمہ مکمل ہوئی۔ بس ٹھیک ہی تھی لیکن آخری صفحات کا حق ادا نہ کر پائی۔ آج کل یہ چلن شاید عام ہو گیا ہے کہ دوست بن کر دوست کا ہی گھر اجاڑ دیا جائے۔ کچھ ایسا ہی اس کہانی کے کرداروں کے ساتھ بھی ہوا لہٰذا سوچ سمجھ کر دوستوں کا انتخاب اور سنبھل کر ان کی صحبت اختیار کرنی چاہیے۔ چاہے مرد ہو یا عورت گھروں کے رابطے میں بھی محتاط رہنا چاہیے۔ بہرحال سبق آموز کہانی تھی۔''

✿ مہتاب احمد حیدرآباد سے شاملِ محفل ہیں ''19 جولائی کو سسپنس کا دیدار کیا۔ بسلسلہ کام فیصل آباد روانہ ہوئے تو سب سے پہلے اس بات کا اطمینان کر لیا کہ سسپنس بیگ میں موجود ہے کہ نہیں۔ کیونکہ لمبا سفر تھا اور اس سفر میں سسپنس سے اچھا ہم سفر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ جب سفر کا سلسلہ رواں ہوا تو تھوڑی پیٹ پوجا کی اور سسپنس نکال کر بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے وقت سے شروع کیا۔ حسام بٹ صاحب اچھے لکھاری ہیں تاہم وقت میں وہ تیزی اور وہ روانی نہیں آپا رہی جو ان کی کہانیوں کا خاصہ ہے۔ پڑھتے ہوئے یکسوئی برقرار نہیں رکھ پا رہے۔ کہانی ایک جگہ ٹھہر جاتی ہے اور اسی میں قسط کا اختتام ہو جاتا ہے۔ کہانی کو تیز اور ایکشن سے بھرپور کرنے کی ضرورت ہے۔ علی اختر کی تاریخی کہانی دھوکے باز اچھی رہی۔ تاریخ سے آگاہی ہوئی۔ کہانی کا اختتام اسم بامسمّیٰ تھا۔ منظر امام کا نام دیکھ کر قطعہ کہانی پڑھ ڈالی مگر اس دفعہ کچھ خاص مزہ نہ آیا۔ رنگِ آسماں پر پہنچے۔ کہانی بہت تیز ترین ہے مگر واقعات گھوم پھر کر یکسانیت کا تاثر دے رہے ہیں۔ حالانکہ کہانی میں ایکشن بھی ہے مگر کہانی اپنے محدود مدار کے گرد گردش کر رہی ہے۔ ہو سکتا ہے رائٹر کے ذہن میں کچھ ہو جو وہ اگلی اقساط میں منظرِ عام پر لائیں، فی الحال ہمیں جو لگا ہم نے کہہ دیا۔ بہرحال کہانی میں بوریت نہیں ہے۔ زبیر حسین کی پہلے پہ دہلا زبردست کہانی تھی۔ چالاک دکاندار کو خاتون نے چونا لگا دیا۔ بہت خوب زبیر صاحب۔ شاہ زین رضوان کی مقدس تصویر بس ٹھیک لگی۔ ملک صفدر حیات کی انجام بہ شر اچھی کہانی تھی۔ ملک صاحب نے ہمیشہ کی طرح اپنی صلاحیتوں کا استعمال کر کے بجلی کا سراغ لگایا۔ محمد الیاس کی کہانی نرس مختصر مگر سبق آموز کہانی رہی۔ محفل شعر و سخن لاجواب تھی۔ جون ایلیا صاحب ہمیں سلامتی کی راہ دکھا رہے تھے۔ فاروق انجم کی بددعا کچھ خاص پسند نہ آئی۔ دو آدمیوں کی بددعا ایک دوسرے کو لگ جانا کچھ سمجھ نہ آیا۔ حالانکہ وہ کوئی متقی پرہیزگار بھی نہیں تھے۔ حقیقت سے دور لگی۔ ظفر اقبال کی کہانی اچھی لگی۔ شہاب خوری کسی کی نہیں سنتا تھا اور شراب میں اپنی زندگی غرق کر دی تھی تاہم اہلِ خانہ نے منصوبے کے تحت صحیح راہ دکھائی۔ کہانی لاجواب تھی، اس میں نصیحت بھی تھی۔ واقعی انسان جب اللہ سے لو لگاتا ہے تو تمام برائیوں کو دور پھینک دیتا ہے۔ ثمر عباس کی یتیم کہانی بھی اچھی رہی۔ حضرت موسیٰ..... مطالعہ شروع کیا تو اس میں کھو سے گئے۔ رضوانہ ساجد بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ ایمان افروز واقعات پڑھ کر تر و تازہ ہو گئے۔ اس طرح کی تحاریر سب کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ نشور ہادی کی سنگین خاتمہ بس ٹھیک رہی۔ زید کی حرکات و سکنات اور دماغی مرض..... پھر قتل کرنا کچھ سمجھ نہ آیا جبکہ وہ جاب بھی کر رہا تھا۔ کہانی میں کئی جگہ جھول نظر آئے۔ مجموعی طور پر رسالہ بہترین تھا۔ آپ سے گزارش ہے کہ طاہر جاوید مغل کی بڑی کہانی شائع کریں۔''

✿ نازش خان کی نواب شاہ سے آمد ''سسپنس ڈائجسٹ سے پہلی ملاقات یادگار تھی۔ ہم اپنی سہیلی کے گھر گئے ہوئے تھے اور ہماری سہیلی صاحبہ ہمیں گھاس ہی نہیں ڈال رہی تھیں۔ بار بار بس انہی الفاظ کی گردان تھی کہ ایک منٹ ٹھہرو، میں کہانی پڑھ لوں، ورنہ ادھوری رہ جائے گی۔ بس جب ہم سے صبر نہ ہو سکا تو سہیلی صاحبہ کے سر پر پہنچ کر ڈائجسٹ چھین لیا اور اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔ پھر ہم نے پورا دن اپنی سہیلی کے ساتھ گزارا اور اس کے بے حد اصرار پر بھی اسے ڈائجسٹ واپس نہ کیا اور اپنے ساتھ گھر لے آئے۔ پھر گھر کے کاموں میں مشغول ہو کر ہوش ہی نہ رہا، احساس تب ہوا جب ہم کچھ آرام کی غرض سے اپنے بستر پر لیٹے۔ اچانک خیال آیا اور ہم ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھے۔ سسپنس نکالا اور اس کا جائزہ لینے لگے۔ پہلی کہانی محمد الیاس کی نرس پڑھی۔ چونکہ تحریر مختصر تھی اور ہمارا ارادہ بھی سرسری پڑھنے کا تھا اس لیے اس کہانی کا انتخاب کیا تھا مگر جب کہانی پڑھ لی تو ہم کافی دیر اس میں کھوئے رہے۔ بہت سبق آموز اور غمزدہ کرنے والی کہانی تھی۔ مزید تجسس میں دیگر کہانیوں کی طرف بڑھے۔ سلسلہ وار کہانی رنگِ آسماں پڑھی۔ واہ جی..... کیا ایکشن سے بھرپور کہانی تھی۔ مزہ آگیا۔ بس پھر کیا تھا۔ آگے سے آگے بڑھتے رہے۔ وقت کا مطالعہ کیا۔ ویسے ہم کوئی مستقل قاری تو نہیں مگر پھر بھی ہمیں کہانی کافی دلچسپ لگی۔ کہانی دھیمے انداز کی تحریر ہے۔ ہیرو صاحب کافی اڑیل ٹٹو لگ رہے ہیں۔ بھئی ہم تو سسپنس کے دیوانے ہو گئے۔ اب ہمیں پتا چلا کہ ہماری سہیلی صاحبہ کیوں ہر وقت آنکھیں گاڑے سسپنس پڑھتی رہتی ہیں۔ علی اختر کی تاریخی کہانی اچھی تھی مگر چونکہ ہم اتنا عادی نہیں ہیں اس لیے تاریخی کہانی میں دلچسپی قائم رکھنے میں ناکام رہے۔ مظہر سلیم ہاشمی کی رائگاں بہت شاندار لگی۔ ملک صفدر حیات کی انجام بہ شر پڑھ کے خود بھی ملک صاحب کے ہمراہ لڑکی کے اغوا کا سراغ لگانے لگے۔ سسپنس سے بھرپور تحریر تھی۔ زبیر حسین کی پہلے پہ دہلا پڑھ کے بس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ خاتون نے مہارت سے جعلی تصویر فروخت کر ڈالی اور جو خاتون کو ٹھگنا چاہ رہے تھے، خود شکار ہو گئے۔ ویلڈن۔ محفل شعر و سخن بھی لاجواب تھی۔ پورا ڈائجسٹ پڑھ لیا اور پھر کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئے کہ ہم بھی خطوط کی محفل میں شامل ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔''

✿ بشریٰ اقبال، لاہور سے خراماں خراماں چلی آرہی ہیں ''مجھے تھوڑی سی شکایت ہے ہمیں ہمارا فیورٹ دوست سسپنس اکثر لیٹ ملتا ہے۔ کیا مجھے گھر پر سسپنس مل سکتا ہے تو اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟..... (جناب اس کے لیے آپ کو ہمارا سالانہ خریدار بننا ہوگا اور اس سلسلے میں ہمارے پرچے میں اشتہار بھی لگا ہے جس میں آپ کی سہولت کے لیے تمام معلومات درج ہیں، ورنہ آپ ادارے میں فون کر کے اپنا مسئلہ حل کر سکتی ہیں) اس مرتبہ ذاکر انکل نے بہت عمدہ ٹائٹل بنایا ہے۔ میری دلی دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کے فن کو اور ترقی دے۔ میں بھی تمام بہنوں کی طرح ہر ماہ اس محفل میں شامل ہونا چاہتی ہوں۔ پہلی بار شرکت کر رہی ہوں دیکھیے کیا سلوک ہوتا ہے میرے ساتھ۔ (ارے بھئی آپ کی اپنی محفل ہے جگ جگ آؤ..... سو بسم اللہ) میں اس محفل سے تمام کوون، بہنوں، اور بلو... کو بھگا دوں گی۔ امید ہے بہنیں میری حوصلہ افزائی ضرور کریں گی اور میں وقتاً فوقتاً ان مخالفوں پر تابڑ توڑ حملے جاری رکھوں گی باقی تمام کہانیاں پسند آئیں۔ خاص طور پر پہلے پہ دہلا، یتیم اور نرس نے دل موہ لیا۔ انجام بہ شر میں ملک صفدر حیات کی تفتیش بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ مجرم کس طرح خود کو چھپاتا ہے۔ یہی سسپنس ہمیں پڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔ رنگ آسماں نے اب اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے ہیں۔ محفل شعر و سخن میں تمام اشعار معیاری اور بامعنی تھے۔ زبردست۔ وقت میں حسام بٹ نے بڑی تیزی دکھائی ہے۔ بس ہمیں بار بار حسینا وؤں کے درمیان رہنا اور ان کے ساتھ وقت گزاری کے طریقے پر..... اعتراض ہے۔ ویسے وہ بہت اعلیٰ اخلاق اور صحیح غلط کی باتیں کرتے ہیں۔ مگر علی صاحب کو اتنا نہیں پتا کہ ان کے طور طریقے کیا ہیں۔ بددعا کہانی بھی اچھی لگی۔ بعض اوقات منہ سے نکلی بات کس طرح پوری ہوتی ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ ہر وقت منہ سے اچھی بات نکالا کرو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بھی سسپنس کی جان ہے۔ بہت معلوماتی اور پُرفکر واقعات..... سنگین خاتمہ آخری صفحات پر نشور ہادی نے بہت اچھی تحریر لکھی..... انسان کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ اس کی آستین میں کب چپکے سے سانپ نے ڈیرا جما لیا ہے۔ یہی حال اس کا بھی تھا۔ جسے خبر ہی نہ تھی کہ اس کے گھر میں اس کے اپنوں نے ہی آگ لگا دی۔ بہت خوب ویلڈن..... اچھی دلچسپ داستان تھی۔ کترینہ بھی اس بار خوب مزہ دے گئیں۔ معلوماتی بھی اور پُرلطف بھی۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

ماریہ سلیم، گلستان جوہر۔ خالد احمد، لاہور۔ عطیہ رسول، پھالیہ (منڈی بہاالدین) عدنان معین، حیدرآباد۔ ذکیہ ارشاد، ملتان۔ شاہین تبسم، کراچی۔ عرفان احمد، سرگودھا۔ نادیہ علی، پشاور۔

PakBooks.pk

ایک دن سب کو اس عالم فانی سے چلے جانا ہے لیکن جانے والوں کے کام ان کی یاد زندہ رکھتے ہیں..... مرحوم مصنفین کی یادگار تحریروں کو خراجِ تحسین

مقبول اور ناقابلِ فراموش کہانیوں کا انتخاب

سسپنس کا ایک نیا سلسلہ

معتوبِ وقت

الیاس سیتاپوری

تاریخ گواہ ہے کہ محلاتی سازشوں میں کنیزوں اور غلاموں کا کتنا ہاتھ رہا ہے... بعض اوقات تو ان کی بازی گری نے راتوں رات تختہ الٹ دیا... کبھی ایسا بھی لگا کہ بادشاہت ان کے آگے ہاتھ باندھے کھڑی تھی... ظاہر میں جو نظر آتا تھا، حقیقت میں کچھ اور ثابت ہوتا رہا۔ ہادی بھی ایک ایسا ہی حکمران ثابت ہوا جس کے گرد بہ ظاہر تو حسن سجدہ ریز تھا لیکن دراصل خود اس کا ذہن ان کنیزوں کی گرفت میں تھا، اس کے باوجود ہادی کو ہر رشتے، ہر جذبے سے زیادہ عزیز اپنی بادشاہی تھی جسے وہ ہر حال میں قائم رکھنا چاہتا تھا مگر قائم تو صرف ایک ہی ذات ہے جو بادشاہوں کا بھی بادشاہ ہے... بس یہی حقیقت بھول کر اس نے ایسا فیصلہ کیا کہ اگر اس پر عمل ہو جاتا تو آج تاریخ کچھ اور لکھ رہی ہوتی۔ اس نے اپنی ماں اور بھائی کے قتل کا حکم دیا مگر اس قادرِ مطلق کے پاس تو کچھ اور درج تھا، سو اسی پر عمل ہوا... جس کے انجام نے آج تک دنیا کو حیرت میں ڈالا ہوا ہے کہ اس خاص رات میں ایک خلیفہ انتقال کر گیا... دوسرا برسرِ اقتدار آیا... اور تیسرے نے دنیا میں قدم رکھا۔

ماضی کا آئینہ، بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت انگیز واقعات







PakiBooks.com

موصل کا رہنے والا ابراہیم فنِ موسیقی میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ اس نے فنِ موسیقی قبیلہ خزاعہ کے غلام ابووہب عبداللہ سے حاصل کیا تھا۔ چونکہ ابووہب ساز پر ضربیں زور سے لگایا کرتا تھا اس لیے سامعین نے اس کو سیاط (کوڑے مارنے والا) کہنا شروع کردیا۔ بعد میں سیاط اس کا لقب قرار پایا اور مؤرخین نے اس کو سیاط ہی کے نام سے محفوظ کردیا۔ سیاط نے اپنے شاگرد ابراہیم کو محنت اور لگن سے تعلیم دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابراہیم نے اپنے فن میں کمال حاصل کرنے کے بعد سب سے پہلا انعام بنوعباس کے دوسرے خلیفہ ابوجعفر منصور سے سمور وراج کا ایک خلعت اور سات ہزار درہم حاصل کیے۔ ابوجعفر منصور سے انعام حاصل کرلینے کا یہ مطلب تھا کہ پتھر میں جونک لگ گئی کیونکہ یہ خلیفہ سخت مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ بلا کا کفایت شعار اور جزورس تھا جس سے لوگوں میں عام تاثر یہ تھا کہ ابوجعفر منصور خسیس واقع ہوا تھا۔

ابوجعفر منصور کا انتقال ہوا تو مہدی سریر آرائے خلافت ہوا۔ ابراہیم کو امید تھی کہ مہدی اس کو ملازمت پر برقرار رکھے گا لیکن نئے خلیفہ نے اس پر کوئی توجہ ہی نہیں دی کیونکہ نئے خلیفہ مہدی کو ابراہیم کی بابت یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ شراب پینے لگا ہے۔ مہدی نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر وہ شراب چھوڑ دے تو ملازم رکھ لیا جائے گا ورنہ وہ اپنی ملازمت کو ختم سمجھے۔

ابراہیم نے انکار کردیا اور دربار کا آنا جانا موقوف کردیا اور مہدی کے دونوں بیٹوں ہادی اور ہارون رشید سے تعلقات استوار کرلیے۔ مہدی کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے ابراہیم کو دربار میں طلب کرلیا ابراہیم کو جب خلیفہ کا فرمانِ طلبی موصول ہوا تو وہ شراب کے نشے میں تھا۔ وہ سخت شش و پنج میں مبتلا ہوگیا۔ اگر وہ نہیں جاتا... تو خلیفہ کے عتاب کا ڈر تھا اور اگر جاتا تھا تو شراب کے نشے کی سزا پاجانے کا ڈر تھا۔ آخر وہ دربار پہنچ گیا۔ مہدی نے اس کو نشے میں دیکھ کر برا بھلا کہنا شروع کیا۔ ''او گویے! شرم کر، گانے ناچنے سے روزی کمانا کہاں کی مردانگی ہے۔ دنیا میں مردوں کے لیے باعزت پیشے بھی تو ہیں۔ کیا میں نے تجھے منع نہیں کیا تھا کہ شراب کے نشے میں میرے دربار میں مت آنا اور تو اتنا ضدی اور ڈھیٹ ہے کہ نشے ہی میں میرے دربار میں آگیا۔''

ابراہیم نے جواب دیا۔ ''امیرالمومنین! گانا بجانا بھی ایک فن ہے اور یہ فن میں نے روزی کمانے کے لیے حاصل کیا ہے۔ اگر میں شراب نہ پیوں تو طبیعت میں جولانی اور شگفتگی پیدا ہی نہیں ہوتی اس لیے میں مجبور ہوں۔ امیرالمومنین! سچی بات تو یہ ہے کہ اگر میں شراب پینا چھوڑ دوں تو میں سست اور غبی ہوجاؤں گا اور روزی کمانے کے لائق نہیں رہوں گا۔''

مہدی مشتعل ہوکر کھڑا ہوگیا اور اپنے حبشی غلام کو حکم دیا۔ ''اس مردود کی پٹائی کی جائے۔''

غلام تیزی سے آگے بڑھا اور ابراہیم کو بالوں سے پکڑ کر زمین پر گرادیا اور مکوں اور لاتوں سے پٹائی کرنے لگا۔ درباری اس منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان میں براکمہ بھی شامل تھے۔ انہیں ابراہیم پر رحم آیا لیکن وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ خالد برمکی نے خلیفہ کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانا۔ پھر خالد برمکی کا بیٹا یحییٰ برمکی آگے بڑھا اور ابراہیم کی سفارش کی۔ مہدی نے دونوں ہی کو ڈانٹ دیا۔ یحییٰ سے کہا۔ ''یحییٰ! تو رشید کا اتالیق بھی ہے اس لیے تیرا یہ فرض ہے کہ تو اپنے شاگرد رشید کو اس سفلے اور نیچ کی صحبت سے دور رکھے۔'' اور پھر ایکدم گرم ہوگیا۔ ''لیکن میں اس کمین اور رذیل کو قید خانے میں کیوں نہ ڈلوا دوں۔''

مہدی کے حکم سے ابراہیم کو قید خانے میں ڈال دیا گیا لیکن کچھ عرصے بعد اس شرط پر رہا کردیا کہ ابراہیم خلیفہ کے بیٹوں ہادی اور ہارون سے دور رہے گا۔ ابراہیم دونوں شہزادوں سے دور دور رہنے لگا۔ ہادی اور ہارون کو بھی بڑا قلق تھا۔ وہ دونوں ابراہیم سے ملنے کے لیے بے چین رہنے لگے اور ایک دن ابراہیم کو گھیر ہی لیا۔ چوری چھپے تشفی میں لے گئے اور مل جل کر شراب پی۔ کنیزیں طلب ہوئیں اور موسیقی کی محفل آراستہ ہوئی' ابراہیم بہت زیادہ..... خوف زدہ تھا۔ خوف نے شراب کا نشہ کافور کردیا تھا اور نوجوان، حسین اور طرحدار کنیزوں کے ہیجان انگیز شباب اور سریلی آوازوں نے اپنا سحر گھودیا تھا۔ یہاں ہادی نے ابراہیم کو یقین دلایا کہ وہ بارِ خلافت سنبھالتے ہی اسے اپنا ندیم بنالے گا اور سارے دلدر دور کردے گا۔

اس دن ابراہیم نے اپنا گانا بھی سنایا اور کنیزوں سے سنا بھی' دونوں شہزادے بہت محظوظ ہوئے۔ استاد کو انعام واکرام بھی دیا لیکن استاد ابراہیم کے چہرے کی اداسی نہیں گئی۔ گانے کے بعد کنیزوں نے اسے گھیر لیا اور راگ راگنیوں کی باتیں کرنے لگیں۔ ابراہیم افسردگی اور مردہ دلی سے انہیں بتاتا سمجھاتا رہا۔ کنیزیں اس یگانہ روزگار کی..... اداسی پر افسوس کررہی تھیں۔ ایک کنیز نے

دعائیہ انداز میں کہا۔ ''خدایا! امیرالمومنین کو استاد ابراہیم کے حق میں نرم کردے۔''

دوسری کنیزوں نے جواب میں آمین کہا۔ ابراہیم نے کنیزوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''اے مہروشان طرب! میں تمہارا کس زبان سے شکریہ ادا کروں، اگر دونوں شہزادوں کی قدردانیاں اور تمہاری پرستاریاں میرے شریکِ حال نہ ہوتیں تو میں مرچکا ہوتا۔ قسمت میرا ساتھ نہیں دے رہی۔ تم دعا مانگ رہی ہو کہ خدا امیرالمومنین کو میرے حق میں نرم کردے۔ جبکہ میں دعا مانگ رہا ہوں کہ خدایا! تو میری قسمت کی برگشتگی دور کردے۔''

ہارون رشید کو یہ بات بہت بری لگی۔ وہ غصے میں کھڑا ہوگیا، بولا۔ ''استاد ابراہیم! تم نے جو دعا مانگی وہ امیرالمومنین کے حق میں بددعا ہے اور میں اس کو برداشت نہیں کرسکتا۔''

لیکن ہادی نے ہارون کو ڈانٹ دیا۔ ''ہارون! زیادہ تیزی نہ دکھا، استاد ابراہیم دعا مانگنے میں حق بجانب ہیں۔ اس میں تو نے امیرالمومنین کے حق میں بددعا کا پہلو کہاں سے نکال لیا؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''بھائی ہادی! موجودہ حالات میں امیرالمومنین کی زندگی میں تو استاد کی قسمت بدلنے سے رہی اور اس کی برگشتگی اسی وقت دور ہوگی جب امیرالمومنین ہم میں نہیں رہیں گے۔''

ہادی مذاق اڑانے کے انداز میں قہقہے لگانے لگا، بولا۔ ''خوب خوب! بڑی دور کی سوجھی، واللہ اسی کو اندیشہ ہائے دوردراز کہتے ہیں۔''

ہارون نے زور زور سے پاؤں پٹکے اور باہر جانے لگا۔ ہادی نے لپک کر اس کو دونوں شانوں سے پکڑ لیا، بولا۔ ''ہارون! یہاں سے تو برہم ہوکر نہیں جائے گا اور اگر باہر نکل کر تو نے استاد کو کسی قسم کی گزند پہنچانے کی کوشش کی تو یہ بھی سن لے کہ میں بہت دور تک استاد ہی کا ساتھ دوں گا اور مجھ کو یہ بات بھی یاد رہے کہ میں، تیرا بھائی ہادی مستقبل کا خلیفہ ہوں اور امیرالمومنین کی مخالفت مول لینا عقلمندی نہیں ہے۔''

ہارون نے نہایت مختصر جواب دیا۔ ''بھائی ہادی! میں شہزادہ ہوں اور کوئی بھی شہزادہ غلاموں کی طرح چغل خوری نہیں کرسکتا۔'' پھر ایک دم ابراہیم کی طرف مڑا۔ ''اور استاد ابراہیم! تم اپنے دل سے خوف اور تردد کو نکال دو، میں تمہارا بھی بُرا نہیں چاہتا۔''

ہارون یہ کہہ کر چلا گیا۔ ہادی اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ ہارون کے چلے جانے کے کچھ ثانیوں بعد بھی وہ اسی راہ پر نظریں جمائے رہا، جس پر چل کر ہارون نظروں سے اوجھل ہوا تھا۔ ہادی نے پہلے استاد کی طرف دیکھا جو پہلے سے کہیں زیادہ سہما ہوا نظر آرہا تھا، استاد کے بعد اس نے کنیزوں کی طرف دیکھا وہ بھی خاصی خوفزدہ تھیں۔ ہادی نے مسکرا کر سبھی کو حکم دیا۔ ''جشنِ طرب! گاؤ، خوب گاؤ، یہاں تک کہ آواز کی لے میں اندیشہ ہائے دوروراز دفعان ہوجائیں..... فکرو تردد بدری اختیار کریں۔''

ابراہیم نے کہا۔ ''شہزادے! ہارون سے ڈر لگ رہا ہے۔''

ایک کنیز نے بھی سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میرا تو یہ خیال ہے کہ فی الحال جشنِ طرب کو ملتوی کردیا جائے۔''

ہادی نے رعونت سے جواب دیا۔ ''ایسا نہیں ہوگا۔ ولی عہد میں ہوں، حکومت مجھے ملے گی۔ ہارون کو میری مرضی کا تابع بن کر رہنا ہوگا ورنہ..... خیر، جشنِ طرب برپا ہو۔''

کنیزوں نے گانا شروع کردیا۔ ابراہیم داد بھی دیتا اور اصلاح بھی کرتا جاتا۔ محفل شباب پر تھی جیسے در و دیوار سے نغمے پھوٹ رہے تھے۔ ہادی جھوم رہا تھا۔ وہ مغنیاؤں کو اپنے پاس بٹھالیتا اور وارفتگی میں حدِ احتیاط سے آگے نکل جاتا۔ وہ بے اختیار بول اٹھا۔ ''واللہ! موسیقی روح کی غذا ہے۔ امیرالمومنین معلوم نہیں کیوں اس سے نفرت کرتے ہیں۔ موسیقی کے بغیر آدمی لطف اندوز کس طرح اور کس چیز سے ہوسکتا ہے۔''

لیکن ابراہیم بدستور سہما ہوا تھا وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا، بولا۔ ''شہزادے! میرا دل بیٹھا جارہا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کچھ ہوکر رہے گا۔ مجھے یہاں سے... جانے دیں۔''

ہادی ہنس دیا۔ ''استاد ابراہیم! آپ کے منہ سے شراب کی بو آرہی ہے، اس لیے آپ اس وقت تک یہاں سے نہ جائیں جب تک کہ یہ بُو باقی ہے۔''

اس کے بعد ہادی نے درہموں کی ایک تھیلی استاد کی طرف بڑھادی۔ ابراہیم نے بے صبرے پن سے تھیلی اپنے زانو تلے دبالی اور جم کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ایک خدمت گار خاتون اندر داخل ہوئی اور ہادی کو اشارے سے بلا کر ایک طرف لے گئی۔ ابراہیم کا چہرہ سفید پڑ گیا کیونکہ خدمت گار خاتون ہادی سے جو کچھ بھی کہہ رہی تھی اس کا تعلق ابراہیم سے ضرور تھا کیونکہ وہ باتوں کے دوران بار بار ابراہیم کو دیکھے جارہی تھی۔ پھر اس نے ہادی کو بھی اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ اب ابراہیم کا ایک لمحہ بیٹھنا بھی دوبھر ہوگیا تھا۔ اٹھ کر اس طرح کھڑا ہوا کہ درہموں کی تھیلی اٹھا کر بغل میں

دبالی اور ہادی سے کہا۔ ''شہزادے! میرا خیال ہے محفل برخاست کردی جائے۔''

ہادی خاتون کو رخصت کر کے استاد ابراہیم کے پاس جا کھڑا ہوا اور کنیزوں کو مخاطب کیا۔ ''آواز اور لحن کی جادوگرنیو! اب تم محل کے اندر گم ہو جاؤ کیونکہ تھوڑی دیر بعد یہاں امیرالمومنین تشریف لانے والے ہیں۔''

ابراہیم کی تو جان ہی نکل گئی، بولا۔ ''امیرالمومنین آنے ہی والے ہیں اس لیے ہم ان کے آنے سے پہلے ہی فرار ہو جائیں تو بہتر ہے۔''

لیکن فرار کا وقت نہیں رہا تھا، مہدی اپنے خدمت گاروں اور سپاہیوں کو لیے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ ہادی جہاں کھڑا تھا وہیں سر جھکا کر کھڑا رہ گیا۔ کنیزیں بھی نہیں بھاگ سکی تھیں۔ وہ منہ کے بل زمین پر لیٹ گئیں۔ ابراہیم کی بغل میں دبی ہوئی درہموں کی تھیلی چھنا کے کے ساتھ فرش پر گر گئی اور وہ خود لرزنے، کپکپانے لگا۔ مہدی نے اجڑی ہوئی محفلِ طرب کا سرسری جائزہ لیا اور سیدھا استاد ابراہیم کے پاس پہنچ گیا، پوچھا۔ ''او گویے! تو یہاں کیا کر رہا تھا؟''

ابراہیم نے جواب دیا۔ ''امیرالمومنین! میں خود نہیں آیا، مجھے بلوایا گیا تھا۔''

مہدی نے ابراہیم کے بال پکڑ کر کئی جھٹکے دیے اور غصے میں کہا۔ ''کیا میں نے تجھ سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ تو ہادی اور ہارون سے نہیں ملے گا؟''

ابراہیم لڑکھڑا کر مہدی کے قدموں میں گر گیا۔ گڑگڑا کر بولا۔ ''امیرالمومنین! مجھے اپنا عہد اس وقت بھی یاد ہے لیکن میں نے عرض جو کیا کہ میں یہاں خود سے، بن بلائے نہیں آیا، مجھے بلایا گیا تھا۔''

مہدی نے پوچھا۔ ''تجھے یہاں کس نے بلوایا تھا؟''

ابراہیم نے کوئی جواب دینے کے بجائے ہادی کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

مہدی نے ابراہیم کی ٹھوڑی کو پکڑ کر اس کا منہ اپنے سامنے کر لیا اور سونگھتے ہوئے کہا۔ ''اور تو نے شراب بھی پی رکھی ہے۔''

اس کے بعد ہادی کے پاس گیا اور اس کا منہ سونگھا، وہ ایکدم اچھل گیا، بولا۔ ''اور تو نے بھی شراب پی رکھی ہے۔'' پھر بہ آواز بلند پوچھا۔ ''اور یہ ہارون کہاں چلا گیا؟ تھوڑی دیر پہلے وہ بھی تو یہاں موجود تھا۔''

ابراہیم کانپ رہا تھا، بولا۔ ''امیرالمومنین رحم!''

مہدی نے حکم دیا۔ ''ہارون کو حاضر کیا جائے۔''

خدمت گار حرکت میں آ گئے، اوندھے منہ زمین پر دراز کنیزوں کو مہدی نے سیدھا کر دیا اور ڈانٹ کر پوچھا۔ ''تم دونوں سچ سچ بتانا، کیا یہاں تھوڑی دیر پہلے ہارون بھی موجود تھا؟''

دونوں نے منہ سے جواب دینے کے بجائے اثبات میں سر ہلا دیے۔ کچھ دیر بعد ہارون کو بھی لے آیا گیا۔ مہدی نے اس کا منہ بھی سونگھ لیا اور ہارون اور ہادی کو ایک ساتھ مخاطب کیا۔ ''تمہیں شرم آنی چاہیے، ایک گویے کی صحبت میں اور کیا سیکھو گے۔'' پھر ابراہیم سے کہا۔ ''ابراہیم! اس دن تو میں نے تجھے معاف کر دیا تھا لیکن آج کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑوں گا۔''

ابراہیم کی آنکھوں تلے اندھیرا پھیل رہا تھا، در و دیوار گھوم رہے تھے۔ اس نے خوشامد کی۔ ''امیرالمومنین! ایک بار اور معاف کر دیجیے۔''

مہدی نے سختی سے انکار کیا۔ ''نہیں ہرگز نہیں، کسی قیمت پر بھی نہیں۔'' پھر آواز دی۔ ''ارے کوئی ہے جو اس جھوٹے اور عہد شکن گویے کو تین سو کوڑے لگا دے؟''

مہدی کا جلاد اس کے پاس ہی موجود تھا، وہ کوڑا سنبھال کر ابراہیم کی طرف بڑھا۔ ابراہیم بچے کی طرح رونے لگا، بولا۔ ''امیرالمومنین! اب میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ میں دونوں شہزادوں سے زندگی بھر نہیں ملوں گا۔''

مہدی نے کہا۔ ''میں تیری قسموں پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ تو شرابی ہے اور میں شرابی پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں۔''

ابراہیم زار و قطار رو رہا تھا، جلاد نے کوڑے والا ہاتھ اوپر اٹھایا، ہادی نے اپنے باپ کا دامن پکڑ لیا۔ ''امیرالمومنین! استاد ابراہیم نے جو کچھ کیا اس میں ہم دونوں بھائیوں کی ایما اور حکم شامل تھے، یا تو آپ اس کو معاف فرما دیں یا پھر ہم دونوں کو بھی استاد ابراہیم کے ساتھ ہی سزا دیں۔''

مہدی نے جلاد کو ہاتھ کے اشارے سے روکا اور ہادی سے پوچھا۔ ''کیا تم دونوں مجھ سے یہ وعدہ کرو گے کہ آئندہ اس گویے سے کوئی تعلق نہیں رکھو گے؟''

ہادی نے جواب دیا۔ ''میں وعدہ کرنے کو تیار ہوں۔ ہارون کیا کہتا ہے یہ اس سے پوچھ لیجیے۔''

مہدی نے ہارون سے سوال کیا۔ ''رشید! تو کیا کہتا ہے؟''

رشید نے جواب دیا۔ ''وہی، جو بھائی ہادی کہہ رہے ہیں۔''

مہدی نے ابراہیم کو ان دونوں کے روبرو کھڑا کر دیا اور سوال کیا۔ ''اور گویے تو کیا کہتا ہے؟''

ابراہیم اتنا سہما ہوا تھا کہ اس کی آواز گلے میں پھنس رہی تھی، بولا۔ ''میں تو پہلے ہی امیرالمومنین کو یہ یقین دلا چکا ہوں کہ آئندہ میں دونوں شہزادوں سے نہیں ملوں گا لیکن امیرالمومنین شرابی ہونے کی وجہ سے میری باتوں پر اعتبار کرنے کو تیار ہی نہیں۔ ویسے میں ایک بار پھر یہ عہد کرتا ہوں کہ ان دونوں شہزادوں سے بے تعلق اور دور دور رہوں گا۔''

مہدی نے جلاد سے کہا۔ ''تو دور ہٹ جا، میں نے دونوں شہزادوں کی وجہ سے اس گویے کو معاف کر دیا لیکن اس کو کچھ عرصہ قید خانے کی ہوا ضرور کھانا پڑے گی۔''

اس کے بعد مہدی نے ابراہیم کو قید خانے بھجوا دیا حالانکہ وہ برابر روئے جا رہا تھا۔

اب مہدی نے دونوں شہزادوں کو مخاطب کیا۔ ''بیٹو! تم دونوں میرے لیے ''بمنزلہ'' دونوں آنکھ ہو۔ ہادی سیدھی آنکھ ہے اور رشید بائیں آنکھ۔ میرے لیے دونوں ہی آنکھیں برابر ہیں۔ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ ایک آنکھ کو بھی کوئی نقصان پہنچے۔ تمہیں خلافت کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔ آئندہ خبردار جو کسی سلسلے میں بھی تم دونوں یا دونوں میں سے کوئی ایک بھی مغنیوں، گویوں کی صحبت میں اٹھا بیٹھا۔''

دونوں شہزادوں نے اپنے اپنے کان پکڑ کے ایک بار پھر یہ عہد کیا کہ وہ استاد ابراہیم سے کسی بھی قسم کا تعلق یا رابطہ نہیں رکھیں گے۔

ابراہیم کو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ دونوں شہزادوں نے اپنا عہد اس طرح نبھایا کہ وہ کسی بھی دن استاد سے ملنے قید خانے نہیں گئے۔ استاد ابراہیم کا حساس اور گداز دل زمانے کی ناقدری اور بے مہری پر خون کے آنسو روتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ دنیا سے بیزار ہو گیا اور کتابت اور قرأت سیکھنے لگا۔ اس کو گانے سے عشق تھا لیکن اس گانے نے اس کو جتنا ذلیل و خوار کیا تھا وہ اس سے دل برداشتہ ہو چکا تھا۔ اس نے کتابت و قرأت اس لیے سیکھی تھی کہ خلیفہ مہدی ان دونوں کا قدردان تھا۔ قید خانے میں اس کی کسی نے بھی خبر نہیں لی لیکن یکبی برمکی نے اس سے کئی ملاقاتیں کیں۔ ہارون رشید کا اتالیق اس بے مثل مطرب کا بڑا قدردان تھا۔ اس نے دل شکستہ اور دل گرفتہ ماہر موسیقی کی بڑی دلداریاں کیں اور ہمیشہ یہی سمجھاتا رہا کہ وہ وقت اور حالات کی ناسازگاری سے مایوس نہ ہو، اچھے دن ضرور آئیں گے اس لیے صبر و تحمل سے ان کا انتظار کرنا چاہیے۔

کئی سال بعد مہدی کو استاد ابراہیم کا خیال آ گیا اور اس نے ابراہیم کو طلب کر لیا۔ سوکھا، سہما ہوا ہڈیوں کا ڈھانچا مہدی کے سامنے اچانک جا کھڑا ہوا۔ مہدی نے ہنس کر سوال کیا۔ ''سرکش گویے! اب کیا حال ہے تیرا؟''

ابراہیم نے جواب دیا۔ ''امیرالمومنین! میرا حال بہت پتلا ہے اور میں نے قید خانے میں کتابت اور قرأت بھی سیکھ لی اور میں فخریہ یہ کہہ سکوں گا کہ میں گویے کے بجائے کاتب ہوں، قاری ہوں۔''

مہدی نے کہا۔ ''پھر قرأت سنا تاکہ میں بھی یقین کر لوں کہ تو سچ بول رہا ہے۔''

ابراہیم نے آنکھیں بند کر لیں اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر سورۃ رحمٰن کی قرأت شروع کر دی۔ مہدی کی مجلس میں اس وقت جو لوگ بھی تھے ان پر وجد طاری ہو گیا۔ ابراہیم کی آواز حرم سرا تک جا رہی تھی۔ خواتین بے چین ہو گئیں۔ جو کنیزیں گانا بھی جانتی تھیں انہیں استاد ابراہیم کی آواز نے دیوانہ کر دیا اور وہ مہدی کی مجلس کے قریب تر پہنچ کر جھانکنے اور ابراہیم کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

مہدی بہت خوش ہوا اور اعلان کر دیا کہ ابراہیم کی بقیہ سزا معاف اور یہ کہ استاد ابراہیم کو اب کتابت اور قرأت ہی کو اپنا پیشہ اور مشغلہ بنانا چاہیے۔

ابراہیم کی خوشی کی حد نہ تھی، اس نے پوچھا۔ ''امیرالمومنین! کیا میں اب دونوں شہزادوں سے مل سکتا ہوں؟''

مہدی ایک دم سنجیدہ اور جذباتی ہو گیا، منہ بنا کے جواب دیا۔ ''ہرگز نہیں، تو نے تو ان دونوں سے لاتعلق رہنے کا مجھ سے عہد کر رکھا ہے۔ کیا تو اپنے عہد کو توڑنا چاہتا ہے؟''

ابراہیم کا دل ڈوبنے لگا، بولا۔ ''نہیں تو امیرالمومنین! میں نے جو عہد کیا ہے اس پر قائم رہوں گا لیکن میں نے یہ بات اس لیے کہی کہ میں نے جب یہ عہد کیا تھا اس وقت میں گویا تھا اور میرے اس پیشے ہی کی وجہ سے مجھ کو شہزادوں سے لاتعلق رہنے کا عہد کرنا پڑا تھا لیکن اب چونکہ میں قاری اور کاتب ہوں اس لیے میں نے خیال کیا کہ شاید امیرالمومنین مجھے معاف فرما کر مجھے اپنے عہد کی پابندی سے بری فرما دیں۔''

مہدی نے کہا۔ ''نہیں، نہیں ابراہیم! تیرا عہد اپنی جگہ۔ ہر چند کہ قرأت ایک بہترین اور لائقِ احترام فن ہے مگر پتا نہیں، کب تیرے دل میں موسیقی کا دیو جاگ جائے اور تو دونوں شہزادوں کو پھر اسی گمراہی اور اسی رویے پر مائل کرنے لگ جائے۔''

ابراہیم خاموش ہو گیا۔

وہ آزاد ہوتے ہی گھر پہنچا۔ وہاں جیسے جیسے دوستوں، شاگردوں اور مداحوں کو اس کی رہائی کی خبریں ملیں، بھاگ بھاگ کر اس کے پاس پہنچنے لگے لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ابراہیم نے کتابت اور قرأت سیکھ لی ہے اور آئندہ وہ انہی دونوں میں سے کسی ایک کو ذریعۂ معاش بنائے گا تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی۔

لیکن عملاً وہ اس ارادے میں ناکام رہا۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ وہ کتابت اور قرأت کو بطور پیشہ اختیار کرے لیکن شوق اور طبیعت کو اس پر آمادہ نہ کر سکا۔ ہادی اس کی تلاش میں تھا۔ ایک دن رات کو ایک شخص نے اس کے در پر دستک دی اور آہستہ سے پوچھا۔ ''کیا استاد ابراہیم صاحب گھر پر تشریف رکھتے ہیں؟''

ابراہیم کی بوڑھی ماں نے دروازے سے کان لگا کر پوچھا۔ ''تم کون ہو؟ ابراہیم گھر میں نہیں ہے، کوئی کام؟''

باہر سے جواب ملا۔ ''مجھے ولی عہد ہادی نے بھیجا ہے میں استاد ابراہیم کے لیے دیناروں کی تھیلی لایا ہوں۔''

ابراہیم اپنی ماں کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔ دیناروں کی تھیلی کا ذکر سنتے ہی وہ ماں کو ایک طرف دھکیل کر دروازے سے باہر نکل گیا اور اعلان کر دیا۔ ''اے شخص! تو کون ہے؟ میں ہوں استاد ابراہیم۔ لا، وہ تھیلی دے دیناروں والی۔''

اس شخص نے اندھیرے میں ابراہیم کو دیکھنے اور پہچاننے کی کوشش کی، پھر بولا۔ ''استاد ابراہیم! میں روشنی میں آپ کو دیکھ اور پہچان کر تھیلی دینا چاہتا ہوں۔''

ابراہیم نے پکار کر اپنی ماں کو مخاطب کیا۔ ''ماں ذرا چراغ تو لانا تاکہ میں اس شخص کو اپنی شکل دکھا کر یہ یقین دلا سکوں کہ میں ہی استاد ابراہیم ہوں اور اس سے دیناروں کی تھیلی لے لوں۔''

کچھ دیر بعد ماں چراغ لے کر آ گئی اور آنے والے نے اس کی روشنی میں استاد ابراہیم کو پہچان کر دیناروں والی تھیلی دے دی۔ تھیلی دینے کے بعد اس شخص نے کہا۔ ''ولی عہد نے دریافت کیا ہے کہ آپ ان سے کب ملاقات کریں گے؟''

ابراہیم سٹپٹا گیا، بولا۔ ''لیکن میں ہادی سے کس طرح مل سکتا ہوں۔ میں نے تو امیر المومنین سے یہ عہد کر رکھا ہے کہ دونوں شہزادوں سے کبھی نہیں ملوں گا۔ ولی عہد سے کہہ دینا کہ افسوس میں نہیں مل سکوں گا۔''

اس شخص نے کہا۔ ''لیکن جناب استاد ابراہیم! ولی عہد نے یہ دیناروں کی تھیلی اس لیے آپ کو بھیجی ہے کہ آپ اس کو وصول فرما کر ان سے ملاقات کر لیں۔ اب اگر آپ ولی عہد سے نہیں ملنا چاہتے تو دیناروں والی تھیلی مجھے واپس کر دیجیے تاکہ میں ولی عہد کو آپ کے انکار سے مطلع کر دوں۔''

لیکن آئی ہوئی دیناروں کی تھیلی ابراہیم واپس نہیں کر سکتا تھا، بولا۔ ''اچھا اگر یہ بات ہے تو ہادی سے کہہ دینا کہ میں تجھ سے ضرور ملوں گا لیکن میری یہ ملاقات صیغۂ راز میں رہے گی۔''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''آپ بالکل بے فکر رہیں میں آپ کا جواب انتہائی رازداری سے ولی عہد تک پہنچا دوں گا۔''

وہ شخص جیسے ہی گیا، ابراہیم نے گھر کا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ ماں نے پوچھا۔ ''ابراہیم! یہ تو کیا کر رہا ہے؟''

ابراہیم نے جواب دیا۔ ''ماں! اب میں یہاں نہیں رہوں گا، میں کسی ایسی جگہ چلا جاؤں گا جہاں ہادی نہ پہنچ سکے، میں ہادی اور رشید کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا کیونکہ اگر اس بار عہد شکنی ہو گئی تو شاید میں کوئی ایسی سزا بھگتوں کہ زندگی ہی سے ہاتھ دھو بیٹھوں۔''

ماں نے پوچھا۔ ''تو، تو گویا ولی عہد سے نہیں ملے گا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''بے شک، آپ نے صحیح سمجھا۔''

ماں نے کہا۔ ''اگر تیری نیت میں ولی عہد کی ملاقات داخل نہیں تھی تو، تُو نے دیناروں کی تھیلی کیوں رکھ لی؟''

ابراہیم نے تھیلی کو مضبوطی سے دبا لیا، بولا۔ ''واہ ماں! اگر میں یہ تھیلی نہ لیتا تو ہماری گزر اوقات کس طرح ہوتی؟''

ماں نے سختی سے کہا۔ ''یہ سراسر بددیانتی اور بے ایمانی ہے۔''

اب ابراہیم نے کہا۔ ''ماں! میں نہ تو بے ایمان ہوں اور نہ ہی بددیانت، میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں حالات اور واقعات سے مجبور ہو کر۔''

ماں نے سختی سے کہا۔ ''حالات اور واقعات کے عذر سے کام کاج نہیں ٹلا کرتے۔''

ابراہیم نے نہایت سختی سے کہا۔ ''ماں! تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو، دیناروں کی مجھ کو ضرورت تھی تو میں نے انہیں رکھ لیا... اللہ مجھے معاف کرے۔''

ماں دوبارہ اندر چلی گئی، وہ بڑبڑائی۔ ''ابراہیم! میں تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی، میں اسی گھر میں رہوں گی۔''

ابراہیم نے جواب دیا۔ ''ماں! تمہاری مرضی، لیکن میں تم سے ہفتوں نہیں مل سکوں گا اور نہ ہی تمہیں اپنا پتا بتاؤں گا۔''

ماں نے کہا۔ ''میں کسی بات کی بھی پروا نہیں کروں



گی لیکن یہ بات گوارا نہیں کہ کسی چیز کا معاوضہ تو لے لوں لیکن اس معاوضے کے عوض کوئی چیز نہ دوں۔"

لیکن ابراہیم کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ ماں سے بحث مباحثے میں الجھا رہتا۔ اس نے اپنا ضروری سامان لیا اور اسی وقت گھر سے رخصت ہو گیا۔ ماں کو ابراہیم کے جانے سے بڑی تکلیف ہوئی لیکن اس کو روک نہیں سکتی تھی۔ ابراہیم کے چلے جانے کے بعد وہ سو نہیں سکی، پوری رات ٹھنڈی سانسیں بھر بھر کے کاٹ دی۔

☆☆☆

ہادی نے ابراہیم کو بہت تلاش کروایا مگر اس کا پتا نہیں چلا، ابراہیم بغداد سے حران چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس گرم اور بے آب و گیاہ صحرائی آبادی کی طرف ہادی کا خیال ہی نہیں جائے گا۔ وہ ایک تجارتی قافلے میں قاری بن گیا۔ جب وہ اونٹ پر بیٹھا حدی خوانی میں مشغول ہوتا تو قافلے والے مست و سرشار ہو جاتے اور دوسرے حدی خوان خاموش ہو کر ابراہیم کی حدی خوانی سے لطف اندوز ہوتے۔ ایک لوہار نے ابراہیم کو اپنا مہمان بنا لیا، وہ ابراہیم کی آواز کا عاشق تھا، اس نے ابراہیم سے درخواست کی کہ وہ جب تک حران میں رہے اس ..... کے پاس رہے۔ لوہار کی دکان بازار میں تھی اور بازار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لکڑی کا سائبان سایہ کیے ہوئے تھا۔ ابراہیم کو مہمان بن کر کھانے میں شرم محسوس ہوئی۔ اس نے اپنے میزبان سے درخواست کی کہ وہ اس سے کوئی کام لے کیونکہ اس کو حران ہی میں بقیہ زندگی گزارنا ہے اور وہ زندگی بھر مہمان بن کر نہیں رہ سکتا۔ لوہار نے اپنی دھونکنی اس کو تھما دی اور کہا کہ وہ دھونکنی چلاتا رہے لوہار اپنا کام کرتا رہے گا۔

ابراہیم نے دھونکنی دھونکنے کا کام شروع کر دیا۔ وہ دھونکنی چلاتا رہتا اور گیت گاتا رہتا۔ لوہار مگن ہو کر اپنا کام کرتا رہتا۔ اسی طرح کئی سال گزر گئے۔ اب ابراہیم کا حران سے دل اچاٹ ہو گیا۔ اسے اپنی ماں کی یاد ستانے لگی تھی۔ اسے کچھ پتا نہ تھا کہ ماں زندہ ہے یا مر گئی۔ اب اس نے گانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہر وقت سوچ میں ڈوبا رہتا۔ اس کی سوچ سے لوہار بھی تنگ آ گیا تھا، ایک دن بولا۔ "بھائی! کیا بات ہے تم ہر وقت کیا سوچتے رہتے ہو؟"

ابراہیم نے جواب دیا۔ "اب میں تم سے کیا چھپاؤں، مجھے اپنی بوڑھی ماں یاد آ رہی ہے۔"

لوہار نے کہا۔ "تب تو تمہیں اپنی ماں کو یہیں بلوا لینا چاہیے۔"

ابراہیم نے کہا۔ "میں اپنی ماں کو یہاں کس طرح بلوا لوں؟"

لوہار دمشقی طرز کی تلواریں بنانے میں ماہر تھا، اس وقت بھی وہ ایک تلوار بنا رہا تھا، ایک لمحے کے لیے وہ رک گیا اور پوچھا۔

"کیوں، ماں کو بلوانے میں قباحت کیا ہے؟"

ابراہیم نے جواب دیا۔ "میرے عظیم محسن! میں اپنی ماں کو کس کے ذریعے بلواؤں؟ اگر میں خود بغداد چلا جاؤں تو یہ کام بہ آسانی ہو جائے گا۔"

لوہار نے کہا۔ "تو خود ہی چلا جا اور اپنی ماں کو بھی یہیں لے آ۔"

ابھی یہ گفتگو جاری ہی تھی کہ جامع مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی۔ جمعے کا دن تھا، لوہار نے کام بند کر دیا اور ابراہیم سے کہا۔ "آ، میرے ساتھ مسجد چل، وہاں نماز پڑھ کر رقت سے اپنی ماں کے لیے دعا مانگ، شاید تیری دعا قبول ہو جائے اور تو اپنی ماں سے ملاقات کر سکے۔"

ابراہیم بے دلی سے اٹھا اور لوہار کے ساتھ جامع مسجد روانہ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ..... یہ دونوں پتھر کی بنی ہوئی جامع مسجد میں داخل ہوئے۔ مسجد میں تین قبے پتھر کے ستونوں پر قائم تھے اور ہر قبے کے نیچے میٹھے پانی کا ایک کنواں تھا۔ مسجد کا صحن نہایت وسیع تھا۔ لوہار ابراہیم کو لیے ہوئے صحن کی دوسری طرف چلا گیا۔ صحن کے وسط میں ایک بہت بڑا قبہ تھا جو دس بڑے بڑے ستونوں پر قائم تھا۔ ہر ستون کا محیط نو دس بالشت کا تھا۔ قبہ کی چھت اوپر سے برج کی طرح خالی تھی۔ لوہار نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "شاید تو نہیں جانتا کہ یہ قبہ جو آج مسجد کا ایک حصہ ہے کس نے اور کس لیے بنوایا تھا؟"

ابراہیم نے جواب دیا۔ "میرے محسن! اس وقت میرا دھیان بغداد میں ہے، میں نہیں جانتا کہ یہ قبہ کس نے اور کس لیے بنوایا تھا۔"

لوہار نے کہا۔ "یہ رومیوں کا اسلحہ خانہ تھا جو آج مسجد کا ایک حصہ بن چکا ہے۔"

ابراہیم کو لوہار پر غصہ آ رہا تھا۔ اسے ان غیر متعلق باتوں سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔ ان دونوں نے جمعے کی نماز ادا کی۔ جب یہ دونوں نماز پڑھ کر باہر نکل رہے تھے تو انہوں نے ایک شخص کو مسجد کے دروازے پر گھوڑے سے اترتے ہوئے دیکھا۔ یہ شخص اپنا چہرہ سیاہ رومال سے چھپائے ہوئے تھا۔ ابراہیم نے سوچا شاید یہ کوئی نمازی ہے جو گرمی میں کہیں دور سے نماز پڑھنے آ گیا ہے۔ ابراہیم

اس کے پاس سے گزرا تو اس اجنبی نے ابراہیم کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ "استاد ابراہیم! تم یہاں؟ بغداد میں خوش قسمت انسان ہوں جس نے تمہیں تلاش کر لیا۔"

ابراہیم کانپ گیا، اس کو شبہ گزرا کہ شاید یہ مہدی کا آدمی ہے، جو اس کو تلاش کرتا ہوا یہاں تک آ گیا۔ لوہار نے اجنبی کے منہ سے استاد ابراہیم سنا تو حیرت سے پوچھا۔ "استاد ابراہیم؟ کون استاد ابراہیم؟ وہی ابراہیم جو فن موسیقی میں اپنا جواب نہیں رکھتا؟"

اجنبی نے جواب دیا۔ "ہاں وہی استاد ابراہیم، لیکن تمہیں حیرت کیوں ہے؟ کیا تم اپنے ساتھی کی عظمت سے واقف نہیں؟"

لوہار ابھی خاموش ہی تھا کہ ابراہیم نے اجنبی سے پوچھا۔ "لیکن تم ہو کون؟"

اجنبی نے اپنے چہرے پر سے سیاہ رومال ہٹا دیا، رومال کے ہٹتے ہی ابراہیم نے اسے پہچان لیا، سہم کر بولا۔ "تو یہ تم ہو ابن ربیع۔"

یہ ہادی کا خادم خاص ابن ربیع تھا۔ ہادی اس پر بے حد اعتماد کرتا تھا۔

لوہار نے شکایتاً ابراہیم سے کہا۔ "استاد ابراہیم افسوس کہ تم نے مجھے دھوکا دیا، اگر مجھے تمہاری حیثیت کا علم ہو گیا ہوتا تو میں تم سے دھونکنی دھونکنے کا کام ہرگز نہ لیتا۔"

لیکن ابراہیم نے لوہار کی باتوں پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ لوہار ان دونوں کو اپنے ساتھ دکان پر لے گیا اور ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ ابراہیم نے لوہار کو تخلیہ میں بتایا کہ وہ عباسی خلیفہ مہدی کا مطلوب ہے اور اس سے چھپا چھپا پھر رہا ہے اور حران میں گمنام بن کر رہنے میں اس کو یہی ایک فائدہ حاصل تھا کہ وہ زیادہ دنوں تک لوگوں کی نظروں سے محفوظ اور اوجھل رہ سکتا ہے۔ لوہار نے کہا۔

"لیکن استاد یہ تم نے بہت برا کیا۔"

ابراہیم نے خوشامدانہ درخواست کی۔ "تم بے شک میرے محسن ہو اور میں یہ نہیں چاہتا کہ تم میری وجہ سے مصیبت اٹھاؤ، میں یہاں سے چپ چاپ فرار ہو جاؤں گا۔ تم ابن ربیع کو میرے پیچھے واپس لوٹا دینا۔"

لوہار نے افسوس سے کہا۔ "جی تو یہی چاہتا ہے کہ تمہیں خلیفہ کے آدمی کے حوالے کر دیا جائے کیونکہ تم نے مجھے دھوکے میں رکھا مگر تم موسیقی کے سب سے بڑے ماہر ہو اس لیے میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔" پھر کچھ دیر ٹھہر کر بولا۔ "اگر جی میں آئے تو دو چار ماہ بعد واپس آ جانا۔"

ابراہیم، ابن ربیع سے بات کرتے ہوئے گھبرا رہا تھا لیکن اس پر اسے یقین تھا کہ ابن ربیع اسے بغداد واپس لے جانا چاہتا ہے، جہاں اسے مہدی تین سو کوڑے لگوا کر ہلاک کر دے گا۔ اس نے چپکے چپکے سامان سفر باندھا اور نصف شب کے بعد لوہار کے دیے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو کر حران سے نکل کھڑا ہوا۔ ابھی وہ نصف فرسخ بھی نہ طے کر سکا تھا کہ اسے اپنے پیچھے گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دیں، اس نے اپنے گھوڑے کو اور تیز بھگانے کی کوشش کی لیکن اندھیری رات میں گھوڑے کا سرپٹ بھگانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وہ یا حفیظ یا حفیظ کا ورد کرتا گھوڑے کو بھگاتا رہا لیکن پچھلے گھوڑے نے اس کو پکڑ لیا۔ ابن ربیع اپنے گھوڑے کو اس کے برابر لے آیا اور غصے میں کہا۔ "استاد ابراہیم! اگر امیر المومنین ہادی تمہاری عزت نہ کرتا ہوتا تو میں اسی وقت تمہیں تیر سے چھید کر گرا دیتا۔"

"امیر المومنین ہادی" نے ابراہیم کو چونکا دیا۔ اس نے گھوڑے کی لگام کھینچ کر پوچھا۔ "امیر المومنین ہادی! کیوں، امیر المومنین مہدی کو کیا ہو گیا؟"

ابن ربیع نے جواب دیا۔ "وہ اللہ کو پیارے ہو گئے اور اب ان کی جگہ امیر المومنین ہادی نے سنبھال لی ہے۔"

خوشی کا ایک جھٹکا سا لگا اور دل رکتے رکتے رہ گیا، اسے اپنی وہ قسم یاد آئی جس میں اس نے ہادی اور ہارون سے نہ ملنے کا عہد کیا تھا، مایوسی سے کہا۔ "ابن ربیع! افسوس کہ میں بغداد نہیں جاؤں گا، کیونکہ میں نے ہادی اور ہارون سے نہ ملنے کی قسم کھا رکھی ہے امیر المومنین مہدی نہ سہی خدا تو موجود ہے جس کو میرے اس عہد کا علم ہے۔"

ابن ربیع نے سختی سے کہا۔ "استاد! فضول باتیں نہ کرو، جب امیر المومنین ہادی تجھے خود ہی بلا رہے ہیں تو اپنے عہد اور قسم کی فکر نہیں کرنا چاہیے۔ امیر المومنین تمہاری عہد شکنی کا کفارہ ادا کرنے کو تیار ہیں۔"

سازگار حالات اور خوش آئند مستقبل اسے ابن ربیع کے ساتھ جانے کی ترغیب دے رہے تھے، اس نے پوچھا۔ "ابن ربیع! کیا امیر المومنین ہادی نے میری قسم کا کفارہ ادا کرنے کا ذکر کیا تھا؟"

"ہاں کیا تھا۔" ابن ربیع نے جواب دیا۔ "استاد ابراہیم! میں تو حیران ہوں کہ خوش قسمتی تمہارا پیچھا کر رہی ہے اور تم اس سے راہ فرار اختیار کر رہے ہو۔"

ابراہیم بغداد جانے پر آمادہ ہو گیا اور آخر کار وہ ابن ربیع کے ساتھ بغداد روانہ ہو گیا۔

ہادی نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور وعدہ کیا کہ اس نے اس کے باپ کے ہاتھوں جو مصائب جھیلے ہیں، ان کی شاندار تلافی کردی جائے گی۔ ابراہیم نے ہارون کی بابت پوچھا۔ ''اور یہ رشید کہاں ہے؟''

ہادی نے منہ بنا کر نفرت سے کہا۔ ''استاد! میرے حریف اور رقیب کا نام خدا کے لیے مت لو۔''

ابراہیم نے سادگی سے عرض کیا۔ ''لیکن امیرالمومنین! ہارون آپ کا بھائی اور میرا شاگرد ہے۔''

ہادی نے تلخی سے جواب دیا۔ ''استادِ محترم! ہارون نہ تو میرا بھائی ہے اور نہ آپ کا شاگرد۔ وہ حکومت اور خلافت کے سلسلے سے محض میرا حریف اور رقیب ہے اور آپ نے کہیں یہ دیکھا ہے کہ ایک نیام میں دو تلواریں اور ایک مملکت کے دو بادشاہ رہے ہوں۔''

ابراہیم نے کہا۔ ''نہیں! ایسا نہیں ہوتا کیونکہ ایسا ہونا غیر فطری ہے۔''

ہادی نے کہا۔ ''آپ میرے پاس رہیں۔ ہارون یا اس کے اتالیق یحییٰ برمکی سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ جو لوگ ان سے جتنے قریب ہوں گے مجھ سے اتنے ہی دور ہو جائیں گے۔''

ابراہیم چپ ہو گیا۔ اس کی ماں زندہ تھی لیکن بیٹے کی دوری اور مفقود الخبری نے اس کی صحت تباہ کردی تھی۔ وہ ابراہیم کو اچانک اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ ہادی نے نوازشوں اور عنایتوں کی بارش کردی لیکن اب ابراہیم کے دل سے غیر یقینی حالات اور ناسازگار قسمت نے زمانے کا اعتبار اٹھا دیا تھا۔ اب وہ ہر وقت کفایت اور بچت کی فکر میں رہتا۔ وہ ہادی سے جو کچھ بھی پاتا اس میں سے کم سے کم خرچ کر کے بقیہ کو محفوظ کردیتا۔

رقص و موسیقی کی محفلیں جمنے لگیں۔ کنیزوں کے پرے استاد ابراہیم کے آگے احتراماً خم ہونے لگے اور ابراہیم نے بہت جلد وہ اعزاز حاصل کرلیا جو اس فن کے کسی اور فن کار کے لیے پوری زندگی میں بھی ناممکن تھا۔ نبیذ کے دور چلتے اور ہنسی مذاق ہوتا رہتا۔ ابراہیم نے ہادی کو ایسے راگ سنائے کہ وہ مست و سرشار ہو کر رہ گیا۔ وہ بار بار یہی کہتا۔ ''استاد! افسوس کہ والد مرحوم نے آپ پر بڑے ظلم کیے، اللہ نے چاہا تو میں ان سب کی تلافی کردوں گا۔''

ہادی دینداروں اور درہموں کی پروانہ کرتا اور استاد ابراہیم کو نوازتا رہتا۔ اسی دوران اس نے اپنے محل کی چند کنیزوں کو ابراہیم کے حوالے کردیا اور اسے تاکید کی کہ وہ انہیں موسیقی سکھائے۔ اب ابراہیم کو اپنے فن اور دربار میں زیادہ مزہ ملنے لگا تھا۔ وہ عورتوں اور لڑکیوں کی صحبت میں کچھ زیادہ جولانیاں محسوس کرنے لگا تھا۔ دربار کی حاضری کے بعد وہ زیادہ وقت انہی کے ساتھ گزارتا۔ ابراہیم کے حاسدوں نے ہادی کو اس کے خلاف بھرنا شروع کردیا لیکن ہادی انہیں جھڑک دیتا اور کہتا... ''ابراہیم نے میری خاطر بڑی پریشانیاں اٹھائی ہیں اس لیے میں اس سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔''

ابراہیم نے جس ذمے داری کو ہنسی خوشی اور امنگ اور ترنگ سے قبول کیا تھا وہ کچھ عرصے بعد اذیت اور دکھ پہنچانے لگی۔ اس کو یہ حسن کے مہ پارے عشق و محبت کی ترغیب دینے لگے تھے۔ ان کی شوخیاں، مسکراہٹیں اور ادائیں ابراہیم کے ہوش و حواس اور ضبط و احتیاط کو یوں تباہ و برباد کرنے لگیں جس طرح آسمانی بجلی اپنی زد میں آنے والی ہر شے کو جلا کر خاکستر کردیا کرتی ہے۔ اس کے لیے مجبوری یہ تھی کہ وہ ان میں سے کسی پر بھی اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرسکتا تھا کیونکہ یہ کنیزیں، یہ لڑکیاں خلیفہ ہادی کی امانتیں تھیں۔ کنیزیں ابراہیم کا پوں تو احترام کرتیں مگر اس کی وضع احتیاط پر دل ہی دل میں ہنستی رہتیں اور جب ابراہیم کی عدم موجودگی میں باتیں کرتیں تو ابراہیم کا خوب خوب مذاق اڑاتیں۔

راتوں کو جب وہ کنیزوں سے ریاض کراتا اور وہ محنت کرتے کرتے تھک کر چور ہو کر اونگھنے لگتیں تو ان پری پیکروں اور چاند کے ٹکڑوں کی آنکھیں شباب کے نشے سے کچھ زیادہ ہی لبریز ہو جاتیں اور وہ نیم وا آنکھوں سے ابراہیم کو دیکھ کر کہیں کا بھی نہ رکھتیں، اس وقت ابراہیم کا بہت برا حال ہوتا وہ بہکنے لگتا مگر ہادی کا خوف سارا مزہ کرکرا کردیتا۔

ان میں ایک کنیز سب سے زیادہ تیز طرار تھی۔ اس کا نام تو کچھ اور تھا مگر اس کی تیزی نے اس کو کہربا کا نام بخش دیا۔ کہربا یعنی برق، بجلی۔ ابراہیم وزدیدہ نظروں سے کہربا کی حرکات و سکنات پر غور کرتا اور دیکھتا رہتا اور دل میں اعتراف کرتا کہ جس نے بھی اس کا نام کہربا رکھا تھا بہت ذہین اور نباض تھا۔ کہربا ابراہیم سے فنِ موسیقی سیکھ رہی تھی مگر اس کی بے چینی اور اضطرار کا یہ حال تھا کہ ریاض کرتے کرتے اٹھ کھڑی ہوتی اور یہ جا وہ جا نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔ ابراہیم اس کے سامنے بے بس تھا وہ اسے ڈانٹ بھی نہ سکتا تھا۔

ایک رات ابراہیم کنیزوں کو ریاض کرا رہا تھا کہ کہربا کو نیند کی وجہ سے جماہیاں آنے لگیں۔ ابراہیم بار بار کہربا

کی طرف متوجہ ہو جاتا اور بقیہ کنیزوں کو نظر انداز کردیتا۔ دوسری کنیزیں اس التفات خاص سے کہربا کے خلاف رقابت و حسد محسوس کر رہی تھیں لیکن خود کہربا کو ان کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔ اس وقت وہ بس راگ کی مشق کر رہی تھی، وہ راگ تو ابراہیم کا تھا مگر شعر کسی اور کے تھے اور کہربا انہیں بطور خاص جوش و خروش سے گا رہی تھی۔ گاتے گاتے وہ اونگھ گئی۔ ابراہیم کہربا کے پاس ہی بیٹھا تھا، کنیزوں کی دبی دبی سی کی آوازیں کہربا کے کانوں میں گئیں تو وہ چونک کر ہوش میں آگئی اور اس نے ہنسنے والی کنیزوں کی طرف دیکھا۔ ابراہیم نے کنیزوں کو ڈانٹا اور کہربا سے کہا۔ ''کہربا! ریاض کے لیے ہوش و حواس اور پوری یکسوئی بہت ضروری ہے اس طرح میں نہیں سکھا سکتا۔''

کہربا بے خیالی میں مسکرا دی اور مسکراہٹ سے یوں محسوس ہوا گویا اس نے استاد ابراہیم کی پوری بات سنی ہی نہ تھی۔ ایک کنیز نے کہربا کی سفارش کی۔ ''استاد ابراہیم! کہربا پر دو نشے غالب ہیں، شباب اور خواب کے نشے، اس لیے اس کو خواب گاہ میں چلا جانے دیجیے۔''

کہربا کھڑی ہو گئی اور غصے سے کنیز کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر انگڑائی نے اس کی زبان بند کردی۔ ابراہیم مبہوت اور سحر زدہ اس کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ استاد ابراہیم دعا مانگنے لگا کہ اے زمان و مکاں کے مالک! ان لمحات کو ساکت و جامد کردے اور کہربا کی انگڑائی اور میری نظروں کو یوں قائم رہنے دے۔

لیکن انگڑائی ختم ہو گئی اور کہربا ایک بار پھر ابراہیم کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ استاد ابراہیم اس وقت اپنے ہوش میں نہ تھا۔ ایک کنیز نے جماہی لے کر درخواست کی۔ ''استادِ محترم! شاید اب ریاض ممکن نہیں رہا۔ اس لیے ہمیں آرام کرنا چاہیے۔''

دوسری کئی کنیزوں نے اس کی تائید کی لیکن کہربا خاموش رہی۔

ابراہیم نے جواب دیا۔ ''جس کو نیند ستا رہی ہو وہ آرام کرنے چلی جائے لیکن جو ریاض کرنا چاہتی ہے وہ یہیں موجود رہے۔''

کئی کنیزیں جو بڑی دیر سے آتشِ حسد میں جل رہی تھیں اٹھ کر چلی گئیں، بس چار کنیزیں بیٹھی رہ گئیں۔ ان میں ایک کہربا تھی۔ وہ اب بھی اونگھ رہی تھی۔ ابراہیم نے جانے والی کنیزوں کو برا بھلا کہا۔ اس کے خیال میں فنِ موسیقی وہ لوگ نہیں سیکھ سکتے تھے جن پر نیند غلبہ کرلیا کرتی ہے۔

کہربا نے ایک دم چونک کر ماحول پر نظر کی اور اپنے سامنے محض تین کنیزیں دیکھ کر حیران رہ گئی، پوچھا۔ ''یہ سب کہاں چلی گئیں؟''

ابراہیم نے ہنس کر جواب دیا۔ ''کہربا! وہ تجھ سے جلتی ہیں، تجھے اونگھتا دیکھ کر چلی گئیں۔''

کہربا نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔ ''حاسدوں کو آتشِ حسد کسی بھی جگہ چین سے نہ بیٹھنے دے گی، نہ جاگتے میں نہ سوتے میں، وہ جہاں بھی ہوں گی حسد ان کے ساتھ رہے گا۔''

ابراہیم نے کنیزوں سے کہا۔ ''اپنا اپنا ریاض جاری رکھو، کیونکہ میں نے استادوں سے سنا ہے کہ راگ راگنیوں کے شیطان راتوں کو نکلتے ہیں اور اپنے شیدائیوں اور عاشقوں کو بیدار اور ریاض میں محو اور مشغول دیکھ کر راگ راگنیوں کا گراں بہا عطیہ دے کر چلے جاتے ہیں۔''

کہربا نے نیند میں کہا۔ ''لیکن استاد! اس وقت میں تو اس قابل ہی نہیں کہ ریاض کرسکوں۔ مجھے بھی سو جانے کی اجازت دے دیجیے۔''

ابراہیم نے جواب دیا۔ ''دیکھ کہربا! میں تجھ میں کچھ ایسی باتیں محسوس کر رہا ہوں جن پر راگ راگنیوں کے شیطان مہربان ہو جایا کرتے ہیں اس لیے میں تجھ کو مشورہ دوں گا کہ رات کا سونا ترک کردے کیونکہ معلوم نہیں کس وقت راگ راگنیوں کے شیطان تیرے در پر دستک دیں اور تجھے سوتا دیکھ کر کہیں اور چلے جائیں۔''

کہربا نے ایک بار پھر جماہی لی اور نیند میں کہا۔ استاد! میں ان دستکوں کا کب تک انتظار کروں گی۔ اگر انہیں کچھ دینا ہی ہوگا تو وہ میرے در پر اس وقت تک دستکیں دیتے رہیں گے جب تک کہ میں اچھی طرح بیدار نہ ہو جاؤں گی۔''

استاد ابراہیم نے دوسری تین کنیزوں کی طرف مسکرا کر دیکھا اور پوچھا۔ ''تم تینوں کا کیا خیال ہے؟''

ان تینوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔ ''اب یہ نیند پر قابو نہیں پا سکتی اس لیے اس کو سو جانے کی اجازت دے دیجیے۔''

استاد ابراہیم نے کھسیا کر کہا۔ ''بہتر ہے، اب تم تینوں بھی جا سکتی ہو۔''

ابراہیم کا فقرہ ابھی پورا بھی نہ ہوا تھا کہ کہربا نیند میں لڑکھڑا کر اس کی گود میں آگری۔ کہربا کا سر ابراہیم کے پیٹ پر ٹک گیا اور دونوں ہاتھ رانوں پر گر گئے۔ کہربا خراٹے لے رہی تھی اور اس کو کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کس حال میں ہے۔

ابراہیم نے بڑی بے بسی سے تینوں کنیزوں کی طرف دیکھا اور کھسیا کر کہا۔ ”تم جاؤ، میں اس کو بھی اٹھا کر بھیجتا ہوں۔“

کنیزیں مسکراتی ہوئی چلی گئیں اور ابراہیم کہربا کو جگانے اور نہ جگانے کی الجھن میں مبتلا ہو گیا۔

ابراہیم تنہا کہربا کے خوابیدہ حسن میں کھو گیا۔ اس نے اپنے آس پاس کا جائزہ لے کر شاید پہلی بار کہربا کو غور سے دیکھا۔ تلوار جیسی بھویں نیچے پپوٹوں کے غلاف میں بند۔ پیشانی کے اوپر دائرے میں زلفوں کی محراب تھی اور شمعوں کی روشنی میں سرخ و سفید رخسارے سفید راکھ میں دبے ہوئے انگارے کی طرح جھلملا رہے تھے۔ ٹھوڑی کے نیچے جو کچھ تھا، ابراہیم انہیں تخیلے میں بھی دیکھنے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ وہ اس بات سے خوفزدہ تھا کہ اگر اس نے اس فتنے کو دیکھا اور بے اختیار ہو گیا تو اس خیانت کی ہادی کی طرف سے سزا کتنی خوفناک تجویز ہو گی۔ مگر اس کی شریانوں میں اس پرکیف منظر نے خون کی جگہ کیف و مستی بھر دی تھی۔ شاید یہی وہ لمحہ تھا جو کسی بھی شخص کو زندگی جیسی متاع بے بہا کی..... قربانی پر آمادہ کر دیا کرتا ہے۔ ابراہیم کو ضبط و احتیاط کے دباؤ نے پاگل سا کر دیا۔ اس کو اپنے دماغ کی رگیں پھٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس نے ایک بار پھر ان کنیزوں کو دیکھنا چاہا جو تھوڑی دیر پہلے اس کو آزمائش میں مبتلا چھوڑ کر چلی گئی تھیں، لیکن بظاہر وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ ابراہیم نے آہستہ آہستہ کہربا کے بالوں پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ ریشم جیسے ملائم اور چمکدار بال انگلیوں میں سرور اور سنسناہٹ پیدا کر رہے تھے۔ انتہائی ضبط اور برداشت کے باوجود ابراہیم کسی مغلوب کی طرح کہربا کی پیشانی پر جھک گیا اور آہستہ سے بوسہ لے کر سیدھا ہو گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اب وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ اس کی اس چوری کا علم کہیں کہربا کو تو نہیں ہو گیا لیکن یہ دیکھ کر مطمئن ہو گیا کہ وہ بدستور خراٹے لے رہی ہے۔

پورا ایک گھنٹا گزر گیا اور کہربا سوتی رہی، ابراہیم کے جسم کے دبے ہوئے حصے سن ہو گئے لیکن پھر بھی وہ یہی خواہش محسوس کر رہا تھا کہ کہربا یوں ہی اس کی آغوش میں سوئی رہے۔ آخر غیر ارادی طور پر ابراہیم نے پہلو بدلنا چاہا۔ اس کے ہلتے ہی کہربا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے وحشت زدہ انداز میں ابراہیم کو دیکھا اور ایک دم گھبرا کر اٹھ گئی۔

ابراہیم بھی چور بن گیا، کہربا نے پوچھا۔ ”وہ سب کہاں چلی گئیں؟“

ابراہیم نے ہکلا ہکلا کر جواب دیا۔ ”تجھے سوتا دیکھ کر سونے چلی گئیں۔“

کہربا نے پوچھا۔ ”کیا میں سو گئی تھی؟“

ابراہیم نے جواب دیا۔ ”ہاں، تو اتنی گہری نیند سوئی ہوئی تھی کہ تیرے خراٹوں کی آواز کو دور تک سنا جا سکتا تھا۔“

کہربا نے ابراہیم کی آغوش کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”استاد ابراہیم! مجھے آپ نے اٹھا کیوں نہیں دیا؟“ پھر کچھ دیر چپ رہ کر بولی۔ ”یہ برا ہوا، لوگوں کی زبان کس نے پکڑی ہے اور استاد آپ! آپ نے چوری چوری جو کچھ کیا وہ سوچتے تو سہی، کہاں تک مناسب تھا۔“

ابراہیم گھبرا گیا، پوچھا۔ ”میں نے چوری چوری کیا کیا؟ یہ کس نے بتایا تجھے؟“

کہربا زیر لب مسکرائی۔ ”استاد ابراہیم! مجھے کون بتاتا اس چوری کی بابت، اپنا چور میں نے خود پکڑا ہے۔“

ابراہیم اور زیادہ گھبرا گیا۔ اس کے پورے وجود میں کپکپی دوڑ رہی تھی، شرمندگی سے بولا۔ ”کہربا! میں تیرا مطلب نہیں سمجھا، تو کیا کہنا چاہتی ہے؟“

کہربا نے جواب دیا۔ ”استاد! میں کہنا یہ چاہتی ہوں کہ میری پیشانی کی چمک دمک ہونٹوں کے لمس اور گرمی سے ماند پڑ چکی ہے اور مجھے اس جگہ ایک سوزش اور جلن سی محسوس ہو رہی ہے، آپ کو ایسا نہیں کرنا تھا۔“

ابراہیم نے سہم کر پوچھا۔ ”تو کیا تو جاگ رہی تھی؟“

کہربا نے مذاق اڑانے کے انداز میں پوچھا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا میں سو رہی تھی؟“

ابراہیم کی حالت قابل رحم تھی۔ جسم کا لہو خشک ہو چکا تھا، بہ مشکل کہا۔ ”اگر تو واقعی جاگ رہی تھی تو یہ بتا کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ جب میں تیری پیشانی کی چمک دمک چرا رہا تھا تو، تو نے مجھے ٹوک کیوں نہیں دیا؟ تو نے میرے منہ پر طمانچہ کیوں نہ رسید کیا؟ تو نے میرا منہ کیوں نہ نوچ لیا؟“

کہربا نے جواب دیا۔ ”استاد ابراہیم! میں سب کچھ کر سکتی تھی لیکن افسوس کہ مجھے اس کی اجازت نہ تھی۔ میرے سپرد جتنا کام کیا گیا تھا، میں نے انجام دے دیا۔“

ابراہیم کو اندیشہ ہائے دور و دراز پریشان کرنے لگے، پوچھا۔ ”کیا مطلب؟ تو کہنا کیا چاہتی ہے؟“

کہربا نے جواب دیا۔ ”میں اگر چاہوں تو امیر المومنین کے سامنے آپ کو عریاں کر دوں۔ آپ کو نیند کی ایک ماری کنیز کو اپنی آغوش میں نہیں گرانا تھا۔ بہر حال آپ نے جو کچھ کیا اچھا نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ مجھ کو آپ کی آغوش میں ناشائستہ حالت میں لیٹا ہوا کنیزوں نے بھی

دیکھا ہو گا اور اگر میں اپنی زبان بند بھی رکھوں تب بھی یہ ماجرا وہ اور گھناؤنی خبر امیر المومنین تک پہنچ جائے گی۔“

ابراہیم کے ہوش و حواس رخصت ہو چکے تھے، گڑگڑا کر بولا۔ ”کہربا طعدا کے لیے بتا کہ اب میں کیا کروں؟“

کہربا نے کچھ تامل سے کہا۔ ”میں کچھ نہ کچھ بتا تو سکتی ہوں لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ بتاؤں آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ میں آپ سے جو کچھ کہوں گی اسے آپ راز میں رکھیں گے۔“

ابراہیم نے کسی پس و پیش کے بغیر جواب دیا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں اپنے باوقار اور مقدس فن کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ میں تیری ہر بات راز میں رکھوں گا۔“

کہربا اپنی جگہ سے اٹھی اور اس طرف چلی گئی جدھر سے کنیزوں کی آمد یا مخبری متوقع تھی۔ ادھر سے مطمئن ہو کر استاد ابراہیم کے پاس جا بیٹھی۔ سرگوشی میں کہا۔ ”استاد ابراہیم! محل میں سازشوں کی ہوائیں چل رہی ہیں۔ کچھ لوگ امیر المومنین ہادی کے ساتھ ہیں اور کچھ لوگ ولی عہد ہارون اور اس کی ماں خیزران کے ساتھ۔ خود خیزران اپنے بڑے بیٹے ہادی کے بجائے چھوٹے بیٹے ہارون کا ساتھ دے رہی ہے۔“

ابراہیم کی سمجھ میں نہ آیا کہ ان بے سر و پا باتوں سے کہربا کا مطلب کیا ہے، پوچھا۔ ”لیکن ان باتوں کا میری ذات سے کوئی تعلق؟“

کہربا نے جواب دیا۔ ”استاد ابراہیم! آپ مرحوم امیر المومنین مہدی کی زندگی میں ہادی اور ہارون دونوں ہی کے استاد تھے لیکن جب سے ہادی امیر المومنین ہوئے ہیں آپ نے ہارون کو یکلخت نظر انداز کر دیا ہے حالانکہ آپ کو یہ سوچنا چاہیے کہ جس شخص کا ساتھ آپ نہیں دے رہے ہیں کل وہی خلافتِ عباسیہ کا سب سے بڑا آدمی ٹھہرے گا۔ اس لیے آپ پر واجب ہے کہ کسی ایک شخص کی وفاداری میں خود کو تباہ و برباد نہ کر لیں۔ آپ ہادی، ہارون، یحییٰ برمکی سے یکساں برتاؤ کیجیے۔ میں نے ہارون سے وعدہ کر لیا ہے کہ میں آپ کو ایک بار ان سے ضرور ملوا دوں گی، اگر آپ ہارون سے مل لیجیے تو یہ بڑی نوازش کا کام ہو گا۔ میں زندگی بھر آپ کی احسان مند رہوں گی۔“

ابراہیم پہلے سے زیادہ پریشان ہو گیا، پوچھا۔ ”ہارون مجھ سے چاہتا کیا ہے؟“

کہربا نے جواب دیا۔ ”آپ اپنے فن کے استاد ہیں۔ ہارون ہر وقت آتشِ حسد میں پھنکتا رہتا ہے کہ استاد ابراہیم کا فن نے ہارون کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے اور ہادی کو سر پہ چڑھا رکھا ہے۔ آپ اگر ہارون سے نہیں ملتے تو نہ ملیے مگر ہارون کے اتالیق یحییٰ سے ضرور مل لیجیے کیونکہ ہارون آپ کو بڑی سے بڑی قیمت پر بھی چھوڑنے کو تیار نہیں۔“

ابراہیم نے آنکھیں بند کر لیں اور چند لمحے اس پیشکش پر غور کرتا رہا۔ آخر آنکھیں کھول کر درشتی سے جواب دیا۔ ”کہربا! میں امیر المومنین ہادی کا احسان مند ہوں۔ میں نے اپنی زندگی اور اس زندگی سے متعلق ہر شے ہادی کے حق میں بیچ کر دی ہے۔ اب میں ہارون، یحییٰ یا اس سے بھی بڑی کسی ذات سے نہیں مل سکتا۔ افسوس کہ میں تیری پیشکش کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا رہا ہوں۔“

کہربا سناٹے میں آ گئی۔ استاد ابراہیم کا جواب اس کی توقع کے بالکل ہی خلاف تھا، آہستہ سے بولی۔ ”استاد! میری خاطر اپنے اس فیصلے پر نظر ثانی کر لیجیے کیونکہ جو میں دیکھ رہی ہوں آپ نہیں دیکھ رہے۔“

استاد ابراہیم نے جھڑک کر پوچھا۔ ”تو کیا دیکھ رہی ہے جو میں نہیں دیکھ رہا؟“

کہربا نے صبر و تحمل سے جواب دیا۔ ”میں امیر المومنین کے تختِ خلافت کو ڈانواں ڈول دیکھ رہی ہوں۔ میں نے ہارون کو اس طرح دیکھا ہے جس طرح مشرقی افق پر طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کو دیکھا جاتا ہے۔“

استاد ابراہیم نے غم و غصے کی ملی جلی کیفیت سے کہا۔ ”کہربا! میری عقل یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ تو امیر المومنین کی کنیز ہے اور وکالت کر رہی ہے ہارون کی، آخر ایسا کیوں؟“

کہربا نے جواب دیا۔ ”میں یحییٰ کی کنیز ہوں استاد! یحییٰ نے مجھے امیر المومنین کے حوالے کر دیا، امیر المومنین نے آپ کے سپرد کر دیا۔ میں امیر المومنین اور یحییٰ دونوں ہی کے اوصاف، خصوصیات اور اہمیت سے واقف ہوں اور اسی بنا پر میں یحییٰ اور ہارون کی طرفداری کرتی ہوں۔ استاد ابراہیم! امیر المومنین کے مقابلے میں یحییٰ اور ہارون تاریخ کے بڑے آدمی ٹھہریں گے آپ میری بات پر یقین کریں۔“

استاد ابراہیم تلملا کر کھڑا ہو گیا، وہ بے چینی سے ٹہلنے لگا، بولا۔ ”کہربا! میں امیر المومنین کی اہانت یا سبکی برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر ہارون یا یحییٰ کا یہ خیال ہے کہ وہ ترغیبات اور تحریصات سے میری وفاداریاں اور میرا فن خرید لیں گے تو یہ ان کی بھول اور خوش فہمی ہو گی۔“

کہربا نے طنز کیا۔ ”حیرت ہے کہ جو شخص امانت میں خیانت کا مرتکب ہو سکتا ہے، وہ کسی کمتر کے مقابلے میں بہتر کو

PakiBooks.com

ترجیح کیوں نہیں دے سکتا؟''

ابراہیم تھکان سی محسوس کر رہا تھا۔ کہربا نے سرد آہ بھری اور کہا۔ ''اب میں یہاں نہیں رکوں گی، کل ہی واپس چلی جاؤں گی اور استاد ابراہیم!'' وہ ابراہیم کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ ''آیئے ہم دونوں ایک دوسرے سے ایک عہد کریں۔''

ابراہیم کے اندر ہلچل مچ گئی۔ کسی انجانی خوشی نے اس کے رگ و پے میں مسرت کی لہر دوڑا دی۔ ''کیسا عہد! میں ہر اس عہد کے لیے تیار ہوں جو تیری طرف سے مجھ پر عاید کیا جائے گا۔''

کہربا نے جواب دیا۔ ''ایک سنگین اور ناقابل معافی، فاش اور فحش غلطی آپ نے کی ہے اور ایک سنگین، مہلک اور خطرناک غلطی میں نے کی ہے۔ آیئے ہم دونوں اپنی اپنی غلطیوں کے عوض یہ معاہدہ کرلیں کہ یہ باتیں ہمیشہ کے لیے سینوں میں دفن ہو جائیں گی۔ آئندہ نہ میں اپنی زبان کھولوں گی اور نہ آپ کچھ کہیں گے۔''

استاد ابراہیم نے جواب دیا۔ ''لیکن اس شرط پر کہ تو ابھی چند دن یہیں میرے پاس رہے گی۔''

کہربا نے کہا۔ ''استاد! میرا آپ کے قریب رہنا اچھا نہیں ہے کیونکہ میں نے آپ کے اندر جو آگ لگا دی ہے وہ مدتوں آپ کو پریشان رکھے گی۔ آپ آگ کو اسی حد تک رہنے دیں۔''

ابراہیم نے کھسیا کر جواب دیا۔ ''کہربا! تو سچ کہتی ہے لیکن تو اس آگ کی بابت یہ بھی جانتی ہوگی کہ اس کی سوزش میں بھی ایک لذت ہے۔ ایک ایسی ناقابل بیان لذت جس پر سب کچھ قربان کیا جاسکتا ہے۔''

کہربا بے مروتی سے چل دی۔ ''لیکن میں کل چلی جاؤں گی، ہر قیمت پر۔ اب میں یہاں نہیں رکوں گی۔''

ابراہیم اس کے اچانک چلے جانے سے اتنا بدحواس ہوا کہ دوڑ کر کہربا کا دامن پکڑنے کی کوشش کی مگر جب تک وہ اس کے پاس پہنچتا کہربا دوسرے کمرے میں داخل ہوگئی اور اس کا دروازہ اپنی طرف سے بند کرلیا۔

☆☆☆

اس رات ابراہیم سو نہیں سکا، ساری رات جاگتا رہا۔ وہ آنکھیں بند کر کے بستر پر دراز ہوگیا اور تصور میں کہربا کو اپنے پیٹ پر لٹا کر لطف و لذت محسوس کرنے لگا۔ اس کی انگلیاں کہربا کے نرم اور چمکیلے بالوں کا لمس اور لذت اسی طرح محسوس کر رہی تھیں جس طرح وہ حقیقتاً محسوس کر چکا تھا۔

پھر اس نے کہربا کی شفاف پیشانی کو چوم لیا اور کیف و سرور میں ڈوب گیا۔ وہ کئی بار ڈانواں ڈول ہوا اور دل بار بار یہی مشورے دیتا رہا کہ کہربا کی بات مان لی جائے لیکن اس کے وجود میں ایک وفادار فنکار بھی موجود تھا جو ہر بار اس کو اپنے حصار میں لے لیتا۔

صبح جب وہ کچھ دیر کے لیے سویا تو اس وقت آنکھ کھلی جب اس کو جگایا گیا۔ رات کی باتیں خواب و خیال کی طرح یاد آنے لگیں۔ کنیزوں نے اس کو اپنے حصار میں لے لیا لیکن خود اس کی نظریں کہربا کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ کسی کو کچھ بتائے یا کسی سے کچھ پوچھے بغیر ہی کہربا کو پانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔

جب وہ کہیں بھی نہ ملی تو ابراہیم کا ماتھا ٹھنکا اور وہ مایوس ہو کر اپنے بستر پر دراز ہوگیا۔

اسی عالم میں ایک دوسری کنیز ابراہیم کے پاس پہنچ گئی اور پوچھا۔ ''استاد! کیا بات ہے؟ آپ کچھ پریشان نظر آتے ہیں؟''

ابراہیم نے بے اختیار سوال کیا۔ ''کیا تو جانتی ہے کہ یہ کہربا کہاں چلی گئی آخر؟''

کنیز نے جواب دیا۔ ''وہ امیر المومنین کے پاس واپس چلی گئی۔''

ابراہیم کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی، کمزور آواز میں کہا۔ ''اس کو ابھی یہیں رہنا تھا، خیر، او خود سر لڑکی! خوش رہ اور میرے سینے کی آگ کو روشن اور مشتعل رکھ۔''

ابراہیم نے اپنے مکان میں موجود کنیزوں پر محنت شروع کردی اب وہ ہادی کے پاس بڑی پابندی سے جانے لگا تھا۔ وہ ہادی کی ایک ایک بات کو تولتا اور اس میں کہربا کی شرارتوں کی جستجو کرتا رہتا لیکن ہادی کی کسی بات سے یہ نہ معلوم ہوسکا کہ کہربا نے اسے کوئی ایسی ویسی بات بتائی ہے۔

ایک دن ہادی نے ابراہیم کو اچانک روک لیا اور کہا۔ ''استاد ابراہیم! آج آپ ذرا رکیں گے۔''

ابراہیم ڈر گیا۔ ''کوئی خاص بات ہے امیر المومنین! فرمائیں تو ذرا دیر کیا معنی میں ہر وقت اور کئی کئی دن امیر المومنین کے روبرو کھڑا رہ سکتا ہوں۔''

دربار کا ایک ایک آدمی رخصت ہوگیا اور پورا ماحول سکوت اور سناٹے میں ڈوب گیا تو ہادی نے ابراہیم کو اپنے آپ سے اور قریب کرلیا اور پوچھا۔ ''استاد ابراہیم! یہ کیا بات ہے کہ کہربا اپنی مرضی سے جو چاہے کرے، آپ نے

اس کو اپنے پاس سے اتنی جلدی کیوں چلا جانے دیا؟''

ابراہیم نے جواب دیا۔ ''امیر المومنین! وہ مجھے بتائے بغیر ہی چلی گئی ہے۔ خدا اسے عقل دے، ہوش و خرد سے نوازے۔ مجھے تو اس لڑکی نے چھاچھا دیا۔''

ہادی نے کہا۔ ''استاد! کیا آپ جانتے ہیں کہ کہربا کون ہے؟''

ابراہیم نے جواب دیا۔ ''امیر المومنین! مجھ کو وہی کچھ معلوم ہے جو آپ نے مجھ کو بتا دیا ہے۔ اس کے علاوہ میں کچھ بھی نہیں جانتا۔''

ہادی نے تقریباً کان میں کہا۔ ''کہربا یحییٰ کا نذرانہ ہے جو جاسوس بنا کر بھیجا گیا ہے۔ کہربا اور اس جیسی چند اور عورتیں بھی ہیں جو میری ایک ایک بات اور حرکات پر نظریں رکھتی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہارون اور یحییٰ کے لیے کام کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں انہیں نہیں پہچانتا مگر حقیقت یہ ہے کہ جو میں جانتا ہوں اور لوگوں کو جتنا میں پہچانتا ہوں، دوسرا ابرا ہی نہیں کرسکتا۔''

ابراہیم نے رقت زدہ آواز میں کہا۔ ''میں تو امیر المومنین کو روشن ضمیروں میں شمار کرتا ہوں۔''

ہادی نے منہ بنا کر کہا۔ ''اب وقت آگیا ہے کہ میں خود کو ان وخاشاک سے پاک کرلوں۔''

ابراہیم نے عرض کیا۔ ''امیر المومنین! اگر آپ اس بارے میں مجھ سے کوئی رائے لیں گے تو میں حلم و مروت کا مشورہ دوں گا۔ آپ اپنے مخالفین کو حلم و مروت سے مسخر کرسکتے ہیں۔''

ہادی ایک دم برہم ہوگیا۔ ''استاد ابراہیم! حلم و مروت ہر جگہ کام نہیں آتے، کبھی کبھی حلم و مروت کا مطلب کمزوری اور مجبوری ہوا کرتا ہے۔ اگر میں اپنے سازشی مخالفین کو نرمی اور مروت سے زیر کرنے کی کوشش کروں گا تو وہ مجھے احمق اور کمزور کہیں گے اور اس سے ان کے حوصلے بڑھ جائیں گے جو میرے لیے خطرناک بات ہوگی۔''

ابراہیم سہم کر چپ ہوگیا، ہادی کہتا رہا۔ ''اب وہ میرے خاص آدمیوں کو توڑ لینے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ اگر میرے بہی خواہ اور زیر بار احسان ساتھی ان کی باتوں میں آگئے تو یہ میرے دوستوں کی بدقسمتی ہوگی۔''

ہادی کو کہربا اور اس کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس نے شک و تشویش سے پوچھا۔ ''لیکن امیر المومنین ایسی باتیں مجھ سے کیوں کر رہے ہیں؟ کیا اس میں بھی کوئی خاص بات ہے؟''

ہادی نے جواب دیا۔ ''استاد ابراہیم! مجھے معلوم ہوا ہے کہ کہربا ہارون کے اتالیق یحییٰ کی مخبر ہے، اگر یہ بات ثابت ہوگئی تو میں کہربا کو وہ سزا دوں گا جس سے اس جیسے دوسرے لوگ عبرت حاصل کریں۔''

ابراہیم کے سینے میں کہربا کی محبت دھیمی آنچ کی طرح روشن تھی۔ اس نے اپنے ضمیر کے خلاف کہربا کی سفارش کی۔ ''امیر المومنین! کہربا سادہ لوح اور بھولی بھالی لڑکی ہے، اگر آپ کا شبہ درست بھی نکلے تب بھی میں اس کی سفارش کروں گا۔ اس کو ایک بار اپنی اصلاح کا موقع ضرور دیا جائے۔''

ہادی نے کہا۔ ''استاد ابراہیم! تم کہربا کی سفارش کیوں کر رہے ہو؟ بہرحال میں نے اس کی بابت یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اس کی تحقیقات کروں گا اور اپنے شبہات کی تصدیق کے بعد اس کو قرار واقعی سزا دوں گا لیکن تم اس کی سفارش کر رہے ہو۔ اب میں زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتا ہوں کہ اس کو اپنے پاس سے دور کردوں اور اس کو تمہارے حوالے کردوں۔''

ابراہیم کے منہ میں پانی بھر آیا، بولا۔ ''امیر المومنین! میں آپ کی نوازشوں کا زندگی بھر شکریہ نہیں ادا کرسکتا۔''

ہادی بہت تھکا تھکا اور پریشان نظر آتا تھا۔ اس نے ابراہیم کو رخصت کردیا اور محل سرا میں چلا گیا۔

ابراہیم کو سر راہ یحییٰ مل گیا۔ ابراہیم نے نظریں چرانے کی کوشش کی مگر یحییٰ نے اسے روک لیا اور کہا۔ ''استاد ابراہیم! آج رات ہارون کی محفل طرب میں ضرور آنا۔''

ابراہیم نے جواب دیا۔ ''یحییٰ! یہ بتا کہ تو میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے؟ میں امیر المومنین کا ملازم ہوں، ہارون کی محفل طرب میں کس طرح آسکتا ہوں۔''

یحییٰ نے کہا۔ ''استاد! تم محض گویے ہی نہیں اور بھی کچھ ہو۔ خدا نے تمہیں علم و دانش سے بھی نوازا ہے۔ ہادی اور ہارون ایک ہی ماں کی دو اولاد ہیں۔ آج دونوں بھائیوں میں کچھ ناچاقی ہے۔ کل دونوں ایک ہو جائیں گے، اس لیے ہم دونوں کی فلاح اسی میں ہے کہ دونوں کی رنجشوں اور ناچاقیوں سے دور اور محفوظ رہیں۔ مجھ ہی کو دیکھو، میں ہارون کا اتالیق ہوں مگر ہادی کا مخالف نہیں۔ میں امیر المومنین ہادی کا بہی خواہ ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ہادی کا نقصان ہارون کا نقصان ہے۔ دونوں ایک ہی ماں کے دو بیٹے ہیں۔''

Pakistan Books Store

یحییٰ کی دلیلوں نے ابراہیم کو متاثر کیا مگر اس کا دل اندر سے گواہی دے رہا تھا کہ یہ یحییٰ کا دامِ تزویر ہے۔ پیچھا چھڑانے کی خاطر بولا۔ ''یحییٰ! میں تیرا ہم خیال ہوں لیکن افسوس کہ آج کی رات امیر المومنین نے مجھے کہیں آنے جانے سے منع کر دیا ہے اس لیے میں گھر سے ہل بھی نہیں سکتا۔''

یحییٰ نے ابراہیم کو دونوں شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔ ''درباری گویے! تو بہت چالاک بنتا ہے، میں تیری باتیں خوب سمجھتا ہوں۔ تو یہ کیوں بھول جاتا ہے کہ تو ایامِ شہزادگی میں دونوں ہی کا زیرِ بار احسان رہ چکا ہے۔ آج ہارون کو یہ احساس دکھ پہنچا رہا ہے کہ تو نے اپنے وقتی، معمولی اور ذاتی مفاد کی خاطر اس کو نظر انداز کر دیا ہے حالانکہ زمانے کی روکیساں اور ہمیشہ کسی ایک ہی کے حق میں نہیں رہتی۔ کل ہارون کے حق میں بھی ہو سکتی ہے، اس لیے اگر خدا نے تجھ کو ذرا سی بھی عقل دی ہے تو، تو اپنی روش میں میانہ روی اختیار کر، ورنہ یاد رکھ کہ ابن الوقت اور زمانہ ناشناس کبھی فائدے میں نہیں رہتے۔''

ابراہیم نے مختصر سا جواب دیا۔ ''یحییٰ! امیر المومنین نے مجھے اتنا نوازا دیا ہے کہ دنیا کی ہوس باقی نہیں رہی۔''

یحییٰ نے منہ بنا کر کہا۔ ''یہ بھی غلط ہے۔ ہوس ایک اتنا گہرا کنواں ہے جس کو پانا نہیں جا سکتا۔ اس کو جتنا پاٹو گے اس کی گہرائی اور عمق میں اضافہ ہوتا جائے گا۔''

ابراہیم نے جواب دیا۔ ''تب پھر یہ سمجھ لو کہ میں قانع ہو گیا ہوں اور ہوس کو معصیت سمجھ کر اپنے دل سے نکال باہر کیا ہے۔''

یحییٰ نے ہنس کر کہا۔ ''یہ بات بھی بری ہے کیونکہ قانع لوگ تگ و دو اور آگے بڑھنے کی امنگوں سے محروم ہو جاتے ہیں جبکہ زندگی نام ہی اس شے کا ہے جو مائل بہ ارتقا ہو، جو ایک حال پر قائم ہو جائے، وہ کچھ بھی نہیں۔ یہاں تک کہ موت بھی یکسانیت اور ٹھہراؤ کا نام نہیں، موت کے بعد مستقل زوال جاری ہو جاتا ہے۔ پہلے جسم روح سے محروم ہوتا ہے اس کے بعد جسم ضائع ہونے لگتا ہے۔''

یحییٰ کی دلیلوں نے ابراہیم کو زچ کر دیا، بولا۔ ''یحییٰ! تو مجھے برباد کر کے رہے گا۔ تیری دلیلیں مجھے ادھر سے ادھر کر دیں گے حالانکہ دلیلیں ہمیشہ سچ کے ساتھ نہیں ہوتیں۔ یہ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے حربوں کا نام ہے۔ تیری ساری باتوں کا میرے پاس ایک ہی جواب ہے، میں ہارون کی محفلِ طرب میں نہیں آ سکتا، میں امیر المومنین کا ملازم ہوں۔''

یحییٰ نے جھڑک دیا۔ ''میں تو تجھے عقل مند سمجھتا تھا لیکن تُو احمق نکلا۔ یاد رکھ، زمانے کا کام ہی یہی ہے کہ تنی ہوئی گردنوں کو جھکا دے، پھولے ہوئے سینوں کو پچکا دے۔''

آس پاس سے گزرنے والے لوگ یحییٰ اور ابراہیم کو محوِ گفتگو دیکھ کر کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ابراہیم نے راہگیروں کو تشنگیوں سے دیکھ کر کہا۔ ''اب بس بھی کر یحییٰ! دیکھنے والے امیر المومنین سے میری چغلیاں کھائیں گے اور میں خواہ مخواہ موردِ عتاب ٹھہروں گا۔''

یحییٰ نے اس کی ٹھوڑی پکڑ لی اور ابراہیم کے چہرے کو اٹھا کر اپنے مقابل کر لیا، تیوریاں بدل کر بولا۔ ''ادھر میری طرف ذرا غور سے دیکھ، میں یحییٰ بن خالد برمکی ہوں، ہارون کا اتالیق اور امیر المومنین اور ہارون کی ماں خیزران کا معتمد۔ تیرا فرض ہے کہ تو مجھے بھی اپنے اعتماد میں لے، امیر المومنین کا وفادار رہ اور ہمیں اپنا دشمن نہ بنا۔''

یحییٰ نے ایک جھٹکا دے کر ابراہیم کو چھوڑ دیا۔ ابراہیم لڑکھڑا گیا، گرتے گرتے بچا۔ ابراہیم نے خوفزدہ نظروں سے یحییٰ کو دیکھا اور جاتے جاتے کہا۔ ''یحییٰ! یہ تو نے اچھا نہیں کیا۔''

اس کے بعد یحییٰ نے اپنی راہ لی اور ابراہیم اپنے گھر چلا گیا، لیکن ابراہیم کا خوف اور غصے سے برا حال تھا۔

☆☆☆

ابراہیم کئی دن تک دربار میں نہیں گیا۔ چغل خوروں نے یحییٰ اور ابراہیم کی سرِ راہ ملاقات اور بات چیت کی خبر ہادی تک پہنچا دی تھی۔ اس ملاقات کے بعد ابراہیم کا کئی دن تک دربار میں نہ آنا ہادی کو شک میں مبتلا کر رہا تھا۔ ہادی دربار سے اٹھ کر اپنی ماں خیزران کے پاس پہنچ گیا اور سختی سے کہا۔ ''ماں! میں دیکھ رہا ہوں کہ تیری محبت کا پلڑا بھائی ہارون کی طرف زیادہ جھکا ہوا ہے۔''

خیزران نے جواب دیا۔ ''یہ تیری غلط فہمی ہے، میں دونوں کو برابر چاہتی ہوں۔''

ہادی نے پاؤں پٹک پٹک کر اشتعال سے کہا۔ ''ماں یہ غلط ہے، بالکل غلط ہے۔ تو ہارون کو برسرِ اقتدار لانا چاہتی ہے تو مجھ کو حکومت کرتے نہیں دیکھ سکتی۔''

خیزران نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ ''میری نظر میں تم دونوں ہی برابر ہو۔ یہ بے ہودہ اور ضرر رساں وسوسے اپنے دل سے نکال دو۔''

ہادی نے بدستور سختی سے کہا۔ ''پھر یہ یحییٰ میرے آدمیوں کو کیوں ورغلا رہا ہے۔ اس نے میری کنیزوں میں اپنی جاسوسائیں داخل کر دی ہیں، وہ میرے درباری گویے ابراہیم کو مجھ سے چھین کر ہارون کی خدمت میں پہنچا دینا چاہتا ہے۔ سچ سچ بتا ماں! کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ یہ سب کیوں ہو رہا ہے، کس لیے اور کس مقصد کے لیے ہو رہا ہے؟''

خیزران بھی مشتعل ہو گئی، کھڑی ہو کر بولی۔ ''ہادی! میں تیری ماں ہوں، مجھ سے اس طرح بات نہ کر جس طرح تو اپنی کنیزوں سے بات کرتا ہے۔ میں ماضی کے ایک امیر المومنین کی بہو، ایک کی بیوی اور ایک امیر المومنین کی ماں ہوں۔ میں ایک عظیم المرتبت خاتون ہوں۔ میں خود کو اپنی زبان سے عظیم المرتب کہہ رہی ہوں کیونکہ اگر میں خود ہی اپنی عزت نہیں کروں گی تو دوسرے کیوں کریں گے۔''

ہادی نے بھی سختی سے جواب دیا۔ ''او عظیم المرتبت خاتون اپنے حواسوں میں رہ، اس وقت تو عظیم المرتبت صرف میں ہوں تو سیاست میں حصہ لینا چھوڑ دے ورنہ اس سے ہاتھوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

خیزران نے کہا۔ ''میں سیاست میں حصہ نہیں لے رہی اور نہ ہی مجھے اس کا شوق ہے لیکن میں محل سرا میں بدامنی کی اطلاع برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اپنے ہمدردوں کو نقصان پہنچتا نہیں دیکھ سکتی۔''

ہادی ایک دم چراغ پا ہو گیا۔ ''تب پھر تو بھی اپنے حواریوں کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گی۔ اگر تو یہ چاہتی ہے کہ تو معاملات حکومت میں دخل دے اور کسی ترکیب سے ہارون کو خلیفہ بنا دے تو یہ ناممکن ہے۔ میں ہادی ہوں، مہدی کا بیٹا ہادی۔ میرے اعصاب مضبوط ہیں میری مملکت میں رہنے والا کوئی شخص بھی میرے لمبے ہاتھوں کی پہنچ سے دور نہیں۔''

خیزران نے اپنے اشتعال کو دبائے رکھنے کی کوشش کی، بولی۔ ''ہادی! تکبر کی باتیں مت کر، اس نے ابلیس لعین کو ہمیشہ کے لیے ذلیل و خوار کر دیا۔''

ہادی اپنی ماں کے پاس سے چلا گیا۔ وہ بہت اول فول بک رہا تھا۔

ہادی کئی دن تک اپنی آگ میں آپ ہی جلتا رہا۔ اس کو ابراہیم کا انتظار تھا۔ جب وہ نہیں آیا تو اس کے پاس اپنے آدمی بھیج دیے اور کہا۔ ''اس بے وقوف گویے سے کہہ دو کہ زیادہ حرص نہ کرے، ہوس انسان کو ذلیل و خوار رکھتی ہے، دربار سے غیر حاضری کیوں؟''

ابراہیم کو جو یہ پیغام ملا تو وہ افتاں و خیزاں دربار میں پہنچ گیا اور ہادی کو وہ ساری گفتگو سنا دی جو یحییٰ سے ہوئی تھی، ہادی نے پوچھا۔ ''میں تو یہ پوچھتا ہوں کہ تو نے اس کی خبر فوراً ہی مجھے کیوں نہ کی۔ تو اپنے گھر میں کیوں بیٹھ رہا؟ کیا میں اس سے یہ سمجھوں کہ تو یحییٰ کی باتوں میں آ گیا اور اس سے توقعات وابستہ کر کے بیٹھا اس سے خوف زدہ ہو کر تو اپنے گھر میں بیٹھ رہا، آخر میں کیا سمجھوں؟''

ابراہیم کانپنے لگا۔ ''امیر المومنین! یہ بات نہیں ہے۔ میں بہت حساس اور جذباتی انسان ہوں۔ میں یحییٰ کی باتیں برداشت نہ کر سکا اور اس کے ہتک آمیز رویے سے اتنا دل برداشتہ ہوا کہ مجھے اپنی زندگی سے نفرت ہو گئی اور میں دنیا کو چھوڑ کر ایک گوشے میں معتکف ہو گیا۔''

ہادی نے درشتی سے کہا۔ ''تو اس کا مطلب ہے کہ میں تجھ کو تیرے حال پر چھوڑ دوں اور تیری مدد سے اپنے ہاتھ کھینچ لوں، تو نے زمانے کو چھوڑ دیا، میں تجھ کو چھوڑ دوں۔''

ابراہیم گڑگڑانے لگا۔ ''ارے بہترین خلفا کے بیٹے! مجھے دشمنوں کا نشانہ بنانے کے لیے نہ چھوڑ..... میں نے تیری محبت میں اپنے گھر بار کو چھوڑنا گوارا کر لیا۔ میں نے اپنی روح تک تیرے لیے پیش کر دی۔ میں نے تیری محبت میں اپنی زندگی تباہ کر لی۔ اب اس کے بعد اگر تو بھی مجھے چھوڑ دے گا تو میں کہاں جاؤں گا۔''

ہادی نے کہا۔ ''اگر تو اسی وقت میرے پاس آ جاتا تو میں یحییٰ سے اس کا جواب طلب کرتا اور اس پر سختی کرتا کہ تجھے یہ حق کس نے دیا کہ تو میرے ندیموں اور محبوں کو ستائے اور تکلیفیں پہنچائے۔''

ابراہیم نے ہادی کے آگے سر جھکا دیا اور آہستہ آہستہ آنسو بہاتا رہا پھر اس کی ہچکیاں بندھ گئیں اور وہ زور زور سے رونے لگا۔ ہادی کا دل پسیج گیا۔ اس نے ابراہیم کو تسلی دی اور اس کو محبت سے سمجھاتا رہا لیکن یحییٰ کے جارحانہ رویوں کا ہادی کے دل پر بھی بڑا اثر ہوا تھا۔ وہ سخت ہیجانی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اس نے اپنی طبیعت پر قابو پانے کے لیے فوری طور پر مغنیاؤں کو طلب کیا اور محفلِ طرب جم گئی۔ اس نے ابراہیم سے کہا۔ ''ابراہیم! ملول ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، میں اس کا بہت جلد تدارک کر دوں گا۔''

ان مغنیہ کنیزوں میں کہربا بھی شامل تھی۔ اس پر ہادی اور ابراہیم کی نظریں ایک ساتھ پڑیں۔ ہادی کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ ایک بار پھر ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہو گیا لیکن ابراہیم پر اس کا کچھ اور ہی اثر ہوا۔ وہ ہادی کی کیفیت بھی محسوس کر رہا تھا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں ہادی کہربا کے بارے میں کوئی ایسا ویسا فرمان نہ جاری کر دے، دست بستہ عرض کیا۔

''امیرالمومنین! میں نے کہربا پر بڑی محنت کی ہے اس لیے آپ سب سے پہلے کہربا کو حکم دیجیے کہ یہ محظوظ کرے۔''

ہادی نے برہمی سے جواب دیا۔ ''تو اس کی سفارش کر رہا ہے تو میں اس کو گانے کا حکم دوں گا ورنہ یہ بھی وہی ہے جو بینائی ہے، یہ میرے خلاف جاسوسی کرتی ہے۔''

کہربا کی حالت غیر ہونے لگی، عرض کیا۔ ''امیرالمومنین! میں امیرالمومنین کے خاندان کو گلستان کے مثل سمجھتی ہوں۔ اس گلستان کا ہر پھول میرے لیے پیارا ہے لیکن اس گلشن کا وہ پھول جو جانِ گلشن کہلائے امیرالمومنین کے سوا کون ہوسکتا ہے۔''

ہادی نے ہنس کر کہا۔ ''بس زیادہ باتیں نہ بنا، نغمہ چھیڑ تاکہ دل کی کدورت دور ہو۔''

ہادی کی مسکراہٹ نے ابراہیم کو خوش کر دیا ورنہ وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ اس وقت حالتِ برہمی میں وہ کہربا کے خلاف کوئی بھی حکم دے سکتا تھا۔ اس نے کہربا کو سمجھایا۔ ''کہربا! تو عورت بھی ہے اور لڑکی بھی۔ عورت ناقص العقل ہوتی ہے اور لڑکی ناسمجھ اور ناتجربہ کار۔ ابھی ابھی تو نے جس گلشن کا ذکر کیا ہے اس میں بدقسمتی سے ہوائے نفاق چل پڑی ہے اور بادِ حسد نے پھولوں میں عناد اور کدورت کا زہر گھول دیا ہے۔ ان حالات میں ہم سب کا فرض ہے کہ جانِ گلشن کے وفادار رہیں۔''

ہادی نے کہربا کو حکم دیا۔ ''بس اب تو کوئی ایسا نغمہ چھیڑ کہ دل کی پژمردگی اور اداسی دور ہو جائے۔''

کہربا کو ساز دے دیا گیا، جس کو اس نے فرش پر ٹکا کر بغل سے گزارا اور پھر بائیں ہاتھ سے پکڑ کر تاروں پر سیدھے ہاتھ کی انگلیاں رکھ دیں۔ اس نے گھنگھار کر گلا صاف کیا اور گانا شروع کرنے سے پہلے ہادی سے عرض کیا۔ ''امیرالمومنین! خوش قسمتی سے میں شاعرہ بھی ہوں اور اپنے احساسات اور خیالات کو اشعار میں کہہ سکتی ہوں چنانچہ میں کچھ عرصہ سے جس خلجان میں مبتلا ہوں اور میرے محبوں اور مخالفوں نے سرگوشیوں میں جو کچھ مشہور کر رکھا ہے اس سے میں بہت سہم گئی ہوں۔ انہی احساسات نے جب لفظوں کی شکل اختیار کی تو وہ شعر بن گئے اور اب وہ آواز اور ساز کی مدد سے امیرالمومنین کے گوشِ مبارک تک پہنچا دیے جائیں گے۔''

ہادی نے خوش ہو کر ابراہیم سے کہا۔ ''ابراہیم! کہربا تو ذہین لڑکی ہے تو نے اس کو ناقص العقل اور ناسمجھ کہہ کر زیادتی کی ہے۔''

ابراہیم نے عرض کیا۔ ''امیرالمومنین! میں نے جو بات کہی تھی وہ عام عورتوں اور لڑکیوں کی بابت تھی۔ ہوسکتا ہے یہ لڑکی غیر معمولی اور فوق الاوصاف ہو۔''

ہادی نے کہربا کو حکم دیا۔ ''اب تو ساز و آواز کا جادو جگا میں زیادہ برداشت نہیں کرسکتا۔''

کہربا نے اجازت طلب نظروں سے ہادی اور ابراہیم کی طرف دیکھا، دونوں نے نظروں اور سر کی خفیف جنبش سے اجازت دے دی۔ کہربا نے انگلی سے تار پر ضرب لگائی۔

''میں ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوئی جبکہ زمانے میں حق کا دھارا باطل کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لیے جا رہا تھا۔ اقوامِ عالم کا یوم الحساب، بادیہ نشینوں نے بیجا تکلفات اور سونے چاندی کی تہذیبوں کو خاک میں ملا دیا ان کے خاکستر پر سادگی اور سچائی کی بنیادیں رکھیں اور ایک ایسی عمارت تعمیر کر دی جس پر زمانہ اور تاریخ یکساں ناز کریں گے۔

''اس سرے سے اس سرے تک، دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک، انسان اس نئی عمارت کے شوقِ دید میں مچلنے اور تلملانے لگے۔ جو رستے اور جن کا شوق کامل تھا وہ یہاں تک پہنچ گئے۔ جنہیں آبلہ پائی گوارا نہ تھی، بچھڑ گئے۔ میں ان میں شامل تھی جن میں نہ تو شوقِ دید تھا، نہ منزل تک پہنچ کی خواہش اور امنگ۔ میں تو یہ بھی نہ جانتی تھی کہ یہ نئی عمارت ہے کیا اور کہاں؟''

کہربا کا لحن اور اس کا زیر و بم ہر سننے والے کے دل میں سوز و گداز پیدا کر رہا تھا، اس کی انگلیاں تاروں پر مشاقی اور مہارت سے ضربیں لگا رہی تھیں۔ اس کی زلفیں چہرے پر بکھری ہوئی تھیں اور سیاہ بالوں کے پیچھے سے جھانکتا ہوا سرخ و سفید چہرہ مہتاب کی چاندنی بکھیر رہا تھا۔ ہادی جھومنے لگا۔

وہ گاتے گاتے ایک دم رک گئی۔ ہادی تڑپ گیا، بے چینی سے کہا۔ ''تو رک کیوں گئی؟ اور اور۔''

کہربا نے سرد آہ بھری اور بڑی غمگین نظروں سے ہادی کی طرف دیکھا۔

ہادی نے کہا۔ ''ہاں ہاں، بول۔ تو چپ کیوں ہوگئی؟ جو کچھ کہنا ہے، برملا، بے تکلفی سے کہہ دے۔''

کہربا نے جواب دیا۔ ''امیرالمومنین! گیت ختم ہوا، اب جو کچھ کہنا ہے، یوں ہی عرض کر دوں گی۔''

ہادی نے کہا۔ ''لیکن یہ کہاں کی خوش مذاقی ہے کہ تو اپنے نغمے، ساز اور آواز سے دلوں میں آگ لگا کر سلگتا ہوا

چھوڑ دے۔''

کہربا نے عرض کیا۔ ''امیرالمومنین! میرے معاملے میں انصاف سے کام لیں کیونکہ میرا دل بھی کئی دن سے بُری طرح جل رہا ہے اور یہ جو میرے سامعین اپنے اپنے دلوں میں میرے گیت کی آگ محسوس کرنے لگے ہیں، میرے دل کی آگ کا نتیجہ ہے۔''

ہادی نے پوچھا۔ ''تو نے اپنے جس دشمن کا ذکر کیا ہے اور جو تیرے بقول قصرِ خلافت میں تیرے پاس ہی موجود ہے، وہ کون ہے اور میرے علاوہ کوئی دوسرا اس کا مقابلہ کیوں نہیں کرسکتا؟''

کہربا نے عرض کیا۔ ''امیرالمومنین! میں نے جس دشمن کا ذکر کیا ہے وہ دکھائی نہیں دیتا، اس کو دیکھا نہیں جاسکتا محسوس کیا جاسکتا ہے۔''

ہادی نے ابراہیم کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''ابراہیم! یہ کیا کہہ رہی ہے؟ میری تو سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا۔''

ابراہیم نے کہربا سے کہا۔ ''کہربا! تو پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہے، جو کچھ کہنا ہے امیرالمومنین سے صاف صاف کہہ دے۔''

ہادی نے ہمت بندھائی۔ ''ہاں ہاں، بے جھجک، صاف صاف کہہ دے۔''

کہربا نے سر جھکا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''قصرِ خلافت میں میری دشمن میری قسمت ہے، میری بدقسمتی۔ خوش قسمتی نے مجھے گمنامی سے نکال کر قصرِ خلافت میں داخل کر دیا۔ اب بدقسمتی مجھ کو یہاں سے نکال کر ٹھوکریں کھلوانا چاہتی ہے۔''

ہادی نے پوچھا۔ ''وہ کس طرح؟''

کہربا نے عرض کیا۔ ''یہ میری بدقسمتی ہی تو ہے جو مجھ پر یہ الزام لگوا رہی ہے کہ میں بینی برکی یا امیرالمومنین کے بھائی ہارون کی مخبرہ ہوں۔ ان الزامات کے زیرِ اثر اگر امیرالمومنین مجھ کو قصرِ خلافت سے نکال دیں گے تو میرے لیے ٹھوکروں کے علاوہ اور کیا رہ جائے گا۔''

ہادی سوچ میں پڑ گیا۔ ابراہیم فوراً بول اٹھا۔ ''امیرالمومنین نے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا کہ اس نایاب اور گرانقدر متاع کو میری نذر فرما دیں گے۔''

ہادی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''ہاں میں نے تجھ سے وعدہ تو کیا تھا۔''

ابراہیم نے جلدی جلدی کہا۔ ''تو وعدے کے ایفا پر تو اللہ تعالیٰ نے بھی بڑا زور دیا ہے، اسے فوراً ایفا ہونا چاہیے۔''

کہربا نے تیز و طرار نظروں سے ابراہیم کی طرف دیکھا اور درشتی سے کہا۔ ''میں تیری اس لیے عزت کرتی ہوں کہ امیرالمومنین تجھ سے محبت کرتے ہیں اور تو اس عہد کا بے مثل مغنی ہے۔ اس عزت میں عقیدت بھی شامل ہے لیکن میں یہ گوارا نہیں کروں گی کہ تیرے حوالے کر دی جاؤں اور قصرِ خلافت سے نکل کر تیرے گھر کو آباد کروں۔''

ابراہیم کو کہربا کی باتوں سے سخت اذیت پہنچی۔ اس نے ہادی سے شکایت کی۔ ''امیرالمومنین کی غیر معمولی نوازشیں اور مراعات غلاموں اور کنیزوں کو گستاخی پر مائل کر دیتی ہیں ورنہ ایک کنیز کی یہ مجال کہ امیرالمومنین کی مرضی پر اپنی مرضی کو ترجیح دینے کی جرأت کرے۔''

کہربا نے جواب دیا۔ ''میں اپنی مرضی کو امیرالمومنین کی مرضی پر مسلط کرنے کی جرأت نہیں کرسکتی۔ اس طرح میں استدعا اور التجا کر رہی ہوں! امیرالمومنین نے جن پھولوں کو اپنے مشام کے لیے پسند فرمایا ہو، انہیں اپنے سے کمتر لوگوں کے حوالے نہیں کرنا چاہیے۔''

ابراہیم کا دل ڈوبنے لگا کہ کہربا ہاتھ آتے آتے رہ گئی تھی، ہادی سے التجا کی۔ ''امیرالمومنین! اپنا وعدہ ضرور وفا فرمائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی بڑی پکڑ ہے۔''

ہادی نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''ابراہیم! میں نے وعدہ کیا ہے تو وہ وفا بھی ہوگا، لیکن تو بھی ذرا صبر سے کام لے، میں جلدی نہیں کرسکتا۔ تجھ کو ذرا انتظار کرنا ہوگا۔''

ابراہیم کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ بجھے بجھے لہجے میں پوچھا۔ ''امیرالمومنین! کب تک؟''

ہادی نے جواب دیا۔ ''میں نے تو تجھ سے ایک سرسری سی بات کی تھی جس کو تو میرا وعدہ سمجھ بیٹھا اور اب میں اس کو اپنا وعدہ ہی سمجھ کر اس کو پورا کر دینا چاہتا ہوں تو، تو جلدی کر رہا ہے جو کسی طرح بھی مناسب نہیں۔''

ابراہیم نے آزردگی سے عرض کیا۔ ''امیرالمومنین! میں چونکہ خیالوں ہی خیالوں میں کہربا کو حاصل کر چکا تھا اس لیے اب تاخیر میرے حق میں سوہانِ روح ثابت ہوگی۔ عاشقی صبر چاہتی ہے لیکن تمنا نکلنے کے لیے بے تاب رہتی ہے میں ان دونوں پاٹوں میں پسا جا رہا ہوں۔ امیرالمومنین مجھ پر رحم فرمائیں۔''

ہادی نے زچ آ کر اعلان کیا۔ ''کیا بدمذاقی ہے میں نے تو کدورتوں اور الجھنوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے محفلِ طرب منعقد کی تھی اور یہاں پھر مسائل اٹھ کھڑے ہوئے۔ خدا کے لیے ان امور کو دوسرے وقت کے لیے رہنے دو۔''

اور اس نے ایک بار پھر کہربا کو حکم دیا۔ ''اے آتش نوا مغنیہ! وہی راگ دوبارہ چھیڑ دے، دلوں کی آگ بجھ چلی ہے اس کو ہوا دے کر دوبارہ مشتعل کر دے۔''

کہربا کو ہادی کے لب و لہجے اور انداز سے اس کا یقین آ گیا تھا کہ ہادی اس کو ابراہیم کے حوالے نہیں کرے گا اس لیے خوشی اور جوش میں پہلے سے زیادہ اچھی طرح نغمہ چھیڑ دیا۔

☆☆☆

ابراہیم کو مایوس واپس جانا پڑا۔ اس کو کہربا پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر اس میں وہ کون سی کمی ہے جو کہربا کو اس سے دور رکھنے پر مجبور کر رہی ہے؟ وہ یگانۂ عصر مغنی، جس کا عرب و عجم میں کوئی جواب نہ تھا اور جس کی قربت اور ہم نشینی کے لیے ہادی کا بھائی ہارون اور ہارون کا اتالیق یحییٰ برمکی، دونوں بے چین اور مضطرب پھر رہے ہیں، کہربا اس سے گریزاں ہے۔ ہادی حاکم مطلق اور خلافتِ عباسیہ کی حدود کی ہر شے کا مالک و مجاز ہونے کے باوجود کہربا کی مرضی کے خلاف کوئی حکم دینے کی قوت نہیں رکھتا تھا۔ اس نے سوچا اگر یہ اس کی بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے۔ اس نے غم غلط کرنے کے لیے شراب کا مٹکا اپنے آگے رکھ لیا اور کہربا کی یاد میں پیالے بھر بھر کر چڑھانے لگا۔ اس نے کہربا کے تصور سے پیچھا چھڑانے کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن یہاں بھی کہربا موجود تھی اور وہ ابراہیم کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

ابراہیم نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور چیخ پڑا۔ ''خدایا! یہ کیسا عذاب ہے جو تو نے مجھ پر مسلط کر دیا ہے۔''

ابراہیم کی ماں اس کی آواز سن کر اس کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ وہ کچھ دیر اس کو حیرت سے دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ ابراہیم کو اپنی ماں کی موجودگی کی کوئی خبر نہ تھی۔ وہ برابر بڑبڑائے جا رہا تھا۔ ''خدایا! تو کہربا کے دل کو مجھ پر مائل کر دے یا پھر میرے دل کو اس کی طرف سے پھیر دے۔''

اس کی ماں نے اس کو جھنجھوڑ دیا۔ ''ابراہیم! یہ کس کہربا کی تو بات کر رہا ہے؟ وہی کہربا جو امیر المومنین نے موسیقی سیکھنے کے لیے تیرے حوالے کی تھی؟''

ابراہیم نے گھبرا کر اپنے چہرے پر سے دونوں ہاتھ ہٹا لیے اور محمور نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ ماں کا دھواں دھواں چہرہ دیکھ کر اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں، بولا۔ ''ہاں ماں! میں اسی کہربا کی بات کر رہا ہوں۔ اس نے بجلی بن کر میرے صبر و سکون کو جلا کر رکھ دیا ہے۔ میں کہیں بھی جاؤں، کہیں بھی اٹھوں بیٹھوں، کچھ بھی کروں، کہربا میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ ماں میں کیا کروں؟ میں بہت پریشان ہوں، میں کہیں کا بھی نہیں رہا۔''

ماں نے درشتی سے کہا۔ ''یہ تو کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ حاسدوں اور دشمنوں سے ڈر، دیواریں بھی کان رکھتی ہیں۔ اگر کسی نے تیری باتیں سن لیں اور امیر المومنین کے گوش گزار کر دیں تو پتا نہیں تیرا کیا حشر کر دیا جائے۔

''کہربا امیر المومنین کی تیرے پاس امانت ہے اور تو خیانت کا مرتکب ہو رہا ہے۔ ہوش میں آ، کیوں اپنی اور اپنے خاندان کی تباہی کے درپے ہے۔''

ابراہیم نے تلملا کر آنکھیں کھول دیں، بولا۔ ''ماں! میرے زخموں پر نمک پاشی نہ کر، کہربا نے میری زندگی وبال کر دی ہے۔''

ماں نے سختی سے کہا۔ ''ابراہیم! میں نے تو تجھے بڑی مصیبتوں سے پالا پوسا ہے۔ میں نے موصل میں تیری شادی کر دی تھی۔ تیرا ایک بیٹا بھی ہے جو تیری آوارہ گردی کی وجہ سے تیرے پاس نہیں رہ سکتا۔ اگر میں تیری ماں نہ ہوتی تو کب کا تیرا ساتھ چھوڑ چکی ہوتی۔ یہاں اچھے حالات میں تو بیوی اور بچے کو بھلا بیٹھا، موصل میں وہ تیرے انتظار میں ہیں۔ آخر وہ کب تک تیرا انتظار کریں گے؟''

ابراہیم نے سر کو اس طرح جھٹکا دیا گویا وہ اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہو، بولا۔ ''ماں! اس وقت کسی اور کا ذکر نہ کر، میں کہربا کو نہیں بھول سکتا۔''

ماں نے ابراہیم کے ہاتھ سے پیالہ چھیننے کی کوشش کی۔ ''میں یہ پیالہ توڑ دوں گی اور موصل چلی جاؤں گی۔ اب میں ان دونوں کو دور نہیں رکھ سکتی۔''

ابراہیم نے پیالے کو ماں کے ہاتھ سے بچا لیا اور اس کو ایک طرف رکھ دیا، بولا۔ ''ماں! جو تیری سمجھ میں آئے کر، لیکن اس گھر میں کہربا کو بھی آنا پڑے گا۔ کہربا کو بھی یہیں رہنا ہوگا۔''

ماں نے اس کو پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ ''میں کہتی ہوں کہربا کا ذکر بند کر، ورنہ امیر المومنین تجھے جلاوطن کر دیں گے اور یہ کنبہ ایک بار پھر اجڑ جائے گا۔''

ابراہیم نے ماں کے ہاتھوں کو جھٹک دیا۔ ''ماں! جب تو کچھ جانتی نہیں تو خوامخواہ مجھے کیوں پریشان کر رہی ہے۔ امیر المومنین نے مجھ سے وعدہ کر لیا ہے کہ وہ کہربا کو مجھے بخش دیں گے۔''

ماں نے سہم کر ابراہیم کو چھوڑ دیا۔ ''ابراہیم! یہ تجھے

ہو گیا ہے، تو نے اپنی ماں کو جھڑک دیا! افسوس کہ شراب اور شباب نے تجھے اپنے ہوش و حواس میں نہیں رکھا، جو منہ میں آتا ہے وہی تباہی بکے جا رہا ہے۔''

ابراہیم سجدے میں گر گیا۔ ''خدایا! میرے سینے کی آگ کو شادمانی و کامرانی کے پانی سے بجھا دے۔ کہربا کے دل کو میرے حق میں پھیر دے۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تو نے میری یہ دعا قبول کر لی تو میں آئندہ کوئی دعا نہ مانگوں گا۔ یہ میری آخری اور قطعی دعا ہے۔''

ماں نے شراب کا خالی پیالہ اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ ''نامراد! کیا تجھے اتنی سی بات بھی معلوم نہیں کہ خدا شرابی کی دعا قبول نہیں کرتا۔''

پیالے کی ضرب نے ابراہیم کے سر کو زخمی کر دیا، اس میں سے خون رسنے لگا۔ ابراہیم بے چینی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور بہتے ہوئے خون کو ہاتھ سے روکنے کی کوشش کی، بولا۔ ''ماں! یہ تو نے کیا کیا؟''

ماں نے جواب دیا۔ ''میں کہتی ہوں تو اب بھی ہوش میں آ جا، میں تجھے صاف صاف بتائے دیتی ہوں کہ کہربا ہو یا کوئی اور، جب تک تیری بیوی اور بچہ یہاں نہیں آ جائیں گے اس گھر میں کوئی اور عورت نہیں آ سکے گی۔''

ابراہیم نے اپنے سر کے زخم پر رومال رکھ دیا اور خون پونچھنے لگا۔ ماں اسے اس کے حال پر چھوڑ کر وہاں سے چلی گئی۔

ابراہیم اٹھا اور سر پر پانی ڈال کر زخم دھونے لگا۔ پانی کی دھار نے نشے کو اور زیادہ تیز کر دیا۔ وہ جھومنے لگا۔ زخم کو دھونے کے بعد اس نے بمشکل اس پر کپڑا باندھا اور بستر پر جا گرا۔

ماں نے ابراہیم کو زخمی تو کر دیا تھا اور اس کو اس کے حال پر چھوڑ کر چلی بھی آئی تھی لیکن اب اس کا دل دکھ رہا تھا۔ اس کے دل کو کوئی مسل رہا تھا۔ وہ بڑی دیر تک ضبط کیے بیٹھی رہی لیکن پھر برداشت نہ کر سکی اور دبے قدموں ابراہیم کی طرف چل پڑی۔ وہ اپنی بے تابی اور محبت کو ابراہیم پر ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ وہ یہ سوچ کر ابراہیم کی طرف جا رہی تھی کہ وہ یا تو زخم کو دھو دھلا کر پھر شراب پینے بیٹھ گیا ہوگا یا پھر کہیں پڑا کراہ رہا ہوگا لیکن جب وہ ابراہیم کی خواب گاہ میں داخل ہوئی تو اس کو سویا دیکھ کر کسی قدر خوشی محسوس کی۔ وہ آہستہ سے ابراہیم کے سرہانے جا کر کھڑی ہو گئی۔ ابراہیم سر پر پٹی باندھے سو رہا تھا۔ ماں کا دل بھر آیا اور وہ کپکپاتے لہجے میں آہستہ آہستہ بولی۔ ''بیٹے ابراہیم! میں نے تیری خاطر بڑے دکھ جھیلے ہیں۔ میں نے تیری محبت سے مغلوب ہو کر تجھے زخمی کر دیا، مجھے معاف کر دینا تو کہربا کو اسی گھر میں لے آ، میں کچھ بھی نہ کہوں گی۔''

لیکن ابراہیم کو کچھ پتا نہ تھا کہ اس کے سرہانے کون کھڑا ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔

☆☆☆

اس نے کئی بار ہادی کو راضی کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس دوران اس کی ماں نے نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے ابراہیم کی بیوی اور بچے کو موصل سے بلوا لیا۔ جب ابراہیم کی خوبرو بیوی دس سالہ اسحاق کو لیے ہوئے گھر میں داخل ہوئی تو ابراہیم کی ماں بے حد خوش ہوئی مگر خود ابراہیم کو ذرا بھی خوشی نہ ہوئی۔ وہ فکرمند ہو گیا۔ چند دن کی الجھن اور کھنچاؤ کے بعد ابراہیم کی حالت اعتدال پر آ گئی اور وہ بیوی بچے کی طرف راغب ہو گیا۔

دل

☆ دل چیزوں کی طرح مختلف ہوتے ہیں۔

☆ دل ایک صاف آئینہ ہے۔ اگر وہ بدی سے پاک ہو تو اس میں خدا نظر آتا ہے۔

☆ سب سے بہترین آواز دل کی ہے۔

☆ دل آنکھ کے تابع ہے۔ آنکھ کے بگڑنے کے بعد دل کی حفاظت مشکل ہے۔

☆ دل رازوں کا صندوق، ہونٹ تالے اور زبان چابی ہے۔

☆ افسردہ دل پوری انجمن کو افسردہ بنا دیتا ہے۔

☆ اگر کوئی چیز چھپانی ہو تو دل سے زیادہ محفوظ اور بہتر جگہ اور کوئی نہیں۔

☆ دل ایک بچہ ہے جو دیکھتا ہے، وہی مانگتا ہے۔

☆ جب اپنے دل میں شوق ڈالتے ہو تو ساتھ ساتھ خوف بھی ڈالا کرو۔

☆ ''جنت'' اور ''جہنم'' یہ دونوں دل ہی میں ہوتے ہیں۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

برسوں کی جدائی جھیلی ہوئی عورت نے جب اپنے گھر میں قصرِ خلافت کی کنیزوں کو آتے جاتے اور اپنے شوہر سے موسیقی کی تعلیم حاصل کرتے دیکھا تو چڑ گئی اور اس نے اپنے شوہر کی بے انصافی اور بے نیازی کا سبب پالیا۔ ابراہیم نے بھی اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ اس گھر میں سکون سے رہنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے، وہ یہ کہ جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ دیکھا جائے اس پر خاموش رہا جائے اور یہ سوچ کر صبر کرلیا جائے کہ اس کا شوہر اپنے عہد کا یگانۂ روزگار موسیقار ہے اور اس پر اس کی بیوی وہ پابندیاں عائد نہیں کرسکتی جو عام روایتی شوہر پر عائد ہوا کرتی ہیں۔ اس نے اپنی بیوی کو یہ بھی بتا دیا کہ مرحوم خلیفہ مہدی نے اس کی شراب نوشی پر پابندی لگانے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہا تھا۔ چنانچہ اس روشنی میں بیوی کو بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

بیوی نے اس کی باتیں غور سے سنیں اور خاموش رہی۔ وہ قبل از وقت نہ تو کوئی وعدہ کرنا چاہتی تھی اور نہ کوئی بات کرنا چاہتی تھی۔ ابراہیم نے اپنے بیٹے اسحاق کو اپنے پاس بٹھالیا اور کہا۔ ''یہ البتہ میرے قریب رہے گا تاکہ میں وہ سب کچھ اسے سکھا دوں جو مجھے آتا ہے اور یہ اپنے باپ کا صحیح وارث ثابت ہو۔''

ان چند باتوں کے بعد دونوں سکون سے ایک ساتھ رہنے لگے۔ بیوی چند دن تک تو کہربا کا غم غلط کرنے میں کامیاب رہی لیکن بیوی کا عارضی نشہ پھر اترنے لگا اور ابراہیم کو کہربا کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی۔ اس کو ہادی پر غصہ آرہا تھا کہ بااختیار اور صاحب اقتدار ہونے کے باوجود ایک کنیز پر اس کا حکم نہیں چل رہا تھا۔ کئی بار اس کے اندر باغیانہ جذبے پیدا ہوئے اور جی میں آئی کہ ہارون اور یحییٰ سے تعلقات استوار کرنا چاہئیں لیکن پھر ضمیر نے ملامت شروع کردی کہ ہادی کی قدردانیوں اور نوازشوں کو یوں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

شراب نوشی میں کچھ زیادہ اضافہ ہوگیا۔ ہر وقت آنکھیں چڑھی چڑھی اور سرخ رہنے لگیں، پپوٹے بھاری ہوگئے۔ نشے کی وجہ سے دربار آنا جانا بھی موقوف ہوا۔ ہادی نے کئی بار اس کی دربار میں عدم موجودگی کا سبب دوسروں سے معلوم کرنے کی کوشش کی تو یہی جواب ملا کہ آج کل ابراہیم زیادہ تر نشے میں رہتا ہے اور گھر سے بہت کم نکلتا ہے۔

کسی نے جواب میں یہ بھی بتایا کہ موصل سے اس کی بیوی لڑکے اسحاق کو لے کر آگئی ہے، ابراہیم ان دونوں میں مشغول ہوگیا ہے۔ لیکن ہادی کو کسی کا جواب بھی مطمئن نہ کرسکا۔ اس نے ابراہیم کو حاضر دربار ہونے کا حکم بھیج دیا۔

جس وقت ہادی کا آدمی حاضری کا حکم لے کر ابراہیم کے گھر پہنچا، وہ کسی بات پر بیوی کو جھڑک رہا تھا اور نشے میں دھت ہونے کی وجہ سے زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ اس کی ماں نے ابراہیم کو مطلع کیا... ''امیر المومنین تجھے یاد کررہے ہیں۔''

نشے کے باوجود ابراہیم کی جان نکل گئی، ماں سے کہا۔ ''لیکن میں اس وقت دربار میں کیسے جاسکتا ہوں۔''

ماں نے پوچھا۔ ''کیوں، جانے میں کیا قباحت ہے؟''

ابراہیم نے کہا۔ ''ماں! میں قصرِ خلافت میں اس حالت میں کیونکر جاسکتا ہوں۔''

ماں نے کہا۔ ''میں کچھ نہیں جانتی۔ باہر جا اور امیر المومنین کے آدمی سے خود ہی بات کرلے۔''

لیکن وہ باہر جاتے ہوئے بھی گھبرا رہا تھا کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ باہر جانے کا مطلب ہے، دربار کی حاضری ضروری ہوجائے گی۔ اس نے خوشامدانہ عرض کیا۔ ''ماں! کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تو خلیفہ کے آدمی سے کہہ دے کہ میں گھر میں موجود نہیں ہوں۔''

ماں نے جواب دیا۔ ''میں جھوٹ نہیں بول سکتی۔ تو شراب پینا چھوڑ دے تاکہ ہم سب جھوٹ سے محفوظ رہیں۔''

ابراہیم نے بیوی کی طرف دیکھا۔ ''اور تو! کیا تو بھی امیر المومنین کے آدمی کو چلتا نہیں کرسکتی؟''

بیوی تو یوں ہی جلی ہوئی تھی، تنک کر بولی۔ ''تم نے تو مجھ سے پہلے ہی یہ عہد لے رکھا ہے کہ میں تمہارے کسی معاملے میں دخل نہ دوں گی، میں اپنا عہد نہیں توڑوں گی۔''

ابراہیم کا نشہ ہرن ہونے لگا، زور سے چیخا۔ ''خدا کے لیے مجھے اس مصیبت سے بچاؤ۔''

ماں نے دبی دبی آواز میں کہا۔ ''اور زور سے چیخ تاکہ تیری باتیں امیر المومنین کا آدمی بھی سنتا رہے۔''

باہر سے آواز آئی۔ ''استاد ابراہیم! امیر المومنین نے آپ کو فوراً ہی طلب فرمایا ہے، اس لیے دیر نہ کیجیے ورنہ جوابدہی مشکل ہوجائے گی۔''

ابراہیم جس حال میں تھا اسی میں باہر چلا گیا اور خلافت کے فرستادے سے کہا۔ ''بھائی! اس وقت میں اس لائق نہیں ہوں کہ تیرے ساتھ چلوں، کیا تو امیر المومنین کی خدمت میں میری طرف سے کوئی عذر نہیں پیش کرسکتا؟''

آدمی نے جواب دیا۔ ''استاد! جھوٹ بھی چھپتا

نہیں۔ اگر عارضی طور پر چھپایا بھی جائے تو کچھ عرصے بعد کھل جاتا ہے۔ اگر مجھ کو یہ یقین ہوتا کہ میں دربارِ خلافت میں عارضی طور پر ہوں تو شاید آپ کا کہا کردیتا لیکن موجودہ حالات میں، میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔''

ابراہیم نے جھنجلا کر کہا۔ ''کیا مصیبت ہے، لوگ میرے بڑے پن کا احترام ہی نہیں کرتے۔ میری ماں، میری بیوی، دربار کا معمولی فرستادہ کسی کو بھی میرے بڑے پن کا خیال نہیں۔ لوگو! میں اس عہد کا سب سے بڑا مغنی ہوں، میرا احترام کرو، میں اقلیم غنا کا بے تاج اور بے حریف بادشاہ ہوں، اس لیے یہاں میرا حکم چلے گا یہ کیا ستم ظریفی اور بدقسمتی ہے کہ میں ایک ایک کی خوشامد کرکے بھی اپنی بات نہیں منوا پا رہا ہوں۔''

درباری فرستادے نے استہزائیہ انداز میں ابراہیم کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ ''استاد! آج کچھ زیادہ ہی چڑھ گئی ہے شاید، خدا کے لیے اب دیر نہ کیجیے اور دربار جانے کے لیے تیار ہوجایئے۔''

ابراہیم عذر کی کوئی راہ نہ دیکھ کر اندر گیا اور دربار کے کپڑے پہنے، اس وقت وہ اپنے علاوہ ہر ایک سے برہم تھا۔ ماں اور بیوی سے کہ انہوں نے جھوٹ نہ بول کر اس کی کوئی مدد نہ کی تھی۔ ہادی سے بھی۔

جب وہ ہادی کے پاس پہنچا تو وہاں کہربا بھی موجود تھی۔ اس وقت اس نے گلابی رنگ کا ریشمی لباس پہن رکھا تھا۔ باریک لباس سے سفید زیرجامہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ گلے میں زمردیں گلوبند اور گلوبند کے نیچے سفید موتیوں کا ہار تھا۔ ہادی کے پیچھے دائیں بائیں کنیزیں مگس رانی کر رہی تھیں۔ ہادی اور کہربا ابراہیم کو دیکھ کر مسکرائے۔ ابراہیم کو نشے کا احساس تھا۔ شدید احساس نے اس کی خود اعتمادی کو مجروح کردیا اور وہ پہلے سے زیادہ لڑکھڑانے لگا۔ وہ ہادی سے تقریباً پچیس تیس قدم دور ہی کھڑا ہوگیا۔ ہادی نے ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا۔ ''ابراہیم! یہاں میرے قریب آجا۔''

ابراہیم لڑکھڑا کر دس قدم اور بڑھ گیا، کہربا نے پوچھا۔ ''استادِ محترم! کیا بات ہے آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

ابراہیم نے کہربا کو قہر کی نظروں سے دیکھا اور خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

ہادی نے کہا۔ ''ابراہیم! باوا مرحوم تیرے نشے سے عاجز تھے۔ میں تیرے حق میں فراخدل ہونے کے باوجود تیرے نشے سے نالاں ہوگیا ہوں۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تو دربار میں شراب پی کر نہ آیا کرے؟''

ابراہیم نے عرض کیا۔ ''میں اس وقت نہیں آنا چاہتا تھا لیکن یا امیر المومنین! آپ کے فرستادے نے مجھے ٹالنے کا موقع ہی نہ دیا اور میں مرضی نہ ہونے کے باوجود دربار میں حاضر ہوگیا۔''

ہادی نے کہا۔ ''ابراہیم! کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تو اگر شراب کو ترک نہ کرے تو کم ہی کردے۔''

ابراہیم نے کہربا کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''امیر المومنین! پہلے تو میں شراب اس لیے پیتا تھا کہ مجھے موسیقی اس پر مجبور کردیتی تھی لیکن آج کل اس لیے پی رہا ہوں کہ مجھے کسی کا دردِ جدائی کھائے جا رہا ہے۔ اگر میں شراب نہ پیوں تو میرا کلیجا پھٹ جائے اور میں مرجاؤں گا۔''

ہادی نے اس کی باتیں توجہ سے نہیں سنیں، پوچھا۔ ''کیا تو جانتا ہے کہ اس وقت میں نے تجھے کیوں بلایا ہے؟''

ابراہیم نے جواب دیا۔ ''یا امیر المومنین! میں نہیں جانتا کہ مجھے کیوں یاد فرمایا گیا ہے۔''

ہادی نے کہا۔ ''میں محلاتی سازشوں سے عاجز آچکا ہوں۔ میری ماں خیزران مجھے معزول کرکے ہارون رشید کو برسرِ اقتدار لانا چاہتی ہے۔ یحییٰ برمکی ان کا مشیر اور مددگار ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس خاموش مقابلے میں کس کا کیا حشر ہوگا۔''

ابراہیم نے عرض کیا۔ ''امیر المومنین کی میں کیا خدمت کرسکتا ہوں مطلع فرمائیں، میں جان دے کر انجام دینے کی کوشش کروں گا۔''

ہادی نے جواب دیا۔ ''تو، تو شراب کے نشے میں دھت رہتا ہے تو تیری کیا مدد کرے گا۔''

کہربا نے عرض کیا۔ ''امیر المومنین اور امیر المومنین کے خاندان کو خدا سلامت رکھے۔ کیا کوئی ایسی صورت ممکن نہیں ہے کہ یہ کشمکش اور خاموش تصادم کسی طرح ختم ہوجائے اور سب مل جل کر رہنے لگیں؟''

ہادی نے گرم ہوکر جواب دیا۔ ''تو کیسی باتیں کرتی رہتی ہے، تو محض مغنیہ ہے۔ یہ سیادت و امارت اپنی بنیادوں میں انسانی خون مانگتی رہتی ہیں۔ یہ قصے باتوں سے نہیں دب سکتے۔''

کہربا چپ ہوگئی۔ ہادی نے ابراہیم سے کہا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ ہارون اور یحییٰ تجھ کو اپنی بزم طرب میں بلاتے رہتے ہیں اور ان کی یہ خواہش ہے تو ہارون کے دربار سے وابستہ ہوجائے۔''

ابراہیم نے جواب دیا۔ ''امیر المومنین! انہوں نے کئی بار کوشش تو کی ہے لیکن میں نے ان سے صاف صاف

کہہ دیا ہے کہ میں امیر المومنین کا دامن نہیں چھوڑ سکتا۔ میں امیر المومنین کے احسانات کو کس طرح فراموش کر دوں۔"

ہادی کھڑا ہو گیا، بگڑ کر بولا۔ "احسان، احسان، احسان! یہ کیا احمقانہ باتیں کرتا رہتا ہے تُو، میں چاہتا ہوں کہ میرے نمک خوار، میرے پروردہ، میرے زیر بار احسان میرے لیے کچھ ایسے بھی کام کریں جو ان کے بظاہر فرائض کے علاوہ ہوں۔ تو ہارون اور یحییٰ سے ملاقات کر اور انہیں اعتماد میں لے کر ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھ۔ انہیں یقین دلا دے کہ تُو مجھ سے دل برداشتہ ہو چکا ہے، تُو مجھ سے خفا ہو گیا ہے۔ اگر مجھ کو کسی طرح ان کے عزائم اور ارادوں کا علم قبل از وقت ہو جائے تو میں انہیں بروقت کچل سکتا ہوں۔"

ابراہیم نے عرض کیا۔ "امیر المومنین کے اختیارات وسیع ہیں، اس گھناؤنے اور مکروہ مقابلے میں، میں ناکام رہوں گا کیونکہ میں فنِ غنا میں جوہر دکھا سکتا ہوں، سیاست وسازش میں کارآمد نہیں ثابت ہوں گا۔"

ہادی نے سختی سے کہا۔ "یہ تو ہوش وحواس میں کہہ رہا ہے یا شراب کے نشے نے تیری ہمت پست کر دی ہے؟"

ابراہیم نے عرض کیا۔ "بے شک میں نشے میں ہوں لیکن مجھے اپنی صلاحیتوں کا اندازہ ہے۔ میں منافقت نہیں کر سکتا امیر المومنین! ذرا غور تو فرمائیں اور یاد کریں جب مرحوم جنت مقام مہدی نے مجھے شراب پینے سے منع کیا تھا، اگر میں منافق ہوتا تو اس کا بہ آسانی وعدہ کر لیتا اور چوری چھپے شراب پیتا رہتا۔"

ہادی نے بدستور سختی سے کہا۔ "میں قیل وقال پسند نہیں کرتا، میں جو چاہتا ہوں ہونا چاہیے۔ تُو عشق کرنے میں تو بڑی جرأت کا مظاہرہ کرتا ہے، راتوں کو آہیں بھرتا ہے، ماں اور بیوی سے جھگڑے کرتا رہتا ہے۔ شراب کے خم کے خم چڑھا جاتا ہے اور جب عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو، تُو راہِ فرار اختیار کرتا ہے۔" پھر کہربا کی طرف دیکھ کر مسکرا کر پوچھا۔ "کیا تُو نہیں چاہتا کہ کہربا تیرے حوالے کر دی جائے؟"

ابراہیم اچھل پڑا، بے اختیار بولا۔ "امیر المومنین! کیا واقعی؟"

ہادی نے طنزاً کہا۔ "اب تو ایک دم بجلی سی دوڑ گئی سارے جسم میں۔"

ابراہیم نے سر جھکا کر عرض کیا۔ "امیر المومنین! میں کہربا کی خاطر ہر وہ کام پوری تندہی اور ہوشیاری سے انجام دے سکتا ہوں جس کا تعلق میری صلاحیتوں سے ہو یا نہ ہو۔"

ہادی نے کہا۔ "تب پھر تُو ہارون اور یحییٰ کو اعتماد میں لے اور ان کے عزائم کا پتا چلا، اب اس معاملے کو طے ہو جانا چاہیے۔"

کہربا نے کچھ کہنا چاہا، کئی بار منہ کھل کھل کر بند ہو گیا، ہادی نے پوچھا۔ "کیا تو کچھ کہنا چاہتی ہے؟"

ابراہیم ڈر گیا کہ کہیں کہربا پھر کاٹ نہ کر جائے، ہادی سے کہا۔ "امیر المومنین! آپ مجھ سے یہ دوبارہ وعدہ فرما رہے ہیں، اگر میں آپ کی خدمت صحیح طور پر انجام دے لوں تو کسی عذر کے بغیر وعدہ پورا ہونا چاہیے۔"

ہادی نے جواب دیا۔ "یہ میرا وعدہ ہے، امیر المومنین کا وعدہ پورا ہو گا اور ہر حال میں پورا ہو گا۔"

اس کے بعد ہادی نے ابراہیم کو رخصت کر دیا اور کارپردازانِ خلافت کو بار یابی کی اجازت بخشی اور ان سے انتظامی امور پر باتیں ہونے لگیں۔

☆☆☆

برمکی خاندان بغداد کے مشرقی حصے میں شماسیہ نامی علاقے میں رہتا تھا۔ یہاں قصور وابوانات کا ایک جال سا بچھا ہوا تھا۔ یہیں وہ محل بھی تھا جو قصر الصنین کہلاتا تھا اور جس میں یحییٰ برمکی کا باپ خالد رہتا تھا۔ ابراہیم رات کی تاریکی میں اپنے گھوڑے کو بھگاتا ہوا قصر الصنین کے صدر دروازے پر جا کر رک گیا۔ اس نے اپنے چہرے کو سیاہ چادر میں چھپا لیا تھا۔ صدر دروازہ آبنوس کا تھا اور اس پر منقش کیا ہوا تھا۔ صدر دروازے کے دونوں طرف باہری حصوں میں کئی حجرے بنے ہوئے تھے، ان میں قصر کے دربان رہتے تھے۔

وہ صدر دروازے پر اتر گیا اور ایک دربان سے پوچھا۔ "کیا یحییٰ اندر تشریف رکھتے ہیں؟"

دربان نے اسے محل کے صدر دروازے سے ملحق حجروں میں سے ایک میں پہنچا دیا اور کہا۔ "استاد ابراہیم! آپ یہاں رکیں، میں اندر مطلع کرتا ہوں۔"

ابراہیم نے حیرت سے پوچھا۔ "تو مجھے پہچانتا ہے؟"

دربان نے جواب دیا۔ "استاد! آج بغداد اور اس کے نواح میں کون ہے جو آپ سے واقف نہیں!"

دربان اندر چلا گیا اور کچھ دیر بعد جب واپس آیا تو یحییٰ اس کے ساتھ تھا۔ یحییٰ نے ایک شخص کو چادر میں منہ چھپائے اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو ذرا ٹھٹکا، زور سے پوچھا۔ "کیا استاد ابراہیم یہ آپ ہیں؟"

استاد ابراہیم نے سرگوشی میں جواب دیا۔ "یحییٰ! میں یہاں چوری سے آیا ہوں اور تو میرا زور زور سے نام لیتا ہے؟"

یحییٰ نے اس کی آواز سے اس کو پہچان لیا اور کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اندر لے گیا۔ کچھ دیر بعد یہ دونوں ایک شاندار ملاقاتی کمرے میں جا بیٹھے، یحییٰ کی ہر بات اور ہر انداز سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس کو ابراہیم کی آمد کا یقین نہیں آ رہا۔

یحییٰ نے پوچھا۔ "مشروب میں کیا چلے گا؟"

ابراہیم نے جواب دیا۔ "ابنِ خالد! میں نبیذ شوق سے پیتا ہوں، وہی پلا لوں گا۔"

یحییٰ نے تالی بجائی تو چند کنیزیں حاضر ہو گئیں۔ یحییٰ نے حکم دیا۔ "نبیذ کا فوراً بندوبست کیا جائے۔"

کنیزیں چلی گئیں تو یحییٰ نے پوچھا۔ "کیوں استاد ابراہیم! اتنی رات گئے تنہا کیونکر آنا ہوا؟"

ابراہیم نے جواب دیا۔ "یحییٰ! اب میں سمجھا کہ ہادی کے دربار میں کس کی کتنی اہمیت اور عزت ہے۔" اس کی آواز بھرا گئی، وہ رونے لگا۔ "یحییٰ! تم یقین کرو کہ میں نے ہادی کی خدمت جس شان اور اہتمام سے کی ہے ویسی کم ہی لوگ کریں گے۔ اس پر بھی ہادی کا دماغ نہیں ملتا۔ ہر وقت ڈانٹ پھٹکار، جھڑکیاں اور ملامتیں۔ میں اس پر پچھتانے لگا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ میں ہادی کا ساتھ چھوڑ کر یحییٰ اور ہارون کا ساتھ دوں گا۔"

یحییٰ نے تیز نظروں سے ابراہیم کو دیکھا اور کہا۔ "استاد! آپ کچھ کھا پی لیں، اس کے بعد باتیں ہوتی رہیں گی۔"

کچھ دیر بعد کنیزیں کھانے کے طشت رومالوں سے ڈھانپے ہوئے لے آئیں۔ دوسری کنیز نبیذ اور آلاتِ نبیذ لے آئی اور اس کو یحییٰ اور ابراہیم کے سامنے رکھ دیا۔ یحییٰ اور ابراہیم نے ایک ساتھ تھوڑا بہت کھایا پیا اور نبیذ ہونٹوں سے لگ گئی۔ یحییٰ نے کہا۔ "ہاں استاد! اب بتائیں یہ معاملہ کیا ہے؟"

ابراہیم نے جواب دیا۔ "معاملہ صرف اتنا سا ہے کہ میں نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے، اب میں ہادی کے پاس کم سے کم جاؤں گا۔ اب اس میں پہلی سی بات نہیں رہی۔ اگر میری معیشت، میری روزی ہادی کے دربار سے وابستہ نہ ہوتی تو میں کب کا ترکِ تعلق کر چکا ہوتا۔"

یحییٰ نے مسکرا کر کہا۔ "آپ میرے پاس تشریف لائے، اس کا شکریہ، لیکن آپ کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ ہادی نے آپ کی قدر نہیں کی۔ آپ کو امیر المومنین ہادی سے بڑا مداح ملنا مشکل ہے، یوں ہارون کا دربار بھی ہادی ہی کا دربار ہے کیونکہ یہ دونوں بھائی ہیں اور ان میں ایک دوسرے کا احترام اور لحاظ پایا جاتا ہے۔"

ابراہیم، یحییٰ کی باتوں سے ذرا پریشان ہو گیا، بولا۔ "کون کس کا احترام اور لحاظ کرتا ہے، ذرا اس کی وضاحت تو ہو جائے کیونکہ میں نے امیر المومنین کے دربار میں جو کچھ دیکھا ہے وہ تمہاری بات کی تائید نہیں کرتا۔"

یحییٰ نے جواب دیا۔ "ہادی، ہارون کا لحاظ کرتے ہیں اور ہارون، ہادی کا احترام۔ جہاں یہ معاشرتی آداب موجود ہوں وہاں جزوی اختلافات فتنے نہیں بن سکتے اور یہ اختلافات ہر جگہ ہوتے ہیں۔"

ابراہیم اور زیادہ پریشان ہو گیا، یحییٰ اپنے کندھے پر ہاتھ رکھنے ہی نہیں دے رہا تھا۔

یحییٰ نے ابراہیم کو بہت پلا دی، یہاں تک کہ وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا۔ وہ جہاں بیٹھا تھا وہیں لیٹ گیا اور کوئی گیت گانے لگا۔ یحییٰ اس کے پاس بیٹھ گیا اور مسکرا کر چھیڑا۔ "استاد! کوئی گیت ہو جائے۔"

ابراہیم نے نشے میں ڈوبی ہوئی آنکھیں کھولیں اور لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔ "گیت! میرا گیت کون سنے گا؟"

یحییٰ نے جواب دیا۔ "آپ کا گیت میں سنوں گا، ہارون سنے گا۔ برسوں سے آپ کا گیت نہیں سنا ہے۔"

ابراہیم نے زہر خند کیا اور ہنس کر آنکھیں بند کر لیں، چہرہ لٹک گیا۔ "ہونہہ! برسوں سے میرا گیت نہیں سنا، میرا گیت سنیں گے خوب! ارے اپنی گانے والیوں کو بلا اور مجھ کو ان کا گیت سنا۔ امیر المومنین ہادی جب یہ سنیں گے کہ میں نے تمہیں اپنا گیت سنایا ہے تو وہ کیا کہیں گے بہت ناراض ہوں گے، میں انہیں کیا جواب دوں گا۔ اپنی کنیزوں کو حکم دے کہ وہ گائیں اور ہم محظوظ ہوں۔"

یحییٰ نے جواب دیا۔ "یہ بھی ممکن ہے لیکن استاد آج تو ہم آپ سے سنیں گے۔ آپ ہی کا عشقیہ کلام آپ ہی کی آواز میں سنیں گے۔ یہ موقعے بار بار کہاں آتے ہیں۔"

ابراہیم نے ہاتھ ہلا کر منع کر دیا۔ "کیا دماغ خراب ہو گیا ہے کہ میرا عشقیہ کلام مجھ سے ہی سنے گا۔ میں نہیں سناؤں گا۔"

یحییٰ نے ناراض ہو کر کہا۔ "اچھا اگر نہیں سنائیں گے تو میں جاتا ہوں آپ یہیں آرام کریں۔"

ابراہیم اس وقت بالکل دھت تھا۔ اس کو زبان اور ارادوں پر قدرت نہیں رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر یحییٰ کی طرف دیکھا، ہر طرف شمعیں روشن تھیں لیکن ابراہیم کو یحییٰ کا چہرہ صاف نظر نہیں آیا۔ دھندلا دھندلا، بھیگا بھیگا۔ اس نے یحییٰ سے پوچھا۔ ''یحییٰ! کیا بات ہے، یہ روشنی کم کیوں ہے؟ ذرا اور شمعیں تو روشن کر، میرے سینے میں آگ جل رہی ہے۔ اپنی مغنیہ کنیزوں کو حکم دے کہ وہ اپنے نغمات سریلی آواز میں سنا کر میرے سینے کی آگ کو اور زیادہ مشتعل کر دیں۔''

یحییٰ نے کہا۔ ''استاد! میرا خیال ہے اس وقت آپ یہیں آرام کریں، سو جائیں کیونکہ اس حال میں آپ کو مزہ نہیں آئے گا۔''

ابراہیم ڈوبتا جا رہا تھا۔ یحییٰ کی باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ اس نے سر اٹھا کر ایک بار پھر یحییٰ کو دیکھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا اور سر ڈال کر پڑ رہا۔ یحییٰ اس کے پاس سے اٹھ گیا اور ایک کنیز کو اس کے پاس بٹھا دیا اور کہا۔ ''دیکھ، تو اس کے پاس بیٹھی رہ، میرا خیال ہے یہ نشے میں بڑبڑائے گا۔ میں یہیں قریب ہی برابر والے کمرے میں موجود ہوں، جب یہ بڑبڑانے لگے تو مجھے فوراً ہی بلا لینا اور اگر میں یہاں نہ ملوں تو مدہوشی میں جو کچھ بھی کہے غور سے سن کر مجھے بتا دینا۔''

کنیز اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

یحییٰ کنیز کو ہدایت دینے اور اس کو ابراہیم کے پاس بٹھا دینے کے باوجود وہیں موجود رہا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے وہاں سے ٹل جاتا مگر فوراً ہی واپس بھی آ جاتا۔ اس نے کئی بار ابراہیم کے چہرے پر جھک کر اس کی حالت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی، ابراہیم بے سدھ پڑا ہوا تھا۔

اس طرح کئی گھنٹے گزر گئے لیکن ابراہیم نے ہوں ہاں تک نہ کی۔ کنیز اس کے پاس بیٹھے بیٹھے اکتا گئی۔

رات کے پچھلے پہر جبکہ چراغوں کی روشنی تھکی تھکی سی نظر آنے لگی تھی اور سناٹے میں کوئی ملاوٹ باقی نہیں رہی تھی، ماحول کی ہر شے سو چکی تھی، ابراہیم نے کروٹ بدلی۔ کروٹ بدلتے بدلتے اس نے ذرا سی آنکھ کھولی اور ماحول پر نظریں ڈالیں۔ وہ اس وقت بھی بے سدھ اور مدہوش تھا۔ اس نے چراغوں کی مدھم اور دھندلی روشنی میں اپنے پاس کسی کو بیٹھے دیکھا تو نیم مدہوشی اور نیم خوابیدگی میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ شراب اور خواب کے دو آتشے نے اس کو وہ کچھ دکھا دیا جو وہ دیکھنا چاہتا تھا۔ کنیز کو کہربا سمجھ بیٹھا، بے اختیار اٹھنے کی کوشش میں لڑکھڑا کر گر گیا۔ کنیز سہم کر ذرا پیچھے ہٹ گئی۔ ابراہیم نے اپنی آنکھیں ملیں اور کنیز کو غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔

کنیز سمجھی اب یہ کچھ بولے گا، وہ یحییٰ کے پاس چلی گئی اور عرض کیا۔ ''میرے آقا! وہ بیدار ہو گیا ہے اور شاید کچھ بولنے والا ہے۔''

یحییٰ نے کہا۔ ''تو وہیں واپس جا اور سن کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، میں یہیں سے سننے کی کوشش کروں گا۔''

کنیز پھر واپس گئی، بدحواس ابراہیم اپنی کہربا کی تلاش میں تھا۔ وہ جیسے ہی واپس آئی، ابراہیم کھل اٹھا، بولا۔ ''تو کہاں چلی گئی تھی کہربا؟''

کنیز اس کا مطلب ہی نہیں سمجھی۔ ابراہیم نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی مگر گر گیا، وہ رونے لگا۔ ''یہ مجھے کیا ہو گیا ہے کہربا؟ میں اٹھ نہیں پا رہا ہوں، تو ہی میرے پاس آ جا کہربا۔''

کنیز نے کہا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ وہیں لیٹے رہیے اور سو جائیے۔''

ابراہیم نے خوشامد کی۔ ''کہربا! یہ امیر المومنین کہاں چلے گئے؟ ان سے کہنا اب وہ اپنا عہد یاد رکھیں، بھول نہ جائیں۔ میں تجھے حاصل کر کے رہوں گا کیونکہ تیرے بغیر میری زندگی محض ادھوری ہے۔''

کنیز ایک بار پھر یحییٰ کے پاس واپس گئی اور کہا۔ ''میرے آقا! وہ معلوم نہیں کس کا نام لے کر مجھے مخاطب کر رہا ہے، وہ کہربا کہہ رہا ہے۔ میں اس سے کس طرح باتیں کروں؟''

یحییٰ نے کہا۔ ''اگر وہ تجھ کو کہربا کہہ کر مخاطب ہے تو تو ہی کہربا بن جا اور کم سے کم باتیں کر کے اس کی باتیں سنتی رہ۔''

کنیز پھر واپس گئی، اب ابراہیم اوندھے منہ پڑ گیا تھا۔ کنیز کی آہٹ نہیں سن سکا، منہ کے بل پڑا رہا۔

کچھ دیر بعد سر اوپر اٹھایا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ اس نے دھندلی دھندلی کنیز کو دیکھا اور پھر کہنے لگا۔ ''کہربا! تو کہاں چلی گئی کہربا!''

اس کے بعد وہ رونے لگا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بڑبڑانے لگا۔ ''کہربا! اب میں تیری خاطر شراب پینا چھوڑ دوں گا کیونکہ تو مجھ سے اب بھی بیزار نظر آتی ہے۔ تو بار بار اٹھ کر کیوں چلی جاتی ہے؟ آہ میری ماں کہتی ہے کہ شرابی کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ میں نے دعا مانگی تھی کہ خدا تجھ کو مجھ پر مائل کر دے لیکن وہ دعا شاید اس لیے قبول

نہیں ہوئی کہ جب وہ دعا مانگ رہا تھا، نشے میں تھا۔''

ابراہیم کی آواز بری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔

اب یحییٰ بھی اس کمرے میں آ گیا لیکن دور اندھیرے میں کھڑا ہو گیا۔ ابراہیم نے یحییٰ کی جھلک بھی دیکھ لی۔ اس نے یحییٰ کو بغور دیکھنے کی کوشش کی لیکن نہ دیکھ سکا۔ اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی اور سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''امیر المومنین! خدا کے لیے کہربا کو حکم دے دیجیے کہ یہ مجھ سے بے التفاتی نہ برتے۔ جب تک میں آپ کا کام نہ کر دوں میں کہربا کو آپ سے مانگ تو نہیں رہا، بس ذرا قربت ضرور چاہتا ہوں۔''

کنیز ابراہیم کے پاس سے ہٹ گئی اور اندھیرے میں جا کھڑی ہوئی۔ ابراہیم تلملا کر بیٹھ گیا لیکن اس سے بیٹھا نہ گیا، پھر لیٹ گیا اور گڑگڑانے لگا۔ ''امیر المومنین! میں شراب چھوڑ دوں گا اگر آپ کہربا کو بخش دیں لیکن اس سے دور رہ کر میں شراب کو کس طرح چھوڑ دوں۔ میں اس کی یاد میں شراب پیتا ہوں۔ جب کہربا اپنی یاد کی جگہ خود ہی موجود ہو گی تو مجھے شراب کی ضرورت نہیں رہے گی۔''

یحییٰ نے کنیز سے کہا۔ ''جا۔ اس کے قریب چلی جا اور خود کو کہربا ظاہر کر کے لگاوٹ کی باتیں کر۔''

کنیز ابراہیم کے قریب چلی گئی بولی۔ ''تو اپنے ہوش میں آ جائے تو میں کوئی بات بھی کروں۔''

ابراہیم نے ادھ کھلی نشیلی آنکھوں سے کنیز کی طرف دیکھا اور ٹک ٹک کر کہنے لگا۔ ''اے کاش امیر المومنین اپنا وعدہ پورا کر دیں اور تو مجھے بخش دی جائے۔''

یحییٰ نے اشارے سے کنیز کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔ ''تو اس کے پاس ہی موجود رہ، میں اس کی باتوں کا مفہوم پا چکا ہوں۔''

ابراہیم رات بھر وہیں پڑا بڑبڑاتا اور سوتا رہا۔ صبح طلوع آفتاب کے کافی دیر بعد بیدار ہوا اور خود کو یحییٰ کے محل میں دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ یحییٰ اس کی پریشانی محسوس کر کے مزے لے رہا تھا۔ ابراہیم کے گھر والے اس کی گمشدگی سے پریشان تھے۔ خود ہادی بھی بڑی الجھن میں تھا کہ ابراہیم کہاں چلا گیا۔ یحییٰ نے ابراہیم سے پوچھا۔ ''ابراہیم! میں تیرے فن کا بہت بڑا مداح ہوں لیکن رات سے میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر تو اپنی راہ سے بھٹک گیا اور کسی لڑکی یا عورت کے چکر میں تو نے نغمہ و موسیقی کے بجائے دوسری ذمے داریاں قبول کر لیں تو تو خود کو ضائع کر دے گا۔''

ابراہیم کا دل دھڑکنے لگا۔ گھبرا کر سوال کیا۔ ''دوسری ذمے داریاں کیا معنی؟ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟''

یحییٰ نے جواب دیا۔ ''کہربا، امیر المومنین، عہد و پیمان۔ ان اشاروں سے تو خوب سمجھ سکتا ہے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔''

ابراہیم کو اپنی بابت یہ یقین ہو گیا کہ وہ خواب میں سب کچھ بتا چکا ہے اور وہ جس مقصد سے یحییٰ سے ملا تھا، یحییٰ کو اس کا علم ہو چکا ہے اور اب کام نہیں بن سکتا۔

یحییٰ نے پوچھا۔ ''اب کیا ارادے ہیں؟''

ابراہیم جان چھڑانے کی فکر میں تھا، جواب دیا۔ ''میں حیران ہوں کہ میں پوری رات اپنے گھر سے غائب کیوں رہا۔ میری ماں، بیوی اور بیٹا سبھی پریشان ہوں گے۔''

یحییٰ نے کہا۔ ''ابراہیم! اب تو اپنے گھر جا اور میری ایک بات گرہ میں باندھ لے۔ تیرا کام ساز و آواز سے تعلق رکھتا ہے، اس کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہ تو تجھے زیب دیتا ہے اور نہ تو اس کا اہل ہے۔ پھر تو یہ کیوں نہیں سوچتا کہ دو بھائیوں کے تنازعے میں غیروں کو شامل نہیں ہونا چاہیے۔ بھائی پھر ایک ہو جائیں گے غیروں کو شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔''

ابراہیم یحییٰ کی باتیں سمجھ رہا تھا۔ اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا لیکن کہربا یہاں بھی آڑے آ رہی تھی۔ اسے ملال تھا کہ یحییٰ نے اسے پہلی ملاقات ہی میں ناکام کر دیا تھا۔ وہ مایوس اور اداس گھر پہنچا تو ماں اور بیوی کو بے حد پریشان پایا۔ وہ جس شرمندگی سے دوچار ہوا تھا اس نے اس کے حوصلے پست کر دیے تھے۔ کئی دن تک دربار جانے کی ہمت نہ پڑی۔

کئی دن بعد ہادی نے اس کو بلوا بھیجا۔ اب ابراہیم ڈرتے ڈرتے دربار پہنچا۔ ہادی نے اس کو دیکھتے ہی طنزاً پوچھا۔ ''تو کہاں چلا گیا تھا ابراہیم؟''

ابراہیم کے پاس اس سوال کا کوئی معقول جواب نہ تھا۔ وہ ہادی کے سامنے موجود درباریوں کو دیکھ کر چپ ہو رہا۔ ہادی کو شبہ گزرا کہ شاید ابراہیم کوئی خاص خبر لے کر حاضر ہوا ہے۔ وہ دربار سے اٹھ کر تخلیے میں چلا گیا اور وہیں ابراہیم کو بھی بلوا لیا۔ دوسری طرف سے کئی کنیزیں طلب کر لی گئیں ان میں کہربا بھی شامل تھی۔ جس وقت ابراہیم تخلیے میں داخل ہو رہا تھا، دوسری طرف سے کہربا بھی داخل ہو رہی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ابراہیم... لڑکھڑا گیا۔ کہربا کی پُرکیف اور سحر انگیز آنکھوں نے وہ اثر کیا کہ ابراہیم اپنے قابو میں نہ رہا لیکن کہربا اس کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔

ہادی نے ابراہیم اور کہربا کو باری باری دیکھا اور ابراہیم سے کہا۔ ''خدا کا شکر ہے کہ تو کامیاب واپس آیا۔'' پھر کہربا کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''مجھے اپنا وعدہ یاد ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تو بار بار میرا عہد، میرا وعدہ یاد دلاتا رہے۔''

کہربا کا چہرہ مست گیا، وہ کچھ بولی تو نہیں مگر چہرے پر اداسی پھیل گئی۔

ابراہیم سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن ہمت اور لفظوں نے ساتھ نہیں دیا۔

ہادی نے چڑ کر کہا۔ ''ابراہیم! تو کیا خبر لایا ہے؟ بتاتا کیوں نہیں؟''

ابراہیم نے بمشکل کہا..... ''امیر المومنین! میں وہ بدقسمت انسان ہوں جس کو خوشیاں راس نہیں آتیں۔''

ہادی نے پوچھا۔ ''کیا مطلب؟ میں تیرا مطلب نہیں سمجھا؟''

ابراہیم نے جواب دیا۔ ''امیر المومنین! میں نے بڑی کوشش کی کہ یحییٰ کو ٹٹولوں اور اس کے دل کی باتیں معلوم کروں لیکن اس نے ایک بات بھی ایسی نہیں کی جو قابلِ گرفت ہو۔ وہ مجھ سے بار بار یہی کہتا رہا کہ امیر المومنین اور ہارون بھائی بھائی ہیں۔ دونوں بھائیوں کے تنازعے میں دوسروں کو نہیں پڑنا چاہیے ورنہ ان میں ایکا ہو جانے کے بعد شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔''

ہادی نے حیرت سے پوچھا۔ ''یحییٰ ایسی باتیں کرتا ہے؟''

ابراہیم نے جواب دیا۔ ''جی امیر المومنین! وہ تو آپ کا ہمدرد اور بہی خواہ ہے۔''

ہادی نے بگڑ کر کہا۔ ''ابراہیم! تو، تو ضرورت سے زیادہ سیدھا اور بھولا نکلا۔ یحییٰ ایک ہی شاطر اور سیاسی ہے۔ اس نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے تجھے بے وقوف بنا دیا۔ وہ میرا وفادار کیونکر ہو سکتا ہے۔ وہ تو ہارون کو برسرِ اقتدار لانا چاہتا ہے کیونکہ اگر میری جگہ ہارون نے لے لی تو یحییٰ بہ آسانی وزیر بن جائے گا۔''

ابراہیم حیرت سے ہادی کی صورت دیکھنے لگا۔

ہادی نے فکرمندی سے اپنا سر جھکا لیا اور کچھ سوچنے لگا۔ کہربا کے چہرے پر طمانیت پیدا ہو گئی۔ ابراہیم حزن و یاس کی تصویر بنا کبھی ہادی کی طرف دیکھنے لگتا اور کبھی کہربا کی شکل میں کھو جاتا۔

کچھ دیر بعد ہادی نے سر اٹھایا اور ابراہیم سے کہا۔ ''ابراہیم! تو نہیں جانتا، یحییٰ بہت ہی شاطر اور ہوشیار آدمی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تیرے پھوہڑ پن اور احمقانہ انداز نے اس سرد و گرم چشیدہ بوڑھے کو تیرے ارادوں سے مطلع کر دیا ہوگا اور وہ محتاط ہو گیا ہوگا۔'' پھر کہربا کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''افسوس کہ میں نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا تھا کہ تیری اس خدمت کے عوض میں کہربا کو تیرے حوالے کر دوں گا لیکن تو اپنے مقصد کی حصولیابی میں ناکام رہا اور مجھ کو بھی مایوس کر دیا۔ تو کہربا سے یوں ہی مایوس رہے گا۔''

ابراہیم کا دل بیٹھنے لگا، بولا۔ ''امیر المومنین! میں آپ کی نوازشوں کے سہارے ہی زندہ ہوں۔ بالکل مایوس نہ کیجیے۔''

ہادی نے جواب دیا۔ ''ابراہیم! میں بہت پریشان ہوں، ہارون اور یحییٰ میرے لیے مستقل خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ میں اپنے بعد اپنے بیٹے جعفر کو حکمراں بنانا چاہتا ہوں مگر یحییٰ ہارون کا طرفدار ہے۔ میں نے یحییٰ کو ہر طرح راضی کرنے کی کوشش کی مگر وہ تیار ہی نہیں ہوتا۔ اب میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ یحییٰ اور ہارون کو قید کر کے قتل کرا دوں لیکن اس سے پہلے میں قصرِ خلد چھوڑ دوں گا۔ اس قصر میں میری ماں خیزران اور اس جیسے دوسرے لوگ بھی رہتے ہیں جن میں سے بعض درپردہ اور بعض اعلانیہ ہارون اور یحییٰ کے طرفدار ہیں۔ مجھ کو ڈر ہے کہ کہیں یہ لوگ میرے خلاف کوئی سازش نہ کر گزریں۔''

ابراہیم نے پوچھا۔ ''امیر المومنین! قصرِ خلد چھوڑ کر کہاں تشریف لے جائیں گے؟''

ہادی نے جواب دیا۔ ''رصافہ کے قریب عیسیٰ باذ میں، وہاں قصرِ ابیض (سفید محل) میرا انتظار کر رہا ہے۔''

ابراہیم نے ڈوبتے دل سے پوچھا۔ ''اور میں، آپ کا یہ غلام کہاں جائے گا؟ اور پھر کہربا.....''

ہادی اس کی بے چینی پر ہنس دیا۔ ''ابراہیم! میں بہت پریشان ہوں لیکن اس پریشانی میں بھی تجھے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ تو قصرِ ابیض میں میرے ساتھ رہے گا، وہیں کہربا بھی رہے گی۔'' پھر شریر نظروں سے کہربا کی طرف دیکھا اور ابراہیم سے کہا۔ ''لیکن تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ کہربا تیرے لیے اتنی سریع الحصول نہیں ہے جتنی تو سمجھ رہا ہے۔ یہ تجھے کسی نہ کسی خدمت کے عوض ہی مل سکتی ہے۔''

کہربا بھی مسکرا رہی تھی اور ابراہیم کے دل پر آرے چل رہے تھے۔

ہادی نے چند ہنگامی اقدام کیے، ہنگامی اور اچانک۔ یحییٰ اور ہارون کو تنگ و تاریک قید خانوں میں ڈال کر خود رصافہ کے قریب عیسیٰ باذ کے قصرِ ابیض میں منتقل ہو گیا۔ جانے سے پہلے اس کی ماں خیزران نے ہارون اور یحییٰ کی رہائی کے لیے اپنے بیٹے ہادی کی بڑی خوشامدیں کیں لیکن

ہادی ذرا بھی نہ پسیجا اور ماں کو جھڑک دیا کہ خبردار جو ملکی اور انتظامی معاملات میں آئندہ دخل دیا۔

اس نے اپنی ماں سے صاف صاف کہہ دیا..... ''کسی عورت کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ حکومت اور کاروبارِ حکومت میں دخل دے۔ اگر وہ ایسا کرے گی تو قتل کر دی جائے گی۔ یہ عورت خواہ امیر المومنین کی ماں ہی کیوں نہ ہو۔''

خیزران نے عجیب سی نظروں سے ہادی کو دیکھا اور بڑے کرب سے کہا۔ ''ہادی! اب میں نہ تو تیری صورت دیکھوں گی اور نہ زندگی بھر بات کروں گی۔''

ہادی نے جواب دیا۔ ''یہ آپ بہت اچھا کریں گی۔ میں اس کے لیے زندگی بھر شکر گزار رہوں گا۔''

خیزران قصرِ خلد کے کسی حصے میں چلی گئی اور ہادی قصرِ ابیض میں منتقل ہو گیا۔ قصرِ ابیض میں ابراہیم کو شاندار ہم نشینی حاصل ہوئی۔ وہ سفید محل ہی کے ایک حصے میں رہنے لگا۔

☆☆☆

محفلِ طرب یہاں بھی منعقد ہوئی، اس محفل میں ابراہیم نے بھی اپنے فن اور آواز کا جادو جگایا۔ کہربا نے بھی خلیفہ کو محظوظ کیا، چند دوسری خوش گلو اور ماہر فن کنیزیں بھی خلیفہ کو لطف اندوز کرنے میں مشغول رہیں لیکن ہادی کی پریشانی اس کے چہرے، بشرے سے ہویدا تھی۔ وہ گیت سنتے سنتے گم ہو جاتا، کنیزیں اس کے پہلو میں بیٹھ جاتیں مگر ان کا لطف و لذت آمیز قرب اور کیف آور اتصال بھی خلیفہ کو الجھنوں سے نہ نکال سکا۔ وہ محفلِ طرب سے اٹھ کر اچانک اندر چلا گیا۔ محفل میں سناٹا طاری ہو گیا، ساز و آواز چپ ہو گئے۔ ابراہیم اور کہربا نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔ ابراہیم نے آہستہ سے کہا۔ ''کہربا! تو اندر جا سکتی ہے، جا اور معلوم کرنے کی کوشش کر کہ امیر المومنین کو یہ ہو کیا گیا ہے؟''

کہربا نے نظریں اٹھائے بغیر ہی جواب دیا۔ ''نہیں، اس وقت میں اندر نہیں جا سکتی، اس وقت تک جب تک کہ امیر المومنین خود طلب نہ کریں۔ ہمیں ان کی تالیوں کا انتظار کرنا چاہیے۔''

ماحول پر ایک بار پھر سناٹا طاری ہو گیا۔ اب ہر کوئی ہادی کی تالیوں کا انتظار کر رہا تھا۔

یہ رات کا پہلا پہر تھا۔ قصرِ ابیض بے شمار شمعوں کی روشنی میں کسی جادوئی سفید محل کی طرح جگمگا رہا تھا۔ وہ سب جو محفلِ طرب میں ہادی کے ہم نشین تھے، اپنی اپنی جگہ مؤدب بیٹھے تھے۔ وہ اس وقت تک ہل بھی نہ سکتے تھے جب

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

کراچی
ماہنامہ سرگزشت
شمارہ ستمبر 2018ء
کی جھلکیاں

یہ پُراسرار بندے
اپنے خون سے تاریخ رقم کرنے والے
شیر جواں کی داستانِ لہو رنگ

سپر پرفارمر
ایک سپر اسٹار، ایک ہر دلعزیز نغمہ نگار
اور ایک معروف گلوکار کا تذکرہ

پکار
محبت کے تکون میں الجھی ایک
شہید فوجی کی دلچسپ سچ بیانی

اس کے علاوہ
پسندیدہ ترین سفرنامہ ''شمشال سے ٹورنٹو'' لہو کی گردش تیز کر دینے والی طویل روداد ''ناسور''.....
اور بھی بہت سی سچ بیانیاں، سچے قصے، تاریخی واقعات، گویا وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں، آپ کو پڑھنا چاہیے۔

آج ہی نزدیکی بک اسٹال
پر نیا شمارہ مختص کرالیں

تک ہادی انہیں کوئی حکم نہ دیتا۔ اس یکساں اور تھکا دینے والے ماحول میں کہربا کی موجودگی سے ابراہیم کو طاقت وتوانائی اور کیف وسکون حاصل ہو رہا تھا۔ اس کی آرزو تھی کہ ہادی ہفتوں نہ آئے اور وہ کہربا کو یوں ہی سامنے بٹھائے دیکھتا رہے۔

وہ کہربا سے باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن کہربا نظر انداز کر رہی تھی۔ کئی گھنٹے بعد کہربا جماہیاں لینے لگی، دوسری کنیزیں بھی اپنی اپنی جگہ اونگھنے لگیں۔ ابراہیم نے کہربا سے کہا۔ ''میرا خیال ہے ہم دونوں کے سوا دوسروں کو چلا جانا چاہیے۔ امیر المومنین معلوم نہیں کب آئیں۔''

کہربا نے جواب دیا۔ ''جب تک امیر المومنین محفل کو خود نہ برخاست کر دیں، یہاں سے کسی کو بھی نہیں جانا چاہیے۔''

ابراہیم اپنی جگہ سے اٹھ کر کہربا کے پاس جا بیٹھا اور ادھر ادھر سرسری نظر ڈال کر بولا۔ ''خاموشی نے طبیعت کو افسردہ کر دیا ہے کیا ہمیں یوں ہی خاموش رہنا چاہیے؟''

کہربا نے کوئی جواب نہ دیا۔ ''میرا خیال ہے ہم دونوں خاموش ہی رہیں تو بہتر ہے۔''

ابراہیم نے رحم طلب نظروں سے کہربا کی طرف دیکھا اور حسرت سے سوال کیا۔ ''تو معلوم نہیں کیوں مجھ سے اتنی بیزار رہتی ہے، آخر کیوں؟ کوئی خاص وجہ؟''

کہربا نے جواب نہ دیا اور منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔

ابراہیم نے افسوس سے کہا۔ ''واہ۔ آواز سننا تو درکنار، اب میں تیری صورت بھی نہیں دیکھ سکتا۔ کہربا، اتنا ظلم نہ کر۔''

کہربا نے جواب دیا۔ ''اگر امیر المومنین کہیں قریب ہی آرام فرما ہیں تو وہ ہماری باتوں کی آواز سے بیدار ہو جائیں گے اس لیے ہمارا خاموش رہنا ہی زیادہ بہتر ہے۔''

ابراہیم نے کہا۔ ''ہم سرگوشیوں میں تو باتیں کر سکتے ہیں؟''

کہربا نے جواب دیا۔ ''لیکن باتیں کرنا اتنا ضروری تو نہیں۔''

ابراہیم نے کہا۔ ''ضروری ہے ورنہ نیند تنگ کرنے لگے گی۔ دوسروں کی طرف دیکھ کہربا! وہ سب اونگھ رہے ہیں۔ پتا نہیں امیر المومنین کس وقت واپس آجائیں۔ اس وقت تک تو..... ہمیں بیدار ہی رہنا ہے، باتیں کرنے سے نیند اڑ جائے گی۔''

کہربا اس کے پاس سے اٹھ کر چلی گئی، دور جا بیٹھی اور جاتے جاتے کہتی گئی۔ ''استاد ابراہیم! میں باتیں کیے بغیر بھی جاگ سکتی ہوں، تم کو فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

ابراہیم کو غصہ تو بہت آیا لیکن ضبط و برداشت سے کام لیا۔

رات کے پچھلے پہر ایک کنیز نے آکر اعلان کر دیا کہ امیر المومنین نے محفل برخاست کی۔ اس لیے جو جہاں جانا چاہے چلا جائے۔

کہربا اور کنیزیں محل ہی کے ایک حصے میں چلی گئیں۔ ابراہیم بھی اپنے ٹھکانے پر چلا گیا۔ اس کے بعد ہادی کئی دن تک کسی کو دکھائی نہ دیا اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ یہ اندازہ لگاتا رہا کہ... ہادی کی یہ خاموشی اور ہر شخص سے لاتعلقی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔

ایک دن ہادی بہت بے چین نظر آیا۔ اس نے دوپہر کے بعد سے محفل طرب جو جمائی تو رات گئے تک اس میں مشغول رہا۔ بے چین، اضطراب اور سیمابی انداز اس کی ایک ایک بات، ہر ہر حرکت سے واضح تھا۔ وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے کے پاس جا کر ایک غلام کو حکم دیا۔ ''جا اور اسی وقت میرے سپہ سالار ہرثمہ بن اعین کو بلا لا۔''

اس کے بعد وہ اپنی جگہ پر جا بیٹھا اور اشارے سے ابراہیم کو اپنے پاس بلایا۔ ابراہیم ڈرتے ڈرتے ہادی کے پاس گیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہادی نے کہا۔ ''ابراہیم! تو یہیں موجود رہ، میں نے ہرثمہ کو بلوایا ہے۔ میں اسے ایک ایسا حکم دینے والا ہوں جس سے میں اپنے مخالفوں اور دشمنوں سے بالکل محفوظ ہو جاؤں گا۔ میں نے ایک خطرناک مگر بہت بڑا فیصلہ کیا ہے۔ یہ فیصلہ میرے اعصاب اور دل و دماغ کو پریشان کر رہا ہے، اس پریشانی میں مجھ کو تیری ہمدردی کی ضرورت ہے۔ تیری قربت اور تیری دل جوئی کی ضرورت ہے۔''

ابراہیم ہادی کے خطرناک اور بڑے فیصلے کا علم نہ رکھنے کے باوجود کانپ گیا مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ہادی سے پوچھتا۔ ''امیر المومنین وہ خطرناک اور بڑا فیصلہ کیا ہے جس نے آپ کے اعصاب اور ذہن و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔''

کافی دیر بعد سپہ سالار ہرثمہ بن اعین حاضر ہو گیا۔ ہادی اس کو لے کر تخلیہ میں چلا گیا اور ایک جلتی ہوئی شمع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہرثمہ! جس طرح یہ شمع جل رہی ہے اس طرح میرے اندر بھی آگ لگی ہوئی ہے۔ یحییٰ، ہارون اور خیزران کے وجود مجھے پھونکے دے رہے ہیں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا ہے یحییٰ، ہارون اور وہ تمام آلِ ابوطالب جو قید خانوں میں ہیں صبح ہوتے ہوتے قتل کر دیے جائیں۔''

ہرثمہ نے پس و پیش سے پوچھا۔ ''خادم امیر المومنین

کے فرمان کی بجا آوری کے لیے ہر وقت آمادہ رہتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیر مشورہ بھی ہے کہ اس کے نتائج اور عواقب پر اچھی طرح غور کر لیا جائے۔''

ہادی نے ہرثمہ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ ''ہرثمہ! تب تو خود کو خلافت کا غلام سمجھتا ہے تو غلام کا فرض ہے کہ اپنے آقا کے ہر حکم کی تعمیل کرے اور اس کے نتائج اور عواقب پر غور کرنے کی فضولیات سے بچا رہے۔ ہرثمہ! یا تو تجھ کو میرے حکم کی تعمیل کرنے گا یا پھر مجھے یہی حکم کسی اور کو دینا پڑے گا اور اس صورت میں تو یحییٰ، ہارون اور آلِ ابوطالب کی صف میں کھڑا، انہی جیسے حشر سے دوچار ہوگا۔''

ہرثمہ لرز گیا، بولا۔ ''غلام آپ کے فرمان کو صبح تک پورا کر دے گا۔''

ہادی خوش ہو گیا۔ فرطِ خوشی میں ہرثمہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، بولا۔ ''تب پھر تو گرانقدر انعام واکرام کا حقدار ٹھہرے گا۔ آج کی رات میں سکون سے سو سکوں گا۔ جا اب وقت نہ ضائع کر۔''

ہرثمہ کے جاتے ہی ابراہیم کو اندر طلب کر لیا گیا۔ اس وقت ہادی بہت خوش تھا۔ اس نے ابراہیم کو یہ نہیں بتایا کہ ہرثمہ کو کیا حکم دیا گیا ہے۔ خوشی اور ترنگ میں بس یہ کہا۔ ''ابراہیم! آج میں سکون سے سو سکوں گا۔ کہربا اور دوسری کنیزوں کو بلوا کر طربیہ گیت چھیڑے جائیں اور تو، تو آج ایسے نغمے سنائے گا جو میرے حق میں لوریاں ثابت ہوں، میں سکون سے سونا چاہتا ہوں۔''

ابراہیم کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ہادی کی خواب گاہ میں جشن جیسا سماں تھا۔ کنیزوں کے پرے صف بہ صف کھڑے تھے۔ ابراہیم ان کے آگے چوکی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہادی نے ابراہیم کو حکم دیا... ''کوئی طربیہ نغمہ شروع کرو۔''

ابراہیم نے ایک ایسا طربیہ گیت شروع کر دیا جس کے بول اور زیر و بم میں سرور و کیف تھا، نیند تھی، خواب تھا، نشہ تھا، سحر تھا۔ وہ جھومنے لگا۔ کہربا بھی سحر زدہ سی ہو گئی۔ آج ابراہیم ڈوب کر گا رہا تھا۔ وہ اپنے فن سے جہاں ہادی کو خوش کرنا چاہتا تھا وہیں کہربا کو بھی متاثر کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔

ہادی پر غنودگی طاری ہونے لگی لیکن اس وقت کسی کنیز نے اندر داخل ہو کر ہادی کو مطلع کیا... ''امیر المومنین کی والدہ محترمہ اذنِ باریابی کی طالب ہیں۔''

ہادی کو گویا جھنجھوڑ دیا گیا تھا۔ اس کی نیند کافور ہو گئی۔ کنیز سے پوچھا۔ ''وہ کیوں آئی ہے؟ اس نے تو یہ عہد کیا تھا کہ وہ زندگی بھر نہ تو میری صورت دیکھے گی اور نہ مجھ سے بات کرے گی۔''

کنیز چپ چاپ کھڑی رہی۔ ہادی اٹھ کر بیٹھ گیا، کچھ دیر... سوچتا رہا پھر کنیز سے کہا۔ ''چل، میں آتا ہوں، وہ کہاں ہے؟''

کنیز نے جواب دیا۔ ''ملحقہ کمرے میں۔''

ہادی ابراہیم کو گاتا ہوا چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا، اس کی ماں خیزران ہادی کو دیکھتے ہی قدموں میں گر گئی۔ ''ہادی، ہارون کو معاف کر دے۔''

ہادی نے پوچھا۔ ''ہارون کو کیا ہو گیا؟''

خیزران نے ہادی کے پاؤں پکڑ لیے۔ ''ہادی، اسے ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا لیکن میں جانتی ہوں کہ جلد یا بدیر اس کو کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ اس کو معاف کر دے، کیونکہ اگر ہارون کو کچھ ہو گیا تو میں بھی زندہ نہیں بچوں گی۔''

ہادی خیزران کی پریشانی سے خوش ہو رہا تھا، وہ مسکرانے لگا، بولا۔ ''عورت! مجھے نہیں پتا کہ ہارون کو کیا ہو گیا یا کیا ہونے والا ہے لیکن اگر اس کو کچھ ہو گیا اور اس کے بعد تجھ کو بھی کچھ ہو گیا تو یہ میرے اور میری خلافت کے لیے بڑی اچھی بات ہوگی۔''

خیزران نے اس کی پنڈلیاں پکڑ لیں۔ ''ہادی! اتنا ظالم نہ بن، اتنا ظلم نہ کر۔''

بادشاہ نے اپنے دونوں پاؤں جھٹکے سے چھڑا لیے... جس سے خیزران منہ کے بل فرش پر گر گئی۔ ہادی نے کہا۔ ''اے عورت! تیرے بیٹے ہارون کے ساتھ جو کچھ ہونے والا ہے وہ کارکنانِ قضا و قدر کا فیصلہ ہوگا۔ میں مجبور ہوں۔'' چند کنیزیں جن میں کہربا بھی شامل تھی، ہادی کے ساتھ ہی کمرے میں آ گئی تھیں۔ ہادی نے اپنی خواب گاہ میں واپس جاتے ہوئے کنیزوں کو حکم دیا۔ ''اس عورت کو محل کے اس حصے میں پہنچا دیا جائے... جہاں سے یہ دوبارہ میرے پاس تک نہ آسکے۔ اب میں نہ تو اس کی صورت دیکھنا چاہتا ہوں اور نہ اس کی آواز سننا چاہتا ہوں۔''

ہادی کے چلے جانے کے بعد بھی خیزران فرش پر اوندھے منہ پڑی رہی۔ کہربا نے اس کو سیدھا کیا اور کہا۔ ''امیر المومنین واپس چلے گئے۔ آپ جہاں کہیں پہنچا دیا جائے گا۔''

خیزران نے ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹائیں۔ پھر بولی۔ ''تھوڑا سا پانی۔''

کہربا نے ایک کنیز کو پانی کے لیے بھیج دیا۔ اس کے جاتے ہی خیزران فرش پر بچھے ہوئے گدے پر لیٹ گئی

اور ایک تکیے کو اپنے چہرے پر رکھ کر کہربا سے کہا۔ ''کہربا! اس طرح۔ جب وہ سو جائے..... بس اب اس کھیل کو ختم ہو جانا چاہیے۔''

کہربا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کنیز پانی لے کر آ گئی۔ خیزران نے پانی پیا اور محل کے کسی حصے میں واپس چلی گئی۔

کہربا ہادی کے پاس واپس گئی، ہادی نے مسکرا کر پوچھا۔ ''کیا وہ چلی گئی؟''

کہربا نے جواب دیا۔ ''جی امیر المومنین۔''

ہادی نے کہا۔ ''آج میں اس عورت کو بے بس اور مجبور دیکھ کر بڑی خوشی محسوس کر رہا ہوں۔'' اس کے بعد ابراہیم سے کہا۔ ''اب تیری ضرورت نہیں رہی۔ تُو جا سکتا ہے اور ہاں، اگر میں کامیاب ہو گیا تو اس خوشی میں کہربا تجھے بخش دی جائے گی۔''

ابراہیم کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نہیں رکھتا تھا۔ اس نے جاتے جاتے امیر المومنین کا شکریہ ادا کیا اور چلا گیا۔ اب ہادی کی خواب گاہ میں کہربا اور چند کنیزیں باقی رہ گئی تھیں۔ طاقتور، خوبصورت کنیزیں۔ انہوں نے ساز بجانے شروع کیے۔ ہلکے سروں والے ساز اور ہادی ان سروں میں ڈوبتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے خراٹوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

کہربا اس کے سرہانے جا کھڑی ہوئی۔ اس نے ایک طاقتور کنیز کو اشارے سے کوئی حکم دیا۔ وہ ایک تکیہ اٹھا لائی۔ کہربا نے تکیہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بقیہ کنیزوں کو اشارے سے حکم دیا کہ وہ ہادی کے سینے، پاؤں اور پیٹ پر ایک ساتھ اس وقت بیٹھ جائیں جب وہ ہاتھ کے اشارے سے حکم دے۔

چار کنیزیں، سینے، پیٹ، ران اور پنڈلیوں کے پاس کھڑی ہو گئیں، کہربا نے تکیے کو ہادی کے منہ پر رکھ دیا اور تمام کنیزیں منہ سے لے کر پنڈلیوں تک ہادی کو دبا کر بیٹھ گئیں۔ ہادی بہت کسمسایا۔ بڑی جدوجہد کی مگر خود کو آزاد نہ کرا سکا۔ وہ کچھ دیر تھرتھرایا کپکپایا، پھر سرد پڑ گیا، وہ مر چکا تھا۔

کہربا نے خیزران کو تلاش کر کے یہ خبر سنا دی۔ وہ بے تابانہ بھاگتی ہوئی ہادی کی خواب گاہ میں داخل ہو گئی اور ہادی کو ہلا جلا کر دیکھا پھر فرطِ خوشی سے سجدے میں گر گئی۔

کچھ دیر بعد خاموشی سے اٹھی اور خواب گاہ کو بند کرا کے واپس چلی گئی۔ ایک آدمی ہرثمہ کے پاس بھیج دیا گیا کہ اس کو اسی وقت حاضر کیا جائے۔

ہرثمہ کو سوتے سے جگا لیا گیا۔ جب قصرِ خلافت کے فرستادے نے ہرثمہ کو یہ بتایا کہ محل میں طلبی ہوئی ہے تو وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے سوچا۔ ''ہادی اس سے جواب طلب کرے گا کہ فرمان کی تعمیل کے بجائے وہ سو کیوں رہا تھا۔''

وہ عذر تلاش کرتا ہوا محل میں داخل ہوا تو اسے خیزران کے روبرو پہنچا دیا گیا۔ اس وقت ہرثمہ کی موجودگی میں کسی بوکھلائی ہوئی کنیز نے خیزران سے کہا۔ ''یا سیدہ غضب ہو گیا۔''

خیزران نے جھنجلا کر پوچھا۔ ''کیا ہو گیا؟''

کنیز نے عرض کیا۔ ''یا سیدہ موسیٰ ہادی کا انتقال ہو گیا؟''

خیزران نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''تو کیا ہوا، ہارون تو زندہ ہے۔'' اس کے بعد ہرثمہ سے کہا۔ ''ہرثمہ! تو یحییٰ اور ہارون کو عزت و احترام سے میرے پاس لے آ اور یحییٰ سے کہہ دے کہ وہ ہارون کی بیعت کا انتظام کرے۔''

ہرثمہ کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ یقین نہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ''یا سیدہ یہ آپ کیا فرما رہی ہیں؟''

خیزران اس کو اپنے ساتھ ہادی کی خواب گاہ میں لے گئی اور کہا۔ ''یہ رہی ہادی کی لاش، اس کو میری بددعا کھا گئی۔ بس زیادہ سوال جواب نہ کرنا۔ میں نے جو حکم دیا اس کی تعمیل ہونی چاہیے۔''

صبح جب ابراہیم کو یہ خبر ملی کہ ہادی مر چکا اور ہارون امیر المومنین بن گیا تو اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا۔ قسمت کی نامساعدت اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ کہربا ملتے ملتے رہ گئی تھی۔ زندگی سے دل بھر گیا۔ جینے کا مزہ جاتا رہا۔

اس رات، جب ہادی کا انتقال ہوا اور ہارون نے تختِ خلافت پر قدم رکھا تو ہارون کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا، مامون الرشید۔ بعد میں مؤرخین نے ان تینوں خبروں کو یوں جمع کر دیا کہ وہ رات بھی کیسی عجیب رات تھی۔ جس میں ایک خلیفہ انتقال کر گیا، دوسرا برسرِ اقتدار آیا۔ تیسرے نے اس دنیا میں قدم رکھا۔

البرامکی۔ عبدالرزاق کانپوری۔ تاریخ طبری۔ امام طبری۔ تاریخ ابنِ خلدون۔ ابنِ خلدون۔ ہارون رشید۔ ڈاکٹر عبدالجبار الجومرد۔ الہارون۔ عمر ابوالنصر۔ حکایاتِ آغانی۔ کاتب اصبہانی

ہم سفر

تنویر ریاض

یہ دنیا عجیب مزاج کے لوگوں اور عجیب و غریب واقعات کا مرقع ہے۔ مشرق، مغرب، شمال، جنوب ہر سمت کی الگ داستان اور الگ اندازِ زندگی... مگر ہم اکثر مشرق کا مقابلہ مغرب سے کرتے ہیں اور واقعی ان دو سمتوں میں جتنا فاصلہ ہے اتنا ہی ان کے رکھ رکھاؤ میں نمایاں فرق بھی ہے... وہ بھی کچھ ایسے ہی ناسمجھ آنے والے مزاج کے لوگ تھے جو مغرب کی فسوں گری کے باوجود خوبصورت عورت کی ہم سفری میں اس طرح ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاتے تھے کہ ان پر مرجانے کا گمان ہونے لگتا۔

ایک کٹھن سفر..... مشکل مراحل اور حسن زہرناک کی کارفرمائیاں

میری رہائش پورٹ لینڈ میں ہے لیکن جب میں نے سنا کہ ریاست اوریگون کے دائیں کنارے پر آباد ہوئی وادی میں سونے کی تلاش میں آنے والوں کا رش بڑھتا جا رہا ہے تو مجھے بھی وہاں جانے کی سوجھی۔ اس وقت میں ایک نوعمر لڑکا تھا اور میری عمر بیس سال سے بھی کم تھی۔ میرے پاس اپنی سواری بھی نہیں تھی اور اس کے بغیر دور دراز کا سفر ممکن نہ تھا لیکن جب آدمی کا حوصلہ اور ہمت جوان ہو تو وہ کسی رکاوٹ کی پروا نہیں کرتا، چنانچہ میں نے بھی پیدل ہی سفر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے امید تھی کہ کسی نہ کسی طرح اپنی منزل تک پہنچ ہی جاؤں گا۔

میں نے والدین کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا اور کہا کہ میں روزگار کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ انہیں اس پر کوئی



PakiBooks.com

اعتراض نہیں تھا۔ والدہ نے مجھے ہوشیار رہنے کی ہدایت کی جبکہ ڈیڈی کا خیال تھا کہ مجھے جتنی جلدی ممکن ہو سکے کوئی ملازمت تلاش کر لینی چاہیے۔ میں نے ان گراں قدر مشوروں پر ان کا شکریہ ادا کیا اور ان پر عمل کرنے کا یقین دلایا۔

میں نے ٹریفک کی مخالف سمت پیدل چلنا شروع کر دیا۔ میرا ایک ہاتھ باہر نکلا ہوا تھا اور تیں انگوٹھے کے ذریعے ہر گزرنے والی گاڑی کو رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ ان علاقوں میں یہ رواج عام تھا اور لفٹ مانگنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ وہ گرمی کا موسم تھا اور دھوپ کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میرے جوتے تارکول کی سڑک سے چپک رہے تھے اور ہر بار میں جب اپنی ایڑی اٹھاتا تو ایک ہلکی سی آواز آتی۔ یوں لگتا جیسے سڑک نے میرے جوتوں کو پکڑ لیا ہے اور مجھے اگلا قدم اٹھانے کے لیے تھوڑا سا زور لگانا پڑتا۔

اس بوڑھے آدمی کی عمر اسی کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے میرا اشارہ دیکھ کر کار روک لی۔ وہ ایک پرانے ماڈل کی ہونڈا سوک چلا رہا تھا۔ میرے خیال میں وہ چالیس سال پرانا ماڈل تھا، تیز گرم ہوا چل رہی تھی اور سورج آگ برسا رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کی چبھتی ہوئی کرنیں میرے سر میں سوراخ کر دیں گی۔

وہ میرے پاس سے گزر چکا تھا پھر میں نے اس کی بریک لائٹس جلتی ہوئی دیکھیں۔ اس نے گاڑی کی رفتار آہستہ کی اور مجھ سے کچھ فاصلے پر آگے جا کر گاڑی روک لی۔ میں نے سوچا کہ بھاگ کر اس تک پہنچ جاؤں لیکن میں بہت تھک چکا تھا اور میرے لیے ایسی کوشش کرنا محال تھا۔ اس نے گاڑی پیچھے کی تو میں نے اس کے انجن کی تیز آواز سنی جیسے کوئی عقاب چلا رہا ہو۔

میں نے اپنی رفتار تھوڑی سی بڑھائی تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ میں بالکل ہی سست نہیں ہوں۔ اس نے پہلے ہی ڈکی کا لاک کھول دیا تھا۔ میں نے اس میں اپنا بیگ رکھا اور پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

''شکریہ۔'' میں نے شرماتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' اس نے مخنی سی آواز میں کہا جیسے وہ کنوئیں سے بول رہا ہو۔

میں نے اس کی طرف دیکھا اور بڑی حیرانی ہوئی کیونکہ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''پریشان مت ہو۔ میں قانونی طور پر گاڑی چلا رہا ہوں۔ انہوں نے ابھی تک میرا لائسنس واپس نہیں لیا۔''

''تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انہیں لائسنس واپس لے لینا چاہیے تھا؟''

اس نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا اور رفتار بڑھا دی۔ مجھے لگا کہ نشست کے درمیان دب گیا ہوں اور ہم گولی کی رفتار سے ٹریفک کے درمیان سے گزرنے لگے۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''بیکرسٹی!'' میں نے جواب دیا۔

''وہاں کیا ہے؟''

''سونا۔'' میں نے کہا۔

''اوہ۔'' اس نے کہا۔ ''تو تم بھی سونے کی تلاش میں ہو؟''

''کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''گھر پر بیٹھے بیٹھے تھک گیا تھا۔ دنیا دیکھنا چاہ رہا ہوں۔''

''تم اسے دنیا کہتے ہو؟''

''ہاں۔ میں کبھی اتنی دور نہیں گیا۔''

''تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔'' اس نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔ اس کے علاوہ میں سیریل کلر بھی ہوں۔ تم بہت سیدھے ہو۔ ابھی تک یہ بات نہیں سمجھ سکے۔''

میں نہیں جانتا تھا کہ میں نے یہ بات کیوں کہی۔ میری ماں ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ کبھی کسی گاڑی کو اشارہ دے کر اس میں نہیں بیٹھنا۔ کیا پتا وہ کوئی مجرم یا قاتل ہو۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی ماں کی طرف داری کریں لیکن وہ ٹھیک کہتی تھی۔ کسی بھی جگہ کوئی بھی قاتل کے روپ میں مل سکتا ہے اور میرا اندازہ ہے کہ لفٹ دینے والے بھی اس سے الگ نہیں ہیں۔

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو تو اپنا شوق پورا کر لو۔ میں اپنی زندگی جی چکا ہوں۔'' اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام جرمی ہے۔''

میں نے اس کا کمزور ہاتھ آہستہ سے تھام لیا۔ مجھے ڈر لگا کہ کہیں ٹوٹ ہی نہ جائے۔ اس کی جلد کاغذ کی طرح پتلی تھی اور اس کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔

''بلیک!'' میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''اچھا نام ہے۔''

''مجھے خوشی ہے کہ تمہیں پسند آیا۔''

''تم کوئی نشہ کرتے ہو؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔

''شرماؤ نہیں۔ میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ تمہارے پاس کوئی سگریٹ یا سگار وغیرہ ہے۔''

''مجھے افسوس ہے۔'' میں نے کہا۔

اس نے میرے چہرے کا جائزہ لیا جیسے وہ کچھ جاننا چاہ رہا ہو۔ ''تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو؟''

''اگر میرے پاس ایسی کوئی چیز ہوتی تو میں ضرور دیتا۔''

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''جانتے ہو، میں تمہارے لیے کار کیوں روکی؟''

''یہ میں کیسے جان سکتا ہوں۔'' میں نے نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

''مجھے ہمیشہ لمبے سفر پر کسی کے ساتھ جانا اچھا لگتا ہے اور اجنبی بہت اچھے ہم سفر ثابت ہوتے ہیں۔ میں نے دوستوں کے ساتھ بھی سڑک کا سفر کیا ہے لیکن اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلا اور میری کئی دوستیاں ختم ہو گئیں۔''

جرمی کوئی ڈرپوک ڈرائیور نہیں تھا اور نہ ہی اسے آہستہ گاڑی چلانے کا کوئی شوق تھا۔ اس نے اپنی کار فاسٹ ٹریک پر سر رکھی ہوئی تھی اور اپنے آگے والی گاڑی کے پیچھے چلنے میں اسے مشکل ہو رہی تھی۔ وہ تین چار سیکنڈ اس کے پیچھے رہتا اور اگر آگے والی گاڑی کی رفتار نہ بڑھتی تو لائٹ سے اشارہ کر کے انہیں راستہ دینے کے لیے کہتا۔

''مجھے ایسے لوگ بالکل اچھے نہیں لگتے جو فاسٹ لین میں چلتے ہیں لیکن گاڑی تیز نہیں چلاتے۔ کیا اس سے تمہیں الجھن نہیں ہوتی؟''

میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''میں زیادہ گاڑی نہیں چلاتا۔''

''اوہ.....'' اس نے کہا۔ ''تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جنہوں نے طویل راستوں پر گاڑی چلائی ہو۔ زیادہ سے زیادہ تمہیں ہوم بوائے کہا جا سکتا ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔

''بلیک!'' اس نے کہا۔ ''میں اپنے مسافروں سے کچھ نہیں مانگتا۔ اگر ان کا دل چاہے تو وہ میری کار کا گیس ٹینک فل کروا دیں یا کسی جگہ رک کر سادہ سا کھانا کھلا دیں لیکن ایک چیز کا ضرور مطالبہ کرتا ہوں اور وہ ہے گفتگو۔ میں نے تمہیں کار میں اسی لیے بٹھایا تاکہ تم سے باتیں کر سکوں۔ مجھے گاڑی چلاتے ہوئے موسیقی سننا پسند نہیں۔ اس لیے اگر تمہیں باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا تو ہم فوری طور پر اس تعلق کو ختم کر دیتے ہیں اور اسی وقت ختم کر دیتے ہیں۔ میں تمہیں اگلے موڑ پر اتار دوں گا اور ہم ایک دوسرے کو ہمیشہ کے لیے بھول جائیں گے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''ہاں۔'' میں نے سعادت مندی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''شاباش۔ اب بتاؤ کہ تم مشرق کی جانب کیوں جا رہے ہو؟''

''میں پہلے بھی بتا چکا ہوں..... سونے کی تلاش میں۔''

اس نے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر سے ہٹا دیے تو مجھے ڈر ہوا کہ کہیں گاڑی اس کے قابو سے باہر نہ ہو جائے اور ایک نعرہ لگایا جیسے وہ پوری دنیا کو بتانا چاہ رہا ہو۔

''یہ بھی ایک نشہ ہے۔ جب تمہارے ہاتھ میں سونے کی ڈلی آئے گی تو تم پاگل ہو جاؤ گے۔ اس کا وزن، اس کی چمک تمہاری آنکھوں کو خیرہ کر دے گی۔ یوں لگے گا کہ جنت کا ایک ٹکڑا تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ تم کھدائی کرتے ہوئے کبھی نہیں تھکو گے۔''

''کبھی تم نے سونے کی کان میں کام کیا ہے؟''

''نہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں تمہیں وہاں جانے سے نہیں روکوں گا۔''

وہ شخص مجھے غصہ دلا رہا تھا لیکن اس کی باتیں دلچسپ تھیں جیسے اسے یہ پروا ہی نہ ہو کہ دوسرا کیا سوچے گا۔ شاید یہ بھی اپنے آپ کو اچھا بنانے کا ایک طریقہ تھا۔ میں نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر سمجھا لیا کہ جو کچھ وہ چاہ رہا ہے، اسے میں پورا نہیں کر سکتا۔

''میں بیکرسٹی میں ایک آدمی کو جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ وہاں سونے کی کان میں کام کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مجھے بھی وہاں کام کرنا چاہیے۔ میں اسی لیے جا رہا ہوں۔''

''سونا کچھ بھی نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن تم یہ بات نہیں جانتے۔ تم سمجھتے ہو کہ سونا مل گیا تو تمہاری زندگی میں بھی بہتری آ جائے گی۔ ایسا نہیں ہوگا۔ کیا تم نے مائیکل گولڈ کا نام سنا ہے؟''

''اسے کون نہیں جانتا۔'' میں نے کہا۔

''اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جس چیز کو ہاتھ لگاتا، وہ سونا بن جاتی تھی۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ خوش رہتا ہوگا؟ ایسا نہیں ہوا بلکہ اس کی زندگی عذاب بن کر رہ گئی۔''

''یہ سب لوگوں کی بنائی ہوئی کہانیاں ہیں۔ ان پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔''

''بلیک!'' اس نے کہا۔ ''تمہارا دماغ بہت تیز ہے۔ میں اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

''تم صرف گاڑی چلاؤ۔''

اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولا۔ بس خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔ البتہ ایکسلریٹر پر اس کے پیر کا دباؤ کچھ اور بڑھ

Pak Books Club

گیا۔ وہ ہرکارا ورٹرک کو پیچھے چھوڑتا ہوا چلا جارہا تھا۔

کچھ دور جانے کے بعد ہم سرسبز علاقے میں داخل ہوگئے جہاں سڑک کے دونوں طرف کھیت تھے اور سامنے کی طرف کچھ پہاڑیاں جھکی ہوئی تھیں۔ یہ دیکھ کر تھوڑی سی پریشانی ہوئی کہ وہ پہاڑیاں بالکل ہمارے سامنے آگئی تھیں۔ کیا ہمیں اس پہاڑی راستے پر گاڑی چلانا ہوگی؟

جرمی نے پہاڑیوں کے دامن میں پہنچنے سے پہلے ہی کار کی رفتار آہستہ کرلی۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''تھک گیا ہوں۔ میں سونا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اب تم گاڑی چلاؤ گے۔''

''میں اچھا ڈرائیور نہیں ہوں۔''

کار کی رفتار بتدریج آہستہ ہورہی تھی۔ ہم ایک ریسٹ ایریا میں داخل ہوئے اور اس نے گاڑی وہاں کھڑی کردی۔

''اچھا ڈرائیور ہونا ضروری نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''تم کسی کار ریس میں حصہ نہیں لے رہے۔ بس تمہیں گاڑی کو سیدھا رکھنا ہے۔ مجھے حاجت محسوس ہورہی ہے۔ ابھی فارغ ہوکر آتا ہوں۔''

اس نے گاڑی کی چابیاں میری طرف اچھالیں اور کار سے اتر گیا۔ میں بھی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر آیا اور پارکنگ لاٹ میں کھڑا ہوگیا۔ تارکول کی سڑک اب بھی گرم تھی۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ کیوں نہ کار سمیت بھاگ جاؤں لیکن فوراً ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ یہ پاگل پن تھا لیکن میرے پاس کبھی کوئی کار نہیں تھی اور اس کار کو چلا کر مجھے صحیح معنوں میں خوشی مل سکتی تھی۔ نہ جانے کہاں سے یہ خیالات میرے دماغ میں آرہے تھے۔

میں نے اپنے ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل پر رکھ دیے اور انگلیوں سے طبلہ بجانا شروع کردیا۔ پھر میں نے اگنیشن میں چابی لگائی اور اسے ایک چوتھائی گھمایا۔ اس کے بعد ریڈیو آن کرکے سوئی کو مختلف اسٹیشنوں پر گھمانے لگا۔ جرمی نے ٹھیک ہی کہا تھا، ہر جگہ سے موسیقی یا سیاست پر تبصرے آرہے تھے۔ میں نے ریڈیو بند کردیا اور اس عورت کو دیکھنے لگا جو ونڈ شیلڈ پر صابن کا اسپرے کررہی تھی پھر ایک کپڑے سے اس کا شیشہ صاف کرنے لگی۔

''ہائے۔'' میں نے کہا۔

''ہائے۔'' اس نے شوخ لہجے میں کہا۔ ''تمہارا سفر کیسا گزر رہا ہے؟''

''تم یہ کیا کررہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہاری ونڈ شیلڈ پر مردہ کیڑے نظر آئے۔ اسے صاف کررہی تھی۔ اس طرح تمہارا سفر بہتر اور محفوظ ہوجائے گا۔ مجھے یہ کام کرکے خوشی ہوتی ہے اور اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیکن اگر تم اپنی مرضی سے کچھ دینا چاہو تو میں شکریہ کے ساتھ اسے قبول کرلوں گی۔''

''یہ میری کار نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

اس نے مجھے کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم نہیں جانتے کہ کار چوری کرنا جرم ہے؟''

''میں نے یہ کار نہیں چرائی۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔ ''یہ کار چاہے کسی کی بھی ہو لیکن اسے تم ہی چلا رہے ہو۔ اس لیے تمہیں صاف نظر آئے گا۔''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تم نہیں سمجھ سکو گی۔''

''یہ کیا ہورہا ہے؟'' جرمی نے کار کے عقب سے آتے ہوئے کہا۔ ''یہ کون ہے؟''

''ڈیزی۔'' میرے بجائے اس عورت نے جواب دیا۔ ''تم سے مل کر خوشی ہوئی۔''

''تم میری کار خراب کررہی ہو۔'' جرمی نے کہا۔

''اس جیسی تاریخی کار خوش نصیبوں کے پاس ہی ہوتی ہے۔'' وہ بولی۔ ''میں صرف اس کی خوب صورتی بڑھا رہی تھی۔''

میں نے دیکھا کہ جرمی کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ ڈیزی لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے کا فن جانتی تھی۔

''اور مجھے اس کی کیا قیمت ادا کرنا ہوگی؟'' جرمی نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

ڈیزی نے اپنا ہاتھ سینے پر رکھا اور بولی۔ ''میں اس خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں لیتی۔''

''اوہ!'' جرمی بولا۔ ''یہ تمہارے اندر کی خوب صورتی ہے۔'' پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''تم تیار ہو؟''

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا تو وہ پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا اور میں انجن اسٹارٹ کرنے لگا۔

''بات سنو۔'' ڈیزی بولی۔ ''ایک چھوٹی سی مہربانی کرسکتے ہو؟''

''تم نے تو کہا تھا کہ معاوضہ نہیں لوگی۔'' میں نے کہا۔

''چھوٹا سا عطیہ دینا بھی ایک رواج ہے۔'' وہ بولی۔

''اس طرح حساب برابر ہوجاتا ہے۔''

''ہم رواجوں پر یقین نہیں رکھتے۔'' میں نے کہا۔

''ہم آزاد خیال لوگ ہیں اور اپنے اصول خود بناتے ہیں۔''

جرمی نے قہقہہ لگایا اور میرے کندھے کو ہلکا سا ٹھوکا

دیا۔ میں ڈیزی کو دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ جانتا تھا کہ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا لیکن مجھے اس کی پروا نہیں تھی اس لیے میں نے وہی کہا جو میرے اندر کی آواز تھی۔ البتہ ڈیزی کو میری یہ صاف گوئی پسند نہیں آئی۔ اس نے کار کو لات ماری اور فٹ پاتھ کی طرف چل دی۔ کسی دوسرے بے وقوف کی تلاش میں جو اسے کچھ پیسے دے سکے۔

میں گاڑی چلاتا ہوا اس کے پاس سے گزرا اور بولا۔ ''تمہیں اپنی مہارت بڑھانے کے لیے مزید مشق کی ضرورت ہے۔''

اس نے مجھے انگوٹھا دکھا دیا۔ ''مجھے یہ عورت اچھی لگی۔'' جرمی بولا۔ ''اس سے پوچھو کہ کیا وہ مونٹانا جانا چاہتی ہے؟''

''کیوں؟'' میں نے کہا۔

''تم پوچھ کر تو دیکھو۔''

میں نے کار اس کے پاس جاکر روک دی۔ وہ بھی اب کار میری طرف دیکھنے لگی۔ ''میرا دوست پوچھ رہا ہے کہ کیا تم مونٹانا جانا چاہو گی۔''

اس نے سر نیچے کیا اور میرے برابر میں بیٹھے ہوئے جرمی کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ جرمی نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں دیکھ کر مجھے اپنی پوتی یاد آگئی۔''

ڈیزی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم لوگوں کو ایک اور مسافر چاہیے؟''

جرمی نے کہا۔ ''ہاں۔''

وہ سیدھی کھڑی ہوگئی اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہاں مجھے کچھ نہیں مل رہا۔ اس جگہ صرف کنجوس اور مفت خورے ہی رہتے ہیں۔ اس ریسٹ ایریا میں دو دن سے ہوں لیکن بہ مشکل بیس ڈالر کما پائی۔''

''مونٹانا میں تمہیں کئی امیر لوگ مل جائیں گے۔'' جرمی نے کہا۔

''چلو دیکھتی ہوں۔'' وہ بولی اور کار کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور بیٹھ گئی۔

''تمہارے پاس کوئی سامان نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تم مذاق کررہے ہو۔'' وہ بولی۔ ''میرے پاس صرف یہ اسپرے بوتل ہے۔''

''اس میں کیا ہے؟'' جرمی نے پوچھا۔

''پانی اور تھوڑا سا صابن جو میں نے باتھ روم سے لیا تھا۔'' جرمی قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ بوتل بھی چوری کی ہوگی۔''

اس نے بھی جواب میں قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''ہاں، یہ

مکمل آرام

ایک خاتون نے چیک اپ کے بعد ڈاکٹر سے پوچھا۔

''میرے شوہر کو کیا تکلیف ہے؟''

ڈاکٹر۔ ''انہیں صرف مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ یہ نیند کی گولیاں لے جایئے۔''

''یہ گولیاں انہیں کس وقت دینی ہیں؟'' بیوی نے پوچھا۔

''خاتون! یہ گولیاں ان کے لیے نہیں، آپ کے لیے ہیں۔''

آنسو

کیمسٹری کے پروفیسر اپنی بیوی سے ناراض ہوگئے تو بیوی نے رونا شروع کردیا۔

پروفیسر صاحب بولے۔ ''مجھ پر تمہارے رونے کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ تمہیں پتا ہے، دراصل یہ آنسو ہیں کیا؟ تمہیں نہیں پتا ہوگا۔ چلو میں بتا دیتا ہوں۔ یہ تھوڑا سا فاسفورس، سالٹ، ذرا سا سوڈیم کلورائیڈ اور باقی پانی ہیں۔''

بیچارہ

ایک دوست کافی عرصے بعد اپنے دوست سے ملا اور بولا۔ ''ارے بھائی! تمہارا وہ طوطا کہاں گیا جو ہر وقت باتیں کرتا رہتا تھا؟''

اس کے دوست نے جواب دیا۔ ''بھئی کیا بتاؤں، میں نے شادی کرلی اور وہ بیچارہ شکستہ دل ہوکر اڑ گیا۔''

''وہ کیوں بھئی.....؟'' دوست نے حیرانی سے پوچھا۔

''دراصل وہ بیچارہ میری بیگم سے باتیں کرنے کا مقابلہ نہ کرسکا۔''

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

PakSociety.com

میں نے ایک صفائی کرنے والے لڑکے سے چرائی تھی۔''
پھر کندھے.... اچکاتے ہوئے بولی۔''مجھے ایسی چیزوں کی قیمت ادا کرنا پسند نہیں۔''

''کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔'' جرمی نے کہا۔''بلنگر میں میرے پوتے رہتے ہیں۔ میں سال میں دو مرتبہ ان سے ملنے جاتا ہوں۔ ان کا بھی یہی حال ہے۔ انہیں جس چیز کی ضرورت ہو، وہ چوری کر لیتے ہیں۔ شاید تم ان سے ملنا چاہو۔''

''شاید۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم ریسٹ اسٹاپ تک کیسے آئی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''گاڑی چلا کر۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمہیں اپنی کار نہیں چاہیے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ خراب ہو گئی تھی۔'' اس نے کہا۔''اور وہ میری کار نہیں تھی۔''

جرمی نے اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔''مجھے تم پر نظر رکھنا ہو گی۔ کہیں تم میری کار پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش نہ کرو۔''

''ممکن ہے۔'' وہ ڈھٹائی سے بولی۔

''یہ میرے سفر کا ساتھی بلیک ہے۔'' جرمی بولا۔''یہ بھی پیسے کمانے کے لیے سونے کی کان پر جا رہا ہے۔''

''میں کئی لوگوں کو جانتی ہوں جو یہ کام کر چکے ہیں۔'' ڈیزی بولی۔''یہ بہت محنت طلب کام ہے۔''

''میں کام سے نہیں گھبراتا۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں گھبرانا چاہیے۔'' ڈیزی بولی۔''بہت سے لوگ کام کرتے کرتے مر جاتے ہیں اور ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ یہ کام ہی اس دنیا میں سب سے بڑا قاتل ہے۔''

''اسے غور سے سنو۔'' جرمی نے کہا۔''یہ عقل کی بات کر رہی ہے۔''

''میں اتنی عقل مند نہیں ہوں۔'' ڈیزی نے کہا۔

''اس کی بات دھیان سے سنو۔'' میں نے ڈیزی سے کہا۔''اگر ہم دونوں کی عمر ملا کر دگنی کر دی جائے تب بھی اس کی عمر زیادہ ہو گی۔ یہ ڈائناسور سے بھی بڑا ہے۔''

''اے.....'' جرمی بولا۔''میری بے عزتی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''میرا خیال تھا کہ تم آزاد خیال ہو اور ایسی باتوں کا برا نہیں مناتے۔''

''میں ایسی ہی ہوں۔'' ڈیزی نے کہا۔''گھر پر میرا باپ ہم سب کو مارتا تھا۔ میری ماں، بھائی اور میں، ہم سب اس کے ظلم کا نشانہ بنتے تھے۔ اس کا ثبوت میرے جسم پر لگنے والے زخم ہیں لیکن میں تمہیں نہیں دکھاؤں گی۔ بالآخر مجھے گھر سے بھاگنا پڑا۔ میں نے کچھ وقت پورٹ لینڈ کی سڑکوں پر گزارا پھر بوائس چلی گئی لیکن لوگ فٹ پاتھ پر رہنے والوں کو پسند نہیں کرتے اس لیے یہاں چلی آئی۔ چھوٹے قصبوں میں رہنا نسبتاً آسان ہے۔ یہاں کے لوگ پھر بھی بہتر ہوتے ہیں۔''

''لیکن تم تو ریسٹ اسٹاپ پر تھیں؟''

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔''میں نے سنا تھا کہ گاڑیوں کے شیشے صاف کر کے کچھ آمدنی ہو سکتی ہے۔''

''یہ بھی ایک مشکل زندگی ہے۔'' میں نے کہا۔

''سب لوگوں کی زندگی مشکل ہوتی ہے اور میں ان سے مختلف نہیں ہوں۔''

''سب لوگوں کو ان کے باپ سے مار نہیں پڑتی۔''

''کوئی اور بات کرتے ہیں۔'' ڈیزی نے موضوع بدلنے کی خاطر کہا۔''تم کسی سے محبت کرتے ہو؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے دھکا دیا۔ اسٹیئرنگ وہیل تھوڑا سا ایک جانب گھوم گیا اور کار سڑک پر لہرانے لگی۔ جرمی نے یہ تماشا دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔

''تم مجھے بتاؤ کہ تمہارا باپ کہاں رہتا ہے؟'' جرمی نے سنبھلتے ہوئے کہا۔''میں ابھی اس کے پاس جاؤں گا اور مار مار کر اس کا بھرکس نکال دوں گا۔''

میں اور ڈیزی یہ سن کر ہنسنے لگے۔ وہ شخص ایک کاکروچ نہیں مار سکتا تھا اور ایک ہٹے کٹے شخص کو مارنے کا دعویٰ کر رہا تھا۔

''میں تمہارے جذبے کی تعریف کرتی ہوں۔'' ڈیزی نے کہا۔''لیکن اب اس کی ضرورت نہیں، اسے مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

ہمارے دائیں بائیں گھنے درختوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ ہم پہاڑی علاقے میں داخل ہو چکے تھے۔ کئی جگہ درختوں کی شاخیں سڑکوں پر جھک آئی تھیں۔ جرمی نے اپنا سر کھڑکی پر رکھ دیا اور باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ ڈیزی کھسک کر میرے بالکل پیچھے آ گئی تاکہ مجھ سے قریب ہو جائے اور ہم دھیمی آواز میں باتیں کر سکیں۔

''کیا تم واقعی سونا نکالنے جا رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''یقیناً۔'' میں نے کہا۔''لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''میں نے سنا ہے کہ 1880ء سے اس جگہ پر سونا نکالا جا رہا ہے اور اب وہاں کچھ نہیں بچا۔''



PAKBooks.site

"ایسی بات نہیں ہے۔ میرے دوست کو سونامل گیا ہے۔"

"کیا وہ امیر ہو گیا؟"

"نہیں۔"

"دیکھو، میں کیا کہہ رہی تھی؟"

"بہرحال وہ گاڑیوں کے شیشے صاف کرنے سے زیادہ پیسے کمار ہا ہے۔"

اس نے اپنا ایک ہاتھ سینے پر رکھا جیسے اسے گولی لگ گئی ہو اور بولی۔ "تم نے مجھے مار ڈالا۔"

"میں نے تو یونہی ایک بات کہی تھی۔"

"سنو۔" وہ میری طرف جھکتے ہوئے بولی۔ "اس بوڑھے کی کیا کہانی ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔ "صرف اتنا معلوم ہے کہ یہ کسی کو اپنے ساتھ بٹھا کر سفر کرنا چاہتا ہے۔ اس نے مجھے ڈالس سے لفٹ دی تھی۔"

"دیکھنے میں تو اچھا آدمی لگتا ہے۔"

میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "ہاں، مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔"

"وہ بھی مر چکا ہے۔"

مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور کار تھوڑی سی اچھلی۔ ڈیزی مسکراتے ہوئے ایک طرف ہو گئی۔ میں نے جرمی کی طرف دیکھا۔ اس جھٹکے کے باوجود اس کی آنکھ نہیں کھلی تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا، وہ بالکل بے حس و حرکت نظر آ رہا تھا۔

"لعنت ہو۔" میں نے کہا۔ "تم نے مجھے ڈرا دیا۔"

"نہیں۔" وہ بولی۔ "کیا تم نے محسوس نہیں کیا؟"

"کیا؟"

"یہ جا چکا ہے۔ کیا تم نے کار میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں کی؟"

میں نے کار کی رفتار کم کی اور ایک طرف لے جا کر سڑک کے کنارے کھڑی کر دی۔ چڑھائی ہونے کی وجہ سے میں نے ہینڈ بریک لگا دیا تا کہ گاڑی اپنی جگہ پر قائم رہے۔ میں نے اپنے ہونٹ ترکیے اور جرمی کا معائنہ کرنے لگا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور سانس لینے کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ اس کا سر عجیب انداز میں ایک طرف کو ڈھلکا ہوا تھا۔

میں نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر اسے ہلایا۔ "جرمی! آنکھیں کھولو۔"

ڈیزی نے قہقہہ لگایا جیسے میں کوئی کامیڈی سین کر رہا ہوں۔

"چپ ہو جاؤ۔" میں نے اسے ڈانٹا۔

"کیوں؟" اس نے پوچھا۔ "میرے پاس اس کیوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ البتہ میں کار میں..... خاموشی چاہتا تھا۔ اس وقت یہی مناسب تھا۔ جیسے ہم کسی کی موت پر احتراماً خاموشی اختیار کر لیتے ہیں اور کوئی لفظ یا آواز اچھی نہیں لگتی۔

میں نے نبض دیکھنے کے لیے اپنا ہاتھ اس کی گردن پر رکھا۔ مجھے نبض دیکھنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ نبض کیسے دیکھی جاتی ہے۔ ابھی اس کا جسم سرد نہیں ہوا تھا اور نہ ہی پوری طرح گرم تھا۔ لگتا تھا کہ اس وقت وہ بیچ کی حالت میں تھا۔

میں نے اسے زیادہ سختی سے جھنجوڑا، اس کے باوجود اس نے آنکھ نہیں کھولی۔ "اب تو اطمینان ہو گیا؟" ڈیزی نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ ہم سے کچھ غلط ہو گیا ہے۔ اگر ہم جرمی کی کار میں نہ بیٹھتے تو اس کی موت واقع نہ ہوتی۔ اگر وہ گاڑی چلا رہا ہوتا تو اس کا دماغ حاضر رہتا اور وہ اپنے آپ کو یقین دلاتا کہ اسے اپنے بچوں اور ان کی فیملی کو دیکھنے کے لیے زندہ رہنا ہے۔

"ہمیں پولیس کو فون کرنا چاہیے۔" ڈیزی نے کہا۔

"تمہارے پاس فون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کیا تمہارے خیال میں میرے پاس فون ہو سکتا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میرے پاس بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"گلووکمپارٹمنٹ میں دیکھو۔"

میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں گاڑی کی مینویل بک، دو عدد پاس، دو پین، ایک پنسل اور اس کا انشورنس کارڈ رکھا ہوا تھا لیکن فون کہیں نظر نہیں آیا۔

"اب کیا کریں؟" میں نے پوچھا۔

ڈیزی کار سے باہر آتے ہوئے بولی۔ "میرا سفر یہاں ختم ہو گیا۔"

"صبر کرو۔" میں نے کہا۔ "تم اس طرح نہیں جا سکتیں۔"

"یقیناً جا سکتی ہوں۔" اس نے کہا۔ "قیمتی وقت دینے کا شکریہ۔ میں نے اس سے پہلے بھی مردہ آدمی کے ساتھ سفر نہیں کیا۔"

وہ مڑی اور اس نے سڑک کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ وہ آہستہ آہستہ کار سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ دور سے ایک ٹرک آتا دکھائی دیا۔ اس نے انگوٹھا اوپر اٹھا کر لفٹ مانگی لیکن وہ نہیں رکا۔

"تمہیں کچھ معلوم ہے۔" میں نے اس کے پیچھے جاتے ہوئے کہا۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔" اس نے جواب دیا۔

میں واپس کار میں آیا اور اسے اسٹارٹ کرنے لگا۔ میری نظر فیول گیج پر گئی جو کافی نیچے آ چکا تھا، مجھے جلد ہی اس میں فیول ڈلوانا ہوگا اور مجھے نہیں لگتا تھا کہ ہائی وے کے اس حصے میں زیادہ سروس اسٹیشن ہوں گے۔

وہاں سے کچھ اور گاڑیاں گزریں۔ ڈیزی انہیں رکنے کا اشارہ کرتی رہی لیکن اس کے چہرے پر کوئی پریشانی نہیں تھی۔ جیسے وہ اس کی عادی ہو۔ میں گاڑی چلا کر اس کے پاس گیا اور بولا۔

"اس کا خیال رکھنے میں میری مدد کرو۔ میں نہیں جانتا کہ اس جگہ پر کیا کروں۔"

"اور جیسے میں جانتی ہوں۔" اس نے طنزاً کہا۔

"ہمیں اس کے گھر والوں کو بتا دینا چاہیے۔"

"وہ کہاں ہیں؟"

"میں نہیں جانتا۔ شاید مونٹانا میں ہوں۔"

"مونٹانا ایک بڑی ریاست ہے۔ کسی خاص جگہ کا پتا ہے؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔"

اس نے گہری سانس لی لیکن اپنی رفتار میں کوئی کمی نہیں کی اور نہ ہی کوئی ایسا اشارہ دیا کہ وہ میری مدد کرنے کے بارے میں اپنا ذہن تبدیل کر رہی ہے۔ میں بھی اس کی رفتار کا ساتھ دیتے ہوئے کار چلاتا رہا۔ کچھ اور کاریں وہاں سے گزریں بالآخر ایک سرخ رنگ کا پک اپ ٹرک ہمارے آگے آ کر رک گیا۔ اس کی عقبی بتیاں روشن تھیں اور وہ پیچھے ہی آ رہا تھا۔

ڈیزی ٹرک تک پہنچنے کے لیے تیزی سے آگے بڑھی۔ میں نے بھی کار کی رفتار بڑھا دی۔ ٹرک کو ایک جھٹکا لگا۔ ڈرائیور کی کار شیشے سے جائزہ لیا۔ میرے منہ سے بے اختیار گالی نکلا اور یہ بھول گیا کہ جرمی میرے الفاظ نہیں سن سکتا پھر بھی اس نے عقبی کا شیشہ کھول کر سر باہر نکالا اور کم از کم پانچ مرتبہ چیخا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے علاوہ کیا کہنا چاہیے۔

ٹرک ہم سے دس گز کے فاصلے پر رک گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ سے ایک عورت اتری اور اس نے ہماری سمت میں چلنا شروع کر دیا۔ اس کی شکل سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی کو گولی مارنے کے لیے تیار ہے۔ مجھے اس کے پاس کوئی ہتھیار نظر نہیں آیا لیکن میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ ہر صورتِ حال سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

"یہ لڑکا تمہیں پریشان کر رہا ہے؟" اس نے ڈیزی سے پوچھا۔

ڈیزی نے رک کر میری طرف دیکھا۔ اس کا منہ پوری طرح کھل گیا اور وہ میری طرف جھکتے ہوئے بولی۔ "اگر میں چاہوں تو تمہیں پھنسا سکتی ہوں۔"

"لیکن تم ایسا نہیں چاہو گی۔"

وہ مسکرائی اور اس نے دوسری جانب منہ پھیر لیا۔ ٹرک ڈرائیور اب قریب آ گئی تھی اور میں اسے بہتر طور پر دیکھ سکتا تھا۔ اس کی عمر پچپن کے لگ بھگ ہو گی۔ اس نے جیکٹ، جینز اور کاؤبوائے شوز پہن رکھے تھے۔

"سب ٹھیک ہے میم۔" ڈیزی نے کہا۔ "یہ میرا دوست ہے۔"

اس عورت نے پہلے مجھے پھر ڈیزی کو دیکھا اور کار میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "تم دوست تو نہیں لگتے۔"

"ہم نئے دوست ہیں۔" ڈیزی نے کہا۔ "ابھی ملاقات ہوئی ہے۔"

وہ عورت سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں غیر ضروری طور پر مداخلت نہیں کرتی لیکن مجھے یہ بھی پسند نہیں کہ کسی عورت کے ساتھ زیادتی کی جائے۔ تمہارے ساتھ بدسلوکی ہوئی ہے۔ تم اس شخص سے خوفزدہ ہو کر بھاگ رہی تھیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" ڈیزی نے کہا۔

اس عورت نے کار کے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ "یہ کون ہے؟" اس کا اشارہ جرمی کی جانب تھا۔

"ایک دوست۔" میں فوراً ہی بول پڑا۔

"تم دونوں بڑے دوست نواز ہو۔"

"اب ہم جدا ہو رہے ہیں۔" ڈیزی بولی۔ "یہ سونے کی کان میں کام کرنے جا رہا ہے اور میں واپس مشرق کا رخ کروں گی۔"

"تم میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔" اس عورت نے کہا۔

ڈیزی نے تائید میں سر ہلایا لیکن اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔

"تم ٹرک پر بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔" اس عورت نے ڈیزی سے کہا۔

مجھے یوں لگا جیسے ڈیزی اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتی۔ اس نے میری طرف دیکھا جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہو لیکن بظاہر وہ اس عورت سے خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔

میرا بھی یہی حال تھا۔ مجھے وہ عورت سن گن لینے والی

PakiBooks.com

لگ رہی تھی اس میں یہ صلاحیت بھی تھی اور وہ جرمی کے بارے میں بہت جلدی اندازہ لگا لیتی۔

ڈیزی نے کندھے اچکائے اور ٹرک کی طرف چل دی۔ میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ میں اس وقت کو کوسنے لگا جب اس بوڑھے کی کار میں بیٹھا تھا۔

''لگتا ہے یہ شخص گہری نیند میں ہے۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس نے سر ہلایا اور پسنجر سیٹ کی طرف چل دی۔ میں بھی اس کے پیچھے چل دیا۔ جرمی دروازے سے سر لگائے ہوئے تھا۔ اگر وہ عورت دروازہ کھولتی تو وہ باہر گر سکتا تھا۔

اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو مجھے پسینے آنے لگے۔ گھٹنوں میں جان نہ رہی اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔

میری کوشش تھی کہ کسی طرح اس عورت کی توجہ ہٹا سکوں لیکن ایسی کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ تھوڑا سا جھک کر کھڑکی میں جھانکنے لگی۔ جرمی سے اس کا فاصلہ صرف چند انچ رہ گیا تھا۔ وہ دیکھ سکتی تھی کہ جرمی سانس نہیں لے رہا پھر اچانک ہی کسی نے پیچھے سے آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ڈیزی تھی۔

''خاتون۔'' اس نے کہا۔ ''میں تمہارے ٹرک میں نہیں بیٹھ سکتی۔''

''کیوں؟'' اس عورت نے پوچھا۔

''اس کا دروازہ بند ہے۔''

وہ عورت پریشان ہوتے ہوئے بولی۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا۔''

''میں بتا رہی ہوں۔''

اس عورت نے ایک گہری سانس لی اور ٹرک کی طرف بڑھ گئی۔ میں جلدی سے گھوم کر آیا اور کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے اگنیشن کی پر ہاتھ مارا لیکن وہ وہاں نہیں تھی جبکہ میں اسے اگنیشن میں لگا ہوا چھوڑ کر گیا تھا۔

میں نے ونڈ شیلڈ سے جھانک کر دیکھا۔ وہ عورت اور ڈیزی ٹرک کے پسنجر ڈور کے پاس کھڑی ہوئی تھیں۔ اس عورت نے دروازہ کھولا اور ڈیزی اسے معذرت خواہانہ انداز میں دیکھنے لگی کہ اس سے دروازہ نہیں کھلا۔ اس عورت نے ایک بار پھر مجھے دیکھا جیسے وہ کار کی طرف واپس آنا چاہ رہی ہو لیکن وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

میں نے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر چابی تلاش کرنے کی کوشش کی پھر میں فرش پر جھک کر دیکھنے لگا۔ اسے وہیں کہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے سیٹ کے نیچے بھی ہاتھ ڈال کر دیکھا لیکن چابی وہاں بھی نہیں تھی۔ میری پریشانی بڑھنے لگی۔ اگر کوئی پولیس والا ایک مردہ شخص کے ساتھ مجھے اس کی کار میں دیکھ لیتا تو میرے لیے جواب دینا مشکل ہو جاتا۔

پھر میں نے کسی کے قدموں کی آہٹ سنی۔ وہ ڈیزی تھی۔ اس نے میرے پاس آ کر کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ تمہیں اس طرح چھوڑ کر چلی گئی۔''

''نہیں۔ تمہیں معذرت کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''اتنے سنگ دل نہ بنو۔'' اس نے کہا اور گاڑی کی چابیاں میری طرف اچھال دیں۔

میں نے چابی اگنیشن میں لگائی تو وہ بولی۔ ''ابھی نہیں۔''

یہ کہہ کر اس نے جرمی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹوا نکالا اور اس میں سے ساری رقم نکال لی۔ وہ دیکھنے میں دو سو ڈالرز لگ رہے تھے۔

''تم ایسا نہیں کر سکتیں۔'' میں نے کہا۔

''میں ایسا کر چکی ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ رقم اس کے کسی کام کی نہیں رہی۔ تم چاہو تو اس میں سے آدھے پیسے لے سکتے ہو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ ''جیسا تم مناسب سمجھو۔'' اس نے کہا پھر جرمی کی گھڑی بھی اتار لی۔ وہ کافی قیمتی لگ رہی تھی۔ اس نے وہ گھڑی مجھے دیتے ہوئے کہا۔

''تمہارے کام آئے گی۔ کان سے سونا نکالنا کوئی مذاق نہیں۔'' اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور پچھلی سیٹ سے اپنا چھوٹا سا بیگ کندھے پر ڈال کر ٹرک کی طرف چل دی۔

جیسے ہی وہ ٹرک میں بیٹھی، اس کا انجن جاگ اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

جرمی میری طرف جھک آیا تھا۔ میں نے اسے پیچھے کی طرف دھکیلا۔ میں ابھی تک نہیں سمجھ پایا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں اسے کہاں لے کر جاؤں یا اسے کار سمیت چھوڑ کر خود یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔ جلد ہی کوئی نہ کوئی اسے دیکھ لے گا پھر یہ مسئلہ بن جائے گا۔

میں نے اپنا سر اسٹیئرنگ وہیل پر رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ مجھے گھر نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ میں نے جرمی کی گھڑی کو انگلی سے چھوا۔ وہ ابھی تک گرم تھی۔ میرے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں اور میں ایک بار پھر یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ میرے برابر میں پسنجر سیٹ پر ایک مردہ شخص بیٹھا ہوا ہے۔

میں نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر دیکھا۔ سڑک پر

گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ مجھے بھی اپنا سفر جاری رکھنا [illegible] لیے رک جائے اور اس کے سامنے ایک [illegible]

میں نے چابی اگنیشن میں لگا کر گھمائی لیکن کچھ نہیں [illegible] ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے دو تین مرتبہ کیس [illegible] چپ لیا۔ اس کے بعد بار بار چابی گھمائی لیکن کچھ [illegible] البتہ دو مرتبہ کلک کی آواز ضرور سنائی دی۔ شاید [illegible] کام نہیں کر رہا تھا۔

''تمہیں انجن اسٹارٹ کرتے وقت اسٹیئرنگ کو [illegible] جانب گھمانا چاہیے۔'' جرمی نے کہا۔

میں یہ آواز سن کر اچھل پڑا اور میرا سر گاڑی کی چھت سے ٹکرایا۔ شاید میری چیخ بھی نکل گئی تھی۔ ''کیا؟'' میں نے [illegible] ''تمہیں کیا ہو گیا تھا؟''

اس نے پلکیں جھپکائیں اور بولا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

میں اسے بتانا چاہ رہا تھا کہ وہ مر گیا تھا لیکن میں نے [illegible] سمجھا۔

اس نے چابی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ [illegible] بہت تنگ کرتی ہے۔ اس لیے چابی کے ساتھ [illegible] گھمانا پڑتا ہے۔ اس طرح کوشش کرو۔''

میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا تو انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ ''تم نے دیکھا۔'' اس نے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ پرانی گاڑیوں میں ایسا ہو جاتا ہے۔ تم نے کچھ غلط نہیں کیا۔''

میں نے تائید میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ''اب ہمیں چلنا چاہیے۔ وہ لڑکی کہاں چلی گئی؟ اس کے ساتھ سفر کرنے میں [illegible] آ رہا تھا۔''

''اسے ایک اور سواری مل گئی تھی۔'' میں نے کہا۔

''برا ہوا۔'' اس نے مایوس ہوتے ہوئے کہا۔

میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ وہ اس کی رقم بھی لے گئی ہے۔ میں نے ٹریفک دیکھا اور کار کی رفتار ساٹھ میل فی گھنٹا [illegible]

''تم بہت گہری نیند سوتے ہو؟''

''ہاں۔ میرا ہمیشہ سے یہی حال ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میری بیوی کہا کرتی تھی کہ میں کسی بھی جگہ اور کسی بھی وقت [illegible] ہوں۔ دو تین مرتبہ وہ سمجھی کہ میں مر گیا ہوں۔''

''اوہ۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا۔'' میں نے کہا۔

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم بھی یہ سمجھ رہے تھے کہ میں مر گیا ہوں؟''

میں تھوڑا سا جھجکا تو وہ میرا مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔ ''تم واقعی یہی سمجھ رہے تھے لیکن بے فکر رہو۔ میں اتنی جلدی مرنے والا نہیں۔''

مجھے یہ بات سن کر بالکل بھی حیرانی نہیں ہوئی۔

''بات دراصل یہ ہے.....'' اس نے کہا۔ ''میں کئی سالوں سے دیکھ رہا ہوں کہ جب کوئی خوب صورت عورت میرے آس پاس ہو تو مجھے بہت گہری نیند آ جاتی ہے۔ مجھے اس کی وجہ معلوم نہیں۔ شاید ان کی موجودگی میں سکون ملتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔'' میں نے کہا۔

''کیا وہ میری رقم بھی لے گئی؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''تم نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی؟''

''میں نے اسے منع کیا تھا لیکن زبردستی نہیں کر سکتا تھا۔''

''جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تو سمجھ گیا تھا کہ تم ایک نکمے شخص ہو۔''

میں نے اپنی جیب سے اس کی گھڑی نکالی اور اس کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تمہاری گھڑی بچا لی۔''

''اسے اپنے پاس رکھو۔'' وہ بولا۔ ''مجھے اس کی برسوں سے ضرورت نہیں ہے۔ میں اسے صرف لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے ہاتھ پر باندھ لیتا ہوں۔ کیا تم متاثر نہیں ہوئے؟''

''تھوڑا سا۔'' میں نے کہا۔

اس نے دوبارہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''بہت خوب۔ اب تم اسے دوسروں کو متاثر کرنے کے لیے استعمال کر سکتے ہو۔ یہ تمہیں ہمیشہ میری یاد دلاتی رہے گی۔ تم میری بات سن رہے ہو؟''

''ہاں سن رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے تو پھر تم مجھے میرے پوتے اور پوتیوں کے پاس لے چلو۔ وہ ہر گزرتے منٹ کے ساتھ بڑے ہو رہے ہیں اور میں ان میں سے کسی ایک کو بھی کھونا نہیں چاہتا۔''

میں نے کار کی رفتار بڑھا دی اور بھول گیا کہ میں کہاں جانے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ میں اسے جلد از جلد اس کی منزل تک پہنچانا چاہ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ گہری نیند سو جائے اور میں کسی مصیبت میں پھنس جاؤں لیکن اس کا امکان کم تھا کیونکہ اب کوئی خوب صورت عورت اس کی ہم سفر نہیں تھی۔





گیارھواں حصہ

رنگ آسماں

اے۔ آر۔ راجپوت

ماضی کی تنگ و تاریک مگر خوابناک راہداریوں سے جنم لینے والے ایسے کردار... جنہیں واقعات و شواہد نے خود ترتیب دے کر ان کی زندگی کی بے قراریوں کو ایک ایسے مقصد میں ڈھال دیا جس کا ادھورا پن بے شمار ہلاکتوں کا سبب بن جاتا... لہٰذا اس کی تکمیل کے لیے وہ باغی فطرت انسان میدان جنگ میں یوں اترا کہ دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کردینے والے گداز احساسات کو بھی بھول گیا لیکن... عشق تو پھر عشق ہوتا ہے... کوئی کتنا ہی بھولنا چاہے، عشق اپنا مسکن کبھی نہیں بھولتا۔ جس دل میں بس جائے اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا ہے... اور پھر ایک دن اچانک اس کے من کا موسم بھی بدل گیا کیونکہ... وہ فرنگی حسینہ دلی کے اس نوجوان کو دل دے بیٹھی تھی، جس کا ہر قدم آزمائش اور ہر نظر کسی امتحان سے کم نہ تھی، اس کے باوجود... خاک و خون کے اس کھیل میں نہ تو اس نے خوابوں کو بکھرنے دیا اور نہ ہی جذبوں کو بے لگام ہونے دیا۔ کیونکہ وہ آسمان پر بکھرے رنگوں کا مطلب جان گیا تھا۔

مشرق و مغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی جنوں خیزیوں کے عبرت اثر اشاروں میں لہراتی دلچسپ داستان

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد کے دور کی داستان ہے۔ کوہِ شمالیہ کے گھنے جنگلوں اور سنگلاخ پہاڑیوں میں ایک مختصر قافلہ محوِ سفر ہے۔ اس قافلے کا سالار ایک انگریز پروفیسر ہنری برنارڈ ہے، جو ایک مختلف سوچ، وضع دار اور مثبت خیالات کا حامل شخص ہے۔ ہندوستان کی قدیم اسراریت اور جستجو اسے لندن سے یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ اس قافلے میں اس کی جوان اور حسین بیٹی رینا بھی شامل ہے۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی فطرتاً تجسس پسند اور مہم جو ہے۔ پروفیسر ہنری کا ایک اُوباش بھتیجا رابرٹ اور اس کی آزاد خیال جوان بہن گارشیا بھی ساتھ ہیں۔ ملازمین میں ڈرائیور امجد خان، اوھیڑ عمر خانساماں میاں بیوی نندو اور شانتا کے علاوہ ایک بانکا سجیلا گڑیل نوجوان شوکت حسین بھی اس قافلے میں شامل ہے۔ یہ جنرل مائیکل شا کے سائیس کریم بخش کا اکلوتا بیٹا ہے۔ شوکت عرف شوکی، رینا کو دل بیٹھا ہے مگر مزاجاً گھمنڈی اور مغرور فطرت رابرٹ کو شوکی سے سخت قسم کی رقابت اور ذاتی عناد ہے۔ پروفیسر ہنری کے برعکس رابرٹ، شوکی سمیت دیگر ملازموں کے ساتھ آقا و غلام جیسا رویہ روا رکھے ہوئے ہے۔ پروفیسر ہنری برنارڈ اپنی اس مہم جوئی کے دوران ایک پراسرار بستی کا کھوج لگاتا ہے۔ کوہِ شمالیہ کی تین خودمختار ریاستوں پر فرنگی سامراج اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے مختلف سازشوں میں مصروف ہیں اور انہی سازشوں کو سبوتاژ کرنے کے لیے پانچ مسلم اور جری جانباز گوریلوں کا گروپ اپنی جانیں جوکھم میں ڈالے ہوئے ہے۔ اس گروپ میں علی ریحان ہے جو فوجِ آزادی کے سپہ سالار جنرل شمیر خان کے ایک خاص کمانڈر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے بارودی ماہر کہا جاتا ہے۔ دوسرا احسان جامو، جو کرنل نہال خان کا قریبی ساتھی ہے۔ شاہ زمان ان کا تیسرا ساتھی بذاتِ خود ایک لیڈر کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ گروپ ''کاروانِ مجاہد'' کہلاتا ہے۔ باقی دو ساتھی شرجیل اور قیصر شاہ تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ سوداگروں کی جماعت اب حکومتوں کا کاروبار کرنے لگی تھی۔ غاصب فرنگیوں کو شبہ تھا کہ منتشر مسلم باغی گروہ کوہِ شمالیہ میں اپنی خفیہ کمین گاہیں بنا سکتے ہیں تاکہ نئے سرے سے اپنی طاقت کو یکجا کرسکیں۔ یوں بھی ان فرنگیوں کا ایک مقصد اپنا ''سلسلۂ تسلط'' کوہِ شمالیہ کی ان تینوں قابلِ ذکر ریاستوں تک دراز کرنا بھی تھا۔ لہٰذا مکاری اور دھوکے بازی کا کھیل کھیلتے ہوئے فرنگی حکومت پہلے ریاست ناگرہ کے مہاراجا چندر گپتا کی طرف بہ ظاہر دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے اور پھر مشرکہ طور پر باقی دو ریاستوں تریپال اور پالن پور کے خلاف عسکری سازش کو عملی جامہ پہناتی ہے تاکہ عسکری کارروائیوں کا آغاز کیا جاسکے۔ تریپال میں مسلم نواب شہباز خان اور پالن پور میں مہاراجا مہندر سنگھ گدی نشین ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے حلیف ہیں۔ راج محل داخلی سازشوں کی زد میں ہے۔ مہارانی نجو بائی اپنے بیٹے ایش کمار کو ولی عہد کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہے مگر پرتاب کمار اس کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہے، جو مہاراجا چندر گپتا کی پہلی اور مرحومہ بیوی کے بطن سے تھا۔ مہارانی نجو بائی کی ایک جواں سال خوبصورت بیٹی سونجنا بھی ہے۔ مہارانی اپنے سوتیلے بیٹے ولی عہد پرتاب کمار کو راستے سے ہٹانے اور اپنے بیٹے ایش کمار کا کانٹا صاف کرنے کے لیے کالی کے مندر کے مہا پجاری بدری ناتھ کے ساتھ خفیہ گٹھ جوڑ کیے ہوئے ہے۔ بدری ناتھ جس کا اپنا ایک پراسرار اور شیطانی مفاد کالی کے مندر سے وابستہ ہے جو سوائے اس کے اور اس کے سیوک کاروں کے اور کوئی نہیں جانتا۔ بدری ناتھ اپنے پجاریوں کے ذریعے ہنری برنارڈ کو قتل کرا دیتا ہے۔ مہارانی نجو بائی پرتاب کمار کو مارنے کے لیے ایک منصوبے کے تحت اس کے دودھ میں زہر ملوا دیتی ہے۔ تاہم گلاس کی تبدیلی کے بعد زہر ملا دودھ مہاراجا چندر گپتا پی لیتا ہے اور پرتاب کمار کے بجائے وہ موت کا شکار ہوجاتا ہے۔ پرتاب کمار راجا بن جاتا ہے اور قتل کی تحقیقات کرواتا ہے۔ شک نجو بائی پر ہوتا ہے تاہم پرتاب نجو بائی کو سزا نہیں دیتا مگر اس کی اہمیت ختم ہوجاتی ہے۔ ادھر علی تریپال پہنچتا ہے تو اسے پولیس پکڑ لیتی ہے تاہم اپنے بارے میں بتانے پر اور نواب شہباز کا نام لینے پر اسے رعایت دی جاتی ہے۔ علی کے پاس نواب شہباز کے لیے ایک پیغام ہوتا ہے مگر انسپکٹر اسے نواب کے بھائی سراج کے پاس لے جاتا ہے۔ تاہم وہ نواب شہباز سے ملاقات کرنے کا کہہ کر سراج سے اپنی جان چھڑاتا ہے مگر راستے میں کچھ لٹیرے پولیس کی گاڑی کو گھیر لیتے ہیں۔ وہ بڑی مشکل سے ان کے گھیرے سے نکلتا ہے اور نواب شہباز کے پاس پہنچ کر انہیں فرنگیوں کی سازش سے آگاہ کرتا ہے۔ ادھر ماریہ کے ہاتھوں فرنگی افسر بروجر کا قتل ہوجاتا ہے اور اسے قیدخانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ شوکی اینڈ کمپنی کے خیموں میں آگ لگ جاتی ہے اور امجد خان، نندو بابا اور شانتا جل کر ہلاک ہوجاتے ہیں۔ یہ آگ پراسرار بستی کے عجیب و غریب لوگ لگاتے ہیں تاہم رینا انہیں رام کرلیتی ہے اور یقین دلاتی ہے کہ وہ لوگ ان کی مدد کے لیے یہاں آئے ہیں۔ بدری ناتھ ایک انگریز لڑکی کی بلی چڑھا دیتا ہے۔ ماریا کا خنجر ایک لڑکی بالی کے پاس ہوتا ہے جو بدری ناتھ کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ پرس رام اسے سمجھاتا ہے کہ وہ خنجر ان کے لیے مصیبت بن سکتا ہے مگر وہ اس کی بات کو خاطر میں نہیں لاتا۔ راجا پرتاب کمار اور ماریہ کو بری کردیتا ہے جس کے باعث وہ انگریزوں سے دشمنی پال لیتا ہے۔ ادھر بچھو رام ماریا کے باپ کرنل اینڈرسن کو خبر دیتا ہے کہ اس کی بیٹی کے غیاب میں مندر کے پجاریوں کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔ پھر بچھو رام کرنل کو حتمی خبر دیتا ہے کہ ماریا کے غیاب میں مندر

[illegible] ہے۔ انگریز کوہِ شمالیہ پر چڑھائی کی منظوری دے دیتے ہیں۔ ادھر بدری ناتھ اپنے چیلوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس گوری [illegible] کو اغوا کرلیں۔ دو پجاری رینا کو اغوا کر کے مندر لے آتے ہیں۔ اریبہ اور شاہ زمان سی ہاک نامی جہاز کو تباہ کرنے کے مشن [illegible] ہوتے ہیں تاہم وہ دھر لیے جاتے ہیں۔ ادھر شوکی رینا کی تلاش میں کالی کے مندر جا پہنچتا ہے۔ وہاں اسے پجاری گھیر لیتے [illegible] اسی وقت گولی چلنے کی آواز فضا میں ابھرتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

شوکی نے اپنے پستول سے پہلی گولی داغی۔

ایک پجاری کے سینے میں سرخ روشندان بن گیا۔ پورا [illegible] اس کی بھیانک چیخ سے لرز گیا۔ وہ تیورا کر گرا۔ باقی [illegible] وہیں رک گئے۔ ان کے مکروہ چہروں سے خوف اور [illegible] وقت ہویدا ہورہا تھا۔

عالم! انہیں شوکی سے ایسے جارحانہ اقدام کی توقع نہ تھی۔ [illegible] نے ایک اور گولی داغ دی۔ دوسرے پجاری کی [illegible] فتح گئی۔ وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہوگیا۔ اب تو ان [illegible] پر اس کی دہشت طاری ہوگئی۔ یکے بعد دیگرے [illegible] کا یہ عبرتناک انجام دیکھ کر کسی پجاری میں [illegible] کہ وہ شوکی کی طرف ایک قدم بھی بڑھاتے۔

[illegible] کوئی آگے بڑھا تو..... کوئی حرکت بھی نہیں [illegible] جگہ سے۔'' وہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے غرا کر [illegible] اس کی آواز اور لہجے کی گھن گرج نے پجاریوں کا پتا پانی [illegible] وہ آج تک صرف کمزوروں پر ہی گیدڑوں کے [illegible] طرح حملہ کرتے آئے تھے۔ شوکی کے خطرناک تیور [illegible] کے ہاتھوں اپنے دو ساتھیوں کی موت دیکھ کر ان کا رہا [illegible] بھی جاتا رہا۔ وہ اب اپنی گلوخلاصی چاہتے نظر [illegible] تھے۔ وہ بھاگ جانا چاہتے تھے مگر ان کی ہمت نہ [illegible]

[illegible] کہاں ہے؟'' شوکی نے پوچھا۔

[illegible] وہ وقت تھا جب ایک سنسناتی ہوئی آواز ابھری [illegible] سنبھلتے سنبھلتے ایک ساعت شکن دھماکا ہوا۔ یہ [illegible] کی فصیل کے قریب ہوا تھا۔ سب ایک دوسرے کو [illegible] پریشان رہ گئے۔ اسی وقت دوسرا دھماکا ہوا [illegible] ان کے قریب ہوا تھا، جیسے کالی کے مندر کے [illegible] ہوا ہو۔ آخرالذکر دھماکا اس قدر شدید تھا کہ انہیں [illegible] ہوئی تھی۔ اس کے بعد تو جیسے ایک جنگ [illegible]

[illegible] نے حملہ کردیا۔ بھاگو..... بھاگو.....'' باقی [illegible] کی حالت کو بھی بھلا کر مندر کی طرف دوڑے۔ خود [illegible] اس صورتِ حال سے پریشان ہوگیا تھا۔ اسے رینا کی زیادہ فکر ستانے لگی، لیکن اس نے دل میں پکا ارادہ کرلیا تھا کہ وہ رینا کو یہاں سے نکالے بنا نہیں جائے گا۔

لہٰذا اس نے بھی انہی پجاریوں کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ دوسرا گولہ مندر کے قریب ہی گرا تھا جس کے باعث گرد و غبار کا ایک زبردست طوفان اٹھا تھا۔ کالی کے مندر کی دیواریں اس قدر کمزور ثابت ہوئی تھیں کہ کہیں کہیں سے چیخ اٹھیں۔ اندر بڑی چھوٹی بڑی مورتیاں بھی گر پڑی تھیں۔ وہاں ہال میں دیگر پجاری بھی جمع ہوگئے تھے۔ شوکی ان کی نظروں سے بچتا ہوا ایک سنگی مورتی کے پیچھے جا چھپا۔

اس نے آڑ سے ان کی طرف دیکھا تو دیگر پجاری ان دونوں سے دریافت کررہے تھے کہ کیا ہوا تھا؟ انہوں نے شوکی اور اس کے ہاتھوں دو پجاریوں کی ہلاکت کے بارے میں بتایا اور پھر اس کا مقصد..... اس کے بعد دھماکوں کے بارے میں بتانے لگے۔

فرنگیوں کی طرف سے ناگرہ اور کالی کے مندر پر حملے کا انہیں بھی علم تھا، پھر تو جیسے ایک طرف شوکی کی ڈھنڈیا پڑ گئی اور دوسری جانب وہ سب بوکھلا کر مہا پجاری بدری ناتھ کے کمرے کی طرف لپکے مگر وہ خود بھی دھماکوں کی آوازیں سن کر انہی کی طرف چلا آرہا تھا۔

''مندر کے گرد ڈھال بن کر کھڑے ہوجاؤ۔'' شوکی نے مہا پجاری بدری ناتھ کو تحکمانہ انداز میں کہتے سنا۔ ''اگر فرنگی یہاں تک پہنچ جائیں تو ان سے صاف کہہ دینا کہ ہم لوگ دھارمک ہیں اور ہمارا کسی بھی ریاستی سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ لوگ عبادت گاہوں پر حملہ نہیں کریں گے۔ راج محل کی بے شک اینٹ سے اینٹ بجا دیں۔''

شوکی نے جو اس خبیث کی یہ بات سنی تو اسے مکار بدری ناتھ کے دوغلے پن پر بے حد غصہ آیا۔ ایک پجاری نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے اسے یاد دلایا۔

''گرو جی! ماریا کی انہیں بھنک ضرور پڑی ہوگی۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ ریاست پر حملہ کرنے کا ایک جواز یہ بھی ہے کہ اس سسری ماریا کا باپ کرنل اینڈرسن.....''

''بکواس بند کروا اپنی۔'' بدری ناتھ غصے سے اپنے

سیوک کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''ہم کسی ماریا کو نہیں جانتے اور تم لوگ بھی ان سے یہی کہنا۔'' انہوں نے اثبات میں اپنے سر ہلا دیے پھر ایک نے شوکی کے بارے میں بتایا تو بدری ناتھ نے ایک فلک شگاف شیطانی قہقہہ لگاتے ہوئے پُرغرور لہجے میں کہا۔

''وہ ساری عمر یہاں اپنا سر پٹختا رہے گا مگر رینا کی پرچھائیں بھی نہیں ڈھونڈ سکے گا۔''

''لیکن پربھو! اس مسلے نے ہمرے دو ساتھیوں کو گولی مار کے ہلاک کر دیا ہے۔ وہ ادھر ہی کہیں موجود ہے۔'' ایک نے بتایا۔

''تو پھر تم منہ اٹھائے یہاں کیا کرنے چلے آئے ہو، جاؤ اسے ڈھونڈو اور مار ڈالو۔ میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ فوجی آجائیں تو مجھے بتا دینا۔ میں خود ان سے بات کروں گا۔'' یہ کہتے ہوئے بدری ناتھ واپسی کے لیے پلٹ گیا۔ شوکی نفرت و غصے سے اپنے ہونٹ سکیڑے بدری ناتھ کو مورتی کے پیچھے سے گھورتا رہا۔

جب سارے پجاری بدری ناتھ کے حکم سے مندر سے باہر چلے گئے تو شوکی مورتی کے عقب سے نکلا۔ اس نے بدری ناتھ کو کالی کی دیوہیکل مورتی کے پیچھے غائب ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اس سے رینا کا پوچھ کر رہے گا، چاہے اس شیطان کی جان ہی کیوں نہ لینی پڑ جائے۔

یہ ارادہ کر کے وہ گردوپیش میں ایک نگاہ ڈالتا ہوا مورتی کے عقب سے نکلا اور دبے پاؤں کالی کی مورتی کی طرف بڑھنے لگا۔ اس سے اس کا دل بھی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ رینا کو ایک شیطان کے چنگل سے بچانے کا جذبہ اپنی جگہ لیکن شوکی کو یہ خدشہ بھی تھا کہ..... کہیں وہ اس ناپاک بدری ناتھ کے چنگل میں ہی نہ پھنس کر رہ جائے۔ اسے اپنی نہیں رینا کی فکر تھی ..... اگر وہ بدری ناتھ کی گرفت میں پھنس جاتا تو پھر وہ اسے کیسے بچا سکتا تھا۔ لیکن وہ مسلمان تھا، اسے صرف اللہ کی طاقت پر بھروسا تھا اور امید تھی کہ وہ ضرور اس..... شیطان کے مقابلے میں اس کی مدد کرے گا۔ اسی عزم نے اس کے ہمت و حوصلے کو سوا کیا اور وہ کالی کی مورتی کے قریب چلا گیا۔

ایک لمحے کے لیے تو اسے یوں لگا جیسے کالی کی مورتی اپنے بھیانک اور خوفناک چہرے سے اسے گھور رہی ہے۔ اس کی دونوں آنکھیں باہر کو ابلی پڑی تھیں۔ ان سے سرخی جھلکتی تھی۔ اس کے ان گنت ہاتھوں میں دبے ہوئے مختلف دھاتی ہتھیار دیکھ کر شوکی کو یوں لگا جیسے ابھی وہ ان سمیت اس پر حملہ کر دے گی، لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے دل کو مضبوط کیا کہ پتھر کی یہ بے جان مورتی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

وہ جیسے ہی مورتی کے عقب میں آیا تو چونک پڑا۔ اسے وہاں کچھ نظر نہیں آیا، ماسوائے سپاٹ دیواروں کے۔ نہ جانے بدری ناتھ کہاں غائب ہو گیا تھا۔

اچانک اسے ایک سنسناتی ہوئی پھنکار سنائی دی۔ وہ چونک گیا۔ دوسری پھنکار کی آواز اسے اپنے بالکل قریب ہی سنائی دی تو وہ بدکا۔ کیا دیکھتا ہے دو تین کالے اور دھاری دار سانپ کالی کی مورتی پر رینگ رہے تھے اور بڑا سا پھن اٹھائے اس پر پھنکار بھی رہے تھے۔ شوکی فوراً وہاں سے پرے ہٹ گیا۔

اس کے بعد تو جیسے پورا ہال سانپوں کی زہریلی پھنکاروں سے گونجنے لگا اور شوکی کو لگا اگر وہ یہاں مزید ٹھہرا تو سانپ اس پر حملہ کر دیں گے۔ اسے مورتی پر بھی اب... ان گنت سانپ لٹکتے نظر آنے لگے۔ شوکی دہل سا گیا۔

وہ دروازے کی طرف بھاگنا چاہتا تھا مگر وہاں بھی اسے لاتعداد زہریلے سانپ رینگتے نظر آئے۔ شوکی کو اپنی موت صاف نظر آنے لگی۔ وہ پریشان ہو کر نکاسی کے لیے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تب ہی اچانک ہال میں بدری ناتھ کا شیطانی قہقہہ گونجا۔

شوکی ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''ہا ہا..... ہا ہا..... دیکھ لیا مورکھ! ہم سے ٹکر لینے کا انجام.....'' اسے بدری ناتھ کی پُرغرور آواز سنائی دی، جو طاقت کے نشے سے چور تھی۔

''تم نے..... ہم مہابلی سے ٹکرانے کی جرأت کیسے کی مورکھ! جانتا نہیں ہم کون ہیں اور کیا ہیں؟ اب اپنے انجام کے لیے تیار ہو جا مسلے! ابھی ذرا دیر میں میرے یہ سارے سیوک تجھے ڈس لیں گے اور ان کے خطرناک زہر سے تیرا پورا شریر پانی بن کر بہہ جائے گا۔''

اس مردود شیطان کی آواز سن کر شوکی نے ہمت کی اور چلا کر بولا۔ ''بدری ناتھ! تو ایک شیطان ہے۔ تیرا انجام زیادہ دور نہیں۔ اتنا ہی بہادر بنتا ہے تو سامنے کیوں نہیں آتا۔'' لیکن جواب میں شوکی کو اس کے قہقہوں کی آوازیں آتی رہیں۔ شوکی نے مورتی کے ایک ہاتھ سے ترشول اچک لیا۔

اچانک ایک سانپ اس کے کاندھے پر آ گرا۔ شوکی محتاط تو تھا ہی، اس نے نہایت پھرتی سے سانپ کو خود سے جھٹک دیا لیکن ابھی وہ پہلے سانپ سے ہی نہیں سنبھل پایا تھا

کہ ایک اور سانپ اس پر گرا اور پھر تیسرا..... پھر چوتھا۔ شوکی کے اوسان خطا ہونے لگے۔ اسے اس شیطانی مندر میں اپنی اذیت ناک موت صاف نظر آ رہی تھی۔ اب بس ان سانپوں کے اسے ڈسنے کی دیر تھی کہ ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ مندر کے نیم تاریک ماحول میں شوکی نے کسی سفید سی رسی نما شے کو لہراتے دیکھا۔ وہ پہلے یہی سمجھا کہ یہ بھی بدری ناتھ کا کوئی شیطانی کھیل ہے۔ وہ ابھی زہریلے سانپوں کے درمیان جکڑا ہوا تھا کہ اچانک وہ سفید سی عجیب رسی نما شے اس پر آن گری۔ اسے بس ہلکی سی جھپک کا احساس ہوا اور دوسرے ہی لمحے اس نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ اس پر رینگتے ہوئے سانپ ایک دم اکڑنے لگے اور پٹ..... پٹ..... کی آواز سے مندر کے پختہ فرش پر گرنے لگے۔ اس تیز و عجیب بازی کو دیکھ کر وہ سکتے میں آ گیا۔

''بھاگ جاؤ.....'' اچانک اس نے ایک نرم اور مہربان سی نسوانی آواز سنی۔ اس کا سکتا ٹوٹ گیا مگر وہ ششدر رہ گیا۔ تاہم اس نے ایک طرف دوڑ لگا دی۔

اسے اپنے دائیں جانب ایک زینہ دکھائی دیا۔ تب ہی اس نے دیکھا کہ ہال کے فرش اور دروازے کے قریب رینگتے ہوئے سانپ تیزی سے اس کی جانب لپک رہے ہیں۔ وہ اگر چاہتا تو دروازے کی جانب بڑھنے کی کوشش کر سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ زینے کی جانب دوڑا۔

اب سانپوں کی زہریلی پھنکاریں اور بدری ناتھ کے شیطانی قہقہے اس کے تعاقب میں تھے۔ وہ رکا نہیں اور دوڑتا ہوا زینے کی جانب لپکا۔ مورتی سے نکالا ہوا ترشول اس نے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ وہ خاصا تیکھا تھا۔ پستول اس کے پاس موجود تھا، جس میں اب صرف دو گولیاں ہی باقی تھیں۔

وہ زینے پر آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سانپ اس طرف آ کر رک گئے تھے اور اس کی طرف اپنے کالے پھن اٹھا اٹھا کر بھیانک آوازوں سے پھنکاریں مار رہے تھے۔

وہ پھر آگے بڑھا اور زینہ چڑھتا چلا گیا جو زیادہ طویل نہ تھا۔ زینہ دائیں جانب گھوم رہا تھا۔ اس طرف اسے اوپر تاریک سا کمرا دکھائی دیا۔ وہ اسی سمت کو لپکا لیکن اوپر داخل نہیں ہوا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اندر کیا تھا۔ بدری ناتھ کے قہقہے رک چکے تھے۔ سانپوں کی پھنکاریں بھی سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ وہ کمرے کے باہر ہی رک گیا۔

اس گوشے میں دن میں بھی تاریکی تھی۔ اس نے ایک طاقچے سے ایک جلتا ہوا دیا اٹھا لیا اور اس کی روشنی میں آگے بڑھا۔

وہ کمرے کی چوکھٹ پر کھڑا ہو کر اندر دیکھنے لگا۔ کمرا خالی تھا اور اندر عجیب سی بو آ رہی تھی۔ دیے کی پیلی زرد روشنی میں اندر کے در و دیوار سے منحوس قسم کی ہولناکی چمٹی نظر آ رہی تھی۔ وہ اللہ کا نام لے کر اندر داخل ہو گیا۔

اچانک ایک انسانی ہیولے نے وحشیانہ چیخ مار کر اس پر حملہ کر دیا۔ وہ اگر محتاط نہ ہوتا تو اس اچانک حملے کی زد میں آ جاتا لیکن اس نے بروقت اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ میں پکڑا ترشول آگے کر دیا۔ تین تیز دھار پھل والا ترشول حملہ آور کے جسم کے کسی حصے میں پیوست ہو گیا۔ اس کے حلق سے اذیت ناک چیخ خارج ہوئی۔ شوکی نے ترشول واپس کھینچ لیا۔

اچانک وہ چونکا۔ حملہ آور کوئی عورت تھی۔ وہ فرش پر گر پڑی تھی۔ شوکی نے دیے کی روشنی میں دیکھا، وہ ایک صحت مند اور دلکش بدن کی مالک لڑکی تھی۔ ترشول کے تینوں پھل اس کے پہلو کو بری طرح زخمی کر گئے تھے۔ حملہ آور لڑکی کے ہاتھ میں ایک لمبے پھل والا چاقو بھی تھا جو زخمی ہو کر گرنے کے باعث اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔

''مجھے افسوس ہے، میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا تھا مگر تم نے مجھ پر حملہ کر کے غلطی کی۔'' شوکی نے اس کے قریب ذرا جھکتے ہوئے تاسف سے کہا۔ اسے اپنے ہاتھوں ایک خوبصورت لڑکی کے..... زخمی ہونے پر دکھ ہو رہا تھا۔

''چلے جاؤ..... یہاں سے..... بھاگ جاؤ..... مورکھ! آہ.....'' وہ لڑکی شدید زخمی ہونے کے باوجود نفرت خیز لہجے میں بولی۔

''میں صرف ایک لڑکی کو رہائی دلانے کے لیے یہاں آیا ہوں اور اسے آزادی دلائے بغیر یہاں سے ہرگز نہیں جاؤں گا۔''

لڑکی کے زخمی پہلو سے تیزی کے ساتھ خون نکل رہا تھا۔ اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔

''تم میری مدد کرنے کا وعدہ کرو تو میں تمہاری جان بچانے کی کوشش ضرور کروں گا۔'' شوکی نے اسے اکسایا۔ ''مجھے بتاؤ، رینا کو کہاں رکھا گیا ہے؟''

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ناچار شوکی اس پر لعنت بھیج کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اچانک زینے کی طرف کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ چونکا اور کچھ سوچ کر دیے کی لو کو پھونک مار کر بجھا دیا۔

اب وہ کمرے کی تاریکی کا حصہ بنا کھلے دروازے سے زینے کی طرف تکے جا رہا تھا۔ کہیں کہیں دیوار پر گیر

طاقچوں پر رکھے دیوں کی روشنی میں اسے کسی کا سایہ اوپر آتا ہوا نظر آیا، جو لمبے سے چغے میں ملبوس تھا۔

اس کا دل سینے میں تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اب اس نے پستول بھی نکال لیا تھا لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے اسے دوبارہ بیلٹ میں اڑس لیا۔

سایہ ایک انسان کی صورت میں نمودار ہوا اور شوکی اسے دیکھتے ہی جوشِ غیظ سے بھر گیا۔

وہ شیطان مہاپجاری بدری ناتھ تھا مگر وہ اسے دیکھ کر ٹھٹکا بھی تھا اور پریشان بھی ہو گیا تھا۔ اس کے کاندھوں پر ان گنت سیاہ رنگ کے سانپ لہرا رہے تھے۔ اسے تشویش ہونے لگی۔ اگر وہ اس پر سانپ چھوڑ دیتا تو اسے یہاں سے بھی بھاگنا پڑتا۔ وہ اسی طرح کمرے کی تاریکی کا حصہ بنا خاموش مگر محتاط کھڑا رہا۔

بدری ناتھ اس کے قریب آ چکا تھا۔ شوکی کے جی میں تو آئی کہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ترشول کو اس شیطان کے جسم میں پیوست کر ڈالے مگر اس نے کچھ سوچ کر خود کو ابھی اس عمل سے باز ہی رکھا۔

بدری ناتھ نے اچانک ایک شیطانی قہقہہ لگایا اور اپنے کاندھوں اور گلے پر لپٹے سانپوں کو کمرے میں اچھال دیا۔ شوکی کی تو جیسے روح ہی فنا ہو گئی۔ سانپ تاریک کمرے کے فرش پر گرے اور خوفناک پھنکاریں مارتے ہوئے اس کی جانب لپکے۔

شوکی نے ایک جست بھری اور بدری ناتھ سے ٹکراتا ہوا زینے پر جا گرا اور وہاں سے لڑھکتا ہوا نیچے آ رہا۔

ترشول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ لڑھکنے کے دوران ہی اس نے دیکھا کہ مندر کے ہال کا فرش سانپوں سے کالا ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں آئی کہ اگر وہ فرش پر جا گرا تو ان گنت زہریلے سانپ..... اسے ڈسنے میں دیر نہیں کریں گے۔ اس نے فوراً ہمت سے کام لیا اور اپنی دونوں ٹانگوں اور ہاتھوں کو پھیلا کر زینے کی دونوں دیواروں کے درمیان پھنسا کر خود کو مزید نیچے لڑھکنے سے بچانے کی تگ و دو کرنے لگا۔

عین آخری زینے پر پہنچ کر وہ رک گیا مگر اس طرح کہ اس کا سر اور چہرہ فرش کو چھونے لگا۔ تب ہی ایک کوڑیالے زہریلے سانپ کے پھن کو اس نے بالکل اپنی پھیلی ہوئی آنکھوں کے سامنے پایا اور اس قدر قریب کہ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں اسے طلسماتی چمک صاف نظر آنے لگی۔

وہ بے حد خوفناک لمحات تھے۔ شوکی نے ان سنگین ترین لمحات میں اپنے بچاؤ کی ایک آخری کوشش میں اپنے دونوں ہاتھوں میں پورے جسم کی طاقت کو مجتمع کیا اور اپنے جسم کو جھٹکے سے پیچھے کیا۔ وہ آخری قدم سے دو تین قدم پیچھے ہوا تو اچانک اس کی پشت پر کسی نے اپنا بھاری بھر پاؤں رکھ دیا۔ ساتھ ہی اسے قہقہے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ وہ اسے دیکھ نہیں سکتا تھا مگر اسے معلوم تھا کہ وہ بدری ناتھ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

پلٹ کر پشت کے بل ہونے کے لیے اسے اپنی کمر پر جنگلی بھینسے جیسے بدری ناتھ کے پاؤں کا دباؤ ہٹانا تھا۔ شوکی نے ہمت ہارنا نہیں سیکھا تھا بلکہ اس طرح کے ''چیلنجز'' میں فطری طور پر اس کا جوش سوا ہو جاتا تھا۔ اس نے وحشی کھیل، جو زینے کے آخری قدمچے پر کھیلا تھا، اس پر فوری عمل کیا۔ لیکن اس بار اس نے اپنے ہاتھوں کے بجائے کہنیوں کے بل پر ایسا کیا اور یکدم ماہیِ بے آب کی طرح تڑپا۔ نتیجے میں بھاری بھرکم بدری ناتھ زینے پر اپنے ایک پاؤں کا توازن قائم نہ رکھ سکا اور جھٹکا کھا کر شوکی کے قریب ہی زینے پر گر پڑا۔ دونوں کے چہرے ایک بار پھر آمنے سامنے ہو گئے۔

بدری ناتھ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ لیا۔ شوکی کے مقابلے میں وہ تنومند اور بھینسے جیسی طاقت رکھتا تھا مگر شوکی بھی اس شیطان کے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے اپنی ٹانگ سکیڑ کر گھٹنے کی ایک بھرپور ضرب بدری ناتھ کے پیٹ پر ناف سے نیچے رسید کر دی۔ بدری ناتھ کے حلق سے بیل جیسی ڈکراہٹ بلند ہوئی۔ گلے پر اس کے ہاتھوں کی گرفت کمزور پڑتے ہی شوکی نے تڑپ کر خود کو اس کی گرفت سے آزاد کروایا اور ایک گھونسا اس کی موٹی ناک پر رسید کر دیا۔ بدری ناتھ کی ناک سے خون بہنا شروع ہو گیا مگر وہ بھی سخت جان واقع ہوا تھا۔ اس نے شوکی کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر آخری زینے سے نیچے فرش کی طرف اچھال دیا جہاں کالے کوڑیالے اور زہریلے سانپوں کی بہتات تھی، جن کی سمع خراش آوازیں ہنوز شوکی کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اسے اپنی یقینی موت صاف نظر آنے لگی تھی۔

☆☆☆

جزیرے میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ جنگل کالا گھنا تھا۔ سورج کی کرنیں گھنیری شاخوں کو چیر کر مقدور بھر ہی نیچے پڑ رہی تھیں۔ ہر شاخ پر بیل بوٹے اور جنگلی پھل

لدے ہوئے تھے۔ زمین میں اُگی جنگلی جھاڑیاں بھی اسے ایک طرح سے ''کیموفلاج'' کیے ہوئے تھیں۔

مزید برآں اس نے کچھ ٹہنیاں اور پتے توڑ کر اپنے اوپری برہنہ بدن پر اور سر کے گرد باندھ دیے تھے۔ یوں وہ ایک طرح سے ''بن مانس'' ہی محسوس ہوتا تھا..... ایک کوریلا۔

شاہ زمان دشمن کے پکلے کو تباہ و برباد کرنے کے بعد کو شکن حوصلوں اور ایک عزمِ صمیم کے ساتھ آگے بڑھا تھا۔ اس کا رخ کیمپ فور کی طرف تھا جہاں مبینہ طور پر اریبہ کو اس گورے خبیث کمانڈر رینالڈ نے قیدی بنا رکھا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں اس فرنگی فوجی کے وہ غلیظ الفاظ گونج رہے تھے جو اس نے اپنے افسر رینالڈ اور اریبہ کے متعلق بے ہودہ انداز میں کہے تھے۔

شاہ زمان بپھر گیا تھا اور اسی غیظ تلے اس نے اس پارہ کو فرنگی سپاہی کو مار ڈالا تھا۔

''کیا یہ مردود رینالڈ بھی اریبہ کے لیے بروجر بننے لگا ہے؟ ہرگز نہیں۔'' وہ طیش میں خود کلامیہ بڑبڑایا۔ ''اگر اس مردود نے ایسا کچھ کرنے کی جرأت بھی کی تو میں اسے کتے کی موت ماروں گا۔''

وہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ دھماکوں کی آوازیں جزیرے میں یقیناً دور تک سنی گئی ہوں گی۔ انگریز مسلح سپاہی بھی حرکت میں آ گئے ہوں گے۔ شاہ زمان کو فرنگیوں کے اس ٹولے پر سخت غصہ تھا جو اپنی تاریخ ساز چوری کو کس طرح عسکری طور پر تحفظ دیے ہوئے تھا۔ یہ جزیرہ انہوں نے اسی مقصد کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔

شاہ زمان یہ سب سوچتا ہوا بڑے دھیان سے آگے بڑھتا رہا۔ اس نے راستے میں دو ایک فوجی گاڑیاں اور ان کے پیچھے گھوڑ سوار سپاہیوں کو بھی دیکھا تھا۔ وہ ان کی نظروں سے بچتا بچاتا بالآخر ایک قدرتی جھیل کے پاس جا پہنچا جس کے کنارے پر درختوں کی گھنی اور کسی جگہ جٹا دار شاخیں جھکی ہوئی تھیں۔ یہی وہ چھوٹی سی جھیل تھی جس کے پار کیمپ فور تھا۔ جہنم واصل فرنگی سپاہی نے اسے یہی نشانیاں بتائی تھیں۔

شاہ زمان نے ذرا دیر رک کر اطراف کا جائزہ لیا۔ پھر مطمئن ہو کے آگے بڑھا۔ ابھی وہ چند گام ہی چلا ہوگا کہ اچانک اسے کسی درندے کی دہاڑ سنائی دی۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

اسے حیرت ہوئی کہ اس چھوٹے سے جزیرے میں درندے بھی موجود ہیں؟ لیکن کیسے؟ یہاں تو آفیسر رینالڈ کا کیمپ تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں اس فرنگی سپاہی نے اسے خطرناک درندوں کے علاقے میں بھیج دیا ہو؟ اس کے ذہن میں پہلی بار یہ خدشہ ابھرا تھا۔ وہ ٹھہر گیا۔ تب ہی وہ ایک منظر دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اس نے فوراً جنگلی جھاڑیوں کی آڑ لے لی تھی۔

منظر کیا تھا، ایک اچھے بھلے آدمی کا دل دہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ تین عدد خونخوار گلدار..... ادھر ادھر گردنیں ہلاتے مستانی چال چلتے ہوئے جھیل کے قریب آ رہے تھے۔ ان کی زنجیریں تین وردی پوش فرنگی سپاہیوں نے تھام رکھی تھیں۔ دو ساتھی اور بھی تھے۔ تیسرے کو دیکھتے ہی شاہ زمان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

یہ وہی فرنگی آفیسر رینالڈ تھا۔ ان سب کو پیادہ دیکھ کر شاہ زمان کے ذہن رسا نے فوراً ایک محتاط اندازہ قائم کرتے ہوئے سوچا کہ یقیناً وہ اپنی منزل کے بے حد قریب پہنچ چکا ہے۔ نیز یہ تینوں گلدار..... رینالڈ کے پالتو تھے۔ کیمپ فور یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

پہلے شاہ زمان یہی سمجھا کہ رینالڈ اپنے ساتھیوں اور پالتو گلدار کے ساتھ یہاں جھیل کنارے ہوا خوری کرنے آیا ہے لیکن جلد ہی اسے اپنا یہ خیال ذہن سے جھٹکنا پڑا، کیونکہ یہ موقع ایسا تھا ہی نہیں۔

اب تک کی صورتِ حال، گولیوں، دھماکوں اور پکلے کی تباہی نے ان پر بہت کچھ واضح کر دیا ہوگا۔ ایسے میں ان کا ''ہوا خوری'' کا کوئی مقصد نہیں بنتا تھا۔

پھر دوسرے اس نے دیکھا کہ رینالڈ اپنے ساتھیوں کو تحکمانہ انداز میں ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ ہدایات دے رہا تھا۔

اس کے ساتھ ہی وہ تینوں اول الذکر فرنگی جنہوں نے گلدار کی زنجیروں کے سرے ہاتھوں میں پکڑ رکھے تھے، حرکت میں آ گئے۔ شاہ زمان کی تو جیسے روح ہی فنا ہو گئی۔

تینوں گلدار بدست فرنگی تین مختلف سمتوں میں پھیل گئے۔ ایک اس کی جانب بڑھنے لگا۔ شاہ زمان کے لیے اب صورتِ حال ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' والی بات تھی۔

سامنے سے اس طرف کو آنے والے فرنگی سپاہی سے بچ کر وہ دائیں یا بائیں جانب ہوتا تو..... دوسرے یا تیسرے گلدار بدست سپاہی کی نظروں میں آ سکتا تھا۔

یہ موقع زیادہ غور و خوض کا تھا ہی نہیں، بس پل کے پل سوچنا اور اس پر عمل کر ڈالنا تھا۔ اس نے بھی یہی کیا۔

لہٰذا وہ بجائے حرکت کرنے کے وہیں دبکا بیٹھا رہا۔ اس کے خیال میں رینالڈ کو یہ شک ہو گیا تھا کہ اس نے جن

دو افراد پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی ہے، وہ اس کے ''مطلوبہ'' ہی تھے جن میں سے ایک (اریبہ) اس کے قبضے میں تھی۔ یوں اسے اندازہ تھا کہ وہ یعنی شاہ زمان یہاں بھی شب خون مارنے آسکتا ہے۔

وہ گلدار بدست سپاہی جیسے جیسے اس کے قریب آتا جا رہا تھا، شاہ زمان نے محسوس کیا کہ اس کے ساتھ مستانی چال چلتا گلدار بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ کبھی رک جاتا اور منہ اٹھا کر فضا میں کچھ سونگھنے کے انداز میں اپنے نتھنوں کو پھلاتا پھر دم ہلاتے ہوئے ہلکے سے غراتا۔ اس کی آنکھیں شاہ زمان کو اپنی جانب گھورتی محسوس ہوئیں۔

شاہ زمان سمجھ گیا کہ اب کسی بھی وقت کچھ بھی ہونے والا ہے، پھر یہی وہ وقت تھا جب گلدار زور زور سے خونخوار انداز میں غرانے اور اپنی زنجیر کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ سپاہی بھی اسے بے چین سا دیکھ کر ایک دم محتاط ہوگیا۔ اس نے گلدار کی زنجیر چھوڑ دی اور کندھے سے رائفل اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی۔

شاہ زمان کو اگلے لمحے کا اب تک بہ خوبی اندازہ ہو چکا تھا۔ ادھر گلدار زنجیر چھوٹتے ہی فوراً... غراتا ہوا انہی جھاڑیوں کی طرف لپکا جدھر زمان دبکا بیٹھا تھا۔ اس نے گلدار کو حسبِ توقع اپنی بو پا کر جھاڑیوں کی طرف بڑھتے پایا تو اس کے دائیں ہاتھ میں سنگین چمکنے لگی جو اس نے خطرہ بھانپتے ہی رائفل کی نال سے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔ اس سے اس کے جسم کا رواں رواں جوش سے تنا ہوا تھا۔

جیسے ہی گلدار نے جھاڑیوں میں چھلانگ لگائی زمان نے رخ بدلا اور دو دھاری تیز سنگین اس کی گردن میں نصف سے زیادہ بھونک دی۔ گلدار تڑپا اور اس نے چنگھاڑنے کی کوشش کی لیکن سنگین حلق تک اتر جانے سے محض خرخراتی آواز ہی برآمد ہو پائی تھی۔ شاہ زمان نے اسی پر بس نہیں کیا تھا۔ سنگین دوبارہ کھینچ کر اس نے ادھ موئے گلدار کے پیٹ میں آخر تک اتار دی۔

گلدار جھاڑیوں میں پڑا آخری سانسیں لینے لگا۔ گلدار پالتو تھا، ایک عرصہ پنجروں میں گزارنے والے ایسے درندوں کی خطرناکی اور چابک دستی وہ نہیں رہتی جو ایک آزاد جنگلی شکاری درندے کی ہوتی ہے اگرچہ بے شک اپنی فطرت میں یہ خونخوار ہی ہوتے ہیں۔ دو بدو اور گھات لگا کر ایسے درندوں سے مقابلے کے لیے بڑا حوصلہ اور جگرا چاہیے ہوتا ہے۔ یوں اس لمحہ بھر کے خون آشام مقابلے میں دو ہی باتیں ہوتی ہیں' آر یا پار..... اور شاہ زمان نے اپنی بہادری اور چابک دستی سے مدمقابل کو ''پار'' لگا دیا تھا۔

اس کے بعد وہ فرنگی سپاہی کی طرف متوجہ ہوا، اپنے گلدار کے پیچھے رائفل اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے محتاط روی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

اسے بھی شبہ ہوا تھا کہ کوئی جھاڑیوں میں ہے اور گلدار اسی وجہ سے بے چین ہو رہا تھا۔ تاہم وہ خود بھی تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ کہیں گلدار نے جھاڑیوں میں دبکا ہوا کوئی چھوٹا موٹا شکار تو نہیں دیکھ لیا تھا۔ شاید اسی سبب وہ ابھی انتظار کا کھیل کھیلنا چاہتا تھا مگر یہی کھیل اس کی موت پر بھی ختم ہوسکتا تھا۔

وہ اپنی لمبی نال والی رائفل دونوں ہاتھ میں پکڑے ایک ایک قدم آہستگی سے اٹھاتا ہوا جھاڑیوں کے بالکل پاس آ کر رک گیا اور نال کے زور پر سامنے کی جھاڑیاں ایک طرف کو کیں تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

اس نے گلدار کو گھاس پر خون میں لت پت پڑے آخری سانسیں لیتے ہوئے پایا۔ یہی وہ وقت تھا جب اس کی بدستور پھٹی پھٹی آنکھوں نے قریب..... بہت قریب سے ایک اور منظر بھی دیکھا۔

اسے اپنے چہرے کے بالکل قریب جنگلی پتوں کی اوٹ سے ایک کیموفلاج چہرہ دکھائی دیا جو نفرت و غیظ کی تصویر بنا ہوا تھا۔ تب پھر اسے ایک ذرا جنبش کرنے کا بھی موقع نہ ملا اور شاہ زمان کے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں سپاہی کی کنپٹیوں سے ٹکرائیں۔ چشم زدن میں اس کا بے سدھ ہوتا جسم آگے کو جھول کر گلدار کی لاش پر گر پڑا۔

راستہ صاف ہوتے ہی اس نے فوراً پیش قدمی کی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کا یہ کارنامہ زیادہ دیر تک چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کی عقابی نظریں سامنے جھیل کے کنارے کھڑے رینالڈ کو دیکھ رہی تھیں مگر ابھی اس کا نشانہ رینالڈ نہیں تھا۔ وہ جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا بالآخر اس سمت پر آ گیا جدھر اس کے محتاط اندازے کے مطابق کیمپ فور تھا۔ کیونکہ رینالڈ اور اس کے ساتھیوں کو اس نے اسی مقام سے نمودار ہوتے دیکھا تھا۔

جھیل اب اس کے عقب میں تھی۔ وہ اپنا راستہ صاف کرتے ہوئے آگے سرکتا رہا۔ اسے رینالڈ کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ رکا نہیں اور پھر جیسے ہی وہ ایک جڑواں تنے والے موٹے درخت ..... کے عقب میں آ کر ٹھہرا تو اس کی متلاشی نظروں نے سامنے ایک گھاس کا میدان دیکھا۔

خوشی اور مسرت تلے اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ وہ اپنی منزل کے عین سامنے تھا۔ تقریباً نصف فرلانگ کے فاصلے پر اسے ایک کھپریل کی مخروطی چھت والی عمارت دکھائی دے گئی جو بہ ظاہر ایک بڑا سا جھونپڑا دکھائی دیتی تھی۔ وہاں اسے چند مسلح فوجی، دو گاڑیاں، ایک ٹرک اور شکاری کتے دکھائی دیے تھے۔

وہ جانتا تھا کہ یہ ''بوگیر'' کتے تھے اور اس کے لیے کسی بھی وقت گلداروں سے زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتے تھے۔ اپنی ''گنز'' (بو) مارنے کے لیے اس نے مختلف جھاڑیوں، پتوں اور بوٹوں کو مسل مسل کر ان کا لیپ سا تیار کر کے اپنے جسم، ہاتھوں اور چہرے پر مل لیا۔ شاہ زمان اس وقت ایک پورے تربیت یافتہ گوریلے کے روپ میں نظر آ رہا تھا اور اپنی تربیتی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا۔

اس نے سامنے کا منظر دیکھ کر پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ، دانتوں سمیت بھینچ لیے تھے جس کے باعث اس کے جبڑوں میں سختی ابھر آئی تھی۔

وہ جانتا کہ اسے کیمپ فور میں شب خون مارنے کا سیدھا موقع یا راستہ نہیں مل سکتا لیکن یہاں صورت حال اس کی توقع سے کچھ زیادہ ہی نازک اور سنگین نظر آتی تھی۔

وہ خاصی دیر تک اپنی جگہ دبکا دور سے ہی کیمپ فور کی جھونپڑا نما عمارت کا جائزہ لیتا رہا۔

دن اچھی طرح نکل آیا تھا، بلکہ اب تو سورج بھی جیسے سر پر چمک رہا تھا۔ اس کی تیز روشنی چھتنار درختوں کی گھنیری شاخوں سے چھن چھن کر نیچے پڑ رہی تھی۔ اس میں کیا شک تھا کہ اس جزیرے کا جنگل کچھ زیادہ ہی گھنا تھا۔

مختلف پرندوں کے چہچہانے کی اور چھوٹے موٹے جانوروں کے بولنے کی آوازوں سے اطراف کے ماحول میں ایک عجیب سی گونجیلی فضا طاری ہوگئی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا بھی چل رہی تھی۔ ہوا میں نمی محسوس ہوتی تھی جس کا مطلب تھا کہ یہ علاقہ ساحل سمندر سے کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ یوں بھی یہ جزیرے کا وسطی علاقہ نہیں تھا۔

شاہ زمان کو اس جزیرے میں ایسے خوش رنگ پروں والے پرندے بھی نظر آئے تھے جنہیں وہ پہلی بار ہی دیکھ رہا تھا۔

کیمپ فور پر کڑا پہرا نظر آتا تھا۔ یہ غور جائزہ لیتے رہنے کے بعد بھی اسے کوئی ایسی صورت نظر نہیں آ رہی تھی کہ وہ..... کسی کی نظروں میں آئے بغیر اندر داخل ہونے میں

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ
ماہِ ستمبر کے شمارے کی ایک جھلک
سیلون کا سورج
شہر خوف و دہشت کے ہاتھوں یرغمال بن چکا تھا۔ سنسنی، دہشت اور خون میں ڈوبی داستان..... امجد رئیس کے قلم کا جادو.....
انگارے
دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتا طاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی
آوارہ گرد
چلچلاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت سے برسرِ پیکار نوجوان کی سرگزشت..... عبدالرب بھٹی کی سلسلے وار کہانی
سروق کے رنگ
ازدواجی زندگی کی الجھنوں میں گھرے جوڑے کی تیکھی کہانی
زندگی کی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر گرتے پڑتے جو تجربہ اور مشاہدہ ہوتا ہے وہ کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں ہوسکتا..... اسی تجربے کا دلچسپ نچوڑ.....
چینی نکتہ چینی
آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں



کامیاب ہوتا۔سب سے بڑی مشکل وہ بوگیر شکاری کتے تھے جو ادھر ادھر غراتے پھر رہے تھے۔ان کی زنجیریں وہاں متعین مسلح سپاہیوں نے تھام رکھی تھیں اور وہ گشت میں مصروف تھے۔

ایک لمحے کے لیے شاہ زمان کو یوں لگا جیسے وہ منزل کے قریب پہنچ کر بھی اس سے دور ہے۔صرف ایک لمحے کے لیے اس کے دل و دماغ میں مایوسی نے گھر کیا اور اگلے ہی لمحے اس نے اسے اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔

اس کا ایمان تھا کہ یہاں تک اللہ نے اسے کامیابی سے ہمکنار کیا تھا تو وہ یقیناً آگے بھی اس کی مدد کرے گا۔ کوئی منزل آسانی سے کب ملتی ہے؟اس کے لیے جستجو، کوشش اور ثابت قدمی کے علاوہ ہمت و حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔

لہٰذا شاہ زمان نے ایک راستہ منتخب کیا اور اللہ کا نام لے کر پیش قدمی شروع کردی۔

یہاں قدرے نیچی جھاڑیاں تھیں۔پھر کیمپ فور کے گردو پیش میں تو لگ بھگ سو سے ڈیڑھ سو گز تک صرف گھاس کا میدان تھا۔البتہ کچھ درخت اسے کہیں کہیں ایستادہ نظر آئے جس کے تلے باولی بنی ہوئی تھی۔درخت کی شاخیں باولی کے عین اوپر منڈیروں پر جھکی ہوئی تھیں۔

چند قدم بڑھانے کے بعد جہاں سے جھاڑیوں کا یہ سلسلہ ختم ہوتا تھا، زمان فوراً سینے اور پیٹ کے بل زمین پر لیٹ گیا۔

وہ اب کسی چوکنا چیتے کی طرح سینے اور کہنیوں کے بل آگے بڑھنے لگا۔یہ ایک خطرناک عمل تھا۔دیکھ لیے جانے کی صورت میں سب سے پہلے تو وہ خونخوار نظر آنے والے کتے اس کی طرف لپکتے، دوسرے گولیوں کی بوچھاڑ اس پر پڑتی تو وہ اپنے بچاؤ کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔

وہ نہایت احتیاط کے ساتھ چند گز آگے بڑھتا اور پھر رک جاتا اور گردن اٹھا کر محتاط انداز میں اس طرف دیکھ لیتا جدھر خطرناک کتے موجود تھے۔وہ ان کی حرکات و سکنات کو بھانپنے کی بھی کوشش کررہا تھا کہ کہیں انہوں نے اس کی بو تو نہیں پالی؟ پتوں اور بوٹوں کا لیپ خاطر خواہ کام دے رہا تھا۔

تاہم احتیاط اب پہلے سے زیادہ ضروری ہوگئی تھی کیونکہ اس نے اس مشکل فاصلے کو نصف پار کرلیا تھا۔وہ رک گیا... اور سامنے کا جائزہ لیتا رہا۔پھر اس نے کچھ سوچ کر لیٹے لیٹے اپنا رخ بدلا۔وہ مشرقی سمت سے آگے رینگنے لگا۔اس طرف باولی تھی اور وہ موٹا درخت۔ذرا فاصلے پر یہاں بغیر ہڈ والی ایک جیپ بھی کھڑی تھی۔وہ اس کی آڑ میں جانا چاہتا تھا۔

اچانک فضا میں ایک تیز سیٹی کی آواز ابھری۔وہ بری طرح ٹھٹک گیا۔اس کے بعد اسے شور سنائی دیا۔یہ آوازیں اسے اپنے عقب میں جھیل کی سمت سے آتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔وہ سمجھ گیا کہ اس کا ''کارنامہ'' آشکار ہوچکا ہے۔یوں بھی کیمپ فور کی عمارت جھیل سے زیادہ دور نہ تھی۔

شاہ زمان کے لیے یہ مشکل اور سنگین لمحات تھے۔وہ اپنا نصف سفر طے کرچکا تھا اور ایک طرح سے ابھی بیچ منجھدار میں تھا۔ایسے میں کیمپ میں بھی کھلبلی کا مچ جانا اس کے لیے خطرناک اور جان لیوا ثابت ہوسکتا تھا۔تاہم وہ ایک طرح سے اپنی ہوشیاری کے بل بوتے پر اس افراتفری سے فائدہ بھی اٹھا سکتا تھا۔

ذہن میں ابھرنے والے ایک فوری خیال کے تحت اس نے دوبارہ پیش قدمی شروع کردی۔کیمپ فور کے گرد مٹرگشت کرتے سپاہی چوکنا نظر آرہے تھے اور سب ایک ساتھ کھڑے ہوکر جھیل کی سمت ہی دیکھ رہے تھے۔

سیٹیوں کی مسلسل ابھرنے والی آوازوں کا یہی مطلب ہوسکتا تھا کہ آس پاس خطرہ ہے اور یہ ''خطرہ'' بالآخر اپنی جان جوکھم میں ڈال کر باولی والے گھنے درخت کے قریب پہنچ کر ٹھہر چکا تھا۔

☆☆☆

جنگ اور راج محل پر حملے کی خبر نے ہر طرف سراسیمگی کی لہر سی دوڑا دی تھی۔

چالاک رابرٹ کو گل کھلانے کا خوب موقع ہاتھ آیا تھا۔وہ پہلے ہی سونجنا کو اچھا خاصا شیشے میں اتار چکا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ جواہرات سمیٹ کر انگلستان (لندن) لے جانا چاہتا تھا۔وہ موجودہ حالات سے بھی بے خبر نہیں تھا۔

وہ اپنے ہم مذہب اور ہم قوم انگریزوں کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھا، جو جوع الارض اور اقتدار کے نشے میں غرق تھے اور جس کو نشانے پر رکھ لیتے اپنی مطلب برآری تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔

''اب وقت آگیا ہے سونجنا! میرا ساتھ دو..... اس سے پہلے کہ یہاں کچھ بھی نہ رہے اور ہماری محبت یہاں جنگ وجدال کی فضا میں فنا ہوجائے، ہم یہاں سے نکل چلتے ہیں۔''

ایک موقع پر رابرٹ نے سونجنا پر اپنے منصوبے

PakiBooksSite

کا آخری وار کیا۔ سونجنا کو راغب کرنے اور اس کے دل و دماغ میں یہاں کی غیر یقینی فضا پیدا کرنے کا اسے ایک سنہری موقع ہاتھ آیا تھا اور وہ اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا جبکہ اپنی ''بے لوث'' محبت کے ڈورے تو وہ اس پر پہلے ہی ڈال چکا تھا۔

وہ دونوں محل کے ایک بعید ترین کمرے میں موجود تھے۔ یہ آرام گاہ تھی۔ تاہم اسے نشست گاہ کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا مگر ایک عرصے سے وہ بے مصرف پڑی تھی۔ رابرٹ اور سونجنا ادھر ہی ملا کرتے تھے۔

رابرٹ نے سونجنا کو اپنی محبت کے جال میں اچھی طرح جکڑ لیا تھا۔ اسی سبب وہ اس کی بات سن کر پریشان اور کچھ سراسیمہ سی ہوگئی۔ بولی۔

''کک..... کیا واقعی ایسا کچھ ہونے والا ہے رابرٹ ڈیئر؟''

''ہونے والا نہیں ہے، بلکہ ہو چکا ہے۔'' رابرٹ چالاکی سے اسے مزید ڈراتے ہوئے بولا۔ ''کیا تمہیں نہیں معلوم کہ میں کون ہوں؟ ایک انگریز جنرل کا بھتیجا ہوں میں..... سونجنا! بھلا مجھ سے اپنوں کے عزائم کیسے چھپ سکتے ہیں؟''

وہ شیخی مارنے کے انداز میں بولا۔ وہ خود کو زبردستی جنرل مائیکل شا کا بھتیجا بتانے پر تلا ہوا تھا۔

''تمہارے باپ مہاراجا چندر گپتا کے مرنے کے بعد راج محل ہی کی نہیں بلکہ پورے ناگرہ کی فضا بدل گئی ہے۔ مہاراجا چندر گپتا کی بات اور تھی۔ وہ ایک دور اندیش انسان تھے۔ انہوں نے تمام انگریز افسران سے اچھے تعلقات بنا رکھے تھے۔ لیکن یہ نیا راجا اور تمہارا سوتیلا بھائی تو لگتا ہے سب کو ہی اپنے ساتھ لے ڈوبے گا۔ اس نے انگریز سرکار کو بری طرح ناراض کیا ہے بلکہ ان کی بے عزتی بھی کر ڈالی ہے۔ کیا تمہیں یہ سب معلوم نہیں ہے؟''

''معلوم ہے۔'' سونجنا نے دھیرے سے کہا۔ ''لیکن ہم نے بھی جنگ کی بھرپور تیاری کر رکھی ہے۔''

''اس کے باوجود تم لوگ ایک عرصے سے برسر اقتدار انگریزوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ان کے پاس جدید اور خطرناک اسلحہ ہے۔ طاقت ہے، نفری ہے۔ اس کے مقابلے میں تم لوگوں کے پاس کیا ہے؟ چند ایک جنگی پٹی توپیں اور بوسیدہ بارود۔ نہیں سونجنا! اس سے پہلے کہ وقت گزر جائے..... یہاں پورے ہندوستان کی فضا کو میں جلتے سلگتے دیکھ رہا ہوں۔ تم میرے ساتھ لندن چلی چلو۔ تم دیکھنا، وہ تمہیں خوابوں کی سرزمین محسوس ہوگی۔ وہاں سکون ہوگا۔ تم اور میں ہوں گے اور ہمارا گھر، ہمارے بچے ہوں گے۔''

اس کی آخر الذکر بات پر سونجنا کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔

''تم وہاں لندن میں کیا کرتے ہو؟'' سونجنا نے ایک لمحہ توقف کے بعد اس سے پوچھا۔

''مجھے بھلا کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' شاطر رابرٹ اس کے سوال کا مطلب سمجھ کر سینہ پھلا کر بولا۔ ''میں تو جدی پشتی ایک نواب ہوں۔ وہاں پوری کاؤنٹی کا مالک ہوں میں.....''

سادہ لوح سونجنا اس سے متاثر ہونے لگی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ رابرٹ وہاں لندن میں ایک تیسرے درجے سے بھی کم کی زندگی گزارتا تھا۔ خود کو کسی کاؤنٹی کا مالک کہنے والا رابرٹ وہاں کے سستے شراب خانوں اور قحبہ خانوں کی صفائی بھی کرتا رہا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ اسے صرف ان جواہرات سے غرض تھی جو سونجنا کی ملکیت تھے۔ لندن میں نوادرات کا درجہ رکھنے والی یہ نادر و نایاب اشیا کس قدر کشش کا باعث ہوتی تھیں اسے یہ بھی معلوم نہ تھا لیکن یہ سب شاطر دغاباز رابرٹ بہت اچھی طرح جانتا تھا۔

سونجنا اس کے لیے محض ایک کھلونا تھی اور ایک سونے کی ایسی چڑیا بھی جسے وہ چھری کے ایک ہی وار سے ذبح کر کے اس کا سب کچھ ہتھیا لینا چاہتا تھا۔ سونجنا کے حوالے سے اس نے بہت سے مکروہ منصوبے بنا رکھے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کھونا کرنے کے بعد بھی وہ اس کے لیے کتنی سودمند ہوگی۔

سادہ لوح سونجنا کو اگر اس کے مکروہ منصوبوں کی ایک ذرا بھنک بھی پڑ جاتی تو وہ اس کے ساتھ جانے کے بجائے ادھر ہی مرنے کو ترجیح دیتی۔

''مم..... مجھے کیا کرنا ہوگا؟ ہم کیسے یہاں سے نکلیں گے رابرٹ؟''

بالآخر سونجنا نے رابرٹ کے مطلب کی بات کر ہی ڈالی۔ وہ میدان سے پہلے ''میدان'' مارنے لگا تھا۔ وہ مکار اپنی مسرتوں پر قابو پاتے ہوئے اور اپنی آنکھوں اور لہجے میں سونجنا کے لیے محبت کا ایک موجزن سمندر سمو کر بولا۔

''کچھ بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ بس! میرے ساتھ رات کی کسی تاریکی میں نکل چلو۔ پانی والے جہاز میں انگلستان روانہ ہو جائیں گے۔''

''خالی ہاتھ.....؟'' سونجنا نے معصومانہ سی حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو رابرٹ بڑی محبت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا اور پھر اس کے مرمریں بازوؤں

کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے محبت پاش لہجے میں بولا۔

''تم مجھے مل جاؤ، بھلا اس سے بڑی دولت مجھ جیسے خوش نصیب انسان کے لیے اور کیا ہو سکتی ہے سونجنا!''

وہ مکار لومڑ معصوم سونجنا کے ساتھ پیار کے ناٹک کی پوری اداکاری کر رہا تھا۔ محتاط بھی تھا اور ابھی مطلب کی بات نوک زبان پر لانے سے گریزاں بھی تھا۔

''لیکن..... رابرٹ ڈیئر! میرے پاس کچھ نشانیاں ہیں، میرے ماتا پتا کی..... زر و جواہر کی صورت میں.....''

رابرٹ یہ سن کر اندر ہی اندر خوش ہوا کہ اس کی چال کے عین مطابق اسے کوئی تقاضا ہی نہیں کرنا پڑا تھا۔ مرغی اپنے انڈوں سمیت اس کے جال میں پھنس رہی تھی۔ وہ اوپری دل سے بولا۔

''اس میں کیا مشکل ہے؟ وہ سب سمیٹ لو بلکہ اور بھی جو کچھ سمیٹ سکتی ہو، وہ بھی..... کیونکہ یہاں انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد وہ یہ سب مہنگی اور قیمتی اشیا اپنے قبضے میں کر لیں گے۔ یوں بھی ان پر تمہارا ہی حق ہے اور بھلا اس قدر قیمتی نشانیوں کو چھوڑا تھوڑا ہی جاتا ہے۔ میں وہاں لندن میں انہیں اپنے محل نما مکان کے اندر سجا کر رکھوں گا۔ یہ اس کی زینت بڑھا دیں گے۔ پھر میں اپنے دوستوں کے سامنے فخر سے کہوں گا کہ دیکھو، میں نے اپنے شایانِ شان اور مرتبے کے مطابق ایک راجکماری سے ہی شادی کی ہے، ورنہ وہ کم بخت یہی کہیں گے کہ میں ہندوستان سے کسی ایسی ویسی لڑکی کو بیوی بنا کے لے آیا ہوں۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات سونجنا!''

رابرٹ نے بڑی مکاری سے یہ سب کہتے ہوئے سونجنا کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کر دیں۔

وہ اس کی بات پر کچھ سوچنے لگی۔ اس کے خوبصورت چہرے پر سوچ کی گہری لکیریں محسوس کر کے رابرٹ نے اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیری اور..... نرمی سے پوچھا۔

''کیا سوچنے لگیں؟''

''کاش! ماتا جی اور بھیا ایش کمار بھی ہمارے ساتھ چلتے۔''

''یہ کون سا مشکل کام ہے بھلا؟'' رابرٹ نے چالاکی سے کہا۔

''تم کیوں بھول جاتی ہو سونجنا کہ میں ایک جنرل کا بھتیجا ہوں..... جنرل مائیکل شا کا بھتیجا۔ تم دیکھنا، مجھ سے تمہاری شادی ہو جانے کے بعد تمہیں کس قدر احترام اور قدر و عزت کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔ شادی کے کچھ دنوں بعد ہم دونوں پورے شان و شوکت کے ساتھ دوبارہ ہندوستان آئیں گے۔''

''لیکن تب تک بھیا اور ماتا.....'' سونجنا کہتے کہتے چپ ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں مستقبل کے سہانے خواب بھی تھے اور اپنوں سے جدائی کا کرب بھی۔

''میں سمجھ گیا، تم کیا کہنا چاہتی ہو۔'' رابرٹ اس کی طرف دیکھ کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''یہی نا کہ تمہارے بھیا اور ماتا پر یہاں کیا بیتے گی..... تو میری بات کا یقین کرو، انہیں میں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ ہمارے لوگ یہاں قابض ہو بھی جائیں گے تو مجھے پورا یقین ہے کہ وہ راج محل کے کسی شخص کو جان سے کبھی بھی نہیں ماریں گے۔ قیدی ضرور بنا لیں گے، ہو سکتا ہے چھوڑ بھی دیں لیکن ہم یہاں کی پل پل کی خبر لیتے رہیں گے، تم اس کی بالکل فکر نہ کرو۔''

غرضیکہ رابرٹ نے سونجنا کو ہر طرح سے مطمئن کر دیا۔ اس کے بعد رابرٹ اسے کچھ مزید ہدایات دینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ وہاں سے رخصت ہونے ہی لگے تھے کہ ایک کان پھاڑ دھماکا ہوا۔ سونجنا دہل کر بے اختیار رابرٹ کے سینے سے جا لگی۔ رابرٹ بھی ذرا دیر کو پریشان سا نظر آنے لگا۔ باہر شور سا مچ گیا تھا۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ دوسرا دھماکا اس قدر شدید ہوا کہ ان دونوں کو راج محل کے در و دیوار لرزتے ہوئے محسوس ہوئے۔ سونجنا، رابرٹ کے ساتھ لگی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپنے لگی۔ وہ روئے اور چیخے جا رہی تھی۔

رابرٹ خود بھی چند ثانیے کے لیے پریشان سا ہو گیا تھا۔ راج محل پر گولوں کی بمباری اس کی توقع کے خلاف تھی۔ کیونکہ کسی ریاست میں حکومت پر قابض ہونے کے لیے راجاؤں اور مہاراجاؤں کے محل کو نقصان نہیں پہنچایا جاتا تھا۔ تاہم یہ بھی تھا کہ ایسا حربہ کسی ضدی راجا کو جھکانے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا لیکن رابرٹ نے اپنے منصوبے کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنا ضروری سمجھا۔ وہ بولا۔

''سونجنا مائی ڈارلنگ! میں نہ کہتا تھا کہ حالات بے حد خراب ہیں۔ اب باتوں کا بالکل وقت نہیں رہا۔ مجھے جواب چاہیے۔''

''مم..... میں تیار ہوں رابرٹ!'' سونجنا نے فوراً جواب دیا۔

''بس تو پھر جتنی جلد ہو سکے، وہی کرو جو میں نے

کہا ہے۔"

"لل..... لیکن اس وقت جنگ کے دوران ہمارا باہر نکلنا مناسب نہیں ہوگا۔" سونجنا بولی۔

"دیکھو، ڈرنے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ جنگ تو چھڑ چکی ہے، ابھی راج محل والے بھی جوابی حملہ کریں گے۔ تم وہی کرو..... جو میں نے کہا ہے۔ آگے تمہاری مرضی۔ میں اسی کمرے میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

سونجنا چلی گئی۔ رابرٹ حالات کا جائزہ لینے کے لیے باہر نکلا لیکن پتا چلا کہ جنگ چھڑ چکی ہے اور مکینوں کو باہر نکلنے کی اجازت نہیں۔ جو جہاں تھا اسے وہیں..... رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ جنگ جاری تھی اور راج محل کی جانب سے بھی جوابی حملے ہو رہے تھے۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں انگریز راج کے خلاف پروان چڑھنے والی نفرت کا وہ شکار نہ ہو جائے، اگرچہ اسے یہ تسلی بھی تھی کہ وہ راجا پرتاب کمار کے "خاص مہمانوں" کا درجہ رکھتے تھے۔

لیکن رابرٹ کو اس کی نجی چنداں پروا نہ تھی..... اس کا اپنا "کام" بہت جلد ہونے والا تھا۔ وہ سونجنا کے ساتھ کسی بھی وقت راج محل سے نکلنے ہی والا تھا۔ اس کے اپنے حق میں بھی ..... یہی تھا کہ وہ اب سونجنا کو لے کر جلد سے جلد راج محل سے ہی نہیں بلکہ ناگرہ سے بھی بہت دور نکل جائے۔

اسے اپنی بہن گارشیا کی بھی فکر نہیں تھی۔ وہ صرف اپنی غرض سے مطلب رکھنے والا انسان تھا۔ یوں بھی اسے ڈر تھا کہ ہوسکتا ہے گارشیا اس کا منصوبہ سن کر کسی پر آشکارا نہ کر دے۔ کیونکہ بھائی کے جانے کے بعد وہ اکیلی ہو جاتی جبکہ رابرٹ جانتا تھا کہ جب تک "رینا اور شوکی" کا معاملہ نمٹ نہیں جاتا، گارشیا یہاں سے ہلنے والی نہیں۔

وقت گزرنے لگا۔ صبح سے دوپہر تک جنگ میں شدت رہی۔ اس کے بعد بتدریج کمی آنا شروع ہوگئی۔ شام تک خاموشی چھا گئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ راج محل میں خوشی اور فتح کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔

یہی کہا جا رہا تھا کہ راج محل کی بہادر افواج نے لشکر غنیم کو جنوب مشرقی فصیل سے پرے ہٹنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ یہ فتح عارضی تھی اور بہت جلد فرنگی افواج راج محل پر دوبارہ حملہ کر سکتی تھیں جبکہ رابرٹ اپنے منصوبے کے لیے اس راہ کو اپنے لیے بہترین مددگار سمجھے ہوئے تھا۔ وہ منتظر تھا کہ سونجنا کب اسے روانگی کی خبر سناتی ہے۔

"کیا بات ہے برادر رابرٹ! تم بڑے خوش اور سنجیدے سے دکھائی دے رہے ہو؟" ایسے وقت میں جب وہ اپنے کمرے میں موجود سونجنا کی "تیاری" کا بے چینی سے منتظر تھا، اس کی بہن گارشیا اندر داخل ہوئی۔

اس کی تیکھی اور بھانپتی ہوئی نگاہوں نے بھائی کے چہرے سے اس کے اندرونی جذبات کو فوراً تاڑ لیا تھا، تاہم وہ خود ذرا پریشان اور فکرمند نظر آرہی تھی مگر رابرٹ بھی کم شاطر و مائع نہ تھا۔ اس نے کسی ہڑبڑاہٹ کا مظاہرہ یا مترشح تاثرات کے پکڑے جانے پر اسے چھپانے کی کوشش کرنے کے بجائے بات کو چالاکی سے گھما دیا۔ جانتا تھا کہ اس کی بہن اتنی آسانی سے مطمئن ہونے والی نہیں۔ لہٰذا بڑی مکاری سے اپنے لہجے کو رازدارانہ بناتے ہوئے اس سے بولا۔

"آہستہ بولو۔ بات خوشی کی ہی تو ہے۔ راج محل پر انگریز افواج نے حملے کی ابتدا کر دی ہے۔ اب یہاں عنقریب ہمارا راج قائم ہونے والا ہے۔"

"یہ تمہاری خام خیالی ہے رابرٹ!" گارشیا قریب رکھی کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے فکرمندی سے بولی۔ "ابھی ایسا کچھ بھی ہوتا دکھائی نہیں دے رہا۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ ناگرہ کے ساتھ پالن پور اور تریپال کی اتحادی افواج بھی شامل ہیں۔ یہ جنگ اتنی جلدی فیصلہ کن ثابت نہیں ہوسکتی۔"

"تو پھر تم کیا چاہتی ہو سسٹر! ہم یہاں سے کوچ کر چلیں؟ جبکہ ابھی ہم راج محل سے باہر نہیں جا سکتے۔"

"یہ میں کب کہہ رہی ہوں؟ لیکن..... حالات ٹھیک نہیں ہیں ہمارے لیے کیونکہ جنگ کی ایسی فضا میں ہمیں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے راج محل میں..... یہ تو راجا پرتاب کمار کی ہم پر کرم نوازی ہے کہ کسی کو ہمارے خلاف کہنے کی جرأت نہیں ہو رہی۔"

"تو بس سسٹر! راجا کی اس کرم نوازی کا خاموشی سے فائدہ اٹھاتی رہو، سب ٹھیک ہو جائے گا آگے چل کر....." رابرٹ نے بے پروا لہجے میں کہا تو گارشیا کو چپ سی لگ گئی۔ وہ بڑے غور سے بھائی کا چہرہ تکے جا رہی تھی۔

رابرٹ جب بہن کو چھوڑ کر کمرے سے نکلا تو ذرا ہی دیر بعد گارشیا بھی کمرے سے نکلی اور اس کے پیچھے چل دی۔ محل کے اندرونی گوشے سناٹے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس نے رابرٹ کو ایک کمرے میں گھستے دیکھا۔ وہ دروازے کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ اور سن گن لینے لگی۔ اسے اندر سے سرگوشی میں باتیں کرنے کی آوازیں آتی محسوس ہوئیں۔ اس نے دروازے کی ایک جھری سے

اندر جھانکا۔

یہ کمرا زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اندر اسے رابرٹ ہی نہیں سونجنا بھی موجود دکھائی دی۔ جھری سی چپکی ہوئی گارشیا کی آنکھ نے ایک اور حیران کن منظر دیکھا۔ فرش پر بچھے قالین پر لعل و جواہرات بکھرے ہوئے تھے اور لکڑی کا ایک صندوقچہ کھلا پڑا تھا۔

رابرٹ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ گارشیا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ سمجھ گئی کہ اس نے مچھلی کو اپنے جال میں پھنسا لیا ہے۔ کچھ سوچ کر اس..... ..... نے دروازے کو اندر کی جانب دھکیلنا چاہا تو وہ اندر سے بند ملا۔ اس نے دستک دے ڈالی۔ اندر موجود رابرٹ اور سونجنا چونکے پھر رابرٹ نے آگے بڑھ کر نپکی آواز میں پوچھا۔

"کون.....؟"

"میں ہوں، برادر! دروازہ کھولو۔"

بہن کی آواز سن کر رابرٹ نے جلدی سے دروازہ کھول دیا اور ایک جھٹکے سے اسے اندر کھینچ لیا۔ گارشیا اندر داخل ہوتے ہی لڑکھڑائی تھی لیکن پھر سنبھل گئی۔ رابرٹ نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور غصے سے بہن کا چہرہ تکنے لگا۔ گارشیا کے چہرے پر اس وقت بڑی مکارانہ مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

راجا پرتاب کمار کا سات مسلح سپاہیوں کا دستہ رینا کی تلاش میں ناکامی کے بعد [illegible] راج محل پہنچ چکا تھا۔ راجا نے جب ان سے یہ پوچھا کہ کیا انہوں نے کالی کے مندر میں رینا کو تلاش کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے یہی بتایا کہ وہ وہاں گئے تھے اور پجاریوں کی ناراضگی کی پروا کیے بغیر انہوں نے مندر کی تلاشی بھی لی تھی مگر وہاں رینا نہیں ملی۔

راجا پرتاب نے یہ سنا تو اسے رابرٹ اور گارشیا کی باتوں پر یقین آنے لگا کہ انہوں نے غلط نہیں کہا تھا۔ رینا کو شوکی ہی اغوا کر کے کہیں لے گیا تھا، لیکن جانے کیا بات تھی کہ اس کا دل نہیں مانتا تھا کہ شوکی ایسی حرکت کر سکتا ہے۔

جنگ چھڑنے کے بعد بھی پرتاب، رینا کی تلاش سے نچلا نہیں بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے دو تین خاص مخبروں کو رینا کی تلاش میں بھیج دیا، جبکہ ایک کو کسی شبہے کے تحت کالی کے مندر کی جاسوسی پر بھی لگا دیا۔

یوں جنگ چھڑتے ہی راجا پرتاب نے اپنی توجہ اس طرف بھی مبذول رکھی تھی۔ اس کے قلعے کی افواج نے فرنگی دشمنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔

راج محل کے سپاہیوں کو دشمن پر جوابی حملہ کرنے کی اس لیے بھی فوقیت حاصل تھی کہ وہ اونچائی پر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انگریز افواج کے پاس مقابلتاً جدید اسلحہ ہونے کے باوصف وہ راج محل کے بوسیدہ اسلحے کا مقابلہ نہیں کر سکے تھے لیکن یہ خیال صرف ناگرہ افواج کے سیناپتی موج سنگھ کے نائب آتما شکلے کا تھا جو اپنی ہی فوج کو غلط راہ دکھانے پر تلا بیٹھا تھا۔ اس لیے کہ وہ بچھو رام کا دستِ راست اور اس کی وساطت سے درونِ خانہ فرنگیوں کا پٹھو بن چکا تھا۔

اس پروپیگنڈے کے باعث بیشتر سپاہی خواب خرگوش کے مزے لوٹنے لگے۔ خود سیناپتی موج سنگھ بھی اس ایک جوابی حملے کی کامیابی کو فتح کا نقارہ سمجھ کے پاؤں پھیلائے بیٹھ گیا لیکن..... راجا پرتاب کے اور ہی تیور تھے۔

اچانک بجتے والا طبلِ جنگ ایک دم خاموش کیوں ہو گیا تھا؟ یہی ایک سوال اس کے حلق میں آنکڑے کی طرح اٹک کر رہ گیا تھا۔ صبح سے دوپہر اور سہ پہر تک جنگ کا بگل بجتا رہا تھا۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی تھی۔

سمجھنے والے اسے اپنی فتح سمجھ کے شادیانے بجا رہے تھے، لیکن راجا پرتاب کمار کو ایسی کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ فرنگی جنگ کرتا تھا تو اسے کسی منطقی انجام تک پہنچا کر ہی دم لیتا تھا۔ چاہے اس کی شکست ہی کیوں نہ ہو۔ اس خاموشی میں ایک راز ہی نہیں، کوئی مقصد بھی پوشیدہ تھا۔

بہت غور و خوض کے بعد راجا پرتاب نے اپنے سیناپتی موج سنگھ کو طلب کیا اور اسے حکم دیا کہ فرنگی جب تک کوہِ شالیہ کی سرحدوں پر موجود ہیں، ان پر جارحانہ حملے کیے جائیں۔

"راجا صاحب! بھگوان کی کرپا سے ہم جنگ جیتے ہوئے ہیں۔ فرنگی افواج کو ناگرہ کی سرحدوں سے پرے دھکیل دیا گیا ہے اور....."

"موج سنگھ.....!" راجا پرتاب کمار نے انتہائی سخت لہجے میں اپنے سیناپتی کی بات کاٹی۔ "ہم ناگرہ کی نہیں کوہِ شالیہ کی حدود کی بات کر رہے ہیں۔ فرنگی ایک سامراج ہیں، ہمارے ازلی دشمن ہیں وہ..... یہ بے حد مکار ہیں۔ یہ ہماری خام خیالی ہے کہ وہ ہم سے شکست کھا کر پلٹ گئے ہیں۔ وہ ہمارا دفاع تھا، اب ہم حملہ کریں گے اور انہیں کوہ شالیہ سے بھی پرے دھکیل دیں گے۔ حملے کا بگل بجاؤ۔"

موج سنگھ نے فوراً آداب بجالاتے ہوئے اس کے حکم کی تعمیل میں اپنے سر کو خم دیا..... اسی وقت کسی نے بتایا کہ اتحادی افواج کا سالار کلی ریحان شرفِ باریابی چاہتا ہے۔

"اجازت ہے۔" راجا پرتاب کمار نے اپنی اونچی

مسند پر شاہانہ تمکنت سے براجمان رہتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی موج سنگھ کو بھی جانے سے روک دیا۔

علی اندر داخل ہوا۔ اپنے اسلامی طرز میں پہلے وہ راجا پرتاب کا آداب بجالایا، ایک نظر قریب دست بستہ کھڑے موج سنگھ پر ڈالی جواب اس سے نظریں چرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بعد وہ راجا پرتاب سے مخاطب ہو کر احترام سے بولا۔

''عزت مآب راجا صاحب کی خیریت مطلوب تھی۔ یہاں دشمن افواج کا ایک گولہ گرا تھا۔''

''ہاں! ہم سب خیریت سے ہیں۔ دشمن پسپا ہو چکا ہے۔'' راجا پرتاب کمار نے شاہانہ وقار سے جواب دیا۔

''لیکن دشمن کی پسپائی سے متعلق میرا خیال کچھ اور ہے یور ہائنس!'' علی جس مطلب سے آیا تھا وہ بات اس نے کہنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس کی بات پر راجا پرتاب کمار نے بھویں اچکا کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تمہارا کیا مطلب ہے؟ کھل کر کہو.....''

''یور ہائنس! میں یہی عرض کرنے آیا تھا کہ دشمن کی پسپائی کو کسی بڑی فتح کے زمرے میں نہ لیا جائے۔ یہ تجاہل عارفانہ ہوگا اور ایک بڑی غفلت بھی۔'' علی نے کھل کر کہا اور ساتھ ہی آدابِ دربار کے مطابق معذرت خواہانہ رویہ اپناتے ہوئے دوبارہ مؤدبانہ کہا۔

''معافی چاہتا ہوں کہ میں نے غفلت کا لفظ استعمال کیا مگر اس وقت اس سے بہتر لفظ اور تھا بھی نہیں میرے پاس۔''

''نوجوان! آخر کہنا کیا چاہتے ہو تم .....؟ کھل کر کیوں نہیں کہتے؟''

''یور ہائنس! بات اتنی سی ہے کہ فرنگیوں نے ہم پر ہلّا بولا ہے۔ وہ چند فرسخ پیش قدمی بھی کر چکے اور ہم نے اب تک فقط دفاع کیا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ دشمن ابھی تک ہم پر دانت نکوسے ہوئے ہے۔ وہ اب بھی وہیں ہے جہاں سے چلا تھا۔ ہم چاہتے ہیں اب ہماری طرف سے دشمن افواج پر دھاوا بولا جائے اور اسے ریاست ہی نہیں بلکہ کوہِ شمالیہ سے بھی پسپا کر کے باہر دھکیل دیا جائے۔ ورنہ دشمن نے اب دوبارہ ہلّا بولا تو وہ پہلے سے زیادہ بھرپور اور زوردار بھی ہو سکتا ہے۔ بس یور ہائنس! یہی کہنا تھا۔''

علی اپنا مطمحِ نظر سمجھانے کے بعد چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ قریب کھڑا ناگرہ افواج کا سینا پتی موج سنگھ اس سے مسلسل نظریں چرا رہا تھا۔ اس کی ایک تو سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ جو عسکری تجزیہ علی نے کیا تھا، وہ راجا پرتاب کے خیالات کے عین مطابق تھا۔ راجا پرتاب علی سے متاثر ہوا مگر اس کا اظہار کیے بغیر اسی شاہانہ وقار سے بولا۔

''تم نے یہ بات ہمارے سینا پتی موج سنگھ سے کیوں نہیں کی؟''

''کی تھی حضور میں نے.....'' علی نے راجا پرتاب کی منافقانہ روش کو سمجھے بغیر ایک نظر موج سنگھ کی طرف دیکھ کر جواباً کہا۔ ''لیکن انہوں نے اسے کوئی خاص اہمیت نہ دی اور ہمیں دشمن کی اس خاموشی کے پس منظر میں ایک بڑے حملے کا خطرہ بے چین کیے دے رہا تھا۔ اس لیے آپ کے گوش گزار کرنے مجھے خود ہی آنا پڑا۔''

اس کی بات سن کر راجا پرتاب کمار نے کچھ تنبیہہ اور کچھ تادیبی نظروں سے اپنے سینا پتی موج سنگھ کی طرف دیکھا، جو اپنا سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ اس کی خاموشی علی کے سچ پر مہر تصدیق ثبت کر گئی ..... ایک اتحادی سالار کے سامنے اپنے سینا پتی کو سست وغیرہ کہنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے راجا پرتاب نے علی سے مخاطب ہو کے کہا۔

''ہم تمہاری بات پر پورا صاد کرتے ہیں۔ دشمن جب تک کوہِ شمالیہ کی حدود میں موجود ہے، ہمیں ان سے خطرہ رہے گا۔ لہٰذا ہم اپنے سینا پتی موج سنگھ کو حکم دیتے ہیں کہ معاہدے کے مطابق اتحادی افواج کے سالار علی ریحان کے مشوروں پر بھی عمل کرے۔''

''یور ہائنس! اجازت چاہوں گا۔'' علی نے کہا اور پلٹ گیا۔

''دیکھو موج سنگھ! ابھی تھوڑی دیر پہلے ہمارے ذہن میں بھی یہی بات آئی تھی، جو اس اتحادی سالار نے ہم سے آ کر کہی۔ حیرت ہے، یہ بات تم نے کیوں نہیں محسوس کی.....؟''

علی ریحان کے جاتے ہی راجا پرتاب نے اپنے سالار کو کھدیڑنا ضروری سمجھا۔ موج سنگھ بری طرح خجل ہو رہا تھا، اس سے کوئی جواب ہی نہیں بن پا رہا تھا۔ بالآخر اس نے اپنی اس کوتاہی کو تسلیم کرتے ہوئے معافی کی درخواست کر ڈالی اور جانے کی اجازت ملتے ہی وہ ... باہر آیا تو ایک آواز پر چونکا۔

''دیکھا مہاشے جی! میں نہ کہتا تھا کہ یہ مسلا سالار صرف اپنے فائدے کی سوچے گا۔ بھلا اسے راجا پرتاب کمار کے پاس جانے کی کیا ضرورت تھی؟''

موج سنگھ نے دیکھا یہ اس کا نائب آتما شکلہ تھا۔ جو علی کو راج محل میں داخل ہوتے ہی اپنے کان کھڑے کیے

دروازے سے لگا ساری باتیں سنتا رہا تھا۔

''اس نے کچھ ایسا غلط بھی تو نہیں کہا ہے۔!'' موج سنگھ نے کہا۔ اس کی یہ عادت اچھی تھی کہ وہ صحیح بات کو غلط نہیں کہتا تھا، چاہے وہ کسی نے بھی کہی ہو۔ اس کی بات پر شکلا اپنا سا منہ لے کر رہ گیا کیونکہ موج سنگھ پھر وہاں رکا نہیں تھا۔

☆☆☆

کرنل اینڈرسن اور اس کی رجمنٹ کے بارے میں ابھی تک نہ ناگرہ افواج کو اور نہ ہی اتحادی افواج کو علم ہو سکا تھا اس لیے کہ ابھی کرنل اینڈرسن نے کسی حملے کی ابتدا کی ہی نہیں تھی جو وہ پیچھے ہٹتا۔ نہ ہی اسے جنگ کی تازہ ترین صورتِ حال کا علم تھا۔ بس اب تک اس نے گولہ باری اور دھماکوں کی آوازیں ہی سنی تھیں۔ یہ جنگ ابھی جاری تھی۔ دن نکلا ہوا تھا۔

راج محل کی جس فصیل کو گرانا تھا، وہ ابھی تک نہیں گر پائی تھی اسی سبب کرنل اینڈرسن اپنی رجمنٹ کے ساتھ مورچے بنائے ہوئے انتظار میں تھا کہ اسے بھی پیش قدمی اور حملہ کرنے کا حکم ملے۔

کرنل اینڈرسن کی رجمنٹ سب سے مختصر کہلاتی تھی۔ ان کے حملے کی ابتدا پہلی دو رجمنٹ کے کامیاب حملوں سے مشروط تھی۔ ڈان کیورشم کی جنگی حکمتِ عملی یہی تھی کہ کرنل اینڈرسن کی رجمنٹ کو سب سے آخر میں راج محل پر حملے کے احکامات دیے جائیں۔

فرنگی افواج کا راج محل کو نشانہ بنانے کا مقصد یہی تھا کہ انہیں ڈرا دھمکا کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا جائے۔ راج محل کو بالکل ہی مسمار کرنا ان کے منصوبے میں شامل نہیں تھا کیونکہ یہاں انہوں نے اپنی کٹھ پتلی حکومت قائم کرنا تھی۔

یہاں اس کا مواصلاتی نظام کچھ بہتر ہوا تو اس نے بریگیڈیئر ڈان کیورشم سے ہدایت لینے کا سوچا لیکن پھر اس کی نظروں کے سامنے اپنی پیاری بیٹی ماریا کا چہرہ رقصاں ہو گیا، ساتھ ہی کالی کے مندر کے مہا پجاری بدری ناتھ کی مکروہ اور جلاد صفت صورت بھی گھوم گئی۔

اسے حیرت تھی کہ ابھی تک اسے حملے کے آرڈرز کیوں نہیں ملے جبکہ جنگ چھڑ چکی تھی۔ اس نے کیپٹن رچرڈ سے مشورہ کیا۔

کیپٹن رچرڈ ایک جوان لڑکا تھا، ذہین اور جنگی ماہر بھی۔ وہ کرنل اینڈرسن کے سینے میں چھپے ہوئے درد..... اور آتشِ انتقام کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ بولا۔

''حملے کا آرڈر ملا ہوتا تو ہم سب سے پہلے کالی کے مندر پر دھاوا بولتے..... لیکن کیا کیا جائے کہ اب تک ایسا کچھ نہیں کیا گیا۔''

''اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے ینگ مین؟ جنگ کی ابتدا تو ڈان کیورشم کر چکا ہے۔'' کرنل اینڈرسن بدستور مخمصے کا شکار تھا۔

''یقیناً اس کی کوئی وجہ ہوگی سر!'' کیپٹن رچرڈ بولا۔

''کیا وجہ ہو سکتی ہے بھلا؟'' اینڈرسن بولا۔ ''صبح ہی سے جنگ کی ابتدا ہو چکی ہے۔ دن آگے سرک گیا ہے اور ہم.....''

''آپ رابطہ کر کے پوچھ لیں، میں ٹیلی فون کی تاروں کو چیک کر لیتا ہوں۔ ہو سکتا ہے مواصلاتی رابطہ منقطع ہونے کے سبب آرڈر نہ مل سکا ہو۔''

''ایسی بات ہوتی تو گھڑسوار قاصد فوراً اس طرف روانہ کیا جاتا۔ رابطے کی ضرورت نہیں، میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔ مجھے تمہارے ساتھ کی ضرورت ہے۔'' کرنل اینڈرسن مطلب کی بات زبان پر لے آیا۔

''حکم کریں سر! میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

''جب تک کوئی آرڈر ملے، میں کالی کے مندر کے اس خبیث پجاری بدری ناتھ سے انتقام لینا چاہتا ہوں۔''

''میں آپ کا دکھ سمجھتا ہوں سر! میرے لیے کیا حکم ہے؟'' کیپٹن رچرڈ نے مؤدبانہ کہا اور تعظیماً اپنی آرمی کیپ کو چھوا۔

''تم نے کچھ نہیں کرنا، صرف میری غیر موجودگی میں ادھر موجود رہو گے۔'' کرنل اینڈرسن بولا۔ اس کا چہرہ جوشِ غیظ تلے سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ ''مجھے صرف دو فوجی چاہئیں، جو کمانڈوز کی ٹریننگ بھی رکھتے ہوں۔''

''مل جائیں گے سر! دونوں اسالٹ آپریشن کے بھی ماہر ہیں۔''

''گڈ! اور سنو..... مجھے زیادہ دیر تو نہیں لگے گی لیکن اگر دیر ہو جاتی ہے تو تم پوری طرح چوکس رہنا۔ ڈان کیورشم کا قاصد کوئی پیغام لے کر آئے تو اس پر عمل کرنے میں ذرا بھی دیر مت کرنا۔ تم میرے بارے میں اس سے کوئی بہانہ کر سکتے ہو۔''

اپنے رجمنٹ آفیسر کی بات پر کیپٹن رچرڈ نے صرف چند ثانیے کے لیے کچھ سوچا پھر مسکرا کر اپنے سیدھے ہاتھ کی دو انگلیوں سے انگریزی کا ''V'' بنایا۔ کرنل اینڈرسن نے مسکرا کر اس کا شانہ ہولے سے تھپتھپا دیا۔

دن چڑھ رہا تھا۔ کرنل اینڈرسن دو کمانڈوز کے ساتھ

اپنی خاص مہم پر کالی کے مندر کی طرف روانہ ہوگیا۔

کرنل اینڈرسن کا ٹارگٹ صرف کالی کا مندر تھا۔ وہ یہاں کے مہاپجاری بدری ناتھ سمیت سارے شیطان پجاریوں کو آناً فاناً موت کے گھاٹ اتار دینے کے لیے بے چین تھا، جہاں اس کی پیاری بیٹی ماریا کو ایک شیطانی قربانی کے لیے بڑی بے دردی سے ذبح کیا گیا تھا۔

کرنل اینڈرسن کے سینے میں جلتی ہوئی آتشِ انتقام اسے بری طرح بے چین کیے ہوئے تھی اور اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے قاتلوں سے جلد از جلد بدلہ لے کر ہی انتقام کی آگ بجھا سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ٹریژر آئی لینڈ جیسے اہم جزیرے کی ذمے داری کو کسی اور کے سپرد کر کے جنگ کے لیے یہاں چلا آیا تھا۔

اس کا اصل مقصد اپنی بیٹی کے سنگ دل قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانا تھا۔ ورنہ کرنل اینڈرسن تو جنگ سے بھی زیادہ اپنی اس وقت کی اہم ذمے داری صرف ٹریژر آئی لینڈ کو سمجھتا تھا۔ جہاں سے ہندوستان کا تمام نوادراتی اہمیت کا حامل اور بیش قیمت خزانہ دھیرے دھیرے افریقا کے ساحل کے ذریعے انگلستان پہنچایا جا رہا تھا۔

اس میں کرنل اینڈرسن کا بھی ایک بڑا حصہ تھا۔ جیسا کہ مذکور ہوا، یہی وہ ظالم فرنگی آفیسر تھا جس نے خاور حیات کے ٹولے کو بڑی بے دردی سے ہلاک کیا تھا۔ یہ مجاہدوں کا وہ ٹولا تھا جس نے فرنگیوں کی اس تاریخی چوری کے منصوبے کو نابود کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا مگر بدقسمتی سے ان کا مشن نہ صرف ناکامی سے دوچار ہوا تھا بلکہ وہ سارے سرفروش مارے گئے تھے۔ اب یہ مشن شاہ زمان اور اریبہ پورا کرنے نکلے ہوئے تھے۔

ٹریژر آئی لینڈ کے سلسلے میں کرنل اینڈرسن کا دعویٰ تھا کہ اس جزیرے میں خفیہ طور پر پروان چڑھنے والے منصوبے کو کامیابی سے صرف وہی جاری رکھ سکتا تھا۔

کرنل اینڈرسن درحقیقت مکافاتِ عمل کی زد میں آ گیا تھا۔ اس نے خاور حیات اور اس کے ساتھیوں کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا تھا اور وہی کچھ اس کی اپنی بیٹی ماریا کے ساتھ بھی ہوا تھا۔

بچھو رام نے اینڈرسن کو ان پجاریوں سے متعلق یہی بتایا تھا کہ یہ لوگ ریاست میں اپنا بہت اثر رسوخ رکھتے ہیں۔ اس قدر کہ یہاں کے راجا مہاراجا بھی ان کے معاملات میں ٹانگ اڑانے سے کتراتے ہیں۔

کرنل اینڈرسن نے اس کا ایک ہی حل نکالا تھا اور وہ تھا ''گوریلا کارروائی.....'' اگرچہ وہ جانتا تھا کہ اس کا یہ اقدام قبل از وقت ہے۔ یہ سب اسے راج محل یا ناگرہ کی سرحد پر حملہ کرنے کے بعد کرنا تھا مگر دل میں بیٹی کے انتقام کی آگ نے اسے اس قدر بے قرار کر رکھا تھا کہ وہ چپکا بیٹھا نہ رہ سکا۔ اسی سبب اس نے جنگ سے پہلے اپنی کارروائی کا آغاز کر ڈالا تھا۔

وہ اپنے دو بہترین کمانڈوز کے ساتھ نقشے کے مطابق پیچیدہ جنگلوں اور پہاڑیوں سے گزرتا، جھاڑیاں روندتا ہوا آگے بڑھتا رہا لیکن ناگرہ کی سرحد پر ان کا ٹکراؤ شاہی افواج کے مسلح پہرے داروں سے ہوگیا۔ چونکہ جنگ کا ماحول تھا اور سرحدی پہرے داروں کے علاوہ ناگرہ اور اتحادی فوج بھی موجود تھی۔ لہٰذا ان کی آپس میں زبردست جھڑپ ہوئی۔ کرنل اینڈرسن کے دونوں کمانڈوز مارے گئے۔ خود اینڈرسن مرتے مرتے بچا اور بری طرح زخمی ہو کر ان کے نرغے سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔

کرنل اینڈرسن نے اپنے رجمنٹ کیمپ پہنچ کر ہی دم لیا تھا۔ کیپٹن رچرڈ اپنے آفیسر کی یہ حالت دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ گوریلا کارروائی بری طرح سے ناکام رہی ہے۔

کرنل اینڈرسن کو طبی امداد دی گئی۔ اپنے مشن کی اس ناکامی پر وہ بری تلملایا ہوا تھا۔ وہ پہلے ہی بہت بپھرا ہوا تھا۔ اس نے فوراً اپنی رجمنٹ کو پیش قدمی کا حکم دے دیا۔

مقررہ ہدف پر پہنچ کر دونوں توپوں کے دہانے کھول دیے گئے۔ گولہ باری اور فائرنگ شروع ہوگئی۔ کیپٹن رچرڈ کرنل اینڈرسن کے ساتھ تابڑ توڑ حملوں میں مصروف تھا۔

اینڈرسن کسی ایسے موقعے کی تاک میں تھا کہ وہ کسی طرح ناگرہ کی افواج کو پیچھے دھکیلنے پر مجبور کر دے اور کالی کے مندر پر حملہ کر ڈالے۔ جب جنگ کا مقصد اصل سے ہٹ کر کچھ اور ہو جائے تو فتح کم ہی نصیب ہوتی ہے۔ اینڈرسن کا بھی یہی معاملہ تھا۔ وہ جوشِ انتقام کے جذبات سے مغلوب الغضب ہو رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا بہترین ساتھی کیپٹن رچرڈ مارا گیا۔ ان کی ایک توپ بھی تباہ ہوگئی۔ کئی فوجی مارے گئے۔ یہاں تک کہ کرنل اینڈرسن کو ایک بار پھر پسپا ہو کر پیچھے ہٹنا پڑا۔

وہ اپنی ناکامی اور ناقابلِ تلافی نقصان پر بری طرح تلملاہٹ کا شکار تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کالی کے مندر پہنچ جائے اور اسے چشمِ زدن میں کھنڈر بنا کر رکھ دے۔

پھر وہ یہاں نہیں ٹھہرا۔ اس نے باقی ماندہ فوجیوں کو

واپس کوچ کا حکم دے دیا اور بیس کیمپ جا پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اس پر مزید تکلیف دہ انکشافات ہوئے کہ ڈان کیورشم اور کرنل بلسٹروڈ بھی ناکامی سے دوچار ہوئے ہیں اور اب وہ سر جوڑے بیٹھے نئی حکمتِ عملی بنا رہے تھے۔

☆☆☆

بریگیڈیئر ڈان کیورشم کی پوری بٹالین اس وقت ناکام ہو کر ''تین حدّے'' کے بیس کیمپ پر موجود اپنی شکست پر بری طرح تلملاہٹ کا شکار تھی۔

ڈان کیورشم کی غصے اور طیش کے مارے بری حالت ہو رہی تھی، اگرچہ خود اس کی رجمنٹ کو بھی شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا لیکن اس نے اس شکست کی ساری ذمے داری کرنل بلسٹروڈ پر ڈال دی تھی۔

''تم ہماری فتح کو یقینی بنا سکتے تھے، کرنل بلسٹروڈ!'' ڈان کیورشم کیمپ کے ایک کھلے حصے میں دونوں ہاتھ پشت پر باندھے ٹہلتے ہوئے بولا۔ وہ اپنی سنہرے ستاروں والی مخصوص سرخ وردی میں ملبوس تھا۔

کیمپ کے اس حصے میں.... کرنل بلسٹروڈ، کمانڈنگ آفیسر جیرالڈ، میجر ڈی فارسٹ اور کرنل اینڈرسن ایک جانب خاموش اور شکست خوردہ سے کھڑے تھے۔ ڈان کیورشم کا اس وقت سارا خطاب کرنل بلسٹروڈ پر گر رہا تھا۔

''تمہارا روٹ زیرو جنگی اہمیت کا حامل تھا، بلسٹروڈ! اور سب سے زیادہ اہم بھی..... لیکن افسوس تم نے ... میری ساری توقعات پر پانی پھیر دیا۔''

ڈان کیورشم ٹہلتے ٹہلتے بلسٹروڈ کے قریب آ کر رکا۔ کرنل نے سر اٹھایا اور اپنی صفائی میں کہنے کی ہمت کی، بولا۔

''سر! میرا روٹ جتنا اہم تھا اس سے زیادہ مشکل اور دشوار گزار بھی تھا..... لیکن اصل وجہ.....''

''لیکن تمہیں اس سلسلے میں پوری بریفنگ دے دی گئی تھی۔'' ڈان کیورشم نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''بہ قول تمہارے تم اپنے مقررہ ہدف پر پہنچ کر حملے کی ابتدا بھی کر چکے تھے۔ تمہارا پہلا حملہ کامیاب رہا تھا، مگر دوسرے حملے میں تم نے یقیناً تساہل سے کام لیا ہوگا، تمہیں چاہیے تھا، پہلے حملے کی کامیابی کے بعد دوسرا حملہ پہلے سے بھی زیادہ بھرپور انداز میں کرتے۔ تمہارے پاس اسلحے کی کیا کمی تھی؟''

''میں نے یہی کیا تھا سر! اور کافی حد تک ہم آگے بھی نکل گئے تھے لیکن پھر اچانک ہم پر دوسری جانب سے ہلا بول دیا گیا۔ یہ دشمن اتحادی افواج کا ہم پر اچانک حملہ تھا۔ یہاں دو اطراف دشمن افواج موجود تھی۔ شکست کا سبب یہی دشمن اتحادی افواج ہے۔'' بلسٹروڈ نے جواز پیش کیا تو بٹالین کے نائب میجر ڈی فارسٹ کو بھی اصل صورتِ حال اور شکست کے جواز کا اندازہ ہوا، بولا۔

''میرا خیال ہے سر! ہم سے ایک غلطی یہ ہوئی کہ ہم دشمن اتحادی افواج کو نظر انداز کر گئے تھے۔ ہم نے انہیں ابتدا سے ہی اہمیت دینے کی کوشش نہیں کی۔ ناگرہ کے راجا پرتاب کمار نے بڑی مکاری اور چالبازی کے ساتھ اس بات سے ان دونوں ریاستوں کو خوف زدہ کر کے ساتھ دینے پر مجبور کر دیا ہوگا کہ اگر ناگرہ پر ہمارا قبضہ ہوگیا تو پالن پور اور تریپال بھی ہمارے آگے سرنگوں ہو جائیں گے۔''

ڈان کیورشم کے طیش میں ذرا کمی واقع ہوئی۔ وہ تھوڑی دیر تک خاموشی اختیار کیے رہا۔ اس کے بعد بولا۔

''ہمیں کمک منگوانی پڑے گی۔'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ دو فوجی گھبرائے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

''سر! دشمن افواج اس طرف آتے دیکھی گئی ہے۔ ان کے ارادے جارحانہ ہیں۔'' ان میں سے ایک نے اطلاع دی۔ وہاں موجود اعلیٰ افسران کے چہروں کے رنگ متغیر ہونے لگے۔

وہ اس اطلاع پر بری طرح چونکے تھے۔ ڈان کیورشم سمیت کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آ سکی تھی کہ سرحد سے باہر ان پر بھی حملہ کیا جا سکتا ہے۔

اسی وقت گولیوں اور دھماکوں کی آوازیں ابھریں۔ اگرچہ یہ آوازیں ذرا دور سے آتی محسوس ہوئی تھیں لیکن..... ان کی شدت سے بہ خوبی یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اگر فوری طور پر جوابی حملے کی تیاری نہ پکڑی گئی تو یہ دھماکے کچھ ہی دیر بعد ان کی کنپٹیوں تک رسائی حاصل کر لیں گے۔

''دشمن اپنی سرحدوں کو چھوڑ کر ہم پر حملے کی پوزیشن میں آ چکا ہے۔'' ڈان کیورشم کے لہجے میں حیرت تھی۔ اس کے بعد وہ سب حرکت میں آ چکے تھے۔

فائرنگ اور گولہ باری کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ فرنگیوں نے بیس کیمپ پر مورچے اور پکٹ بنانے کی مطلق ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ڈان کیورشم کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ دشمن افواج اس طرح کی بھی ہمت و جرأت کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔ اب اسے اچھی طرح احساس ہونے لگا تھا کہ ان کی جنگ صرف ناگرہ سے ہی نہیں ہے بلکہ تریپال اور پالن پور بھی ان کے خلاف کود پڑے ہیں۔

یہاں ان کے درمیان گھمسان کا رن پڑ گیا۔ یہ جنگ شام سے رات گئے تک جاری رہی۔ ناگرہ افواج اور اس

کے اتحادیوں نے فرنگیوں کے چھکے چھڑا دیے۔ بالآخر انہیں.....کوہ شالیہ کے بیس کیمپ سے بھی بھاگنا پڑا۔

فرنگیوں کے بہت سے فوجی مارے گئے۔ان کے ہتھیاروں پر قبضہ جمالیا گیا۔ان کے کئی فوجی قیدی بنالیے گئے۔ان میں دو اہم جنگی قیدی بھی شامل تھے۔ایک قیدی کرنل اینڈرسن اور دوسرا میجر ڈی فارسٹ.....

بھاگ جانے والے فرنگیوں کو سامان حتیٰ کہ اپنا بھاری اسلحہ بھی ساتھ لے جانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ انہیں سب چھوڑ کے بھاگ جانے میں ہی عافیت نظر آئی تھی۔یہ ان کی بڑی ذلت آمیز شکست تھی۔

دیکھا جاتا تو ناگرہ اور اس کے اتحادیوں کی اصل فتح اب ہوئی تھی۔اس میں اتحادی فوج کے سالار علی ریحان کی جنگی حکمتِ عملی کا زیادہ دخل تھا۔

☆☆☆

شوکی ان لاتعداد زہریلے سانپوں کے درمیان میں گرا تھا۔ان کی خوفناک پھنکاریں دل دہلا رہی تھیں۔شوکی نے کبھی بھی ایسی اذیت ناک موت کا تصور نہیں کیا تھا۔اسے افسوس اپنی موت کا نہیں، رینا کا تھا کہ وہ مرنے سے پہلے رینا کو اس شیطان پجاری بدری ناتھ کے چنگل سے نہیں چھڑا سکا تھا۔

اگلا لمحہ اس کے لیے ناقابلِ یقین ثابت ہوا، جب اس نے دیکھا کہ بپھرے ہوئے سانپوں نے اس پر ہلا بولنے کے بجائے اپنا رخ بدلنا شروع کر دیا ہے۔وہ کائی کی طرح پھٹتے چلے گئے۔شوکی نے اسی سفید سی شے کو ان کے بیچ لہراتے دیکھا۔اب اسے اس کی غصے سے بھری ہوئی پھنکار بھی سنائی دینے لگی تھی۔مندر کا فرش سانپوں سے صاف ہوتا چلا جا رہا تھا۔

وہ حیران بھی تھا اور خوش بھی کہ اسے جیسے ایک نئی زندگی مل گئی تھی۔اسی سفید پراسرار شے نے اس کی بروقت مدد کی تھی، جو پہلے بھی کر چکی تھی۔

وہ ایک دم سنبھل کر کھڑا ہو گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا، وہ سفید شے غائب ہو چکی تھی۔تب ہی اس نے زینے کی طرف دیکھا۔وہاں بدری ناتھ گنگ سا کھڑا دکھائی دیا۔وہ کبھی اس کی طرف تو کبھی مندر کے چٹے فرش کو گھور کر رہ جاتا، جو کچھ دیر پہلے لاتعداد زہریلے سانپوں سے اٹا پڑا تھا، مگر اب وہاں کئی سانپ اکڑے ہوئے مرے پڑے تھے جبکہ باقی سارے ادھر ادھر بھاگ گئے تھے۔اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب ہوا کیا تھا اور کیوں؟ پہلے تو اسے خیال آیا کہ کہیں اس مسلے نے کوئی جادو جنتر تو نہیں کیا تھا؟ بھلا یہ اتنے سارے زہریلے کوڑیالے سانپوں کو کیسے بھگا سکتا تھا؟

''بدری ناتھ!'' اچانک شوکی نے چیخ کر اسے للکارا اور ساتھ ہی خنجر نکال لیا۔''میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے رینا کا پتا چاہیے۔بتا، اسے تو نے کہاں رکھا ہے، ورنہ میں تجھے آج ہلاک کر کے ہی دم لوں گا۔'' اسے یہ دھمکی دیتا ہوا شوکی غیظ و غضب سے بپھرا ہوا خنجر تانے اس کی جانب بڑھا۔

بدری ناتھ کی بیل جیسی بڑے بڑے ڈھیلوں والی آنکھوں میں نفرت کی آگ سی بھڑکی۔

''رینا میرے قبضے میں ہے اور تو ساری عمر اسے میری قید سے نہیں چھڑا سکتا اور نہ ہی..میرا کچھ بگاڑ سکتا ہے مورکھ! تو نے میرا پہلے ہی اتنا نقصان کر ڈالا ہے۔میرے سارے پجاریوں کو مار بھگایا تو نے .....میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' بدری ناتھ بھی غصے سے کہتا زینے سے اتر کر اس کی جانب لپکا۔

دونوں جانی دشمن غصے اور طیش سے بپھرے ہوئے ایک دوسرے کی جانب بڑھے۔بدری ناتھ ... خالی ہاتھ تھا، جبکہ شوکی کے ایک ہاتھ میں خنجر تھا۔

''رک جاؤ.....اس کی طرف مت بڑھو۔'' وہی نرم اور مہربان سی آواز شوکی کے کانوں میں گونجی۔''یہ اس بار بڑا خطرناک داؤ چلنے والا ہے تمہارے ساتھ۔''

شوکی نے اس آواز پر.. کوئی توجہ نہ دی۔وہ جوشِ جنوں میں بدری ناتھ سے جا ٹکرایا۔اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر بدری ناتھ کے پیٹ میں گھونپنا چاہا تھا کہ اچانک بدری ناتھ نے عین وقت پر پلٹا کھایا۔اسے بدری ناتھ کے بھاری بھرکم کندھے کی ٹھوکر لگی۔وہ بری طرح لڑکھڑاتا ہوا کالی دیوی کے قریب جا گرا۔

خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر دور جا گرا۔ بدری ناتھ نے ایک شیطانی قہقہہ لگایا اور منہ ہی منہ میں کچھ بدبدانے کے بعد مورتی کی طرف اپنا منہ کر کے پھونک ماری۔

اچانک کالی دیوی کے کھلے پڑے منہ سے ایک تیز اور خوفناک پھنکار سنائی دی۔ساتھ ہی وہاں سے آگ کا ایک بڑا سا شعلہ پھوٹا۔اس کے بعد کالی دیوی کے منہ سے خوفناک پھنکاریں مارتا ہوا ایک سیاہ رنگ کا موٹا اور لمبا اژدہا برآمد ہوا۔وہ تیزی سے نیچے پڑے شوکی کی جانب لپکا۔

شوکی اتنے بڑے اور خوفناک اژدہے کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے دہل گیا، مگر دوسرے ہی لمحے اس نے حرکت کر کے اس سے بچنے کی کوشش کی۔اژدہا تیزی سے حرکت کرتا ہوا اس کے جسم کے گرد لپٹتا چلا گیا۔

شوکی کا دم گھٹنے لگا۔اژدہا اسے بل پر بل دیے کستا چلا جا رہا تھا کہ اچانک.....شوکی کی لمحہ بہ لمحہ ڈوبتی آنکھوں نے پھر وہی سفید شے لہراتی ہوئی دیکھی۔وہ پھر بجلی کی طرح لہرائی اور اژدہے سے ٹکرائی۔اژدہے کے منہ سے تیز پھنکار برآمد ہوئی اور اگلے ہی لمحے اس کا جسم اکڑنے لگا۔

بل ڈھیلے پڑتے چلے گئے۔وہ شوکی کو چھوڑ کر دھم سے گرا اور.....اسی طرح فرش پر اکڑ کر رہ گیا جس طرح سانپ اکڑے تھے۔پتا چلتا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔

''کون ہے تو.....مورکھ! بتا مجھے .....کیسے میرے جنتر منتر ضائع کیے جا رہا ہے؟ سچ سچ بتا.....تیرے پیچھے کون سی شکتی کا ہاتھ ہے؟''

بدری ناتھ کی بوکھلاہٹ عروج پر تھی۔شوکی اسے کیا بتاتا؟ وہ تو خود حیران تھا کہ یہ ہو کیا رہا تھا؟ کون مہربان شخصیت تھی جو اس کی مدد کر رہی تھی اور سرگوشی میں بھی اس سے بات بھی کر لیتی تھی۔

وہی سرگوشی دوبارہ اسے سنائی دی۔''میں پھر کہتی ہوں.....چلے جاؤ یہاں سے.....اپنی جان بچاؤ۔''

''ہرگز نہیں، میں رینا کے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا، چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔'' شوکی بالآخر پاگلوں کی طرح چلا کر بولا۔وہ پھر بدری ناتھ کی طرف بڑھا لیکن وہ حیران رہ گیا۔بدری ناتھ غائب ہو گیا تھا۔

''بدری ناتھ! میرے سامنا آ.....یوں بزدلوں کی طرح کیوں غائب ہو گیا؟ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا.....تو کیسا مہابلی ہے، کیسا مہارشی ہے.....؟ مجھ سے ڈرتا ہے؟ بزدل.....خبیث، شیطان.....!'' شوکی غصے اور جنون سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔''یاد رکھ شیطان! میں رینا کو یہاں سے لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔ٹھیک ہے تو نہیں آتا سامنے تو دیکھ میں کیا کرتا ہوں۔''

جوشِ جنوں اور غیظ سے شوکی کے بپھرے ہوئے بدن کا رُواں رُواں کانپ رہا تھا۔وہ دوڑتا ہوا کالی دیوی کے قریب آیا اور اس دیوہیکل مورتی پر چڑھ گیا۔اس کے ایک ہاتھ میں کانٹے دار گرز تھما ہوا تھا۔وہ اس نے کسی طرح ہاتھ سے نکال کر اپنے قبضے میں کیا پھر مورتی سے نیچے اتر کر اس نے وہ گرز مورتی پر مارنا شروع کر دیا۔

ہر ضرب پر مندر میں ہولناک سی گونج پیدا ہوتی تھی۔ کالی دیوی کی مورتی کو کسی کرسی پر شاہانہ حکمنت کے ساتھ

رنگِ آسماں

موتی مالا

☆اگر خیالات میں گہرائی ہو تو کردار میں سادگی آجاتی ہے۔

☆دو کل مل کر بھی آج کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

☆ہم یہ جانتے ہیں کہ ہم کیا ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ ہم کیا بن سکتے ہیں۔

کچھ باتیں

☆آنکھ کے پانی اور ندی کے پانی میں جذبات کا فرق ہے۔

☆رنگین خواب دیکھنے سے بہتر ہے کہ انسان ڈٹ کر زندگی کی بلیک اینڈ وائٹ حقیقتوں کا سامنا کرے۔

☆زمین پر تکبر سے پاؤں مارنے والا یہ نہیں جانتا کہ اس کے قدموں کے نیچے اس جیسے انسانوں کی مٹی ہے۔

(مستنصر حسین تارڑ)

مسکراتی کرنیں

☆ہماری قسمت کا فیصلہ ہماری زبان کی نوک پر ہوتا ہے۔

☆محض بڑا ہونے سے کیا ہوتا ہے جب تک فیض نہ ہو۔کھجور کے درخت کو دیکھو کہ مسافر کو سایہ بھی نہیں اور پھل بھی بہت دور۔

☆اپنی زندگی کے واقعات میں ایسے پھول بکھیرو کہ لوگ انہیں چننے کی کوشش کریں۔

☆محبت ہمیشہ اپنی گہرائیوں سے بے خبر رہتی ہے جب تک جدائی کے لمحے اسے بیدار نہ کریں۔

مرسلہ۔وزیر محمد خان، بلل ہزارہ

جنگ بندی

نیّر ندیم سے۔''اچھا تو تمہاری بیوی اب تم سے بالکل جھگڑا نہیں کرتی؟''

ندیم۔''بالکل، اب وہ مجھ سے جھگڑا نہیں کرتی۔''

نیّر۔''حیرت ہے لیکن یہ معجزہ کیسے رونما ہوا؟''

ندیم سرد آہ بھر کے بولا۔''یار! اس کا انتقال ہو گیا ہے۔''

مرسلہ۔ریاض بٹ، حسن ابدال

بیٹھا ہوا بنایا گیا تھا، شوکی نے اس کی ٹانگوں سے ہی گزر برسانے کی ابتداء کی تھی۔ اس کا توانا جسم پسینے سے شرابور ہوگیا۔ وہ مورتی پر ضرب پر ضرب برسائے جا رہا تھا۔

مورتی ٹوٹنے لگی۔ چیخ کے ایک طرف کو جھک گئی۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ اگلی چند ضربات کے بعد فرش پر گر کر پاش پاش ہو جاتی کہ اچانک اسے اپنے دائیں جانب سے ایک آواز سنائی دی۔

''رک جاؤ..... میں آگئی ہوں۔''

ہانپتا ہوا شوکی اس آواز کو سن کر رک گیا۔ گرز ہنوز اس کے ہاتھ میں تھما ہوا تھا۔ اس کی سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی۔ وہ اس آواز کو اگر پہچانتا نہ ہوتا تو کالی دیوی کی مورتی کو پاش پاش کر کے ہی دم لیتا۔

وہ آواز رینا کی تھی۔ اس رینا کی جس سے وہ بے اندازہ محبت کرتا تھا۔ اس کی خاطر ہی اس نے ہر بڑی رکاوٹ کو عبور کیا تھا اور کر رہا تھا۔ رینا..... جس کی خاطر وہ بلا خوف و خطر بڑی سے بڑی طاقت سے بھڑ جایا کرتا تھا۔ چاہے انجام جو بھی ہو۔ وہ رینا..... اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''رینا.....!'' وہ اسے دیکھ کر خوشی سے چیخا اور گرز پھینک کر بے اختیار اس کی جانب لپکا۔ وہ اس کے لیے اس قدر بے تاب ہو رہا تھا اور ایسی دیوانہ وار تڑپ محسوس کر رہا تھا کہ قریب پہنچتے ہی وہ اس سے لپٹ گیا۔ اگلے ہی لمحے رینا نے ایک سیاہ رنگ کی ناگن کا روپ دھار لیا اور ایک خوفناک پھنکار خارج کرتے ہوئے اس کی گردن پر ڈس لیا۔ شوکی کے حلق سے تیز سسکاری نکلی اور وہ فرش پر گر پڑا۔ وہ تڑپ رہا تھا، اس کے بعد اس کی یہ تشنجی حرکات ماند پڑنے لگیں۔ اسی وقت ایک بھیانک قہقہہ گونجا اور بدری ناتھ ایک طرف سے نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ رینا بھی بے حال سی کھڑی تھی۔ اس کے سنہری بالوں کو بدری ناتھ نے اپنے بدہیت کالے ہاتھوں سے دبوچ رکھا تھا اور بری طرح گھسیٹ کر اسے اس طرف لا رہا تھا جہاں شوکی کا بے سدھ وجود گرا پڑا تھا۔

''یہ دیکھ اپنے عاشق کو..... تجھے میرے چنگل سے چھڑانے آیا تھا۔ بہت تباہی مچائی اس نے یہاں، بہت نقصان کیا ہے اس نے میرا۔ تیرے یارانے نے اسے پاگل جنونی بنا ڈالا تھا مگر آخر کار میرے ہی ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ دیکھ لے اس مورکھ کی لاش تاکہ تو بھی اب اس کا خیال دل سے نکال دے اور شانت رہے یہاں۔''

بدری ناتھ نے رینا سے بڑے حقارت اور غرور آمیز انداز میں کہا اور رینا، شوکی کو یوں بے حس و حرکت پڑا دیکھ کر ایک چیخ مار کے اس پر گری، بدری نے اس کے بال چھوڑ دیے تھے۔ اس نے دیکھا کہ اس کی گردن پر دو ننھے سوراخ بنے ہوئے تھے جن سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ وہ جان گئی کہ اسے سانپ نے ڈس لیا تھا۔

''شوکی.....'' رینا نے ایک غم زدہ سی چیخ ماری اور خود بھی اس پر گر کے بے ہوش ہوگئی۔

بدری ناتھ کے شیطانی قہقہوں سے پورا مندر گونجنے لگا۔ ٹھیک اسی وقت ایسی آواز ابھری جیسے کوئی بھاری بھرکم شے اپنی جگہ دھیرے دھیرے چھوڑ رہی ہو۔ یہ آواز اس کے عقب سے ابھر رہی تھی۔ وہ چونک کر پیچھے کی طرف گھوما اور اگلے ہی لمحے خوف و دہشت سے اس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ وہ فتح کی ساری مستی اور قہقہے بھول گیا۔

اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں کالی دیوی کی مورتی کو فرش پر یوں ہوتے دیکھ رہی تھیں۔ وہ گری اور منہدم ہوتی چلی گئی۔ ایک ہولناک دھماکا ہوا اور وہ پاش پاش ہوگئی۔ کالی دیوی کی مورتی کے گرتے ہی ہال میں گرد و غبار کے بگولے اٹھے اور پھر چند لمحوں بعد یہ مٹیالے بادل ذرا چھٹے تو بدری ناتھ کی خوف زدہ نظروں نے اپنی اس تنگ سی کوٹھری کا دروازہ از خود وا ہوتے دیکھا۔ دروازہ ایک ہلکی سی اسرار بھری چرچراہٹ کے ساتھ کھلا تھا۔ یہ وہی کوٹھری نما کمرا تھا جہاں وہ کسی سادھو کی ''گڈے'' نما مورتی سے مخاطب ہوا کرتا تھا، وہاں دھری پڑی وہی انگیٹھی از خود سلگ اٹھی تھی۔ ماحول میں پراسراری تاریکی چھا گئی تھی۔ انگیٹھی کے سلگتے شعلوں کی سرخ انگارہ روشنی میں اسے طاق میں رکھی سادھو کی مورتی نظر آگئی اور پھر اگلے ہی لمحے بدری ناتھ کی وہی حالت ہونے لگی جو اس سے مخاطب ہوتے وقت ہوتی تھی۔ پھر اچانک ایک زوردار ہنکارا ابھرنے کی آواز ابھری۔

مہا پجاری بدری ناتھ کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور پھر ایک دم پوری کھل گئیں، جیسے عرصے سے قبر میں پڑے کسی مردے کی کھل گئی ہوں۔ ماحول بھی اسی طرح ایکا ایکی خوفناک اور پراسرار سا ہوگیا۔ بدری ناتھ کی کھلی آنکھوں سے اب ڈھیلے غائب ہو چکے تھے اور اس کی جگہ ہلکی ہلکی لوٹمٹانے لگی تھی۔ اس کا مکروہ چہرہ ڈراؤنا سا ہونے لگا تھا۔ تب ہی اس کے حلق سے آواز ابھری۔ یہ اس کی آواز ہرگز نہ تھی۔

''مورکھ! کالی کی رکھشا تیرے ذمے تھی، پر تو تو اس کی رکھشا نہ کر سکا۔ اس کا پوتر استھان نشٹ کر دیا۔ کالی نے تجھے کتنی شکتیاں دان کر رکھی تھیں۔ تجھے مہابلی سے مہارشی دان ہونے والی تھی، پر تو سب تو نے ایک مسلے کے ہاتھوں خاک میں ملا دیا۔ اب تم وہی پتیا بھوگے جو اس منزل تک پہنچنے کے لیے پہلے بھی تمہیں بھوگنا پڑی تھی۔ پر تو اس بار بڑی کٹھنا ہوگی، تو ایک قیدی کی صورت زندگی کے دن تاریک اور ویران گپھاؤں میں گزارے گا۔ وہاں تجھے ایک کھانڈا..... دی جائے گی، جس سے تو ہر روز اپنے شریر میں ایک چرکا لگایا کرے گا۔ بہت عرصہ بھوگنا پڑے گا تجھے ہولناک ویرانوں میں۔ تجھے نہیں معلوم تیرے ہی کارن یہاں کون آگیا تھا..... نہیں جانتا تو.....! تو نے اپنے دشمنوں کو..... کالی کے دشمنوں کو مضبوط کر دیا۔ اس پوتر استھان کا ہی نہیں بلکہ کالی دیوی کا بھی اپمان کر دیا۔ چل بھوگ..... اپنا کرم.....''

اس کے بعد بدری ناتھ کے موٹے موٹے بدہیت ہونٹ ایک دم تھم گئے۔ آنکھوں میں ٹمٹماتی کو غائب ہوگئی۔ چہرے کا ڈراؤنا پن ماند پڑنے لگا۔ اس کا چہرہ بتدریج معمول پر آگیا، لیکن دوسرے ہی لمحے بدری ناتھ کے حلق سے لرزہ خیز چیخیں ابھرنے لگیں۔ وہ پاگل جنونیوں کی طرح اپنے سر کے بال نوچنے لگا۔ خود گزیدہ ہونے لگا، پھر بے سدھ ہو کر گر پڑا۔ مٹیالے بگولے اسے اپنے گرد لپیٹنے لگے۔

مندر کی فضا گدلی ہونے لگی۔ شوکی اور رینا ایک دوسرے پر بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔

کالی کے مندر کے باہر دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ وہی وقت تھا جب راجا پرتاب کے تین مخبروں میں سے ایک مخبر نے کالی کے مندر کی سن گن لینے کے لیے یہاں کی راہ لی تھی۔ وہ اندر ہونے والے دھماکوں اور گرد و غبار کو دیکھ کر یہی سمجھا کہ شاید فرنگیوں کی گولہ باری ہوئی ہے، مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اندر کسی عورت کی چیخ کی آواز سنی تو وہ فوراً پکا اور دروازے سے گزر کر جب ہال میں آیا تو دنگ رہ گیا۔

اسے رینا بے ہوش پڑی ملی۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے بے ہوش رینا کو اٹھایا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کے نیچے گرد و غبار سے اٹا ہوا ایک اور جسم بھی پڑا ہے۔ اس نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ وہ تو اپنا کام نمٹانا چاہتا تھا جو تقریباً نمٹ ہی چکا تھا۔ اس نے بے ہوش رینا کو کندھے پر ڈالا اور راج محل کا رخ کیا۔

ادھر کالی کے مندر کی دیواریں لرزنے لگیں۔ یوں لگا جیسے وہ اب تب میں منہدم ہونے والی ہوں اور یہی ہوا۔ دیواریں ڈھنے لگیں۔ پہلے شمالی دیوار گری، پھر چھت کا ایک کونا گرا، دروازے گرے اور پھر مندر آہستہ آہستہ مسمار ہونے لگا۔

اسی وقت وہی رسی نما سفید شے برآمد ہوئی اور فضا میں لہراتی ہوئی گرد آلود فرش پر پڑے شوکی کے قریب آگئی اور کسی رسی کی طرح ہی اس کے جسم سے لپٹنے لگی۔ یہاں تک کہ شوکی کا بے سدھ پڑا جسم اس میں چھپ گیا اور ٹھیک اسی وقت مندر کی دوسری دیوار بھی منہدم ہوئی تو پوری چھت بھی نیچے آرہی۔ وہ سفید اور پراسرار سی شے شوکی کے ساتھ لپٹتے ہی اس سمیت غائب ہو چکی تھی۔

کالی دیوی کا یہ شیطانی مندر پوری طرح ڈھے چکا تھا اور اب کسی اجڑے کھنڈر کی تصویر پیش کرنے لگا تھا۔ اس کی بربادی دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے ایک طویل شیطانی داستان کا خاتمہ ہو چکا ہو۔ لیکن بعض ایسی داستانوں کا اختتام ہی دراصل ابتدا ہوتی ہے۔ ایسی ابتدا جس کا اختتام ابتدائیے سے زیادہ کڑا اور بھاری ہوتا ہے۔

☆☆☆

راج محل کا جاسوس بے ہوش رینا کو اپنے کندھے پر لادے راج محل جا پہنچا اور جیسے ہی راجا پرتاب کمار کو اس کی خبر ملی، اس نے اسے اپنے روبرو پیش کرنے کا حکم صادر کر دیا۔

رینا کو اس حالت میں دیکھا تو پرتاب کمار تشویش زدہ ہوگیا۔ اس نے فوراً شاہی حکیموں کو رینا کے علاج معالجے کے لیے طلب کر لیا۔ ایک شاہانہ آرام دہ کمرا اس کے لیے مقرر کر دیا گیا اور خادماؤں کو حکم دیا کہ وہ رینا کے پاس سے ایک لمحے کے لیے بھی نہ ہٹیں۔

کافی دیر بعد رینا کو ہوش آیا اور شاہی علاج رنگ لایا تو اس کی حالت قدرے سنبھل گئی۔ اسے سب یاد آگیا اور پھر اسے وہ کرب آمیز منظر یاد آیا جب اس نے شوکی کو فرش پر بے سدھ پڑے دیکھا تھا۔ اس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔

وہ بے چین ہوگئی۔ اس نے ''شوکی..... شوکی'' پکارنا شروع کر دیا۔ راجا کو بتایا گیا تو وہ خود اس کے کمرے میں آن پہنچا۔

رینا نے رو رو کر اسے سارا ماجرا بیان کیا تو..... حقیقت کا علم ہوتے ہی راجا پرتاب نے فوراً ایک ٹکڑی تیار کرنے کا حکم دیا اور رینا کو ساتھ لے کر کالی کے مندر کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس کے ہمراہ مصاحبِ خاص کی بیٹی بھی تھی جو پیچھے چلی آرہی تھی۔

یہ سب لوگ جب وہاں پہنچے تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ کالی کے مندر کی جگہ اب وہاں صرف کھنڈر نظر آتا تھا، جس کے دامن سے دھوئیں کی باریک لکیریں بلند ہو رہی تھیں۔ پھر بھی رینا کے کہنے پر کچھ لوگ اندر گئے اور کافی دیر تک شوکی کا سراغ لگاتے رہے مگر وہاں انہیں کوئی نہ ملا۔ وہاں کا منظر ہی کچھ ایسا تھا جیسے کہ سب کچھ تباہ و برباد ہو چکا ہو اور کچھ بھی باقی نہ بچا ہو۔

☆☆☆

ایسے میں دو باتوں کا وقوع پذیر ہونا یقینی امر تھا۔ اول یہ کہ خطرہ اس کے سر پر پہنچ جاتا دوم یا خطرہ سر سے ٹل جاتا۔ شاہ زمان کی یہ خوش قسمتی تھی کہ یہاں امر دوم واقع ہوا اور خطرہ اس کے سر سے عارضی طور پر ہی سہی مگر ٹل گیا۔

جھیل کی جانب سے سیٹیوں اور شور کی آوازیں سن کر کیمپ فور کے گرد مٹر گشت کرتے بہت سے فوجی اس جانب دوڑے۔ شاہ زمان باولی والے درخت کے تنے کی آڑ میں ہو گیا، اس طرف باولی کی منڈیر تھی اور درمیانی خلا میں خودرو کائی زدہ جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔

جیسے ہی سب لوگ اس کے قریب سے دوڑتے ہوئے بھاگے وہ خلا سے باہر نکلا اور اسی طرح جھکے جھکے انداز میں چلتا ہوا پہلے جیپ کے قریب پہنچا اور ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اس کی احتیاط کام آئی اور اس نے دیکھا کہ اب بھی چند فوجی وہاں موجود تھے، اگرچہ ان کا رخ بھی جھیل کی طرف ہی تھا اور وہ وہاں کھڑے کھڑے اپنے طور پر اندازہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ہوا کیا تھا؟

وہ چند ہی تھے اور ساتھ آن کھڑے ہوئے تھے۔ زمان جیپ کی آڑ سے نکلا اور بے آواز کیمپ فور کی عقبی سمت میں چلا گیا۔

اب اسے جو کرنا تھا وہ فوری کرنے کا متقاضی تھا۔ اس کی متلاشی اور چوکس نظروں نے پہلے اردگرد اور عقب میں دیکھا، پھر کیمپ کی پچھلی سمت کا جائزہ لیا۔ عارضی اور عمومی انداز کے بنے اس کیمپ میں داخل ہونے کی بہت سی جگہیں تھیں۔ وہ ایک جگہ کو نسبتاً کارآمد محسوس کرتے ہی آگے بڑھا اور ایک بند کھڑکی کے چھجے سے اوپر چڑھ کر بڑے سے روشن دان کے ذریعے اندر کود گیا۔

وہ جس کمرے میں کودا تھا، کوئی اسٹور ہی محسوس ہوتا تھا۔ وہاں الابلا اور کچھ فولادی آلات بکھرے پڑے تھے۔ ان میں خالی بوتلیں، ٹن اور کچھ اسلحہ اور کھانے کے کھلے ہوئے ڈبے تھے۔

وہ اس کے دروازے سے باہر نکلا اور ایک تنگ سی راہداری میں آ گیا۔ اندر اندھیرا رکھا گیا تھا۔ باہر سے دن کی مقدور بھر روشنی اندر پڑتی تھی۔ وہ آگے بڑھتا رہا۔ ایمونیشن اس کے پاس بھی تھا، کچھ اس نے مزید ایک کمرے میں جھانک کر اسلحہ خانے سے اٹھا لیا تھا۔

شاہ زمان ایک جنگجو گوریلا تھا۔ خاطر خواہ اسلحہ ہاتھ میں آتے ہی وہ اپنے اندر عجیب طرح کا اعتماد محسوس کرنے لگا۔ اسے اریبہ کی تلاش تھی۔ آگے بڑھتے ہوئے ایک تنگ سی راہداری میں بائیں جانب مڑتے ہی وہ ٹھٹک کر رکا۔ اسے سامنے کی دیوار میں ایک کمرے کا سنگل پٹ والا دروازہ دکھائی دیا۔ اس کی مخملی درز سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اندر اسے کسی کے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ رک گیا اور دروازے سے کان لگا دیا۔

''میری بات مان لے اے حسینہ! میں تجھے رہائی دلا دوں گا۔'' اسے ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ بولنے والے نے یہ خیال بھی نہیں رکھا تھا کہ کوئی باہر سے اس کی آواز بھی سن سکتا ہے۔ شاید اسے علم تھا کہ اس وقت ماسوائے چند ایک کے کوئی بھی اس عمارت میں موجود نہیں ہے۔ تاہم وہ عجلت میں ہی بول رہا تھا۔ یہ معنی خیز جملہ سن کر زمان کے اعصاب یکلخت تن گئے اور وہ سرتاپا سماعت بن گیا۔

''دیکھ! ہم وعدے کے پکے ہیں۔'' ایک اور اسی طرح کی بھاری مردانہ آواز ابھری۔ ''ہم دونوں سے میل کر لے، ورنہ یہ فرنگی آفیسر رینالڈ تجھے ویسے بھی اتنی آسانی سے نہیں چھوڑے گا۔ ہماری والی بات تو تجھ سے ضرور پوری کرے گا اور بعد میں تجھے گولی بھی مار دے گا۔ تیرے پتی راجو کو بھی اس نے زندہ نہیں چھوڑا ہو گا۔''

اندر یہ دونوں کون ہو سکتے تھے، اس کا زمان بہ خوبی اندازہ کر سکتا تھا۔ ''راجو'' اور ''پتی'' کے ذکر نے بھی اسے سمجھا دیا کہ وہ کس سے مخاطب تھے۔ زمان دھڑکتے دل سے اب ''تخاطب'' کا جواب سننے کے لیے بے چین تھا۔

''تم دونوں کے منہ میں خاک..... میرا پتی راجو زندہ ہو گا۔ لیکن اس بات کا کیا اعتبار کہ تمہاری بات مان لینے کی صورت میں نہ صرف میری جان بھی بچ جائے اور میں اس منحوس قید خانے سے زندہ سلامت بھی نکل جاؤں؟''

یہ آواز سن کر زمان کی کنپٹیاں سائیں سائیں کرنے لگی تھیں۔ یہ نسوانی آواز اریبہ کی تھی۔

(جاری ہے)

دوست

ناصر ملک

نظریات میں اتفاق کو لوگ ذہنی ہم آہنگی کا نام دیتے ہیں جبکہ نظریات کا اختلاف ایک کو دوسرے کا مخالف بنا دیتا ہے مگر... عشق کے جذبے پر نہ تو یہ اتفاق اثر انداز ہوتا ہے اور نہ ہی اختلاف اس کی شدت کو ختم کر سکتا ہے۔ ایسی ہی کیفیت سے یہ دونوں بھی گزر رہے تھے جو اپنی اپنی انائوں کے خول میں لپٹے نہ تو اپنے دلوں سے ایک دوسرے کا نام مٹا پا رہے تھے اور نہ ہی ساتھ رہنے کے لیے تیار تھے پھر وقت نے ایک عجیب فیصلہ کر دیا۔

ایک معمولی بات پر انتہائی غیر معمولی قدم اٹھانے والے حسرت زدہ جوڑے کی کتھا

چاروں جانب بے لگام انسانوں کی دھکم پیل اور بے معنی شور اپنے جلو میں عجیب سے اضطراب کو عیاں کرتا تھا۔ ایسے میں، میں لاہور کے اس مصروف ریلوے اسٹیشن کے بک اسٹال پر کھڑا کسی رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ مجھے کچھ خریدنا نہیں تھا، محض وقت گزاری کے لیے خود کو مصروف کرنا تھا اور میں اپنے اس مقصد میں کامیاب رہا تھا کیونکہ اسٹیشن پر موجود مسافروں کی نہ سمجھ میں آنے والی حرکات میری توجہ اپنی جانب مبذول نہیں کر رہی تھیں۔

تب ریلوے اسٹیشن انسانوں کی دنیا میں اپنی الگ پہچان اور ثقافت رکھتے تھے اور مجھے اپنی زندگی کی مصروفیات سے کٹ کر اس ماحول میں کچھ وقت گزارنا اچھا لگتا تھا مگر نہ جانے کیوں آج مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ بک اسٹال کا مالک مجھے امید بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں مجھے کچھ شرمسار کیے دے رہی تھیں کیونکہ میں اس کی



PAKISOCIETY.COM

خاص ترتیب سے رکھی ہوئی کتابوں سے چھیڑ چھاڑ تو کر رہا تھا مگر ان میں سے کوئی بھی کتاب خریدنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

ایسے میں میرے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا لمس اپنے ہونے کا احساس دے گیا۔ میں چونکا۔ کانوں میں جلترنگ سی بج اٹھی۔ ''دوست!''

میں آہستگی سے پلٹ گیا۔ دیکھا، نازو اپنی جگمگاتی آنکھوں میں شرارت کی لپٹیں لیے مجھے یک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ شوخ نیلے رنگ کے دوپٹے کا لیس دار کنارہ اس کے ماتھے پر منقش محراب کی طرح سایہ فگن تھا۔ میں اسے کافی دیر تک بس دیکھتا رہا۔ کوئی ایسا وقت مجھ پر آن اترا تھا کہ میری شخصیت کی تمام تر طاقتیں میری بصارت پر آن ٹھہری تھیں۔

''ہائے نازو تم..... کہیں میں نوسٹلجیا..... (Nostalgia) کا شکار تو نہیں ہو گیا؟'' مجھے اپنی آواز بھی اجنبی محسوس ہوئی۔

''ہاں نازو..... میں نازو ہی ہوں۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں نچلا ہونٹ خوبصورت اور متوازن دانتوں کی لڑی تلے کچلتے ہوئے بولی۔ ''تم دیکھ کر بھی یقین کرنے کو تیار نہیں ہو، میں نہ دیکھتے ہوئے بھی آج تک یقین کی دولت سے مالا مال رہی ہوں۔ کہو، تمہارے پاس یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ ہے؟ کیا میں بدل گئی ہوں یا تمہاری نظر بدل گئی ہے؟''

زمانہ بدل گیا تھا، اس کی اور میری عمروں کے تقاضے بدل گئے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہم دونوں کے حالات نے پلٹا کھا کر نئی صورتیں اوڑھ لی تھیں۔ سب کچھ بدل گیا تھا مگر اس کی شوخی، بے ساختہ مسکراہٹ اور گالوں میں ہونٹوں کے گوشوں کے قریب پڑنے والے ننھے ننھے گڑھوں نے نظروں کو ساکت کر دینے والی روش نہیں بدلی تھی۔ میں تعجب بھرے لہجے میں بولا، یوں جیسے خود سے مخاطب ہوا ہوں۔ ''واقعی! یقین نہیں آ رہا۔ تم اتنے برسوں کے بعد مجھے ملی ہو مگر اتنے لمبے عرصے میں پڑنے والی وقت کی گرد تمہارے چہرے اور وجود پر کہیں بھی دکھائی نہیں دیتی۔ کل والی نازو اور آج والی نازو میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ سچ کہتے ہیں، حسن ہر عمر میں حسن ہی کہلاتا ہے۔''

وہ ایک ذرا جھینپ کر مسکرائی، سر جھکا کر بولی۔ ''رہنے دو میں تو سمجھی تھی کہ تم نے بولنا کم کر دیا ہوگا۔ زبان تھک چکی ہوگی مگر تم بھی ویسے کے ویسے ہی ہو۔ باتونی، بات کو بے بات بڑھانے والے.....''

اس نے مجھے یاد دلا دیا تھا کہ میں ماضی میں بہت بولا کرتا تھا۔ شاید اسے یہ علم نہیں تھا کہ میری زبان نے ہمیشہ اسی کے سامنے اپنی تمام قوتِ گویائی کو بروئے کار لانے کی کوششیں کی تھیں وگرنہ میں اتنا بھی باتونی نہیں تھا۔ شاید اسے احساس نہیں تھا کہ اس کے زندہ اور تڑپا دینے والے حسن کے سامنے پتھر بھی بول پڑتے تھے۔

میں نے سر گھما کر اس کے اطراف میں دیکھا۔ کسی کو نہ پا کر متعجب ہوا۔ پوچھا۔ ''کیا تم اکیلی ہو؟''

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے بات بدل دی، بولی۔ ''سنو! میں نے شادی کر لی ہے۔''

میرا اوپر کا سانس اوپر رہ گیا۔ ''کیا واقعی؟''

''اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے؟'' اس کی نظریں بے سبب شوخ ہو گئیں۔

''نازو! تم نے شادی کر لی..... حیرت ہے۔'' میں ابھی تک سنبھل نہیں پایا تھا۔ ''مجھے یقین نہیں آ رہا۔''

''تم یقین کرو نہ کرو، مگر سچ یہی ہے کہ میں نے شادی کر لی ہے۔ وہ دیکھو وہ رہے میرے شوہر۔'' وہ ہنسی۔

میں نے اس کے ہاتھ کے اشارے کی طرف نظر دوڑائی۔ چند قدموں کے فاصلے پر شیڈ کے آہنی ستون کے ساتھ بہترین سوٹ میں ملبوس ایک قد آور شخص کھڑا تھا۔ ہماری جانب اس کی پشت تھی۔ میں نے بے یقینی سے نازو کی طرف دیکھا۔ نازو مجھے ہاتھ سے پکڑ کر تقریباً کھینچتے ہوئے شیڈ کی طرف بڑھی۔ اس کے سامنے لے جا کر کھڑا کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ ہیں میرے شوہر، ڈاکٹر صادق چودھری.....''

میں نے ستائش بھری نگاہوں سے وجیہہ، پُرکشش اور وضع دار ڈاکٹر صادق چودھری کے سراپا کا جائزہ لیا۔ نازو میری طرف اشارہ کر کے بتلا رہی تھی۔ ''ڈاکٹر صاحب! یہ رضی الدین ہے۔ میرا کالج فیلو۔ میں نے آپ کے سامنے بارہا اس کا تذکرہ کیا ہے۔ یاد ہے نا؟''

ڈاکٹر صادق نے اثبات میں سر ہلایا اور میری جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر گرمجوشی سے دباتے ہوئے بڑے مہذب انداز میں گویا ہوا۔ ''آپ سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ یہ بھی گزارش کرتا چلوں کہ میرے ان الفاظ کو رسمی جان کر نظر انداز مت کیجیے گا۔''

میں نے بھی اسے رسمی انداز میں کہا۔ ''اور مجھے بھی بہت مسرت ہوئی۔''

مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ مجھے اس سے مل کر ہرگز خوشی نہیں ہوئی تھی حالانکہ اس کی شخصیت میں ایسی کشش پنہاں تھی کہ مل کر ملتے رہنے کو جی کرتا تھا۔ شاید اس وقت یادوں کی دیوی اپنی نازک انگلیوں کے ساتھ ماضی کے گزرے ہوئے یادگار لمحات کے خوبصورت بشرے پر لپٹا ہوا گھونگٹ اتارنے میں محو تھی اور میری تمام تر توجیہات کو اپنی جانب مبذول کیے بیٹھی تھی۔ نازو کے دیدار میں کھڑی ہر رکاوٹ شاید اس سے رقیب کا چہرہ اوڑھ چکی تھی۔

''دوست! خاموش کیوں ہو؟'' نازو نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟''

میں کیا بتلاتا کہ کیا سوچ رہا ہوں؟ اس کے پوچھنے پر سوچوں کا لطف آ گیں سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میں چونک گیا، بولا۔ ''آں..... ہاں..... ہاں! تم کیا پوچھ رہی تھیں؟''

''میں نے پوچھا ہے کہ تم کن سوچوں میں گم ہو؟'' وہ مسکرائی۔

میں نے سنبھل کر بات بنائی۔ ''میں سوچ رہا ہوں کہ بچھڑے ہوئے دوست سے مل کر انسان ماضی میں کیوں کھو جاتا ہے؟ اور ماضی کی یادوں میں کتنی زیادہ کشش چھپی ہوتی ہے۔ آہ! وہ ماضی کتنا خوبصورت تھا..... ہائے! یہ ملاقات کتنی کیف آور ثابت ہو رہی ہے۔''

نازو کے سرخ لبوں سے جلترنگ پھوٹ پڑی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس بے ساختہ ہنسی میں وہ اکیلی شامل نہیں تھی بلکہ اس کے شوہر کی محبت بھی موجزن تھی۔ وہ کسی بھی لحاظ سے اکیلی نہیں رہی تھی۔ اس کی ہنسی نے ارد گرد بیٹھے اور کھڑے مسافروں کو ایک ذرا اپنی جانب متوجہ کیا۔ انہوں نے تعجب سے ہمیں دیکھا پھر بظاہر اپنے اپنے معمولات میں مگن ہو گئے۔ وہ اپنی فطری بے ساختگی سے بولی۔ ''ارے واہ دوست! کالج چھوڑنے کے بعد شاید تم نے فلسفہ سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ اب تو پورے اور پکے فلسفی بن چکے ہو۔''

''فلسفی.....'' میں نے دل ہی دل میں اپنی اس نئی حیثیت کا تعین کیا۔ خود کو اس مقام پر فائز نہ پا کر سوچا کہ شاید وہ مجھ پر طنز کر رہی ہے۔ اپنی سوچ کو جھٹلاتے ہوئے میں نے سوچا..... نازو طنز کرنے والی ہستی کبھی بھی نہیں رہی۔ طنز تو کجا، اس نے کبھی کسی کو مذاق کا نشانہ بھی نہیں بنایا تھا۔ وہ صبح کی طرح نوخیز تھی، صبح میں پھولوں پر چمکتی شبنم کی طرح پاک تھی..... وہ عجیب لڑکی تھی۔

مجھے یاد آیا، جب میں کالج میں زیرِ تعلیم تھا، تب اس کا باپ مسلم لیگ کا سرگرم اور فعال کارکن ہوا کرتا تھا۔ سوتے جاگتے پاکستان بنانے کی دھن میں مصروفِ عمل رہتا تھا۔ انہی دنوں میں نے کسی سے سنا تھا کہ اگر اس کے سامنے نظریۂ حصولِ پاکستان، قائداعظم یا چودھری رحمت علی کے خلاف کچھ بول دیا جاتا تو وہ غیر معمولی حد تک برانگیختہ ہو جاتا اور مرنے مارنے پر تل جاتا۔ بعد میں میرے دریافت کرنے پر نازو نے اس سنی سنائی بات پر تائید کی مہر ثبت کر دی تھی۔

نازو کی خواہش پر ایک مرتبہ میں اس کے باپو جی سے ملنے کے لیے اس کے گھر گیا۔ وہ بڑی محبت سے ملا۔ ملکی سیاست پر، کانگریس اور دیگر پارٹی کے ملک گیر کردار پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ مجھے ماننا پڑا کہ اس کے پاس معلومات کا نہ ختم ہونے والا خزانہ موجود تھا۔ محفل برخاست ہونے پر اس نے میرا ہاتھ گرمجوشی سے دباتے ہوئے کہا تھا۔ ''رضی بیٹا! پاکستان کا بننا آسانوں پر طے پا چکا ہے۔ دیکھنا، بن کے رہے گا ہمارا پیارا پاکستان!''

اس کا لہجہ اتنا اٹل تھا کہ میرے بدن میں جھرجھری سی آ گئی۔ میں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی خواہش کا خیر مقدم کیا تھا۔

وہ معروف دانش ور بھی تھا۔ دو ضخیم کتابوں کا تصنیف کار ہونے کے باوصف اس میں غرور نام کو نہ تھا۔ اس نے اپنی اولاد کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔ یہ اس کی تربیت کا اثر تھا کہ اس کی اولاد مثالی زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے سماج کی بے حیثیت رسموں کو کبھی اہمیت نہیں دی تھی اور گھر میں ہر ایک کے حقوق کے ساتھ انصاف برتا تھا۔ اس نے گھر کے ہر فرد کو بے جا پابندیوں سے مبرا رکھا تھا۔ ہر کسی کو شخصی آزادی حاصل تھی مگر یہ بھی اس کی مثالی تربیت کا نتیجہ تھا کہ اس کی اولاد میں سے کسی نے بھی جوانی بھر سنیما کا منہ نہیں دیکھا تھا۔

نازو نے گورنمنٹ کالج میں گریجویشن میرے ساتھ کیا تھا۔ مجھے لڑکا ہونے کے ناتے اپنے ماحول نے اتنی آزادی نہیں دے رکھی تھی جتنی نازو کو صنفِ نازک ہوتے ہوئے حاصل تھی۔ وہ مکمل آزادی سے لطف اندوز ہوتی تھی۔ جہاں جانا چاہتی، بلا روک ٹوک جا سکتی تھی۔ بارہا مرتبہ میں نے اسے سنیما چلنے کی پیش کش کی، مجبور کیا مگر اس نے بڑے رسان سے ہر مرتبہ ''نو'' کہہ کر مجھے مایوس کر دیا۔

ایک مرتبہ میرے جھنجلانے پر اس نے شیریں لہجے میں سمجھایا۔ ''دیکھ میرے اچھے دوست! میرے باپو جی نے مجھے ہر طرح کی آزادی دے رکھی ہے۔ مجھ پر اندھا اعتماد کرتے ہیں وہ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں ان کا دل دکھاؤں؟ ان کی مرحت کی ہوئی آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھاؤں؟ انہوں نے مجھ..... سمیت سبھی گھر والوں کو سنیما جانے سے منع کر رکھا ہے۔ ان کا کہا پتھر پر لکیر ہوتا ہے۔ یہ لکیر تشدد سے نہیں، محبت سے کھینچی گئی ہے جس میں بداعتمادی اور نافرمانی کا میل ہم بہن بھائیوں میں سے کوئی بھی بھرنے کو تیار نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ سنیما چلی جاؤں اور باپ کے اعتماد کو کھو دوں،

کیا یہ کام میری شخصیت کے لیے اچھا ہوگا؟''

میں لاجواب ہوگیا۔ اس کے بعد میں نے اسے سنیما جانے کی پیش کش نہیں کی۔

پھر ایک مرتبہ کلاس کے سبھی لڑکے لڑکیوں نے پکنک پر جانے کا پروگرام ترتیب دیا۔ نازو اپنے باپو جی کی اجازت کے ساتھ ہمارے سنگ پکنک پر گئی۔ اس کا انداز وہاں بھی جداگانہ دکھائی دیا۔ اس نے بچوں ایسی حرکات کرتے ساتھیوں کا ساتھ نہیں دیا تھا بلکہ باوقار انداز میں ٹہلتی رہی یا ایک بڑھے ہوئے کنارے والے پتھر پر جا کر بیٹھ رہی۔ پھر جب ایک دائرے میں بیٹھ کر سبھی لڑکے لڑکیاں باری باری گیت گانے لگے تو وہ پُرتمکنت انداز میں بیٹھی بڑے انہماک سے سب کو دیکھتی رہی۔ جوانیوں کے چولہوں پر چڑھی دیگچیوں میں فلمی رومانی گیتوں کی آنچ نے ابال پیدا کردیا۔ محفل ہر آنی آن میں پہلوؤں کو گرمائے جارہی تھی۔

اپنی باری پر اس نے شاہ حسین کی کافی ''مائے نی میں کنوں آکھاں'' گا کر سب کا دھیان پلٹ دیا۔ میں نے دیکھا، کافی کا لفظ لفظ اس کی زبان کے ساتھ ساتھ اس کے پورے وجود سے پھوٹنے لگا تھا۔ چہرے پر عجیب سی طمانیت چھائی ہوئی تھی جسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے وہ اس دنیا کی نہیں، کسی اور ہی دنیا کی رہنے والی ہو۔ اسے کوئی اندیشہ نہیں تھا، اس کے کسی شوق نے حسرت کا لبادہ نہیں اوڑھا تھا، اس کا کوئی بھی خواب رات سے نکل کر دن کے اجالے تک نہیں پہنچا تھا۔ کم از کم میں نے شباب کی دہلیز پر انگڑائیاں لیتے ہوئے کسی وجود میں اتنا سکون کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کافی ختم ہوئی، یوں لگا جیسے تمام شرکاء کے لبوں میں روح پھر گئی ہو اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگے۔ مبالغہ نہیں کہ وہ جب تک گاتی رہی، سانسیں تک ٹھہری رہیں۔ اس کے خاموش ہونے پر وقت نے سرکنا شروع کردیا۔

میں اس کے پہلو میں بیٹھا تھا، غیر اختیاری طور پر اس کی جانب جھکا اور نہایت مدھم آواز میں بولا۔ ''تم قلندر ہو یا جوگن..... بہت عجیب ہو۔''

وہ بند آنکھوں کے ساتھ مسکرائی۔ پھر ادھ کھلی آنکھوں سے مجھے عجیب سے انداز میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یس..... اینڈ تھینک یو!''

اس کے بعد کسی کو بھی اپنی خوش گلوئی کو بزم میں آزمانے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ دن گیا اور کہیں چھپ کر ہر نظر کو دیوانگی سونپ کر اس کی طرف پلٹانے لگا۔ سارا کالج اس کے حسن، حسن کی مہمیز اداؤں اور ندرت کا دیوانہ ہوگیا۔ بے تمنا دلوں والے طلباء سے لے کر پرنسپل تک..... ہر کوئی اس سے، اس کے خیالات سے اور ہر دم چھا جانے والی شخصیت سے متاثر دکھائی دینے لگا۔

وہ فطرتاً ہنس مکھ واقع ہوئی تھی۔ ہر کسی سے آزادانہ ہنس بول لیتی تھی۔ اس کی اس عادت نے کئی لڑکوں کو غلط فہمیوں کی سیج پر سلا دیا۔ رات کی نہ تھکنے والی کروٹوں کی ہر شکن، ہر جواہی کو لجاتے ہوئے نازو کی شبیہہ دکھانے لگی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ سب سے پیار کرتی تھی، مگر شاید کسی سے بھی پیار نہیں کرتی تھی۔

اسے چاہنے والوں کے جم غفیر میں پروفیسر ارشد جمال بھی شامل تھا۔ وہ کنوارا تھا۔ غیر شادی شدہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ لیڈی کلر بھی واقع ہوا تھا۔ پرکشش اور قدآور شخصیت، وجیہہ نقوش اور دھیمے لہجے کی گفتگو کالج کی ہر لڑکی کے دل میں بستی تھی۔ کئی لڑکیاں کھلم کھلا اس سے اپنی چاہت کا اظہار بھی کر چکی تھیں مگر وہ اپنے تمام تر پروفیشنل ازم کو نازو کے قدموں میں ڈھول بنانے پر آمادہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی نظروں سے ہویدا ہونے والے نازو کے لیے محبت کے پیغام کو کالج کی ہر نظر بہ آسانی پڑھ سکتی تھی۔ غضب یہ ہوا کہ نازو بھی کئی مرتبہ اس کے ساتھ چلتی پھرتی دکھائی دی تھی۔ لڑکوں کا خیال تھا کہ نازو پروفیسر ارشد جمال کی پچھے دار باتوں میں پُور پُور ڈوب چکی ہے اور دونوں محبت کی پینگ پر ارد گرد دیکھے بغیر جھولنے لگے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر اسٹوڈنٹس پروفیسر ارشد جمال کو اپنا دشمن خیال کرنے لگے تھے۔

پھر یوں ہوا کہ پروفیسر ارشد جمال کے ایک چہیتے شاگرد انور فاروقی نے اسے تنہائی میں حسرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''پروفیسر صاحب! آپ بڑے خوش قسمت ہیں۔''

''وہ کیسے بھئی؟'' پروفیسر نے تعجب بھرے لہجے میں پوچھا۔

''آپ کو نازو چاہتی ہے اور آثار بتلاتے ہیں کہ آپ دونوں شادی کرلیں گے۔''

پروفیسر کے چہرے پر کئی سائے لہرا گئے۔ وہ کافی دیر تک انور فاروقی کو عجیب نظروں سے دیکھتا رہا، ٹٹولتا رہا پھر آہ بھر کر بولا۔ ''نہیں فاروقی! تم مجھے اپنی نا سمجھی میں خوش قسمت قرار دے رہے ہو۔ حقیقت میں، میں بدقسمت ہوں۔ ہر اس لڑکے کی طرح جو مسکرا کر آنے اور ہاتھ لہرا کر جانے والی نازو کی محبت کو دل میں سجائے بیٹھا ہے اور اپنی محبت کی معراج پانے کے لیے دن رات دعائیں کرتا ہے۔ مگر تم سمیت کسی کو بھی اندازہ نہیں ہے کہ نازو کے سینے میں دل نہیں، پتھر رکھا ہوا ہے۔ پتھر پر سردی، گرمی، بارش یا

دھوپ اپنا اثر نہیں چھوڑ پاتی۔''

''سر! میں سمجھا نہیں۔'' انور فاروقی کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔

''میں نے اسے شادی کی پیشکش کی تھی.....''

پروفیسر نے اپنے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا اور ادھوری بات چھوڑ کر خاموش ہوگیا۔ انور فاروقی کچھ ساعتیں خاموشی سے اس کے مزید کچھ کہنے کا منتظر رہا، پھر بول پڑا۔ ''پھر کیا ہوا سر؟''

''وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی..... بولی، آپ کے ساتھ شادی نہیں ہوسکتی۔ میری کیوں کے جواب میں وہ ایک بار پھر ہنسی، بولی..... کیونکہ میں آپ کے ساتھ شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔''

پروفیسر کا لہجہ سرد ہوگیا۔ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''پتا ہے، پھر اس نے مجھ سے کیا کہا؟''

''کیا کہا سر؟''

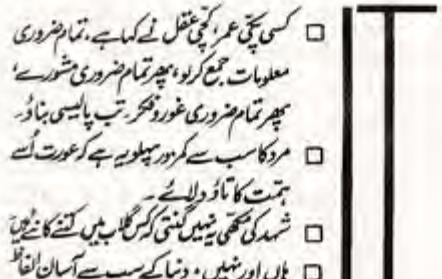
''اس نے کہا کہ میرا شوہر محض میرا مجازی خدا نہیں ہوگا، پورے اختیار اور وقار سے اسے بہت اعلیٰ درجہ دوں گی۔ محبت کے ساتھ ساتھ مجھ پر اعتبار بھی کرے گا۔ مجھے کسی اور کے ساتھ ہنستا کھیلتا دیکھ کر کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوگا۔ گھر کی نوکرانی نہیں سمجھے گا۔ صرف اپنے حقوق کی بات نہیں کرے گا، میرے تمام تر حقوق کی حفاظت بھی کرے گا اور صحیح معنوں میں میرا شریکِ حیات ثابت ہوگا۔ پروفیسر صاحب! آپ میں یہ وصف کہاں؟ آپ کالج کے کسی لڑکے کے ساتھ مجھے باتیں کرتے دیکھ کر برا مناتے ہیں۔ مجھے ابھی سے عورت سمجھنے لگے ہیں، اپنی خواہشوں کی تسکین کا محور خیال کرنے لگے ہیں۔ ایسے میں، میں آپ کے ساتھ کیسے شادی کرسکتی ہوں؟''

پروفیسر کا لہجہ بھرا سا گیا۔ آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ خود پر قابو پاتے ہوئے تھکے تھکے لہجے میں بولا۔ ''نازو عجیب لڑکی ہے۔ خدا جانے وہ کس کے ساتھ محبت کرتی ہے..... خدا جانے وہ کس کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے، کچھ علم نہیں ہو پاتا۔''

''عجیب لڑکی؟'' فاروقی نے تعجب آمیز انداز میں ہونٹ سکیڑے۔

''ہاں! عجیب لڑکی.....''

فاروقی کا استعجاب اعلان بن کر کالج کی دیواروں میں گونج گیا۔ بہت تھوڑے دنوں میں سبھی ہونٹ سکڑ گئے۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، سن رکھا تھا، تب پتا چلا کہ دیواروں کی زبان بھی ہوتی ہے۔ کالج کے در و دیوار سے



- کسی پکی عمر کی پکی عقل نے کہا ہے، تمام ضروری معلومات جمع کرلو، پھر تمام ضروری مشورے، پھر تمام ضروری غور و فکر۔ تب پالیسی بناؤ۔
- مرد کا سب سے کمزور پہلو یہ ہے کہ عورت اُسے ہمت کا تاؤ دلائے۔
- شہد کی مکھی یہ نہیں گنتی کہ کس گلاب میں کتنے کانٹے ہیں۔
- ہاں اور نہیں، دنیا کے سب سے آسان الفاظ مگر جن کے درمیان فیصلہ کرنا سب سے مشکل ہے۔
- صبح آٹھ بج کر سترہ منٹ ۔۔۔ بزرگوں کے لیے یہ ابھی میٹھی نیند کا وقت تھا، ہمارے لیے کام پر جانے کی آخری ٹرین کی روانگی۔
- ریسرچ والوں نے ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کیا کہ آنسو نازنین کی داہنی آنکھ میں اچھا لگتا ہے یا بائیں آنکھ میں اور ان دونوں میں زیادہ حسین آنکھ کون سی ہے۔

جاہل وراثتی و بدمعاش وسٹری ایک ہوئے تری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

آوازے پھوٹنے لگے۔ ''نازو عجیب لڑکی ہے!''

''نازو پروفیسر ارشد جمال کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی۔''

''نازو کے سینے میں دل نہیں، پتھر رکھا ہے۔''

''نازو عجیب لڑکی ہے۔''

وقت نے اسی عجیب لڑکی نازو کو آج برسوں بعد لاہور کے ریلوے اسٹیشن کی حد سے بڑھی ہوئی بھیڑ میں میرے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ اسے دیکھ کر میں نے آنکھیں بند کیں تو پروفیسر ارشد جمال کا اداس اور مضمحل چہرہ میرے تصور میں جھلملا گیا۔ اس کا پڑھاتے پڑھاتے بھول جانا، رک کر ادھر ادھر دیکھنا اور پھر کتاب ڈائس پر پٹخ کر کلاس روم سے نکلنا آنکھوں میں لہرا گیا۔ ٹھہرا کر آنکھیں کھولیں تو نازو کا شوہر دکھائی دیا جو چند قدموں کے فاصلے پر اپنا سامان قلی کے سر پر رکھوانے میں مصروف تھا۔ اس کے کندھوں کے اوپر سے ہولے ہولے کھسک کر پلیٹ فارم تک آتی ہوئی ریل گاڑی نظر آرہی تھی۔ پھر ایک جھٹکے سے جھٹکے کے ساتھ گاڑی رک گئی۔ ڈاکٹر صادق قلی کو ساتھ لے کر سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں گھس گیا۔ ایسے ہی وقت میں میرے لبوں پر بے اختیار ایک سوال، ماضی کا استعارہ مچل گیا۔ ''نازو! کیا پروفیسر ارشد جمال

ابھی تک اسی کالج میں پڑھا رہا ہے؟"

اس کے خوبصورت چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں رقصاں ہوئیں، حیرانی سے بولی۔ "پروفیسر ارشد جمال... وہ کون.....؟"

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ کیا عورت اپنے ماضی کو نئے سفر پر گامزن ہوتے ہی یکسر بھلا دیتی ہے؟ اگر ایسا ہے تو وہ میرے ساتھ قدم بہ قدم چلتے ہوئے لاہور کی اس سیر کو بھی فراموش کر چکی ہوگی جس نے ہمیں ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا تھا، اتنا کہ ہم ہمیشہ کے لیے دور ہو گئے۔

میرے لہجے میں واضح طور پر ارتعاش عود کر آیا۔ "کیا واقعی تم پروفیسر ارشد جمال کو بھول گئی ہو جو ہمیں اکنامکس پڑھایا کرتا تھا؟"

مخصوص انداز میں اس کے ہونٹوں نے سکڑ کر دائرے کی شکل اختیار کر لی، بولی۔ "اچھا، اچھا، وہ پروفیسر ارشد..... وہی نا، جو میرے ساتھ شادی کرنے کا خواہش مند تھا؟"

میں نے جلدی سے کہا۔ "ہاں وہی پروفیسر ارشد!"

"وہ تو کب کا اس کالج سے تبادلہ کروا کر چلا گیا۔ کہاں گیا؟ موتیوں والا برقع پہننے والی حکیمنہ تو یاد ہوگی؟ وہی جو ہر وقت کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتی رہتی تھی۔ وہ ایک مرتبہ ملی تھی۔ اس نے بتلایا تھا کہ پروفیسر ارشد نے اپنا تبادلہ دلی کے کالج میں کروا لیا تھا۔ اب وہ کہاں ہے، خبر نہیں۔" اس کا لہجہ عجیب انداز میں زہر خند ہو گیا۔ "دوست! مجھے اس سے شدید نفرت تھی۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ جینئس ہرگز نہیں تھا۔" وہ سر جھٹک کر بولی۔ "وہ اس قابل بھی ہرگز نہیں تھا کہ اسے یاد رکھا جاتا۔"

"تم نے شاید اس آوارہ گردی کو بھی بھلا دیا ہوگا....." میرے اندر بے عنوان تپش بھرنے لگی۔

"وہ، جسے تم نے "شب گردی" کا نام دے رکھا تھا؟" وہ جھینپ گئی۔

"ہاں ہاں وہی..... جب تم اور میں شب بھر لاہور کی سیر کرتے رہے تھے۔ رات کا پچھلا پہر ہم نے مقبرہ جہانگیر میں گزارا تھا۔ کیا تمہیں یاد رہا اب تک؟"

"کیوں نہیں دوست!" وہ غیر محسوس انداز میں نظریں چراتے ہوئے بولی۔ "شانہ بشانہ پیدل چلتے ہوئے گزرنے والی وہ رات، مسجد کی سیڑھیاں، پیروں تلے اڑتی ہوئی گرد اور مقبرہ جہانگیر کی تنہائی..... آہ! میں چاہوں بھی تو اس رات کو بھول نہیں سکتی۔ وہ رات میری زندگی کی خوبصورت ترین رات ہے اور ہاں میرے اچھے دوست! اگر میں نے زندگی میں اپنے سوا کسی کو چاہا ہے، تو وہ تم ہو....."

وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے تھم گئی۔ "ہاں میرے اچھے دوست! وہ تم ہو رشی الدین..... ہاں! وہ تم ہی ہو....."

اچانک میرا سر غرور سے بلند ہو گیا کہ نازو کے دل میں اب بھی میں سانسیں لے رہا تھا۔ اچانک اس رات کی تمام تر یادیں میری نظروں کے سامنے لہرانے لگیں۔ مسجد کی سیڑھیوں پر بیچ میں پانچ سات فٹ کا فاصلہ حائل کر کے نہ جانے کتنی دیر تک ہم بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔ دربار تک کندھے سے کندھا ملائے چلتے ہوئے وہ کتنی مدہوش ہو رہی تھی۔ پھر جب شب کے پچھلے پہر میں ہم مقبرہ جہانگیر کی تنہائی کا حصہ بنے تو اس کے لہجے کا خمار پوری کائنات کو بے خود کرنے لگا تھا۔

پھر میری فرمائش پر جب وہ میری گود میں سر رکھ کر "مائے نی میں کنوں آکھاں" گنگنا رہی تھی تو مجھے یوں لگا تھا جیسے پوری کائنات اس کے سنگ سنگ رقص کرنے لگی تھی۔ کیف کی وہ کیفیت، بے خودی کا وہ احساس اور جاگتی آنکھوں دکھائی دینے والے خواب کا سرور..... تب سے اب تک شاید میں اس کیفیت سے نکل ہی نہیں پایا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ شب تھک گئی۔ ہم تھک گئے پھر میں نے اس کی نیم کھلی زلفوں میں اپنی انگلیوں کا اضطراب چھپاتے ہوئے کہا۔ "نازو....." تو مجھے اپنا لہجہ بھی ناآشنا سا لگا تھا۔

وہ چونکی۔ "ہاں میرے اچھے دوست! کہو۔"

"کیا میرے ساتھ شادی کرو گی؟"

وہ ناگن کی طرح اچانک میری جانب پلٹ آئی۔ فجر میں رات کے دم توڑتے اندھیارے میں کئی ساعتوں تک نظریں گاڑے مجھے ٹٹولتی رہی۔ صاف دکھائی پڑتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ پائی اور اس کے لبوں سے بے ربط سا جملہ برآمد ہوا۔ "آں..... ہاں..... میرے بہت اچھے دوست..... مگر....."

"مگر کیا؟"

"مگر شاید تم مجھ سے محبت نہیں کرتے ہو۔" اس کے لہجے میں پائی جانے والی شکست و ریخت کو میں آج تک بھول نہیں پایا تھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" مجھے اچنبھا ہوا۔

"نہ جانے کیا کہہ رہی ہوں، نہ جانے تم کیا سن کر کیا سمجھ رہے ہو؟" وہ تھکے تھکے انداز میں اٹھ کر میرے روبرو بیٹھ گئی۔

کافی دیر تک سر جھکائے گرد آلود فرش پر انگلیوں سے لکیریں ڈالتی رہی۔ شاید میری قسمت کا فیصلہ سنانے سے پیشتر وہ میری قسمت کی لکیروں میں ردوبدل کرنے لگی تھی پھر اچانک سر اٹھا کر بولی۔ "کیا تم اپنی.... پارٹی کو چھوڑ کر میری پارٹی جوائن کر سکتے ہو؟"

میرا اوپر کا سانس اوپر ہی کہیں اٹک گیا۔ "مم..... مگر..... تم یہ شرط کیوں عائد کر رہی ہو؟"

اس کی نگاہوں میں خالی پن عود کر آنے لگا۔ "میں جو پوچھ رہی ہوں، اس کا جواب دو میرے اچھے دوست!"

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "جیسے میرے دل میں تمہاری محبت اپنا مکمل اور معتبر وجود رکھتی ہے، ایسے ہی میرا ذہن میرے نظریات کی لاٹھی تھامے اندھیروں میں راستہ ٹٹولتا پھرتا ہے۔"

"تو کیا تم اپنی.... پارٹی کی رکنیت سے دستبردار نہیں ہو سکتے؟" اس نے اپنے سوال پر زور دیا۔

"یہ دست برداری میرے لیے مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی ہے۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ شادی نہیں کروں گی۔" اس نے کندھے اچکا کر فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"لیکن سنو تو سہی....."

اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "میں کچھ اور سننا ہی نہیں چاہتی۔ خاموش رہو، زندگی کی اس بہترین رات کے آخری لمحات کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کرنے دو میرے اچھے دوست!"

پھر اس نے مجھے اس موضوع پر کبھی بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس کے لہجے کی قطعیت نے مجھے چند دنوں میں ہی توڑ کر رکھ دیا۔ آنے والے دنوں میں، میں نے اس پر بارہا مرتبہ باور کرایا کہ میں اس کی خاطر اپنی .... پارٹی کو چھوڑ سکتا ہوں۔ میں، جو اپنے مصمم نظریات میں کسی آمیزش کو بھی قبول نہیں کرتا تھا، اچانک اس ایک لڑکی کے لیے نظریات سے یکسر دست بردار ہونے کو بھی تیار ہو گیا۔ پارٹی تو ایک طرف رہی، میں پوری دنیا کو چھوڑنے پر تیار تھا مگر وہ سننے اور ماننے پر آمادہ نہیں ہوئی۔ میں اس کی غلط فہمی کو محو کرنے میں ناکام ہو گیا اور اس کی نفرت کو محبت میں بدل نہ سکا۔ پھر اپنی صفائی میں پیش کرنے کے لیے میرے پاس دلیلیں، تاویلیں اور جواز دم توڑ گئے اور ہم دونوں کے بیچ ایک لمبی چپ حائل ہو گئی جو ایگزامز کے دوران بھی سانس لیتی رہی۔

پھر اس موت آگیں چپ نے جدائی کی چادر اوڑھ لی۔ یادوں سے چھٹکارا نہیں پا سکا، اسے دل سے بھلا نہیں سکا تو لاہور کو چھوڑ کر گجرانوالہ سدھار گیا۔ یہ جلاوطنی بھی مجھے اس ناکام محبت کے اثر سے نکال نہیں سکی تھی۔ ہوش میں ہوتا تو اسے سوچتا، مدہوشی میں اس کے خواب دیکھتا..... پھر یوں بھی ہوا کہ وہی مجھے رات کو سلایا کرتی، وہی علی الصباح جگانے کے لیے بالوں میں انگلیاں پھیرا کرتی۔ میرے دہن میں اترنے والا ہر لقمہ اس کی انگلیوں کا لمس لے کر اترتا تھا۔

لاہور میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ چند روزہ قیام کے بعد واپسی کا قصد کیا تو مقدر نے مجھے ریلوے اسٹیشن پر نازو سے ملوا دیا۔ وہی نازو جو ہر شب میں میرے ناز اٹھانے کے لیے... آتی رہی تھی اور اس نے آج تک میری نامکمل تنہائی کو کسی اور عورت کے وجود سے مکمل نہیں ہونے دیا تھا۔

سگنل ڈاؤن ہو گیا۔ دور کھڑے انجن نے سیٹی بجائی۔ ایسے میں ڈاکٹر صادق چودھری کی تیز آواز ہمارے کانوں تک پہنچی۔ "نازو! گاڑی چلنے والی ہے۔ کم آن پلیز!"

نازو نے میرے دائیں ہاتھ کو اپنے پرگداز اور ملائم ہاتھوں میں پوری قوت سے دباتے ہوئے کہا۔ "میرے بہت اچھے دوست! تمہیں خدا اپنی امان میں رکھے اور ہاں! اپنا خیال رکھنا۔"

میں اسے کوئی دعا بھی نہ دے سکا۔ میرے حلق میں نمک گھل گیا۔ میرے ماضی کا مکمل حصہ، جو میری پوری زندگانی پر محیط تھا، مجھ سے دور جا رہا تھا اور میں اسے روکنے پر قدرت نہیں رکھتا تھا۔ وہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی سیکنڈ کلاس کے ڈبے کے اگلے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی جس میں ایک ہاتھ پھیلائے اس کا ناخدا ڈاکٹر صادق کھڑا اسے اپنی جانب بلا رہا تھا۔ ایسے میں گاڑی ہولے ہولے سرکنے لگی۔

اس کا ہاتھ تھکے تھکے انداز میں ہل رہا تھا۔ میں نے جواباً ہاتھ لہرا کر 'بائے' کہنے کی کوشش کی مگر شاید میرے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ میرا کھلی انگلیوں والا ہاتھ میری آنکھوں کے سامنے ساکت موجود رہا اور وہ میری انگلیوں کے بیچ میں بھرے پرے وجود سے ایک نقطہ بن کر مٹ گئی۔

پھر شاید سب کچھ مٹ گیا تھا۔ میرا ہاتھ بے جان انداز میں نیچے گر گیا اور میں پوری قوت سے چیخ پڑا۔ "نازو! تم واقعی عجیب لڑکی ہو۔"

پلیٹ فارم پر میرے اطراف میں کھڑے مسافر، جو اب تک میری اور نازو کی باتوں سے حظ کشید کر رہے تھے، پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے گھورنے لگے۔



چوہے دان

مرزا امجد بیگ

صد شکر کہ قدرت نے ہر کام کا اختیار انسان کو نہیں سونپا... اگر ایسا ہوجاتا تو انسانیت اندھیروں میں کہیں گم ہوجاتی اور فرعونیت کا راج عام ہوجاتا... اگرچہ عہدِ حاضر میں اس کی جھلک کہیں کہیں نظر آتی رہتی ہے مگر کہیں کہیں مرزا امجد بیگ جیسے لوگ انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اپنے فرائض کی ادائیگی میں خوشی اور اطمینان بھی محسوس کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ حساس اور خطرناک ظلم کسی کا ناحق خون بہانا ہے جسے قاتل ہر ممکن کوشش سے جھوٹ کے پردوں میں چھپاتا چلا جاتا ہے مگر... جہاں قاتل کی کوششوں کی انتہا ہوجاتی ہے وہاں سے قدرت کے غیظ کی ابتدا ہوتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ سارے پردے اٹھتے چلے جاتے ہیں اور بالآخر ناحق خون بہانے والا خود بخود قدرت کے جال میں الجھ کر منہ کے بل گر جاتا ہے... اور یہی حال اس کا بھی ہوا جو خود کو چوہے کے مانند نظروں سے اوجھل رکھنا چاہتا تھا لیکن بے خبری میں خود ہی چوہے دان میں قید ہوگیا۔

بیگ صاحب کی ڈائری کے اوراق سے ایک اور دلچسپ واقعہ

اصول تو یہی ہے کہ اگر آپ ڈرائیونگ میں ناپختہ ہیں تو سڑک پر چڑھنے کے بعد آپ کو اپنی گاڑی مڈل لین میں رکھنا چاہیے۔ یہ لین سب سے زیادہ محفوظ ہوتی ہے، کوئی آپ کو ڈسٹرب نہیں کرے گا۔ جسے بہت جلدی ہوگی وہ آپ کو اوورٹیک کر کے آگے نکل جائے گا اور جو مڑنا چاہے گا اس کے لیے لیفٹ لین خالی ہوگی۔ اپنی لین کو پکڑ کر رکھنے ہی میں سلامتی ہے۔ جو لوگ اصول کو توڑتے ہیں اور لین کو چھوڑتے ہیں انہیں لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ انسان کی زندگی بھی کسی گاڑی کے مانند ہی ہے۔ اس کی محفوظ ڈرائیونگ کے لیے ٹریفک کے اصولوں اور سڑک کی لینز کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

اس تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔ متذکرہ بالا زندگی کا فلسفہ بیان کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ زیرِ نظر کہانی کے بعض کرداروں نے بھی اصول کو توڑنے اور اپنی لین کو چھوڑنے کی غلطی کی تھی جس کے نتیجے میں یہ کہانی وجود میں آگئی..... کہانیاں اسی طرح جنم لیا کرتی ہیں۔

وہ موسم برسات کی ایک ابر آلود شام تھی۔ میں اپنے آفس میں بیٹھا تھا۔ میں نے ابھی جس موسم کا ذکر کیا، اہلِ کراچی اس نام سے تو اچھی طرح آگاہ ہیں تاہم اس کی شکل دیکھنے کے لیے پورا سال انتظار کرنا پڑتا ہے اور بعض اوقات تو کئی سال گزر جاتے ہیں۔ یہ اگر آتا بھی ہے تو چند دن کے لیے۔ وہ آیا، برسا اور چلا گیا تاہم اس سال یہ خلافِ توقع کسی اور ہی موڈ میں نظر آتا تھا۔ کراچی شہر کا ڈیزائن کچھ اس نوعیت کا ہے کہ زیادہ بارش اس سے موافقت نہیں رکھتی۔ اگر دو تین روز جم کر بارش ہوجائے تو گلیاں اور بازار ندی نالوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور بیشتر نشیبی آبادیوں کے گھروں میں بقول کسے، چھت تک پانی بھر جاتا ہے۔ اب کی بار کا موسم برسات کچھ اسی طرح کا تھا۔

اس برساتی دن نے جہاں کاروبارِ زندگی کو تلپٹ کر رکھا تھا وہاں میرے آفس میں بھی اس روز سناٹا ہی چھایا ہوا

تھا۔ ایسے میں میری سیکریٹری نے کسی کلائنٹ کی آمد کی اطلاع دی تو میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ کلائنٹ میرے سامنے موجود تھی یعنی وہ ایک خاتون تھی۔

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا اور ایک کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تشریف رکھیں۔“

”جی شکریہ۔“ وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی اور میری میز کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”جی فرمائیں۔ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟“

”میرا نام سلمٰی ہے۔“ وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”اور مجھے اپنے شوہر کے لیے آپ کی مدد درکار ہے۔“

”آپ کے شوہر کا نام کیا ہے؟“ میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ ”اور انہیں کس قسم کی مدد چاہیے؟“

سلمٰی درمیانے قد اور متناسب جسم کی مالک ایک جاذبِ نظر اور دلکش عورت تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے تیس کے قریب قائم کیا۔ وہ اپنی بات چیت اور رکھ رکھاؤ سے ایک تعلیم یافتہ اور مہذب عورت لگتی تھی تاہم اس وقت وہ بے حد فکرمند اور الجھی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ میرے استفسار کے جواب میں سلمٰی نے اپنے پرس کے اندر سے ایک چھوٹا بٹوا برآمد کیا پھر اس بٹوے میں سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

”یہ میرے شوہر کا کارڈ ہے۔“

میں نے مذکورہ کارڈ سلمٰی کے ہاتھ سے لے کر اس کا معائنہ کیا۔ اس کارڈ کے مندرجات کے مطابق سلمٰی کے شوہر کا نام سکندر تھا اور پیشے کے اعتبار سے سکندر ایک سول انجینئر تھا۔ وزیٹنگ کارڈ میں ”ڈبل اے“ کنسٹرکشن کمپنی کا نام بھی چھپا ہوا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ سکندر، مذکورہ کمپنی میں کام کرتا تھا۔ میں نے کارڈ کو ایک طرف رکھا اور اپنے سامنے بیٹھی ہوئی خوب صورت عورت کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

”سلمٰی صاحبہ! اس کارڈ کے ذریعے میں آپ کے شوہر سکندر صاحب سے تو متعارف ہوگیا ہوں لیکن یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ مجھ سے اپنے شوہر کے لیے کس نوعیت کی مدد لینے آئی ہیں؟“

”وہ بات دراصل یہ ہے وکیل صاحب!“ وہ میرے سوال کے جواب میں گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”سکندر اس وقت پولیس کسٹڈی میں ہے۔ پولیس نے گزشتہ روز سکندر کو عدالت میں پیش کرکے سات دن کا ریمانڈ حاصل کرلیا ہے۔ میں سکندر کے لیے بہت پریشان ہوں.....“

آخری جملہ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ میں اس کے بدن میں موجزن اضطرار کو بڑی وضاحت سے دیکھ رہا تھا۔ موجودہ صورتِ حال نے اسے خاصا ڈسٹرب کررکھا تھا۔

”آج اگست کی دس تاریخ ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ پولیس نے نو اگست کو آپ کے شوہر کا عدالتی ریمانڈ حاصل کیا ہے۔“ میں نے سلمٰی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ کا شوہر کس چکر میں پولیس کے ہتھے چڑھا ہوا ہے؟“

”سکندر پر قتل کا الزام ہے۔“ وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

”کس کے قتل کا الزام؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”مقتول کا نام انیلا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”انیلا کا آپ کے شوہر کے ساتھ کیا تعلق تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے، انیلا کے قتل کے الزام میں آپ کے شوہر ہی کو کیوں گرفتار کیا گیا؟“

وہ ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”انیلا اور اس کا شوہر انیس علی ہمارے فیملی فرینڈز ہیں۔ ہم دونوں فیملیز کا ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا بھی ہے۔ سکندر جس کنسٹرکشن کمپنی میں کام کرتے ہیں اس کے دو مالک ہیں۔ یہ ایک پارٹنرشپ بزنس ہے۔ ایک پارٹنر کا نام امان اللہ ہے اور دوسرا پارٹنر انیس علی ہے۔“

”یعنی ڈبل اے کنسٹرکشن کمپنی؟“ میں نے لقمہ دیا۔

”جی!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”لیکن سکندر کے معاملے کو سمجھنے کے لیے آپ کو میری بات توجہ سے سننا پڑے گی۔“

”میں پوری طرح متوجہ ہوں۔“ میں نے رسان بھرے انداز میں کہا۔ ”آپ بولتی جائیں، میں سن رہا ہوں۔“

اگلے تیس چالیس منٹ میں سلمٰی نے مجھے جو کہانی سنائی، میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کیس کے پس منظر سے بخوبی آگاہ ہوجائیں۔ آپ کو باخبر کرتے ہوئے میں نے اپنے بیان میں بعض ایسی باتیں بھی شامل کرلی ہیں جو مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں۔

اسی طرح چند ایک باتوں کو میں نے دانستہ چھپالیا ہے، انہیں بعد ازاں عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب مواقع پر ظاہر کیا جائے گا۔ کہانی کا سسپنس برقرار رکھنے کے لیے ایسا کرنا ناگزیر ہے۔

☆☆☆

”اے اے“ یعنی ڈبل اے کنسٹرکشن کمپنی کا آفس گلشن اقبال کے علاقے میں، حسن اسکوائر اور نیپا چورنگی کے درمیان ایک بلڈنگ میں واقع تھا تاہم شہر کے مختلف حصوں میں کمپنی کے تعمیراتی پروجیکٹس چل رہے تھے۔ یہ آفس گلشن اقبال کے جس حصے میں تھا اسے ”نیم رہائشی“ یا نیم کاروباری کہا جاسکتا تھا۔ مطلب وہاں موجود اکثر عمارتوں میں رہائشی اپارٹمنٹس بھی تھے اور بعض اپارٹمنٹس میں مختلف کمپنیوں نے اپنے دفاتر قائم کررکھے تھے جن میں کنسٹرکشن کمپنیاں، رہائشی اسکیمیں، ٹریول ایجنسیاں، ریکروٹنگ ایجنسیاں اور کوچنگ سینٹرز کی بھرمار تھی۔ ڈبل اے کنسٹرکشن کمپنی کا آفس بھی ایک ایسی ہی بلڈنگ کے اپارٹمنٹ میں تھا۔ اسٹاف نصف درجن سے متجاوز تھا۔

جیسا کہ تھوڑی دیر پہلے بتایا جاچکا ہے کہ مذکورہ تعمیراتی کمپنی دو افراد کی ملکیت تھی۔ امان اللہ اور انیس علی، امان اللہ ان دنوں عمرہ ادا کرنے سعودی عرب گیا ہوا تھا اور آفس کا نظام انیس علی اکیلا ہی سنبھال رہا تھا۔ ملزم سکندر اس کمپنی میں ایک انجینئر کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور انیس علی سے اس کے دوستانہ مراسم تھے، یہاں تک کہ انیس علی کی بیوی مقتول انیلا اور ملزم سکندر کی بیوی سلمٰی میں بھی گہری دوستی پائی جاتی تھی اور ان دونوں فیملیز کا ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا بھی تھا۔

ڈبل اے کا آفس صبح دس بجے سے شام چھ بجے تک کام کرتا تھا۔ یہ عام اسٹاف کے لیے اوقاتِ کار تھے تاہم انیس علی شام چھ بجے کے بعد بھی دفتر میں موجود رہتا تھا اور لگ بھگ سات بجے وہ دفتر سے رخصت ہوتا تھا۔ انیس علی کی رہائش نارتھ ناظم آباد میں تھی جبکہ سکندر کا گھر سبزی منڈی کے نزدیک ایک اپارٹمنٹس بلڈنگ میں واقع تھا۔ اس زمانے میں کراچی میں صرف یہی ایک سبزی منڈی ہوا کرتی تھی جو آج پرانی سبزی منڈی کہلاتی ہے۔

وقوعہ کی شام یعنی آٹھ اگست کو ملزم سکندر نے مقررہ وقت سے ایک گھنٹا پہلے یعنی پانچ بجے چھٹی کی اور اپنے گھر روانہ ہوگیا۔ آج اس کے اکلوتے بیٹے کی سالگرہ تھی۔ سکندر اور سلمٰی کا بیٹا سلمان آج پانچ سال کا ہوگیا تھا۔ دفتر سے سکندر کا گھر زیادہ دور نہیں تھا لہٰذا وہ تھوڑی ہی دیر میں اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ کم و بیش چھ بجے سکندر کے گھر پر آفس سے فون آگیا۔

”ہیلو.....!“ سکندر نے فون اٹینڈ کرتے ہوئے کہا۔

دوسری جانب انیلا تھی۔ وہ بے حد گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”سکندر، تم ابھی آفس آجاؤ.....“

”میں ابھی تو گھر پہنچا ہوں۔“ سکندر نے کہا۔ ”آخر، بات کیا ہے۔ تم اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو؟“

”میں فون پر تمہیں کچھ نہیں بتاسکتی۔ تم فوراً یہاں آجاؤ پھر بات کرتے ہیں۔“ وہ بے حد پراسرار انداز میں بولی۔

انیلا کے انداز نے سکندر کو گہری تشویش میں ڈال دیا۔ ”تم بہت پریشان لگ رہی ہو۔“ سکندر نے اپنایت بھرے لہجے میں کہا۔ ”تم خیریت سے تو ہو نا؟ انیس کہاں ہے؟“

”انیس سہراب گوٹھ تک گیا ہے، ایک پارٹی سے پے منٹ لینے۔“ انیلا نے بتایا۔ ”وہ تھوڑی دیر میں لوٹے گا۔ میں خیریت سے ہوں مگر تمہارا ابھی آفس پہنچنا بہت ضروری ہے۔ میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتی ہوں۔ پلیز، فوراً یہاں آجاؤ.....“

”اوکے..... میں آرہا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے سکندر نے ریسیور کریڈل کردیا۔

سلمٰی، سکندر کے پاس ہی کھڑی تھی۔ اس نے سوالیہ نظر سے اپنے شوہر کو دیکھا اور پوچھا۔ ”معاملہ کیا ہے؟“

”ساری بات تمہارے سامنے ہی تو ہوئی ہے۔“ سکندر نے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ ”انیلا کسی مشکل میں ہے اور مجھے فی الفور آفس بلا رہی ہے۔ مجھے جانا ہوگا۔ انیس اس وقت آفس میں موجود نہیں ہے۔“

”اور ہمارے آج کے پروگرام کا کیا ہوگا؟“ سلمٰی نے سوالیہ نظر سے سکندر کی طرف دیکھا۔ ”آج سلمان کی سالگرہ ہے اور ہم نے ڈنر کے لیے باہر جانا ہے.....“

”سب ہوجائے گا۔“ سکندر قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ”میں جلد ہی لوٹ آؤں گا۔ پھر ہم ہر کام اپنے پروگرام کے مطابق کریں گے۔“

اس موقع پر سلمٰی نے ..... بحث مناسب نہ سمجھی۔ سکندر نے سلمان کو پیار کیا اور جلدی واپس آنے کا کہہ کر وہ گھر سے نکل آیا۔ اس مختصر سے سفر کے دوران میں اس کا ذہن مسلسل انیلا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

انیلا پچھلے تین چار روز سے باقاعدہ آفس آرہی تھی۔ وہ سہ پہر میں آفس پہنچتی اور پھر انیس کے ساتھ ہی... واپس

گھر جاتی تھی۔ انیس، انیلا کو ایک خاص مقصد سے آفس بلا رہا تھا۔ انیس علی اور امان اللہ کو شک ہوا تھا کہ کمپنی کے حسابات میں کوئی بڑی گڑبڑ موجود ہے۔ ڈبل اے کمپنی میں مایا نامی ایک خاتون باقاعدہ اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے کام کر رہی تھی اور مایا ہی کی نشاندہی پر کمپنی کے دونوں پارٹنرز کو شک ہوا تھا۔ انیلا نے ایم کام کر رکھا تھا اور وہ اکاؤنٹس کے معاملات کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ مایا چھ بجے چھٹی کر کے چلی جاتی تھی۔ اس کے بعد انیلا کمپنی کے حسابات کی جانچ پڑتال کیا کرتی تھی۔ مایا نے یہ انکشاف کیا تھا کہ مئی اور جون دو ماہ کے اندر پانچ لاکھ روپے کمپنی سے کسی کو دیے گئے ہیں۔ پندرہ مئی کو ڈیڑھ لاکھ، اٹھائیس مئی کو ڈیڑھ لاکھ اور پھر بارہ جون کو دو لاکھ..... مگر مایا یہ پتا لگانے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکی تھی کہ پانچ لاکھ روپے کس مد میں، کس کو دیے گئے..... اسی مقصد کے حصول کے لیے انیس اپنی بیوی انیلا سے کمپنی کے حسابات کو خفیہ طریقے سے چیک کروا رہا تھا تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ پانچ لاکھ کی رقم گئی کہاں۔ یہ واقعہ آج سے لگ بھگ چالیس سال پہلے کا ہے۔ اس وقت پانچ لاکھ ایک بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔ آپ اسے آج کے پچاس لاکھ روپے سمجھ لیں۔

''بس تم جلدی سے آفس آجاؤ۔'' سکندر کے ذہن میں انیلا کے گھبراہٹ بھرے الفاظ گھوم رہے تھے۔ ''میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتی ہوں۔''

''وہ مجھے کیا دکھانا چاہتی ہے.....'' ڈرائیونگ کے دوران میں سکندر سوچ رہا تھا۔ ''کیا اس نے کمپنی کے حسابات میں پانچ لاکھ کے گھپلے کا سراغ لگا لیا ہے.....؟''

انیلا پچھلے تین چار دن سے آفس میں جو کچھ بھی کر رہی تھی اُس کے بارے میں عام اسٹاف کو کچھ علم نہیں تھا حتیٰ کہ اکاؤنٹنٹ مایا بھی اس حوالے سے کچھ نہیں جانتی تھی۔ یہ کمپنی کے دونوں پارٹنرز کا خفیہ پروگرام تھا اور فیملی فرینڈ ہونے کے باعث سکندر بھی انیلا کی سرگرمی سے واقف ہو گیا تھا۔ سکندر اسی ادھیڑبن میں آفس پہنچ گیا۔

جب وہ دفتر کے اندر داخل ہوا تو ایک پراسرار سناٹے نے اس کا استقبال کیا۔ فون پر انیلا اسے بتا چکی تھی کہ انیس علی کسی پے منٹ کے چکر میں تھوڑی دیر کے لیے سہراب گوٹھ کی طرف گیا تھا۔

''انیلا! تم کہاں ہو.....؟'' سکندر آواز لگاتے ہوئے اکاؤنٹ سیکشن کی جانب بڑھ گیا۔

سکندر کو یقین تھا کہ انیلا اس وقت اکاؤنٹنٹ کی کرسی پر بیٹھی ضخیم رجسٹروں کے ساتھ مغزماری کر رہی ہوگی۔ جب وہ اکاؤنٹ سیکشن میں پہنچا اور مایا کی کرسی خالی دکھائی دی تو وہ بوکھلا کر رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کی نگاہ ایک ایسی چیز پر پڑی کہ اس کے قدموں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔ مایا کی کرسی کے پیچھے دفتر کے فرش پر انیلا بڑے بے ڈھنگے انداز میں پڑی تھی۔ سکندر کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

وہ بے اختیار چلتے ہوئے فرش پر پڑی ہوئی انیلا کے پاس پہنچ گیا۔ تبھی اسے پتا چلا کہ انیلا اب اس دنیا میں باقی نہیں رہی تھی۔ سکندر نے اسے سیدھا کیا تو معلوم ہوا کہ انیلا کے سینے میں گولیاں اتار کر اسے موت کی نیند سلایا گیا تھا۔ انیلا کا لباس سینے پر سے لہو میں بھیگا ہوا تھا اور انیلا کی لاش کے قریب فرش پر بھی خون پھیلا ہوا تھا۔ اگلے ہی لمحے انیلا کی لاش سے تھوڑے فاصلے پر سکندر کو ایک گن پڑی نظر آئی۔ مذکورہ گن پر سائیلنسر بھی لگا ہوا تھا۔ سکندر کو یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ انیلا کو اسی گن سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

اس صورتِ حال نے سکندر کے ذہن کو بری طرح الجھا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اکاؤنٹ سیکشن سے نکل کر انیس کے کمرے کی طرف جانے لگا تو غیر ارادی طور پر اس نے سائیلنسر لگی گن کو بھی اٹھا لیا لیکن ابھی وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ کسی نے اسے زور کا دھکا دیا اور وہ گن سمیت انیلا کی لاش کے نزدیک جا گرا۔

دھکا دینے والا جو کوئی بھی تھا، سکندر اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، مبینہ شخص کہیں بہت دور سے بھاگتا چلا آ رہا ہو اور اسے کہیں پہنچنے کی جلدی بھی ہو۔ بس، سکندر اس کی راہ میں آیا اور وہ سکندر کو دھکا دے کر آگے نکل گیا۔ قبل اس کے کہ وہ پیش آمدہ حالات کو سمجھ پاتا، آفس کے اندر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز ابھری۔ اگلے ہی لمحے دو پولیس والے بھرمار کر آفس میں داخل ہوئے۔ ان میں ایک سب انسپکٹر اور دوسرا کانسٹیبل تھا۔ انہوں نے وہاں پہنچتے ہی سکندر کو انیلا کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا۔

تھوڑی ہی دیر میں انیس علی بھی سہراب گوٹھ سے واپس آ گیا۔ اس کے لیے یہ صورتِ حال انتہائی غیر یقینی تھی۔ جب اسے پتا چلا کہ سکندر کو انیلا کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے تو وہ سکندر پر گرجنے برسنے لگا۔

''مجھے تم سے اتنی گھٹیا حرکت کی امید نہیں تھی۔'' انیس نے غصیلی نظر سے سکندر کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''تم تو آج جلدی آفس سے چلے گئے تھے..... کیا اسی لیے کہ دوبارہ

یہاں آ کر میری بیوی کی جان لے سکو۔ آخر انیلا نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟''

''تم غلط انداز میں سوچ رہے ہو انیس۔'' سکندر نے اپنا تحفظ کرتے ہوئے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ آج میرے بیٹے کی سالگرہ ہے۔ میں اسی وجہ سے جلدی چلا گیا تھا۔ پھر انیلا نے مجھے فون کیا اور فوراً دفتر آنے کے لیے کہا۔ وہ مجھے کچھ دکھانا چاہتی تھی لیکن جب میں یہاں پہنچا تو اس کی لاش سے میری ملاقات ہوئی.....'' اس کے بعد سکندر نے اس نامعلوم شخص کا بھی ذکر کیا جس کا زوردار دھکا کھانے کے بعد وہ انیلا کی لاش کے قریب جا گرا تھا۔

''تم پتا نہیں، کیا بکواس کر رہے ہو۔'' انیس نے کراہت آمیز لہجے میں کہا۔ ''دفتر میں میرے اور انیلا کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ میں تھوڑی دیر کے لیے سہراب گوٹھ گیا اور اس دوران میں تم نے یہاں آ کر انیلا کا خون کر دیا۔ او مائی گاڈ.....'' انیس نے اپنا سر تھام لیا اور عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''سکندر! یہ تم نے کیا کر ڈالا.....؟''

''میں نے کچھ نہیں کیا انیس.....''

سکندر نے ایک بار پھر اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن پولیس آفیسر نے اسے بولنے نہیں دیا اور اس کے گال پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کرنے کے بعد زہریلے انداز میں کہا۔

''تمہیں جو کچھ بھی کہنا ہے، اب عدالت میں جا کر کہنا۔''

اس کے بعد دونوں پولیس والوں نے موقع کی کارروائی مکمل کی۔ پھر انیلا کی لاش کو سرکاری اسپتال اور سکندر کو سرکاری مہمان خانے پہنچا دیا گیا۔ پولیس والے جاتے ہوئے اپنے ساتھ اکاؤنٹ سیکشن کے چند رجسٹرز بھی اٹھا لے گئے تھے۔ اگلے روز یعنی نو اگست کو پولیس نے سکندر کو عدالت میں پیش کر کے سات روز کا ریمانڈ حاصل کر لیا تھا اور اب دس اگست کی ایک ابر آلود سہ پہر میں سکندر کی بیوی میرے سامنے بیٹھی اپنی اور اپنے شوہر کی بپتا سنا رہی تھی۔

میں نے پوری توجہ سے سلمیٰ کی کہانی سنی۔ اس دوران میں، میں رف پیڈ پر اہم نکات بھی نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ جب وہ خاموش ہوئی تو میں نے پوچھا۔

''سلمیٰ جی! آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ انیلا نے کس مقصد کے لیے سکندر کو ایمرجنسی میں آفس بلایا تھا؟''

''نہیں.....'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''اس بارے میں، میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی البتہ میرا ذہن یہ کہتا ہے کہ انیلا نے پانچ لاکھ والے گھپلے کے بارے میں کوئی اہم راز جان لیا تھا اور وہ سکندر کو اسی سلسلے میں کچھ بتانا چاہتی تھی لیکن سکندر کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی انیلا کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا.....''

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ایک اہم سوال کیا۔ ''آپ کے خیال میں انیلا کو کس نے قتل کیا ہوگا؟''

''میرا شک اسی بندے کی طرف جا رہا ہے جو سکندر کو دھکا مارتے ہوئے وہاں سے گزرا تھا۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مجھے لگتا ہے، انیلا نے پانچ لاکھ والے گھپلے کے حوالے سے جو بھی سنسنی خیز معلومات حاصل کی تھیں، وہ اس نامعلوم شخص کے خلاف جاتی تھیں اسی لیے اس نے انیلا کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دی۔''

''آپ کی بات میں کافی وزن محسوس ہو رہا ہے لیکن ابھی تک اس کیس کے کئی گوشے مکمل تاریکی میں ہیں۔'' سلمیٰ کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ ''لیکن آپ فکر نہ کریں۔ میں کل کسی وقت تھانے جا کر سکندر سے ایک بھرپور ملاقات کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ ریمانڈ کی مدت پوری ہونے سے پہلے میں حقائق کی تہ میں پہنچ جاؤں گا۔''

''اللہ آپ کو کامیابی عطا فرمائے وکیل صاحب۔'' وہ خاصے توانا لہجے میں بولی۔ ''مجھے امید ہے، آپ سکندر کو اس طوفان سے بہ آسانی باہر نکال لائیں گے۔''

''انشاءاللہ!'' میں نے پُروثوق انداز میں کہا۔

اس نے میری فیس کے بارے میں استفسار کیا۔ میں نے اسے اپنی فیس بتاتے ہوئے کہا۔

''یہ میرا اصول ہے کہ میں فیس ایڈوانس میں لیتا ہوں۔''

''جی ضرور۔'' وہ اپنا پورلیدر بیگ کھولتے ہوئے بولی۔ ''مجھے فیس ایڈوانس دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

پھر اس نے میری فیس کی رقم گن کر میری جانب بڑھا دی۔ میں نے مذکورہ رقم گنے بغیر اپنی میز کی دراز میں ڈالا اور ریکارڈ کی درستی کے لیے فیس کی وصولی کی ایک رسید بنا کر سلمیٰ کے حوالے کر دی۔

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور رسید کو اپنے قیمتی بیگ کے اندر رکھتے ہوئے بولی۔ ''وکیل صاحب! آپ پیسے گن لیتے تو اچھی بات تھی۔''

''جب آپ گن رہی تھیں اسی وقت میں نے بھی گن لیے تھے۔'' میں نے بہ دستور تبسم ریز لہجے میں کہا۔

''اوہ.....!'' وہ توصیفی انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ تو بہت تیز ہیں وکیل صاحب!''

''تیزی اور طراری اس پیشے کا تقاضا ہے سلمٰی جی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

میری گفتگو سے وہ کافی متاثر ہوئی پھر میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوگئی۔ میں نے دو روز بعد اسے دوبارہ اپنے دفتر میں بلالیا تھا۔

آیندہ روز میں سکندر سے ملاقات کرنے متعلقہ تھانے پہنچ گیا۔ ریمانڈ کی مدت کے دوران میں کسی بھی ملزم سے ملاقات آسان کام نہیں ہوتا۔ پولیس والے خصوصاً تفتیشی افسر آپ کے راستے کی رکاوٹ بن جاتا ہے لیکن ہوشیار وکلا کے پاس اس مرحلے کو طے کرنے کے لیے مخصوص ہتھکنڈے ہوتے ہیں جنہیں استعمال کر کے وہ اپنا مقصد حاصل کرلیتا ہے۔

سکندر کی عمر چالیس کے قریب تھی۔ وہ درمیانے قد کا مالک ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ عام حالات میں وہ ایک خوش طبع انسان تھا تاہم اس وقت گہرے تفکرات میں گھرا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔ آپ کی بیوی نے مجھے آپ کا وکیل مقرر کیا ہے۔ پہلے آپ ان ضروری کاغذات پر دستخط کردیں۔ باقی باتیں بعد میں۔''

اس نے حوالات کے اندر سے بڑی امید بھری نگاہ سے مجھے دیکھا اور ایک افسردہ سی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''وکیل صاحب! میں نے انیلا کو قتل نہیں کیا۔''

''جانتا ہوں..... اسی لیے تو یہاں آیا ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں لچے لفنگے اور جرائم پیشہ افراد کے کیس نہیں لیا کرتا۔''

وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بتائیں، کہاں دستخط کرنا ہیں؟''

میں نے اپنے وکالت نامے اور دیگر ضروری کاغذات پر اس کے دستخط لیے پھر ان کاغذات کو اپنے بریف کیس میں رکھنے کے بعد کہا۔

''سکندر صاحب! آپ کی بیوی نے مجھے کافی حد تک آپ کو پیش آنے والے افسوسناک واقعے کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں جن کی بنا پر مجھے یقین ہے کہ انیلا کی موت میں آپ کا کوئی ہاتھ نہیں لیکن آپ کو اس مصیبت سے نکالنے کے لیے مجھے آپ کے بھرپور تعاون کی ضرورت ہوگی۔''

''میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ حکم کریں۔''

''یہ بات تو طے ہے کہ انیلا کو آپ نے موت کے گھاٹ نہیں اتارا۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے خیال میں یہ کس کا کام ہوسکتا ہے؟''

''مجھے اس کا ٹھیک سے کوئی اندازہ نہیں وکیل صاحب۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''میں جب وہاں پہنچا تو انیلا کی موت واقع ہوچکی تھی۔''

اپنی بات کے اختتام پر اس نے مجھے بتایا کہ کس طرح وقوعہ کے روز انیلا نے فون کر کے اسے فوراً دفتر پہنچنے کو کہا تھا۔ یہ تمام تر تفصیل سلمٰی کی زبانی گزشتہ روز مجھ تک پہنچ چکی تھی۔ اس کی بات مکمل ہونے پر میں نے پوچھا۔

''آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ انیلا آپ کو کیا دکھانا چاہ رہی تھی؟''

''مجھے یقین ہے کہ اس نے پانچ لاکھ روپے والے گھپلے کے حوالے سے کوئی اہم راز پالیا تھا۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''اور وہ اسی بارے میں مجھے کچھ بتانا چاہ رہی تھی۔''

''گھپلا کرنے والے شخص کا تعلق بھی یقیناً ''ڈبل اے'' کنسٹرکشن کمپنی ہی سے ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس امر میں تو کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں جناب۔'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ''کوئی باہر کا آدمی کمپنی کے اکاؤنٹ میں بھلا کیسے گڑبڑ کرسکتا ہے۔''

''کیا آپ اس گھپلا کرنے والے مبینہ شخص کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔ ''مطلب، آپ کو کوئی اندازہ ہے کہ وہ کون ہوسکتا ہے؟''

''میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''جائے وقوعہ پر جس شخص نے دھکا دے کر آپ کو انیلا کی لاش کے نزدیک پھینکا تھا، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''میں اس کی صورت نہیں دیکھ سکا تھا۔'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''وہ شخص اچانک ہی دوڑتا ہوا میرے سامنے آگیا تھا پھر مجھے ایک زوردار دھکا مار کر وہ دوڑتے ہوئے اکاؤنٹ سیکشن سے نکل گیا تھا۔''

''اس کے قد کاٹھ، جسامت کو دیکھ کر آپ کوئی اندازہ قائم کرسکتے ہیں؟''

چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ ''جہاں

تک میری یادداشت کام کرتی ہے، وہ بندہ اسٹاف میں سے کوئی نہیں تھا۔''

''ہوں.....'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''حالات وواقعات کی روشنی میں تو یہی نظر آرہا ہے کہ آپ کو دھکا دینے والا شخص اکاؤنٹ سیکشن کے اندر ہی کہیں چھپا ہوا تھا۔ اس نے انیلا کو فون کرتے ہوئے بھی سنا ہوگا۔ انیلا کو اس بندے کی وہاں موجودگی کا علم نہیں تھا کیونکہ اس نے آپ کو فون پر بتایا تھا کہ وہ اس وقت آفس میں اکیلی ہی ہے اور اس کا شوہر انیس علی کسی پے منٹ کے چکر میں سہراب گوٹھ کی طرف گیا ہوا ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا انجینئر صاحب!''

''نہیں جناب! آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں آپ کے تجزیے سے اتفاق کرتا ہوں اور میرا دماغ یہ کہتا ہے کہ وہ پراسرار بندہ انیلا اور انیس کی لاعلمی میں آفس کے اندر چھپا بیٹھا تھا۔ اغلب امکان یہی ہے کہ وہ انیلا کی سن گن لے رہا تھا اور جیسے ہی اسے پتا چلا کہ انیلا نے کمپنی کے اکاؤنٹ میں کسی بڑی گڑبڑ کا سراغ لگالیا ہے اور وہ مجھے بھی اس کے بارے میں بتانے کے لیے فی الفور آفس بلا رہی ہے تو اس نے سائیلنسر لگی گن سے انیلا کا کام تمام کردیا۔ مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ وہ شخص ہی انیلا کا قاتل ہے۔''

''آپ کی بات میں وزن ہے انجینئر صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر تمام تر واقعات اسی طرح پیش آئے ہوں تو پھر بڑے وثوق کے ساتھ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اسی نامعلوم شخص نے انیلا کو قتل کیا اور پھر وہ آپ کے انتظار میں ادھر ہی چھپا رہا۔ جب آپ آفس میں پہنچے تو اس نے آپ کو دھکا دے کر انیلا کی لاش کے نزدیک پھینکا اور خود وہاں سے غائب ہوگیا۔ مجھے تو یوں محسوس ہورہا ہے، وہ آپ کو انیلا کے قتل میں پھانسنا چاہتا تھا اور موجودہ حالات کو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی چال میں کامیاب ہوگیا ہے۔ کیا آپ اپنے کسی ایسے دشمن کو جانتے ہیں؟''

''نہیں جناب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میری یادداشت کے مطابق تو میرا ایسا کوئی بھی دشمن نہیں ہے۔''

''اگر آپ کا یہ اندازہ درست ہے کہ دھکا دینے والے شخص کا کمپنی کے اسٹاف سے کوئی تعلق نہیں تو پھر بڑے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کمپنی کے کسی شخص کا بھیجا ہوا کرائے کا قاتل تھا۔ کمپنی سے تعلق رکھنے والا کوئی ایسا شخص جو پانچ لاکھ والے گھپلے کا ذمے دار ہے اور وہ شخص یہ بھی جانتا تھا کہ انیلا آف ٹائم میں اکاؤنٹ سیکشن میں کسی قسم کی سرگرمی جاری رکھے ہوئے ہے۔ اگر وہ نامعلوم دھکا دینے والا شخص آپ کا دشمن نہیں تو پھر وہ شخص یقیناً آپ کا دشمن ہے جس نے دھکا دینے والے کو انیلا کا کام تمام کرنے بھیجا تھا۔ آپ کیا کہتے ہیں؟''

''بہت الجھی ہوئی صورت حال ہے وکیل صاحب.....!'' وہ فکر بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''سلمٰی نے مجھے بتایا ہے کہ انیس اور انیلا سے آپ لوگوں کے فیملی ٹرمز ہیں۔'' میں نے سکندر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن وقوعہ کے روز آپ کی گرفتاری کے وقت انیس نے جس قسم کے روکھے پھیکے بلکہ معاندانہ رویے کا مظاہرہ کیا وہ تو دیرینہ فیملی ٹرمز کی نفی کرتا ہے.....؟''

''واقعی! اس روز انیس کا رویہ مجھے بہت عجیب اور ناقابلِ یقین محسوس ہوا تھا۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''اس سے اس قسم کے ردِعمل کی توقع نہیں کررہا تھا۔ وہ تو سیدھا سیدھا مجھے انیلا کا قاتل سمجھ رہا تھا۔ اس نے میری حمایت میں ایک لفظ نہیں کہا اور پولیس مجھے گرفتار کر کے لے گئی.....''

''انجینئر صاحب! اپنے ذہن پر زیادہ دباؤ نہ ڈالیں۔'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''وقت آنے پر اس کیس کی ساری گتھیاں سلجھ جائیں گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کسی طرح ہم نامعلوم دھکا دینے والے شخص کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوگئے تو پھر آپ کی بے گناہی کو ثابت کرنا بہت آسان ہوجائے گا۔''

''اس بندے کو ڈھونڈا جاسکتا ہے.....'' وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''وہ کیسے؟''

سکندر کے انکشاف نے میرے رگ وپے میں ایک کرنٹ سا دوڑا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر مجھے بڑے سنسنی خیز تاثرات دکھائی دے رہے تھے۔ چند لمحے مضطرب رہنے کے بعد اس نے بتانا شروع کیا۔

''وکیل صاحب! ہماری کمپنی کے اکاؤنٹ سیکشن کی ایک کھڑکی باہر کی جانب کھلتی ہے اور اس کھڑکی سے چند فٹ کی دوری پر ایک دوسری اپارٹمنٹ بلڈنگ ہے۔ جب میں اس شخص کا دھکا کھانے کے بعد انیلا کی لاش کے قریب جاگرا تھا تو میں نے اکاؤنٹ سیکشن کی کھلی ہوئی کھڑکی میں سے مذکورہ اپارٹمنٹ بلڈنگ کے ایک فلیٹ کی کھڑکی کھلی ہوئی



دیکھی تھی۔۔۔۔۔''

''تو۔۔۔۔۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟''

''میں نے اس فلیٹ کی کھلی ہوئی کھڑکی میں ایک عورت کو کیمرا تھامے کھڑے دیکھا تھا۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''مجھے یہی محسوس ہوا تھا کہ وہ اکاؤنٹ سیکشن میں ہونے والی مجرمانہ کارروائی کی عکس بندی کر رہی تھی۔ اگر آپ کسی طرح اس عورت کو ڈھونڈ نکالیں تو انیلا کے قتل کے معمے کو حل کرنا آسان ہو جائے گا۔''

سکندر نے بڑے پتے کی بات کی تھی۔ میں نے مذکورہ اپارٹمنٹ کی لوکیشن اچھی طرح ذہن نشین کرتے ہوئے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔

''آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں کل ہی اس اپارٹمنٹ میں جا کر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر اس کیمرا بردار عورت سے میری ملاقات ہو جاتی ہے تو مجھے یقین ہے کہ انیلا کے قتل پر خاصی روشنی پڑے گی۔''

''اللہ آپ کو کامیابی عطا فرمائے وکیل صاحب!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

میں نے اس کے ہاتھ کو تھامتے ہوئے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''آمین!''

میں نے پولیس کے تفتیشی ظلم و ستم سے محفوظ رہنے کے لیے سکندر کو چند ضروری ہدایات دیں پھر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اگلے روز میں اس اپارٹمنٹ پہنچ گیا جس کی ایک کھڑکی سے ڈبل اے کنسٹرکشن کمپنی کا اکاؤنٹ سیکشن دکھتا تھا۔ یہ وہی کھڑکی تھی جہاں سکندر نے وقوعہ کے روز ایک عورت کو کھڑے دیکھا تھا۔ مذکورہ عورت کے ہاتھ میں ایک کیمرا بھی تھا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ وہ عورت انیلا کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو اپنے کیمرے میں محفوظ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس فوٹو گرافر عورت کا فلیٹ بلڈنگ کے تیسرے فلور پر تھا۔ سلمٰی نے مجھے بتایا تھا کہ ڈبل اے کمپنی کا دفتر بھی تیسرے فلور پر ہی تھا۔ اسی لیے کمپنی کے اکاؤنٹ سیکشن اور فوٹو گرافر عورت والے فلیٹ کی کھڑکیاں آمنے سامنے پڑتی تھیں اور دونوں عمارتوں کے بیچ میں آٹھ سے دس فٹ کا فاصلہ تھا۔

میں اپنے مطلوبہ اپارٹمنٹ پر پہنچا تو مجھے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ اپارٹمنٹ کے دروازے پر ایک تالا جھول رہا تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ عورت وقت اپنے اپارٹمنٹ میں موجود نہیں تھی۔ میں بڑی لے کر وہاں آیا تھا اور خالی ہاتھ واپس نہیں جانا چاہتا تھا لیے میں نے پڑوس والے اپارٹمنٹ کی گھنٹی بجا دی۔

چند لمحات کے بعد ایک درمیانی عمر کی عو دروازے پر نمودار ہوئی پھر سوالیہ نظر سے مجھے گھور ہوئے مستفسر ہوئی۔

''جی فرمائیں۔۔۔۔۔؟''

میں نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیانی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام امجد ہے۔'' سا ہی میں نے پڑوس والے دروازے پر جھولتے تا جانب اشارہ بھی کر دیا۔ ''میں ان خاتون سے ملنے آیا تھا کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ یہ کہاں گئی ہیں اور کب تک وا آئیں گی؟''

اس نے شک زدہ نظر سے میرے چہرے تاثرات کا جائزہ لیا پھر پوچھا۔ ''آپ کون ہیں اور زر سے کس سلسلے میں ملنے آئے ہیں؟''

اس عورت کا یہ استفسار مجھے اچھا تو نہیں لگا لیکن بات کو بگاڑنا نہیں چاہتا تھا لہٰذا اپنی چال کو آگے بڑ دیا۔ اس عورت کی زبانی مجھے فوٹو گرافر عورت کا نام معلو ہو چکا تھا۔ میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''خاتون! میں آپ کو اپنا نام بتا چکا ہوں۔ میں دراصل ایک انشورنس ایجنٹ ہوں۔ زرینہ صاحبہ مجھ سے لائف پالیسی بنوانا چاہتی تھیں اسی لیے انہوں نے آج مجھے گھر پر بلایا تھا۔''

''اوہ۔۔۔۔۔!'' وہ عورت ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''پھر تو آپ کو لائف پالیسی بیچنے کے لیے نواب شاہ جانا پڑے گا۔''

''نواب شاہ کیوں؟'' میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''اس لیے کہ وہ نو اگست کی صبح نواب شاہ کے لیے روانہ ہو گئی تھیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اور زرینہ کے جانے کے بعد یہاں کافی افراتفری مچی تھی۔ زرینہ نے آپ کو کب کہا تھا کہ آج اس سے ملنے آئیں؟''

اس عورت نے بتایا تھا کہ زرینہ نو اگست کی صبح نواب شاہ چلی گئی تھی۔ میں نے نہایت ہی ہوشیاری سے صورتِ حال کو سنبھال لیا اور بڑے اعتماد سے کہا۔

''میری اس سلسلے میں آٹھ اگست کو زرینہ صاحبہ سے

فون پر بات ہوئی تھی.....'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے ابھی کسی افراتفری کا ذکر کیا ہے۔ یہ کیا معاملہ ہے؟''

''امجد صاحب! آپ بھلے انسان ہیں۔'' وہ خوش اخلاقی سے بولی۔ ''دروازے پر کھڑے ہوکر باتیں کرنا ٹھیک نہیں۔ آپ ڈرائنگ روم میں آجائیں۔ مجھے اپنے بچوں کی پالیسی کے بارے میں بھی آپ سے معلومات حاصل کرنا ہیں۔''

تھوڑی دیر کے بعد ہم ڈرائنگ روم میں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کا نام آسیہ بیگم تھا۔ اس کے شوہر منصور خان کی صدر میں گھڑیوں کی دکان تھی۔ آسیہ کی تین اولادیں تھیں۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ بیٹیاں علی الترتیب پندرہ اور بارہ سال کی تھیں جبکہ اس کے بیٹے کی عمر آٹھ سال تھی۔ دونوں لڑکیاں اس وقت ٹیوشن پڑھنے گئی ہوئی تھیں اور آٹھ سالہ بیٹا ٹی وی کے سامنے بیٹھا کارٹون دیکھ رہا تھا۔ میں نے آسیہ بیگم کو بچوں کی انشورنس پالیسیز کے بارے میں جو کچھ بتایا وہ اس کہانی کا حصہ نہیں ہے لہٰذا میں اس ذکر کو گول کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں۔

آسیہ بیگم کی زبانی مجھے پتا چلا کہ زرینہ کا تعلق نواب شاہ سے تھا اور وہ اس اپارٹمنٹ میں اکیلی رہتی تھی۔ وہ لوگوں سے زیادہ ملتی جلتی نہیں تھی اس لیے کوئی اس کے بارے میں تفصیلاً کچھ نہیں جانتا تھا۔ ایک پڑوسی ہونے کے ناتے آسیہ بیگم صرف اتنا جانتی تھی کہ نواب شاہ میں زرینہ کا ایک چاچا فضل کریم رہتا تھا اور وہی زرینہ کا سارا خرچہ اٹھاتا تھا۔ جس اپارٹمنٹ میں زرینہ رہ رہی تھی، وہ کرائے کا تھا۔ آسیہ بیگم کا اپنا اندازہ یہ تھا کہ زرینہ کسی وڈیرے کی دوسری بیوی تھی کیونکہ مہینے میں دو تین بار اس سے ایک ادھیڑ عمر شخص ملنے آتا تھا۔ وہ فضل کریم تھا یا کوئی اور، اس بارے میں آسیہ کو پکا پتا نہیں تھا۔

آسیہ بیگم مجھے تفصیل بتا چکی تو میں پھر اپنے مقصد پر آگیا۔ ''آپ نے بتایا ہے کہ زرینہ کے نواب شاہ روانہ ہوتے ہی یہاں کسی قسم کی افراتفری مچ گئی تھی۔ وہ کیا قصہ ہے؟''

''زرینہ تو نو اگست کی صبح ہی نواب شاہ کے لیے روانہ ہوگئی تھی۔'' وہ مجھے تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے بولی۔ ''لگ بھگ دس بجے ایک بندہ اس سے ملنے کے لیے آیا۔ اتفاق سے اس وقت میرا شوہر گھر پر ہی تھا۔ منصور نے اس بندے کو بتایا کہ زرینہ تو نواب شاہ گئی ہوئی ہے۔ وہ بندہ الجھن زدہ انداز میں کبھی منصور کو اور کبھی زرینہ کے دروازے کو دیکھتا رہا پھر کچھ کہے بغیر وہ یہاں سے رخصت ہوگیا تھا۔''

''تو اس میں افراتفری والی کون سی بات ہوئی؟'' لمحے بھر کے لیے رکی تو میں نے سوال داغ دیا۔

''آپ سنیں تو.....'' وہ ایک خاص ادا سے بولی۔ ''اس شخص کے جانے کے بعد منصور نے مجھ سے کہا کہ بندہ کسی چکر میں یہاں آیا ہے۔ ضرور زرینہ کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے اور پھر اسی رات گڑبڑ ہو بھی گئی.....''

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''کیسی گڑبڑ؟''

''اگلی صبح ہم سو کر اٹھے تو زرینہ کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں سمجھی، شاید زرینہ واپس آگئی ہے۔ اسی خیال کے ساتھ میں اسے آوازیں دیتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوگئی اور اگلے ہی لمحے میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔''

''کیوں.....'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ نے زرینہ کے گھر میں ایسا کیا دیکھ لیا تھا؟''

''اس کا پورا گھر الٹا ہوا تھا۔'' وہ تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ ''یوں محسوس ہوتا تھا، گزشتہ رات کوئی شخص چوری کی نیت سے زرینہ کے گھر میں گھسا ہو اور اس شخص کو کسی خاص چیز کی تلاش ہو جس کے حصول کی خاطر اس بندے نے گھر کی ہر چیز کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ پتا نہیں، اس نامراد کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی یا نہیں.....''

آسیہ بیگم کی بیان کردہ کہانی نے میرا ذہن صاف کردیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا سی بھی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ سکندر کی طرح دھکا دینے والے اس شخص نے بھی زرینہ کو اپنے کیمرے کی مدد سے جائے وقوعہ کی فوٹو گرافی کرتے دیکھ لیا تھا۔ یقیناً وقوعہ کی شام زرینہ کے کیمرے کی آنکھ نے کوئی ایسا خوفناک منظر دیکھا تھا جس کی مدد سے سکندر کو دھکا دینے والا شخص انیلا کا قاتل ثابت ہوتا تھا۔ شاید اسی خوفناک منظر نے زرینہ کو اس قدر بوکھلا دیا تھا کہ وہ اگلی صبح نواب شاہ روانہ ہوگئی اور اگلی رات اس بندے نے کیمرے کی تلاش میں زرینہ کے اپارٹمنٹ کو پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ حالات و واقعات سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ زرینہ ایک بزدل عورت تھی۔ اس نے پولیس کو آگاہ کرنے کے بجائے نواب شاہ کا رخ کیا تھا۔ بہرحال، اس قسم کی صورتِ حال میں بڑے بڑے بہادر بھی پرائی آگ میں کودنے کے بجائے کنی کاٹ کر نکل جاتے ہیں۔

''جب آپ لوگوں نے زرینہ کے گھر کو الٹا ہوا دیکھا تو کیا کسی نے زرینہ کو اس واقعے کی اطلاع دینے کی کوشش کی؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''ہم میں سے کسی کے پاس زرینہ کا نواب شاہ کا فون نمبر یا وہاں کا ایڈریس نہیں ہے۔'' وہ مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''لہٰذا منصور نے پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دے دی تھی۔ پولیس فوراً موقع پر پہنچی اور ایک گھنٹے میں اپنی کارروائی مکمل کرنے کے بعد گھر کو سیل کرکے چلی گئی۔ زرینہ کے گھر کے داخلی دروازے پر آپ کو جو بڑا سا تالا جھولتا نظر آیا ہے نا وہ پولیس ہی ڈال کر گئی ہے۔ جاتے ہوئے پولیس والوں نے ہم سے کہا تھا کہ وہ جلد از جلد زرینہ کا سراغ لگانے کی کوشش کریں گے۔ اس دوران میں اگر ہمیں کوئی اہم بات پتا چلے تو ہم فوراً پولیس کو اطلاع دیں۔''

''جو بندہ زرینہ کا پوچھنے یہاں پہنچا تھا اور جس کے بارے میں آپ کے شوہر کا خیال تھا کہ وہ کوئی اچھا انسان نہیں، کیا آپ نے بھی اس بندے کو دیکھا تھا؟''

میرے سوال پر آسیہ ایک لمحے کے لیے تذبذب کا شکار دکھائی دی پھر بڑے اعتماد کے ساتھ بولی۔ ''جی، بالکل دیکھا تھا۔ جب منصور اس بندے سے بات کررہا تھا تو میں بھی منصور کے پیچھے کھڑی تھی لہٰذا میں نے اسے دیکھا تھا۔''

سکندر دھکا دینے والے شخص کا چہرہ نہیں دیکھ پایا تھا تاہم اس نے مجھے اس کے ڈیل ڈول اور قد کاٹھ کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا تھا۔ اسی حوالے سے میں نے آسیہ بیگم سے سوال کیا تو اس نے میرے تمام تر اندازوں کی تصدیق کردی یعنی سکندر کو دھکا دینے والا اور زرینہ کے اپارٹمنٹ پر پہنچنے والا شخص ایک ہی تھا۔ میں نے آسیہ کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے چلا آیا۔

آئندہ روز سلمیٰ مجھ سے ملنے دفتر آئی تو میں نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔ ان میں سے بہت سی باتیں اس کے علم میں نہیں تھیں۔ میں نے اپنی بات مکمل کی تو اس نے کہا۔

''نواب شاہ کوئی بہت بڑا علاقہ نہیں ہے۔ ہمارے بہت سے رشتے دار وہاں رہتے ہیں۔ میں اپنے طور پر زرینہ اور اس کے چاچا فضل کریم کو تلاش کرنے کی کوشش کروں گی۔ اگر زرینہ سے ہمارا رابطہ ہوگیا تو سکندر کے لیے کافی آسانیاں پیدا ہوجائیں گی۔ مجھے یقین ہے، زرینہ اور اس کا کیمرا انیلا کے قتل کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوں گے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نواب شاہ میں میری جان پہچان کے بھی کئی افراد موجود ہیں۔ آپ اپنے طور پر کوشش کریں، میں اپنے طریقے سے معلومات حاصل کرتا ہوں۔ انشاءاللہ! بہت جلد ہم زرینہ کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ ویسے زرینہ کی تلاش کے سلسلے میں پولیس بھی کافی متحرک ہے۔ یہاں کراچی میں بھی ہم ایک ذریعے سے فضل کریم تک رسائی حاصل کرسکتے ہیں۔''

''کس ذریعے سے؟'' اس نے پوچھا۔

''زرینہ اس اپارٹمنٹ میں ایک کرائے دار کی حیثیت سے رہائش پذیر تھی۔'' میں نے سلمیٰ کو بتایا۔ ''اور مذکورہ اپارٹمنٹ کا کرایہ فضل کریم ادا کیا کرتا تھا۔ اگر کسی طرح ہم اس اپارٹمنٹ کے مالک تک رسائی حاصل کرلیں تو ہمارا کام آسان ہوجائے گا۔''

''یہ کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''آپ بس مجھے زرینہ کے اپارٹمنٹ کا نمبر بتا دیں۔ باقی سب میں خود کرلوں گی۔''

''تین سو دو۔'' میں نے زرینہ کے اپارٹمنٹ کا نمبر دہراتے ہوئے کہا۔ ''یعنی تھرڈ فلور کا دوسرا اپارٹمنٹ۔ تین سو ایک میں آسیہ اور منصور نامی ایک فیملی رہتی ہے جن کے تین بچے ہیں۔''

''زرینہ کے اپارٹمنٹ کا نمبر تو بڑا خطرناک ہے وکیل صاحب!'' سلمیٰ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دفعہ تین سو دو تو اقدامِ قتل کے لیے استعمال ہوتی ہے..... اگر میں غلط نہیں کہہ رہی تو.....!''

''آپ نے بالکل بجا فرمایا ہے سلمیٰ جی۔'' میں نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''زرینہ کے اپارٹمنٹ کا نمبر اور اقدامِ قتل کی دفعہ کا فگر ایک ہی ہے اور اتفاق دیکھیں کہ زرینہ نے اپنی آنکھوں سے یا اپنے کیمرے کی آنکھ سے قتل کی ایک سنگین واردات ہوتے دیکھی ہے..... انیلا انیس کا قتل!''

''اور اسی قتل کے الزام میں میرا شوہر پولیس کی تحویل میں ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''میں سکندر کو اس جھمیلے سے نکالنے کے لیے ہر قیمت پر زرینہ کو ڈھونڈ نکالوں گی۔''

سلمیٰ کے عزم کو دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ وہ جیسا کہہ رہی ہے، ویسا کر بھی گزرے گی۔ میں نے ضروری ہدایات دے کر اسے رخصت کردیا۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے اس

کیس کا چالان عدالت میں پیش کردیا۔ میں نے اپنے وکالت نامے کے ساتھ ملزم سکندر کی درخواستِ ضمانت بھی دائر کردی۔ قتل کے ملزم کی ضمانت ناممکن کی حد تک مشکل ہوتی ہے اور اس کیس میں سکندر کی پوزیشن انتہائی نازک تھی۔ اسے پولیس نے جائے وقوعہ پر گرفتار کیا تھا اور جس سائیلنسر لگی گن سے انیلا کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اس گن پر سکندر کے فنگر پرنٹس پائے گئے تھے۔ نیز پولیس نے جائے وقوعہ یعنی ڈبل اے کنسٹرکشن کمپنی کے اکاؤنٹ سیکشن سے جو رجسٹرز اپنے قبضے میں کیے تھے ان میں سکندر کے خلاف کافی مواد موجود تھا۔ مجھے اپنے موکل کی ضمانت منظور ہونے کا یقین نہیں تھا اور ایسا ہی ہوا۔ میں نے سکندر کی ضمانت کے حق میں جو بھی دلائل دیے، عدالت نے انہیں یکسر مسترد کرتے ہوئے ملزم کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا۔

کیس کی باقاعدہ سماعت میں دو ماہ لگ گئے۔ اس پیشی پر عدالت میں اچھا خاصا رش تھا۔ جج نے اپنی مخصوص کرسی پر براجمان ہونے کے بعد عدالتی کارروائی کا آغاز کیا اور فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحتِ جرم سے صاف انکار کردیا۔ اس کے بعد ملزم کا بیان ہوا۔ سکندر نے میری ہدایات کی روشنی میں نہایت ہی نپے تلے الفاظ میں حقائق کو بیان کردیا۔

وکیلِ استغاثہ اکیوزڈ باکس کے نزدیک پہنچا پھر سکندر کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے بڑے جارحانہ انداز میں اپنی جرح کا آغاز کیا۔ ''تم ڈبل اے کنسٹرکشن کمپنی میں کتنے عرصے سے کام کررہے تھے؟''

''لگ بھگ دس سال سے۔'' میرے موکل نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ ''یوں کہہ لیں کہ کمپنی کے قیام کے وقت سے۔''

''کمپنی میں تم کس حیثیت سے کام کررہے تھے؟''

''بطور سول انجینئر۔''

''کیا انجینئرنگ کے علاوہ بھی تم کوئی اور کام جانتے ہو؟'' وکیلِ استغاثہ نے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔

''جی بالکل۔'' ملزم نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''میں کھانا بہت اچھا بنالیتا ہوں، گانا گالیتا ہوں، گٹار بجالیتا ہوں اور میٹرک سے بی ایس سی تک کے اسٹوڈنٹس کو ٹیوشن پڑھا سکتا ہوں۔''

''میں کسی ایسے کام کے بارے میں پوچھ رہا ہوں جو تم نے ڈبل اے کنسٹرکشن کمپنی میں انجینئرنگ کے علاوہ کیا ہو.....؟''

''میرا میتھ بہت اچھا ہے اور میں کافی حد تک اکاؤنٹس کا کام جانتا ہوں۔'' ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں کچھ عرصے کے لیے ڈبل اے کمپنی کے حسابات بھی دیکھتا رہا ہوں..... آڈٹ وغیرہ کی حد تک۔''

''کیا تم معزز عدالت کو بتاؤ گے کہ تم کب کمپنی کے حسابات دیکھتے رہے ہو؟'' وکیلِ استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''جی بالکل۔'' ملزم نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ ''میں اس سال کم وبیش تین ماہ تک کمپنی کے حسابات دیکھتا رہا ہوں۔''

''کون سے تین ماہ؟''

''اپریل، مئی، جون۔'' ملزم نے جواب دیا۔ ''دراصل اس سال مارچ میں کمپنی کا اکاؤنٹنٹ کام چھوڑ کر چلا گیا تھا اور کوئی اچھا اکاؤنٹنٹ سردست مل نہیں رہا تھا اس لیے یہ تین ماہ میں نے اس شعبے میں بھی کمپنی کی خدمات انجام دیں۔ پھر جولائی میں کمپنی کو مایا کی شکل میں ایک ماہر اکاؤنٹنٹ مل گئی لہٰذا میں اس کام سے بری الذمہ ہوگیا تھا۔''

''تم نے تین ماہ تک اکاؤنٹس کے شعبے میں کمپنی کی خدمات انجام دیں.....'' وکیلِ استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اور اس عرصے کے دوران میں تم نے کمپنی کو پانچ لاکھ کا چونا لگا دیا..... ہے نا؟''

''بالکل نہیں.....'' ملزم بڑی شدت سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''آپ سراسر غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔''

''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے.....'' وکیلِ استغاثہ دو رجسٹرز لے کر جج کے قریب پہنچا پھر وہ رجسٹرز جج کی جانب بڑھاتے ہوئے بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ''جناب عالی! ان دونوں رجسٹرز کا تعلق ڈبل اے کنسٹرکشن کمپنی سے ہے اور وقوعہ کے روز پولیس نے کمپنی کے اکاؤنٹ سیکشن سے انہیں اپنی تحویل میں لیا تھا۔ جیسا کہ استغاثہ میں بڑی وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ کمپنی کے مالکان کو اکاؤنٹس کے معاملات میں کسی بڑی تو درپردہ کا شک ہوا تھا۔ اکاؤنٹنٹ مایا نے مالکان کی اس جانب توجہ دلائی تھی۔ مایا نے جولائی میں کمپنی جوائن کی تھی اور مذکورہ خوردبرد کا تعلق مئی اور جون کے مہینوں سے تھا۔ یہ وہی عرصہ ہے جب ملزم کمپنی کے حسابات دیکھا کرتا تھا۔ اسی دوران میں حسابات کے مطابق کمپنی کے اکاؤنٹ سے پانچ لاکھ روپے (بالترتیب پندرہ مئی کو ڈیڑھ لاکھ، اٹھائیس مئی کو بھی ڈیڑھ لاکھ اور بارہ

جون کو دو لاکھ روپے) نکالے گئے تھے۔ مایا نے اتنی بڑی رقم کے جانے کا سراغ تو لگالیا تھا تاہم وہ یہ نہیں جان پائی تھی کہ یہ پانچ لاکھ روپے کس مد میں کس کو دیے گئے تھے۔ اس راز سے پردہ اٹھانے کے لیے کمپنی کے ایک مالک انیس علی نے اپنی بیوی انیلا کو حسابات کی جانچ پڑتال کا کام سونپا۔ انیلا نے کامرس میں ماسٹرز کیا ہوا ہے۔ وہ مایا کے جانے کے بعد روزانہ آفس میں بیٹھ کر کمپنی کے مئی اور جون کے حسابات کو چیک کرتی تھی۔ چند روز بعد انیلا نے پتا چلالیا کہ پانچ لاکھ کی یہ رقم ملزم کے ہاتھ سے گئی تھی۔ یہ انکشاف مقتول انیلا کے لیے ناقابلِ یقین تھا کیونکہ ملزم اور مقتول کی فیملیز کے مابین دوستانہ مراسم ہیں۔ مقتول کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ملزم اس نوعیت کی گھٹیا حرکت کرے گا۔ مقتول نے اسی لیے سب سے پہلے ملزم کو فون کیا اور اسے فوراً آفس پہنچنے کو کہا۔

ملزم جب آفس پہنچا تو مقتول نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔ پہلے تو ملزم آئیں بائیں کرتا رہا لیکن جب اسے یقین ہوگیا کہ مقتول اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی ہے اور وہ پانچ لاکھ کے اس فراڈ کو کمپنی کے مالکان کے علم میں ضرور لائے گی تو ملزم نے اپنی جان بچانے کے لیے مقتول کو موت کے گھاٹ اتار دیا..... لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر میری جانب دیکھتے ہوئے اس نے بڑے فخریہ انداز میں جج سے کہا۔

''یور آنر! مقتول انیلا نے حسابات میں پانچ لاکھ کی ان تینوں پے منٹس پر فلیگ لگا رکھے ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پندرہ مئی، اٹھائیس مئی اور بارہ جون کو ملزم نے یہ رقم کمپنی کے اکاؤنٹ سے نکالی تھی۔ ملزم نے یہ رقم کس مقصد کے لیے حاصل کی، یہ نہ تو کمپنی کے مالکان کو معلوم ہے اور نہ ہی حسابات میں اس کا کہیں ذکر نظر آتا ہے۔ معزز عدالت مذکورہ رجسٹرز کا جائزہ لے کر استغاثہ کے موقف کی تصدیق کرسکتی ہے، دیٹس آل یور آنر.....''

جج چند لمحات تک دونوں رجسٹرز کا معائنہ کرتا رہا پھر ملزم کی طرف دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں استفسار کیا۔

''تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟''

''جنابِ عالی!'' میرے موکل نے مودبانہ انداز میں کہا۔ ''میں ان رجسٹرز کو دیکھنے کے بعد ہی کچھ کہہ سکتا ہوں۔''

جج کے حکم پر متعلقہ عدالتی عملے نے وہ دونوں رجسٹرز اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم تک پہنچادیے۔ چند لمحات تک ملزم سکندر ان رجسٹرز کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔

''سر! یہ رجسٹرز اصلی نہیں ہیں۔''

سکندر کے انکشاف نے عدالت کے کمرے میں سنسنی سی دوڑا دی۔ جج نے سرسراتی ہوئی آواز میں ملزم سے استفسار کیا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''سر! میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ.....'' ملزم نے معتدل انداز میں کہا۔ ''ان رجسٹرز کا ڈبل اے کمپنی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ اصل رجسٹرز کا چربہ ہے جس میں نقلی انٹریز ڈال کر مجھے پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ سراسر میرے خلاف ایک گھناؤنی سازش ہے۔''

''تم کس بنا پر اتنا بڑا دعویٰ کررہے ہو کہ یہ رجسٹرز اصلی نہیں ہیں؟'' جج نے ملزم سے ایک اہم سوال کیا۔

''جنابِ عالی! میری ایک مخصوص عادت ہے۔'' ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''آپ اسے میری کوئی نفسیاتی حرکت بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو بھی کتاب، کاپی، رجسٹر، میگزین..... میرے زیرِ استعمال یا میرے زیرِ مطالعہ رہتا ہے، میں اس کے صفحہ نمبر تینتیس پر ایک چھوٹا سا دائرہ لگا دیتا ہوں۔ ان دونوں رجسٹرز کے صفحات نمبر تھرٹی تھری پر کوئی سرکل نہیں بنا ہوا۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ کمپنی کے اصل رجسٹرز کی ہو بہو نقل تیار کرکے کسی نے مجھے پھانسنے کے لیے پندرہ، اٹھائیس مئی اور بارہ جون کی تاریخوں میں جعلی اندراجات کیے ہیں۔''

''مجھے دو سوالات کا ٹھیک ٹھیک جواب چاہیے۔'' جج نے ملزم کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''نمبر ایک۔ عدالت کس طرح تمہاری اس بات پر یقین کرے کہ تم کتابوں کے صفحہ نمبر تینتیس پر دائرہ لگانے کے عادی ہو؟ نمبر دو۔ تمہارے خیال میں کون تمہیں اس کیس میں پھانسنے کی کوشش کررہا ہے؟''

''جنابِ عالی! میں آپ کے دوسرے سوال کا جواب پہلے دوں گا۔'' ملزم گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''یہ تو ایک حقیقت ہے کہ کمپنی کے اکاؤنٹ میں کوئی بڑی گڑبڑ ہوئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس شخص نے بھی یہ گھپلا کیا ہے وہی مجھے قربانی کا بکرا بنانا چاہتا ہے اور آپ کے پہلے سوال کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ آپ میرے گھر میں موجود میری تمام کتابوں، کاپیوں اور جرنلز کو چیک کرسکتے ہیں۔ اسی طرح کمپنی کے آفس میں میرے زیرِ استعمال رہنے والی ایسی چیزوں کو بھی چیک کیا جاسکتا ہے۔''

جج نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی پھر وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! آپ ملزم سے کوئی اور سوال کرنا چاہتے ہیں؟''

وکیلِ استغاثہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے ملزموں والے کٹہرے کے نزدیک پہنچ گیا پھر میرے موکل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہاری اچھی بری تمام عادتوں کو تو ہم چیک کر ہی لیں گے۔ ابھی معزز عدالت کو یہ بتاؤ کہ تمہیں کس بنا پر یقین ہے کہ کمپنی کے اکاؤنٹ میں کوئی گڑبڑ ہوئی تھی۔ تم نے تھوڑی دیر پہلے اس گڑبڑ کو ایک حقیقت قرار دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی تم پانچ لاکھ کے گھپلے سے انکار بھی کر رہے ہو؟''

''میں اگر کمپنی کے اکاؤنٹس میں کسی ہیرا پھیری کی تصدیق کر رہا ہوں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ یہ ہیرا پھیری میں نے کی ہے۔'' ملزم نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''مایا اور انیلا نے تو بہت بعد میں اس معاملے میں ہاتھ ڈالا تھا۔ میں نے تو اپریل ہی میں اس گڑبڑ کا پتا چلا لیا تھا۔''

''آخر تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟'' وکیلِ استغاثہ نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

''میں اپریل سے جون تک کمپنی کے اکاؤنٹس کو دیکھتا رہا ہوں۔'' ملزم نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''ابتدائی دنوں ہی میں مجھے کمپنی کے حسابات میں گڑبڑ کا احساس ہوگیا تھا۔ پانچ لاکھ کی رقم اکاؤنٹ سے غائب تھی اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ رقم کس نے کس مد میں کس کو دی تھی.....''

''اور تم منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے رہے۔'' وکیلِ استغاثہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے کرخت نظر سے ملزم کو گھورا۔ ''اگر تمہیں اپریل میں پانچ لاکھ کے غبن کا علم ہوگیا تھا تو تم چپ شاہ کا روزہ رکھ کر کیوں بیٹھے ہوئے تھے؟''

اگر آپ کا موکل تعلیم یافتہ اور عملی زندگی گزارنے والا ہوتو پھر آپ کا کام آدھا رہ جاتا ہے، اپنی آدھی وکالت موکل خود ہی کر لیتا ہے۔ ایکوزڈ باکس میں کھڑا انجینئر سکندر بھی اس وقت یہی کر رہا تھا۔ وکیلِ استغاثہ کے کڑے استفسار کے جواب میں ملزم نے نہایت ہی شائستگی سے کہا۔

''سر! ایک پرابلم ہے.....''

''تمہارے ساتھ کون سی پرابلم ہے؟'' وکیلِ استغاثہ نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''میرے ساتھ نہیں سر.....'' ملزم نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''پرابلم آپ کے ساتھ ہے۔''

وکیلِ استغاثہ تپتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''سر! آپ سنتے کم اور بولتے زیادہ ہیں۔'' ملزم نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ آپ نے مجھے روک کر میرے منہ میں گھنگنیاں ڈالنے کا قصہ شروع کر دیا۔ اگر آپ نے میری بات توجہ سے سنی ہوتی تو معاملہ صاف ہوجاتا اور آپ کو مزید کوئی سوال پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔''

ملزم کی اس گہری چوٹ پر وکیلِ استغاثہ پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اس موقع پر جج نے ملزم سے کہا۔

''تم اپنی بات مکمل کر سکتے ہو۔''

''شکریہ جنابِ عالی۔'' میرے موکل نے تشکرانہ انداز میں جج کی طرف دیکھا پھر اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اپریل کے اوائل ہی میں مجھے کمپنی کے حسابات میں گڑبڑ کا احساس ہوگیا تھا اور میں نے اس بارے میں کمپنی کے ایک مالک امان اللہ صاحب کو بتا دیا تھا۔ امان اللہ صاحب کو بتانے کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے ڈائریکٹ مجھے یہ کام سونپا تھا اور یہ تاکید کی تھی کہ میں چھوٹی بڑی بات کے لیے انہی سے رابطہ کروں۔ جنابِ عالی! یہ وضاحت اس لیے ضروری تھی کہ وکیلِ استغاثہ یہ اعتراض اٹھا سکتے ہیں کہ کمپنی کے دوسرے مالک انیس علی سے تو میرے فیملی ٹرمز ہیں پھر میں نے انیس علی کو اعتماد میں لینے کے بجائے امان اللہ سے پانچ لاکھ کے گھپلے کی بات کیوں کی.....'' لمحاتی توقف کر کے ملزم نے تپانے والے انداز میں وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''جنابِ عالی! میں نے اپنی بات کی وضاحت کر دی ہے۔ اگر معزز عدالت چاہے تو امان اللہ صاحب سے میرے بیان کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔''

ملزم کی بات مکمل ہوئی تو میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''یور آنر! اس کیس میں چند کردار بڑی اہمیت کے حامل ہیں جن میں ملزم، مقتول، مایا اور کمپنی کے دونوں مالکان شامل ہیں لیکن مجھے اس بات کی حیرت ہے کہ ڈبل اے کنسٹرکشن کمپنی کے ایک مالک امان اللہ کا نام گواہوں کی فہرست میں شامل نہیں۔ معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ استغاثہ کو اس بات کے لیے پابند کیا جائے کہ آئندہ پیشی پر امان اللہ صاحب کو عدالت میں پیش کرے تاکہ میرے موکل کے بیان کی تصدیق کی جاسکے۔ علاوہ ازیں.....''

میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ڈبل اے کنسٹرکشن کمپنی کے یہ دونوں رجسٹرز متنازع حیثیت اختیار کر چکے ہیں لہٰذا احتیاط کے تقاضے کے پیشِ نظر ان دونوں رجسٹرز کو اس وقت تک عدالت کی تحویل میں رہنا چاہیے جب تک اس کیس کا اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھ جاتا۔''

جج نے میری باتوں کو اہمیت دی اور استغاثہ کو پابند کیا کہ آئندہ پیشی پر وہ کمپنی کے مالک امان اللہ کو ہر صورت عدالت میں پیش کرے اور پہلی فرصت میں استغاثہ ملزم کے اس بیان کی بھی تصدیق کرے کہ وہ کتابوں کے صفحہ نمبر تینتیس کو سرکل کرنے کا عادی ہے تاکہ ان رجسٹرز کی صحت کا تعین کیا جاسکے۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

☆☆☆

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول انیلا کی موت آٹھ اگست کی شام چھ اور سات بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ وجہ موت وہ دو گولیاں تھیں جو سائیلنسر لگی گن سے اس کے سینے میں اتاری گئی تھیں۔ یہ وہی گن تھی جو جائے وقوعہ سے پولیس کو ملی تھی اور مذکورہ گن پر میرے موکل کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے، انیلا کی لاش کو دیکھ کر [illegible] کل بدحواس ہوگیا تھا اور بے دھیانی میں اس نے انیلا کی لاش کے قریب پڑی سائیلنسر لگی گن کو اٹھا لیا تھا۔ اسی غیر اختیاری حرکت کے دوران میں آلۂ قتل پر اس کے فنگر پرنٹس ثبت ہوگئے تھے۔

آئندہ پیشی سے قبل سلمیٰ مجھ سے ملنے آئی اور اس نے مجھے مقتول کی فیملی کے حوالے سے خاصی دلچسپ اور مفید معلومات فراہم کیں۔ علاوہ ازیں اس نے مجھے کمپنی کی اکاؤنٹنٹ مایا کے بارے میں بھی چند انکشافات انگیز باتیں بتائیں جن کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران کیا جائے گا۔

اگلی پیشی پر عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو معلوم ہوا، استغاثہ ڈبل اے کنسٹرکشن کمپنی کے مالک امان اللہ کو عدالت میں پیش کرنے سے قاصر رہا ہے۔ امان اللہ کی طبیعت ناساز تھی۔ استغاثہ کی طرف سے اس کا میڈیکل سرٹیفکیٹ عدالت میں جمع کرا دیا گیا تھا۔

قبل اس کے کہ استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ آگے بڑھتا، میں نے جج سے درخواست کی۔ ''جنابِ عالی! معزز عدالت کی اجازت ہوتو میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

جج نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''پرمیشن گرانٹیڈ۔''

انکوائری آفیسر کا نام انور ملک تھا اور وہ عہدے کے اعتبار سے ایک سب انسپکٹر تھا۔ کسی بھی کیس میں تفتیشی افسر کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے اور ہر پیشی پر اسے عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ ایک لحاظ سے وہ استغاثہ کا وارث ہوتا ہے کیونکہ کیس کا چالان اسی نے تیار کیا ہوتا ہے۔

''ملک صاحب!'' میں نے تفتیشی افسر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی مخصوص انداز کی جرح کا آغاز کیا۔ ''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ڈبل اے کنسٹرکشن کمپنی کا آفس یعنی جائے وقوعہ آپ کے تھانے کی حدود میں آتا ہے؟''

''وکیل صاحب! آپ نے بڑا عجیب سوال کیا ہے۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ''اگر جائے وقوعہ میرے تھانے کی حدود میں واقع نہیں ہوتا تو مجھے اس کیس میں ہاتھ ڈالنے کا اختیار کیسے ہوتا.....؟''

''جناب! آپ تو بادشاہ لوگ ہیں لامحدود اختیارات کے مالک۔ جس معاملے میں جی چاہے، ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔'' میں نے نیم طنزیہ انداز میں کہا۔ ''بہرحال، مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا ہے..... شکریہ۔''

وہ ایسی نظر سے مجھے دیکھنے لگا جیسے میں کوئی خلائی مخلوق ہوں۔ میں نے ایک خاص مقصد کے حصول کے لیے ایسا انداز اپنایا تھا۔ اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے میں نے کہا۔

''آئی او صاحب! آپ ماشاءاللہ بڑے ذہین اور چاق و چوبند پولیس آفیسر ہیں۔ آپ کو اپنے تھانے کی حدود میں پیش آنے والے واقعات کی خبر تو رہتی ہوگی؟''

''بالکل رہتی ہے۔'' وہ بڑے فخر سے بولا۔ ''اپنے علاقے کے معاملات سے باخبر رہنا تو ہمارے فرائض کا حصہ ہے۔ تمام بڑے واقعات ہمارے علم میں رہتے ہیں، خاص طور پر وہ واقعات جو رپورٹ ہوئے ہوں۔''

''اگر کسی واقعے کی اطلاع ملنے پر پولیس جائے واردات پر پہنچ کر باقاعدہ کارروائی کرتی ہے تو اس کا شمار بڑے واقعات ہی میں ہوگا نا؟'' میں نے سوالیہ نظر سے انکوائری آفیسر کی طرف دیکھا۔

''جی، صد فیصد!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''جائے وقوعہ سے چند فٹ کے فاصلے پر'' صدف

آرکیڈ'' نامی ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ ہے۔'' میں نے تفتیشی افسر کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''دونوں عمارتیں پہلو بہ پہلو کھڑی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ''صدف آرکیڈ'' بھی آپ کے تھانے کی حدود ہی میں آتی ہے۔ کہیں میں غلط تو نہیں سمجھ رہا ملک صاحب؟''

''صدف آرکیڈ'' ایک فرضی نام ہے۔ بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر مذکورہ اپارٹمنٹ بلڈنگ کا اصل نام ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔ تفتیشی افسر نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔

''آپ بالکل ٹھیک سمجھ رہے ہیں وکیل صاحب لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ یہ آپ کس قسم کے سوالات پوچھ رہے ہیں.....!''

''آپ جواب دیتے جائیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''سب کچھ آپ کی سمجھ میں آجائے گا۔''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیلِ استغاثہ نے موقع محل دیکھتے ہی صدائے احتجاج بلند کردی۔ ''فاضل وکیل غیر ضروری باتوں میں معزز عدالت کا وقت برباد کررہے ہیں۔ انہیں ایسے تاخیری ہتھکنڈوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔''

''آپ کیا کہتے ہیں بیگ صاحب؟'' جج نے مجھ سے پوچھا۔

''جنابِ عالی!'' میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ابھی تک ایک بھی سوال غیر منطقی، غیر متعلق اور غیر ضروری نہیں کیا۔ جائے واردات اور صدف آرکیڈ آپس میں فرسٹ کزن کی حیثیت رکھتی ہیں اور دونوں عمارتوں کا اس کیس کے حوالے سے بڑا گہرا اور اہم کردار ہے۔ جب میں اپنی بات کی وضاحت کروں گا تو سب کچھ واضح ہوجائے گا لیکن اس کے لیے.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے معنی خیز نظر سے وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن اس کے لیے میرے فاضل دوست کو تھوڑے تحمل اور برداشت سے کام لینا ہوگا۔''

جج نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔''

وکیلِ استغاثہ نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسا کچا چبا ڈالے گا۔ میں نے اس کی معاندانہ نگاہ کی پروا کیے بغیر انکوائری آفیسر پر توجہ مرکوز کردی۔

''ملک صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول انیلا کو آٹھ اگست کی شام چھ اور سات بجے کے درمیان موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ معزز عدالت آپ کی زبان سے یہ جاننا چاہتی ہے کہ قتل کی اس واردات کی اطلاع آپ کو کب اور کس نے دی تھی؟''

''پولیس کے روزنامچے کے مطابق وقوعہ کی شام لگ بھگ ساڑھے چھ بجے کسی نامعلوم شخص نے تھانے فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔'' تفتیشی افسر نے جواب دیا۔

''نامعلوم شخص!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یعنی پولیس اطلاع دینے والے شخص کے بارے میں کچھ نہیں جانتی؟''

وہ بے بسی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''یہی حقیقت ہے۔''

''واقعات کے مطابق وقوعہ کے روز تمام اسٹاف کے چلے جانے کے بعد آفس میں صرف مقتول انیلا اور اس کا شوہر انیس علی ہی رہ گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد کمپنی کا دوسرا پارٹنر یعنی انیس علی بھی کسی ضروری کام سے سہراب گوٹھ چلا گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی موت کے وقت مقتول آفس میں تنہا ہی تھی۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''جی.....'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''کم و بیش سات بجے۔'' اس نے جواب دیا۔

''جب آپ موقعِ واردات پر پہنچے تو مقتول کو آپ نے کس حالت میں دیکھا؟'' میں نے جرح کے سلسلے میں تیزی لاتے ہوئے پوچھا۔

''مردہ حالت میں۔''

''مقتول کی لاش کے علاوہ آفس میں اس وقت کتنے افراد موجود تھے؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں سوال کیا۔

''صرف ملزم!'' اس نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ ''مقتول کی لاش اکاؤنٹ سیکشن کے فرش پر اپنے ہی خون میں لت پت پڑی تھی اور اس کے نزدیک ہی ملزم سائیلنسر لگی گن تھامے کھڑا تھا۔ ہم نے فوراً ملزم کو گرفتار کرلیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد مقتول کا شوہر انیس علی بھی سہراب گوٹھ سے لوٹ آیا تھا۔''

''تو آپ کا دعویٰ ہے کہ میرے موکل یعنی اس کیس کے ملزم نے کمپنی کے ایک پارٹنر انیس علی کی بیوی کا قتل کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس میں تو کسی شک و شبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بڑے وثوق سے بولا۔ ''مقتول کے جسم سے برآمد ہونے والی گولیاں اسی گن سے چلائی گئی تھیں جو گن ہمیں ملزم کے ہاتھ سے ملی تھی۔ مذکورہ سائیلنسر لگی گن پر ملزم کے فنگر پرنٹس بھی ملے ہیں پھر اس قتل کا محرک بھی بالکل واضح ہے۔ ہم نے آفس اور ملزم کے گھر کے فون کا ریکارڈ چیک کیا ہے۔ وقوعہ کے روز شام چھ بج کر دو منٹ پر مقتول نے ملزم کو فون کیا تھا، جس کے بعد ملزم آفس پہنچ گیا تھا۔ جائے وقوعہ سے ہم نے جو دو رجسٹرز اپنی تحویل میں لیے تھے، ان کے بعض صفحات پر مقتول نے فلیگ لگا رکھے تھے۔ چیک کرنے پر معلوم ہوا کہ مذکورہ صفحات پر ملزم کے پانچ لاکھ کے فراڈ کی کہانی فگرز میں درج تھی۔ اپنی موت سے قبل مقتول انہی رجسٹرز پر کام کررہی تھی۔ ان تمام تر حقائق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پانچ لاکھ کے غبن کا سراغ ملنے کے بعد مقتول نے ملزم کو فون کر کے صورتِ حال سے آگاہ کیا تھا اور ملزم نے فوراً آفس پہنچ کر مقتول کو ٹھکانے لگا دیا لیکن اس کی بدقسمتی کہ اسے فرار ہونے کا موقع نہیں ملا۔ ہم نے بروقت جائے وقوعہ پر پہنچ کر نہ صرف ملزم کو آلۂ قتل سمیت رنگے ہاتھوں پکڑ لیا بلکہ اس کے جرائم کے ثبوت کے طور پر وہ دونوں رجسٹرز بھی اٹھا لیے جو اب معزز عدالت کی تحویل میں ہیں۔''

''بہت خوب ملک صاحب!'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''آپ نے ماشاءاللہ بڑی تفصیل کے ساتھ اس کیس کی منظر کشی کی ہے۔ آپ کو تو کوئی وکیل یا کوئی لیکچرر ہونا چاہیے تھا۔''

''آپ وکالت کررہے ہیں، یہی کافی ہے۔'' اس نے گہری چوٹ کی۔ ''میں پولیس ڈیپارٹمنٹ ہی میں خوش ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں، اپنی جگہ پر پڑا ہوا پتھر بھاری ہوتا ہے۔''

''اچھی طرح جانتا ہوں ملک صاحب۔'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور مجھے چیک کرنے کا ہنر بھی آتا ہے۔''

میرے آخری معنی خیز جملے نے اسے گڑبڑا کر رکھ دیا، بے حد الجھے ہوئے لہجے میں... اس نے استفسار کیا۔ ''آپ کس چیز کو چیک کرنے کے ہنر کی بات کررہے ہیں وکیل صاحب؟''

''بھاری پتھر کو چیک کرنے کا ہنر.....!''

جہالت کی تاریکی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ چند لوگ ہندوستان سے ایک ہاتھی کسی ایسے ملک میں لے گئے جہاں پہلے کسی نے ہاتھی دیکھا ہی نہ تھا۔ ہاتھی کو ایک تاریک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ لوگوں کو اس بات کا علم ہوا تو اس کمرے کے باہر ہجوم جمع ہوگیا۔ کمرا تاریک اور ہاتھی سیاہ کسی کو کچھ نظر نہ آتا تھا۔ لوگوں نے ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر یہ اندازہ لگانا چاہا کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے؟ جس شخص کا ہاتھی کے جسم کے کسی حصے پر ہاتھ لگتا وہ اسی سے ہاتھی کی ایک تصویر اپنے ذہن میں بنالیتا۔ جس کا ہاتھ کان پر پڑا اس نے کہا یہ بہت بڑے پنکھے جیسا ہے، جس نے ہاتھی کی پیٹھ کو چھوا اس نے کہا یہ تخت کی طرح ہے، جس نے ہاتھی کے پاؤں اور ٹانگوں کو چھوا تھا اس نے اعلان کیا۔ ''یہ تو ستون جیسا ہے۔''

ہر شخص نے ہاتھی کو جیسا ٹٹول کر دیکھا ویسا بتایا۔ کسی نے کہا الف ہے کسی نے اسے ب کہا مگر ہاتھی کی ابجد سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ البتہ ان کے ہاتھوں میں روشنی کے لیے شمع ہوتی تو سب کی ایک رائے ہوتی اور اختلاف رائے نہ ہوتا اور انہیں معلوم ہوجاتا کہ ہاتھی کی شکل و صورت کیسی ہے۔

سبق: تیری ظاہری آنکھوں کی بینائی پورے ہاتھی کو پہچان نہیں سکتی اپنی آنکھوں سے جہالت کی تاریکی دور کرے گا تو بات بنے گی۔

اقتباس حکایات رومی اور سعدی

از ڈاکٹر تصدق حسین

"میں کچھ سمجھا نہیں۔" اس کی الجھن دوچند ہوگئی۔

میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ "ابھی سمجھا تا ہوں۔"

وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔

"آئی او صاحب!" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے کہا۔ "اس نکتے پر پراسیکیوٹر اور ڈیفنس دونوں کا مکمل اتفاق ہے کہ وقوعہ کے وقت ڈبل اے کنسٹرکشن کمپنی کے آفس میں قاتل اور مقتول کے سوا اور کوئی تیسرا شخص موجود نہیں تھا..... ہیں نا؟"

"جی بالکل....." اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"لیکن اس اتفاق میں اس وقت اچھی خاصی دراڑ پڑ جاتی ہے جب استغاثہ کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ مقتول انیلا کو میرے موکل یعنی اس کیس کے ملزم سکندر نے موت کے گھاٹ اتارا ہے جبکہ دوسری جانب ڈیفنس کا اصرار ہے کہ ملزم جب موقع واردات پر پہنچا تو مقتول انیلا کو قتل کیا جاچکا تھا۔ ایک نامعلوم شخص نے دھکا دے کر میرے ملزم کو مقتول کی لاش کے قریب پھینکا اور پھر وہاں سے فرار ہوگیا۔ ڈیفنس کا دعویٰ ہے کہ اسی دھکا دینے والے نامعلوم شخص نے انیلا کو قتل کیا تھا لہٰذا ملزم سکندر بے گناہ ہے۔"

"وکیل صاحب! کہانی آپ کی بھی کافی جاندار ہے مگر اس کی بنیاد ایک نامعلوم دھکا دینے والے شخص پر رکھی گئی ہے۔" انکوائری آفیسر نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "جبکہ دوسری جانب استغاثہ کے پاس ملزم کو مجرم ثابت کرنے والے تمام ثبوت موجود ہیں۔"

"ہوں....." میں نے چند لمحات تک سوچنے کی اداکاری کی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کیوں نہ ہم دونوں مل کر ملزم کو دھکا دینے والے اس نامعلوم شخص کو تلاش کریں تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے.....!"

"وہ کیسے!" اس نے آنکھیں سکوڑ کر مجھے دیکھا۔

"ہم اس بندے کو کس طرح تلاش کرسکتے ہیں؟"

"آئی او صاحب! آپ تو پولیس والے ہیں۔" میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ کو کسی چیز کی ذرا سی بھنک مل جائے تو آپ اسے زمین کی تہ سے بھی کھود نکالتے ہیں....." میں نے لمحاتی توقف کیا پھر ڈرامائی انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"ویسے آپ کا ڈیپارٹمنٹ بھی دس اگست سے اس نامعلوم، ملزم کو دھکا دینے والے بندے کی تلاش میں ہے مگر ان ڈائریکٹ وے میں....."

"میں کچھ بھی نہیں سمجھا۔" وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔ "ایسی کوئی بات میرے علم میں نہیں ہے۔"

"جبکہ تھوڑی دیر پہلے آپ معزز عدالت کے سامنے اس امر کا اقرار کرچکے ہیں کہ اپنے تھانے کی حدود میں رونما ہونے والے ہر بڑے واقعے کی آپ کو خبر رہتی ہے.....؟" میں نے گھور کر سوالیہ نظر سے انکوائری آفیسر کو دیکھا۔

"میں نے کوئی بھی غلط بیانی نہیں کی۔" وہ جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "مگر یہ واقعہ میرے علم میں نہیں ہے۔ میں نے ایسا کچھ نہیں سنا کہ پولیس کسی ایسے شخص کو ڈھونڈ رہی ہے جس نے وقوعہ کے روز ملزم کو دھکا دیا تھا۔"

"ایک منٹ آئی او صاحب! میں یاد دلانے کی کوشش کرتا ہوں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر اپنی جرح کے سلسلے کو بڑی احتیاط کے ساتھ سمیٹتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ "آپ یہ تو مانتے ہیں نا کہ وقوعہ کے وقت قاتل اور مقتول کے سوا جائے واردات پر اور کوئی بندہ بشر موجود نہیں تھا؟"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "جی مانتا ہوں۔"

"اور جب آپ وقوعہ پر پہنچے تو اس وقت وہاں ملزم اور مقتول کی لاش کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا؟"

"جی، یہ بھی ایک حقیقت ہے۔" اس نے کہا۔

"آپ کو وقوعہ کی شام ساڑھے چھ بجے قتل کی اس واردات کی اطلاع دی گئی۔" میں نے انکوائری آفیسر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ سات بجے موقع واردات پر پہنچے اور وہاں مقتول کی لاش کے نزدیک ملزم کو ایک سائیلنسر لگی گن تھامے دیکھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول انیلا کی موت شام چھ اور سات بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اگر ہم اس وقت کو کلوز کرلیں تو یہ ساڑھے چھ بجے کا وقت بنتا ہے یعنی وہی وقت جب کسی نامعلوم شخص نے تھانے فون کرکے آپ کو قتل کی اس واردات کی اطلاع دی۔ ایسی اطلاع وہی شخص دے سکتا ہے جو واردات کے وقت جائے وقوعہ پر موجود ہو اور اس نے اپنی آنکھوں سے قتل ہوتا دیکھا ہو یا پھر وہ شخص اس قسم کی معلومات رکھ سکتا ہے جو قتل کی اس واردات کا ماسٹر مائنڈ ہو اور اسی کے اشارے پر یہ قتل کیا گیا ہو۔"

تفتیشی افسر کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے وہ میری باتوں کی گہرائی ناپنے کی کوشش کررہا ہو۔ چند لمحات کی سوچ بچار کے بعد اس نے کہا۔

"آپ نے وہ قصہ تو گول ہی کردیا کہ ہمارا مطمحِ نامعلوم بندے کی تلاش میں ہے جس نے آپ کے بیان کے مطابق، وقوعہ کے روز ملزم کو دھکا دے کر مقتول کی لاش کے قریب پھینک دیا تھا اور..... آپ کی نظر میں وہی انیلا کا قاتل ہے؟"

"یہ قصہ وقتی طور پر اس لیے گول ہوگیا ملک صاحب کہ دوسرا قصہ طویل ہوگیا تھا۔" میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "چلیں، اس موضوع پر ابھی بات کرلیتے ہیں....."

میں یہ تمام تر گفتگو اس کیس کے تفتیشی افسر سے کررہا تھا لیکن میرا مطمحِ نظر یہ تمام باتیں کرسیِ انصاف پر بیٹھے ہوئے جج تک پہنچانا تھا اور میں اپنے اس مقصد میں پوری طرح کامیاب تھا۔ جج پوری توجہ سے میری جرح سن رہا تھا اور وقفے وقفے سے اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹ بھی کرتا جارہا تھا۔ مجھے اس بات کا بھرپور اطمینان تھا کہ میں اپنے موکل کی وکالت کا فریضہ بہ طریقِ احسن ادا کررہا ہوں۔

"صدف آرکیڈ" میں نے آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "جائے وقوعہ والی بلڈنگ کے پڑوس میں چند فٹ کی دوری پر استادہ ہے۔ آٹھ اگست کی شام سات بجے آپ نے ملزم کو مقتول کے قتل کے الزام میں موقع سے گرفتار کیا۔ اس واقعے کی اطلاع کسی نامعلوم شخص نے ساڑھے چھ بجے آپ کو دی تھی اور....." میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کرکے حاضرینِ عدالت پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی پھر دوبارہ تفتیشی افسر کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"اور..... نو اور دس اگست کی درمیانی رات "صدف آرکیڈ" کے اپارٹمنٹ نمبر تین سو دو میں ڈکیتی کی ایک واردات ہوئی جس کی اطلاع دس اگست کی صبح منصور خان نامی ایک شخص نے تھانے فون کرکے دی۔ منصور خان اپارٹمنٹ نمبر تین سو ایک کا رہائشی ہے اور مذکورہ ڈکیتی اس کے پڑوس والے گھر میں ہوئی تھی۔ کچھ یاد آیا آپ کو.....؟"

"یہ واقعہ تو بڑی وضاحت کے ساتھ میری یادداشت میں محفوظ ہے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میرا ایک پینٹی بھائی خادم حسین اس واردات کی تفتیش کے لیے گیا تھا۔ خادم حسین نے مجھے بتایا تھا کہ مذکورہ فلیٹ میں زرینہ نام کی کوئی عورت اکیلی رہتی تھی تاہم وقوعہ کے موقع پر وہ گھر میں موجود نہیں تھی لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ڈکیتوں نے اس بے چاری عورت کے گھر کو الٹ کر رکھ دیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی خاص چیز کی تلاش میں وہاں آئے ہوں۔"

"آپ کو بالکل درست محسوس ہورہا ہے آئی او صاحب!" میں نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ڈاکو ایک تھا یا ایک سے زیادہ مگر حقیقت یہ ہے کہ انہیں ایک کیمرے کی تلاش تھی۔"

"کیمرا؟ کیمرا بیچ میں کہاں سے آگیا؟" آئی او نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔

"کہیں سے نہیں۔" میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "کیمرا پہلے سے گھر میں موجود تھا لیکن ڈاکوؤں کی آمد سے قبل زرینہ اسے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ زرینہ نو اگست کی صبح نواب شاہ روانہ ہوگئی تھی۔ پولیس تاحال زرینہ کی تلاش میں ہے۔"

"لیکن....." اس نے شک زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ "آپ کو زرینہ اور اس کے گھریلو معاملات کی کیسے خبر ہے؟"

"مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!" وکیلِ استغاثہ نے تیز آواز میں کہا۔ "عدالت میں اس وقت انیلا مرڈر کیس کی سماعت جاری ہے اور وکیل صفائی "صدف آرکیڈ" میں ہونے والی کسی واردات کو بیچ میں لے آئے ہیں۔ میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ ڈیفنس کو ٹو دی پوائنٹ رہنے کی ہدایت کی جائے۔"

جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ "بیگ صاحب! کیا صدف آرکیڈ میں پیش آنے والے واقعے کا زیرِ سماعت کیس سے کوئی تعلق بنتا ہے؟"

"بہت گہرا تعلق یور آنر۔" میں نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ "اگر وکیل استغاثہ چند منٹ کی خاموشی اختیار کرنے کی زحمت گوارا کرلیں تو میں اس تعلق کو معزز عدالت کے سامنے روزِ روشن کے مانند عیاں کردوں گا۔"

"بیگ صاحب! آپ اپنی جرح جاری رکھیں۔" جج نے اپنی مخصوص آواز میں مجھے گرین سگنل دے دیا۔

"آئی او صاحب!" میں نے وکیلِ استغاثہ کی اپنے لیے انتہائی ناپسندیدہ نگاہ کو نظر انداز کرتے ہوئے تفتیشی افسر کو بتانا شروع کیا۔ "زرینہ کا اپارٹمنٹ صدف آرکیڈ کے تھرڈ فلور پر واقع ہے اور حسنِ اتفاق سے ڈبل اے کنسٹرکشن کمپنی کا آفس بھی تھرڈ فلور پر ہی واقع ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ زرینہ کے اپارٹمنٹ کی ایک

کھڑکی، ڈبل اے کے اکاؤنٹ سیکشن کی طرف کھلتی ہے اور اگر اکاؤنٹ سیکشن کی اس جانب والی کھڑکی کھلی ہو تو زرینہ والے اپارٹمنٹ کی کھڑکی میں سے اکاؤنٹ سیکشن کے مناظر کو بہ آسانی دیکھا جاسکتا ہے اور وقوعہ کے روز اکاؤنٹ سیکشن کا اے سی کام نہیں کر رہا تھا لہٰذا مقتول نے کھڑکیاں کھول رکھی تھیں.....''

''تو.....؟'' میری بات پوری ہونے سے پیشتر ہی آئی او نے الجھن زدہ انداز میں سوال کیا۔

''تو..... یہ کہ زرینہ نامی وہ عورت غضب کی فوٹوگرافر ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس نے وقوعہ کی رات نہ صرف اپنے گھر کی کھڑکی میں سے انیلا کا قتل ہوتے دیکھا تھا بلکہ اس واقعے کی فوٹوگرافی بھی کر ڈالی تھی۔ یہ اس کا ایک غیر ارادی مہماتی اقدام تھا۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ بے اختیاری میں کتنا اہم کام کر رہی تھی۔ بعد ازاں جب اسے اس فوٹوگرافی کی سنگینی کا اندازہ ہوا تو وہ ڈر گئی اور فی الفور اپنے آبائی شہر نواب شاہ روانہ ہوگئی.....'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ قاتل نے زرینہ کو جائے وقوعہ کی تصاویر اتارتے دیکھ لیا تھا لہٰذا وہ اگلے روز یعنی نو اگست کو زرینہ کے اپارٹمنٹ پر پہنچ گیا لیکن اس کی آمد سے پہلے ہی زرینہ نواب شاہ روانہ ہو چکی تھی، اپنے کیمرے سمیت مگر یہ بات قاتل کو معلوم نہیں تھی لہٰذا اس نے نو اور دس اگست کی درمیانی رات زرینہ کے اپارٹمنٹ کو تہ و بالا کرکے رکھ دیا۔''

''وکیل صاحب.....'' وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی یہ تمام تر کہانی تو مجھے ایک مفروضہ ہی محسوس ہو رہی ہے۔''

''ایسا بالکل نہیں ہے آئی او صاحب۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے کہا۔ ''میں نے زرینہ کے پڑوس میں جا کر کافی چھان بین کی ہے۔ منصور خان کی بیوی آسیہ بیگم نے مجھے بتایا ہے کہ زرینہ کے نواب شاہ روانہ ہونے کے بعد وہاں ایک شخص اس سے ملنے آیا تھا مگر زرینہ کو غیر موجود پا کر وہ مایوس لوٹ گیا تھا۔ میں نے آسیہ بیگم سے اس بندے کے حلیے کے بارے میں تفصیلاً پوچھا ہے۔ اس نے مذکورہ بندے کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ ہو بہو اس شخص سے میچ کرتا ہے جس نے وقوعہ کے روز میرے موکل کو دھکا دے کر مقتول کی لاش کے نزدیک پھینک دیا تھا۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہ ہو تو آپ آسیہ بیگم سے تصدیق کر سکتے ہیں۔ ویسے اس سلسلے میں آپ کو اپنے پیٹی بھائی سے بھی خاصی معلومات مل جائیں گی۔''

وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں خادم حسین سے بات کروں گا۔''

''مجھے تو یقین ہے کہ وہی بندہ انیلا کا قاتل ہے جس نے اکاؤنٹ سیکشن میں میرے موکل کو دھکا دیا تھا۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''آپ کسی طرح زرینہ کا سراغ لگانے کی کوشش کریں۔ اگر زرینہ آپ کو مل گئی تو اس کا کیمرا بھی آپ کے ہاتھ لگے گا جس کے اندر انیلا کے قتل کی فوٹوز موجود ہیں۔ اگر آپ وہ تصاویر حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تو سمجھ لیجیے گا، آپ نے اصل قاتل کو پالیا.....'' لمحاتی توقف کرکے میں نے گہری نظر سے آئی او کو دیکھا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ملک صاحب! میں پروفیشنل ہوں۔ بغیر فیس وصول کیے میں کسی کو مفت میں مشورہ نہیں دیتا۔ آپ کو اتنی قیمتی ٹپس اس لیے دی ہیں کہ اس میں میرے موکل کی بھی بھلائی ہے۔ آپ اپنے عمل کے لیے آزاد ہیں۔ مجھے مخالف وکیل سمجھتے ہوئے اگر آپ کو میری فراہم کردہ معلومات پر بھروسا نہ ہو تو آپ اپنی من پسند ٹانک ٹوئیاں جاری رکھیں۔ میں تو اپنے موکل کو باعزت بری کروا ہی لوں گا۔ میں نے زرینہ کے کیمرے تک رسائی حاصل کرنے کا بندوبست کر لیا ہے.....''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔ جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''داکورٹ از ایڈ جارنڈ۔''

آئندہ پیشی سے پہلے سلمٰی سے میری ایک بھرپور ملاقات ہوئی۔ اس نے مجھے اپنی کارکردگی سے آگاہ کیا۔ اس کی فراہم کردہ معلومات کو میں نے اپنی یادداشت میں محفوظ کر لیا۔

میں نے تفتیشی افسر کو انیلا کے قاتل کے حوالے سے ایک نئی سوچ دے دی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ بہت جلد زرینہ کو کھوج نکالے گا۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں

ڈبل اے کمپنی کا ایک پارٹنر امان اللہ کھڑا تھا۔ اس سے پہلے بھی استغاثہ کے دو گواہ بھگتائے گئے تھے لیکن ان کے بیان میں قابلِ ذکر کوئی بات موجود نہیں تھی اسی لیے میں ان کا تذکرہ گول کر رہا ہوں۔

امان اللہ کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ گٹھے ہوئے بدن کا مالک ایک دراز قامت شخص تھا۔ اس کے سر کے بیشتر بال رخصت ہو چکے تھے۔ امان اللہ نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کروا دیا تو وکیل استغاثہ نے ہلکی پھلکی جرح کے بعد اسے فارغ کر دیا۔ اپنی باری پر میں ونس باکس کے نزدیک چلا گیا اور بڑے شائستہ انداز میں جرح کا آغاز کیا۔

''امان اللہ صاحب!'' میں نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پچھلے دنوں آپ کی طبیعت ناساز تھی۔ اب کیسا محسوس کر رہے ہیں؟''

''الحمدللہ!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اب میں ٹھیک ہوں۔''

''امان اللہ صاحب! میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''بس چند سوالات.....''

''میں تیار ہوں وکیل صاحب۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

میں نے پوچھا۔ ''ڈبل اے کنسٹرکشن کمپنی کے قیام کو کتنا عرصہ ہوگیا ہے؟''

''لگ بھگ گیارہ سال۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ابتدا میں یہ کام میں نے اکیلے ہی شروع کیا تھا لیکن ایک سال کے بعد انیس علی ایک پارٹنر کی حیثیت سے اس کاروبار میں شامل ہوگیا اس طرح ہماری کمپنی کا نام ڈبل اے یعنی امان اللہ اینڈ انیس کنسٹرکشن کمپنی ہوگیا۔''

''ملزم کب سے آپ کی کمپنی میں کام کر رہا ہے؟''

''کم و بیش دس سال سے۔''

''اس دوران میں آپ نے ملزم کو کیسا پایا؟''

''ایک محنتی اور ایمان دار انسان۔'' اس نے جواب دیا۔

استغاثہ کے گواہ کا بیان میرے موکل کی حمایت میں جاتا تھا۔ دراصل، پہلے استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں امان اللہ کا نام شامل نہیں تھا۔ میرے اصرار پر اسے گواہی کے لیے عدالت تک لایا گیا تھا۔

''امان اللہ صاحب! مارچ کے آخری عشرے میں آپ کی کمپنی کا اکاؤنٹنٹ کام چھوڑ کر چلا گیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اور فوری طور پر کوئی اچھا اکاؤنٹنٹ مل نہیں رہا تھا لہٰذا اپریل سے جون تک کمپنی کے حسابات کو ملزم دیکھتا رہا تھا اور اپریل کے آغاز ہی میں ملزم نے آپ کو بتا دیا تھا کہ کمپنی کے اکاؤنٹ میں پانچ لاکھ کا حساب نہیں مل رہا۔ موجودہ کیس میں پانچ لاکھ کی اس خورد برد کو ملزم کے کھاتے میں ڈال دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کمپنی کے اکاؤنٹ میں بہ تواریخ پندرہ مئی، اٹھائیس مئی اور بارہ جون پانچ لاکھ کا غبن ہو چکا تھا۔ کیا واقعتاً ملزم نے آپ کو ایسی کوئی اطلاع دی تھی؟

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

مرزا ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کوئنگی روڈ کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

مطلب اپریل کی ابتدائی تاریخوں میں.....!''

''جی بالکل..... ملزم نے مجھے اس بارے میں بتایا تھا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن باوجود کوشش کے ملزم اس غبن کا سراغ نہیں لگا پایا تھا لہٰذا میں نے اپنے پارٹنر انیس علی کو اس بارے میں بتایا۔ انیس نے مایا نامی اکاؤنٹنٹ رکھ کر اس معاملے کی چھین بین کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جب ملزم کی طرح مایا کو بھی اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی تو پھر کاؤنٹر چیکنگ کے لیے انیس نے اپنی بیوی انیلا سے کام لینا شروع کیا اور چند روز بعد ہی انیلا کو قتل کر دیا گیا.....'' سانس ہموار کرنے کے لیے وہ تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''وکیل صاحب! سچی بات یہ ہے کہ میں تعلیم یافتہ نہیں ہوں اس لیے زیادہ تر سائٹ کے کام سنبھالتا ہوں۔ لکھنے پڑھنے اور حساب کتاب والے تمام کام انیس علی دیکھتا ہے۔ آپ مجھے ایک سیدھا سادہ انسان سمجھ لیں۔''

''آپ کی اس سادگی کو میں سلام پیش کرتا ہوں امان اللہ صاحب!'' میں نے توصیفی نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سادگی کے اندر سچائی چھپی ہوتی ہے اور میری نظر میں سچائی رحمت خداوندی ہے۔ آپ کا سادہ اور پرکار بیان میرے موکل کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ اس کیس میں آپ ملزم کے لیے رحمت کا ایک فرشتہ ثابت ہوئے ہیں۔ شاید اسی لیے استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں آپ کا نام شامل نہیں کیا گیا تھا کیونکہ اس بے گناہ کے خلاف بڑی گہری سازش بنی گئی تھی۔''

امان اللہ کے بعد مایا گواہی کے لیے پیش ہوئی۔ عدالت کے کمرے میں ایک وقت میں صرف ایک گواہ کو لایا جاتا تھا تاکہ بعد میں آنے والے گواہ کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ اس سے پہلے والے گواہ نے کیا بیان دیا ہے۔ اس طرح ایک گواہ کے بیان سے دوسرے گواہ کی گواہی متاثر نہیں ہوتی۔

مایا ایک ینگ اینڈ اسمارٹ لڑکی تھی۔ اس کے بارے میں، میں نے جو معلومات اکٹھا کی تھیں ان کے مطابق وہ اپنے کام کی ماہر اور اپنے کام سے کام رکھنے والی ایک نڈر اور صاف گو لڑکی تھی۔ پہلے وکیل استغاثہ نے مایا پر ایک واجبی سی جرح کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ مایا نے کمپنی کے حسابات میں پانچ لاکھ کا گھپلا پکڑا تھا۔

اپنی باری پر میں وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا اور جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''مایا جی! آپ نے اپنی آمد کے بعد ایک ماہ کے اندر ہی کمپنی کے حسابات میں ایک بڑی گڑبڑ کی نشاندہی کر دی تھی۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ایک قابل اور تجربہ کار اکاؤنٹنٹ ہیں۔''

''کاش ایسا ہی ہوتا.....!'' وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔

''میں سمجھا نہیں۔'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کاش کیسا ہوتا؟''

''میں نے کمپنی کے حسابات میں پانچ لاکھ کی گڑبڑ کا سراغ لگا لیا تھا لیکن اس کارنامے پر مجھے ایک قابل اور تجربہ کار اکاؤنٹنٹ کہنا ٹھیک نہیں۔ کاش میں نے یہ بھی معلوم کر لیا ہوتا کہ پانچ لاکھ کی وہ رقم کس نے، کس کو، کب، کس مد میں دی تھی.....!''

''اب میرے حیران ہونے کی باری ہے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بالکل بھی یقین نہیں آ رہا مایا جی.....!''

''آپ کو کس بات کا یقین نہیں آ رہا؟'' وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''اس بات کا یقین کہ آپ جیسی ماہر اکاؤنٹنٹ ایک ماہ میں جس بات کا سراغ نہیں لگا سکی.....'' میں نے اپنے مقصد کی جانب پیش قدمی جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ تین روز میں مقتول نے وہ گتھی سلجھا ڈالی۔''

''آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟'' وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''مقتول انیلا کا میرے ڈیپارٹمنٹ سے کیا تعلق واسطہ؟''

یہ بات پہلے بھی بتائی جا چکی ہے کہ انیس علی خفیہ انداز میں اپنی بیوی سے کمپنی کے حسابات کی جو جانچ پڑتال کروا رہا تھا اس کے بارے میں آفس کے دیگر اسٹاف کو علم نہیں تھا اور مایا کا شمار بھی انہی افراد میں ہوتا تھا لیکن ان لمحات میں، اپنے موکل کی نجات کے لیے میں نے مایا پر حیرتوں کا بم پھوڑنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا لہٰذا میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

''کیا آپ کو اس حوالے سے واقعی کچھ معلوم نہیں ہے؟''

''بالکل نہیں!'' وہ دوٹوک انداز میں بولی۔ ''آپ بتائیں.....''

''جب ایک ماہ کی تگ و دو کے بعد آپ پانچ لاکھ کا غبن کرنے والے شخص تک نہیں پہنچ سکیں تو کمپنی کے ایک پارٹنر انیس علی نے اپنی بیوی انیلا یعنی مقتول کو کمپنی کے حسابات کی چیکنگ کا کام سونپا تھا۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''جب چھ بجے آپ چھٹی کر کے اپنے گھر

ماڈرن دور

☆ گھر میں ملازمت کے امیدوار کا انٹرویو لیتے ہوئے گھر کے مالک نے قدرے حیرت سے کہا۔ ''پچھلے ایک سال میں تم آٹھ نوکریاں چھوڑ چکے ہو؟''

○ ''بس جی..... کیا کریں..... مجبوری ہے.....''

امیدوار نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''آج کل اچھے مالک کہاں ملتے ہیں؟''

مرسلہ: صفیہ رشید۔ لاہور

چلی جاتی تھیں تو اس کے بعد اکاؤنٹ سیکشن میں بیٹھ کر مقتول کمپنی کے حسابات کو کھنگالا کرتی تھی۔''

''یہ میرے لیے ایک بہت بڑا انکشاف ہے وکیل صاحب۔'' وہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے اس بارے میں ذرا سا بھی علم نہیں ہے۔''

''جو حقیقت ہے، وہ میں نے آپ کو بتا دی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جن رجسٹرز میں سے آپ کچھ بھی برآمد نہ کر سکیں، انہی رجسٹرز کی چیکنگ میں مقتول نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ کمپنی کے حسابات میں سے پندرہ مئی کو ڈیڑھ لاکھ، اٹھائیس مئی کو ڈیڑھ لاکھ اور بارہ جون کو دو لاکھ روپے نکالے گئے تھے.....''

''ایک منٹ وکیل صاحب!'' مایا قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ ''ان تاریخوں کے حساب سے کمپنی کے اکاؤنٹ میں سے پانچ لاکھ جانے کا سراغ تو میں نے بھی لگا لیا تھا مگر یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ یہ رقم کس کو دی گئی۔''

''دیکھیں، مقتول نے دو تین روز ہی میں معلوم کر لیا تھا کہ وہ پانچ لاکھ روپے ملزم نے غائب کیے تھے۔'' میں نے کہا۔

''مگر یہ کیسے ممکن ہے۔'' اس کی الجھن میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ ''کیا مقتول نے انہی رجسٹرز میں سے ملزم کے نام کا قرعہ نکالا تھا؟''

''جی بالکل۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مقتول نے ان رجسٹرز کے بعض صفحات پر فلیگ بھی لگائے تھے جس سے ثابت ہوتا تھا کہ غبن ملزم ہی نے کیا ہے۔''

''آپ ایک انہونی بات کر رہے ہیں وکیل صاحب!'' وہ مضطرب انداز میں بولی۔ ''کاش میں فلیگ لگے وہ دونوں رجسٹرز دیکھ سکتی۔ مجھے پتا چلا ہے کہ مذکورہ رجسٹرز پولیس اپنے ساتھ لے گئی تھی۔''

''آپ کو بالکل ٹھیک پتا چلا ہے مایا جی۔'' میں نے اپنی جرح کو فائنل ٹچ لگاتے ہوئے کہا۔ ''واقعی پولیس نے جائے وقوعہ سے وہ دونوں رجسٹرز اپنی تحویل میں لے لیے تھے لیکن میں ابھی عدالت کے کمرے میں آپ کی خواہش پوری کر سکتا ہوں۔''

''یعنی آپ وہ دونوں فلیگ لگے رجسٹرز مجھے ابھی دکھا سکتے ہیں؟'' مایا کے استفسار میں ایک خاص قسم کا ہیجان پایا جاتا تھا۔

میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔''

در اصل میں نے یہ محاورہ بول کر ایک طرح سے وکیل استغاثہ کی چوٹ کا جواب بھی دیا تھا۔ جب وکیل استغاثہ نے میرے موکل کو مجرم ثابت کرنے کے لیے یہ دونوں رجسٹرز جج کے سامنے پیش کیے تھے تو اس نے یہی محاورہ بولا تھا۔

آج عدالت کے کمرے میں مجھے سلمیٰ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس سے پہلے وہ ہر پیشی پر عدالت میں موجود ہوا کرتی تھی۔ بہر حال، میری فرمائش پر مذکورہ دونوں رجسٹرز استغاثہ کی گواہ اور ڈبل اے کنسٹرکشن کمپنی کی اکاؤنٹنٹ مایا کو دکھائے گئے۔

چند لمحات تک وہ بے یقینی اور حسرت کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ رجسٹرز کے مختلف صفحات کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی پھر فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

''وکیل صاحب! اگرچہ یہ دونوں رجسٹرز اپنی ساخت، سائز، صفحات، رنگ و فونٹ کے اعتبار سے ویسے ہی ہیں جو اکاؤنٹ سیکشن میں میرے زیر استعمال تھے لیکن یہ ہرگز ہرگز وہ نہیں ہیں۔ میں سمجھتی ہوں، اصل رجسٹرز جیسے ہو بہو دو رجسٹرز لے کر ملزم کے غبن کی اضافی انٹریز کے ساتھ خاص طور پر انہیں تیار کیا گیا ہے جس کا مقصد صرف اور صرف ملزم کو پانچ لاکھ کے غبن میں پھنسانا ہے۔''

''مایا جی! آپ کے منہ میں گھی شکر۔'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے آپ سے کچھ اور نہیں پوچھنا۔'' پھر میں نے روئے سخن جج کی جانب پھیرتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہنا شروع کیا۔

''جناب عالی! کمپنی کے ایک پارٹنر امان اللہ کے مطابق، ملزم نے اسے اپریل کے شروع میں کمپنی کے حسابات میں پانچ لاکھ کی گڑبڑ کی اطلاع دے دی تھی۔ اس بیان کی روشنی میں استغاثہ کا یہ موقف باطل ہو جاتا ہے کہ ملزم نے پندرہ مئی سے بارہ جون کے درمیان تین قسطوں میں پانچ لاکھ کا غبن کیا ہے.....'' لمحاتی توقف کر کے میں نے

Pakdigest.com

ایک گہری سانس خارج کی پھر سلسلۂ دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یور آنر! میرے موکل اور اس کیس کے ملزم انجینئر سکندر نے ان رجسٹرز کو دیکھ کر دوٹوک انداز میں کہہ دیا تھا کہ یہ اصلی نہیں ہیں۔ ملزم نے اپنے دعوے کے ثبوت کے طور پر صفحہ نمبر تینتیس پر سرکل لگانے کی عادت کی جو بات کی تھی، وہ بھی درست ثابت ہوئی ہے۔ عدالت کے حکم پر ملزم کے گھر اور آفس میں موجود تمام کتابوں کو چیک کرنے پر پتا چلا ہے کہ ملزم نے اپنی اس نفسیاتی عادت کا ذکر کرتے ہوئے کسی قسم کی دروغ گوئی سے کام نہیں لیا اور اب.....'' میں نے ایک مرتبہ پھر رک کر مایا کی جانب اشارہ کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''ڈبل اے کنسٹرکشن کمپنی کی اکاؤنٹنٹ نے بھی ان دونوں رجسٹرز کو بوگس قرار دے دیا ہے جس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ پانچ لاکھ کے غبن کے حوالے سے میرے موکل کا دامن صاف ہے اور کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت اسے اس مقدمے میں پھنسایا گیا ہے۔ استغاثہ نے اسی پانچ لاکھ کے غبن کو بنیاد بنا کر ملزم کو انیلا کا قاتل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بنیاد اپنے قدموں سے ہل چکی ہے۔ جائے وقوعہ پر میرے موکل کو دھکا دینے والا وہ نامعلوم پراسرار شخص جب پولیس کے ہتھے چڑھے گا تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے گا۔ مذکورہ بندے تک پہنچنے کا ایک ہی راستہ ہے..... زرینہ! میں نے اور ملزم کی بیوی سلمٰی نے زرینہ کے حوالے سے اچھا خاصا ہوم ورک کر رکھا ہے۔ اگر پولیس ہماری خدمات لینے کے لیے تیار ہو تو ہم ان کی مدد کرنے میں خوشی محسوس کریں گے۔''

اس کیس کی صورت جس انداز کی ہوگئی تھی اس میں ہمارے دشمنوں کو بھی یہی محسوس ہو رہا تھا کہ ملزم کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ استغاثہ کا صرف ایک گواہ باقی تھا یعنی مقتول کا شوہر انیس علی اور اس کے بارے میں پتا چلا تھا کہ وہ اسلام آباد گیا ہوا ہے۔

جج نے ایک ہفتے کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

☆☆☆

آیندہ پیشی سے پہلے ہی اس کیس کا ڈراپ سین ہوگیا۔ انکوائری آفیسر انور ملک سب انسپکٹر نے سلمٰی کے تعاون سے زرینہ کے اپارٹمنٹ کے مالک تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ پتا چلا کہ مذکورہ اپارٹمنٹ کا کرایہ فضل کریم نامی ایک شخص ادا کرتا ہے جو کسی سرکاری محکمے میں کام کرتا ہے۔ زرینہ نے جس شخص کو اپنا چاچا بتایا ہوا تھا وہ آسیہ بیگم کے شک کے مطابق، زرینہ کا شوہر تھا۔ فضل کریم کی ایک بیوی نواب شاہ میں بھی تھی۔ زرینہ اس کی دوسری بیوی تھی۔

جب سرکار کو سرکار سے کام پڑا تو دونوں نے ایک دوسرے سے بھرپور تعاون کیا۔ فضل کریم نے زرینہ کا کیمرا آئی او کے حوالے کر دیا۔ اسی روز کیمرے کے رول کو دھلوا کر تصاویر بنوالی گئیں۔ دیگر فوٹو کے علاوہ دو فوٹو ایسے تھے جن میں وہ نامعلوم، سکندر کو دھکا دینے والا شخص بڑے واضح طور پر انیلا پر فائرنگ کرتا نظر آرہا تھا۔ آئی او نے جان توڑ کوشش کر کے مذکورہ بندے کو ڈھونڈ نکالا۔

اس کا نام صفدر تھا۔ پولیس کی مار کھانے کے بعد صفدر نے بتایا کہ وہ انیس علی کا ناجائز بھائی تھا۔ یعنی صفدر انیس علی کے والد کا نطفہ تھا لیکن اس نے کبھی صفدر کی ماں سے شادی نہیں کی تھی۔ یہ راز صفدر اور انیس علی جانتے تھے۔ صفدر بنیادی طور پر مجرمانہ ذہنیت کا مالک تھا اور اپنی گزر بسر کے لیے وہ ہر قسم کے جرائم کرتا رہتا تھا۔ انیس کی معاشی حالت بہت اچھی تھی اس لیے گاہے بگاہے وہ صفدر کی مدد بھی کرتا رہتا تھا۔ جب پولیس کسٹڈی میں صفدر نے یہ انکشاف کیا کہ اس نے انیس علی کے کہنے پر انیلا کا قتل کیا تھا تو پولیس نے انیس علی کو شاملِ تفتیش کر لیا۔

''انیس پولیس والوں کی آؤ بھگت'' کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کرسکا اور اس نے زبان کھول دی۔ اس کی زبان سے ہونے والے انکشافات بڑے واہیات تھے۔

انیس اور سکندر میں گہرے فیملی ٹرمز تھے اور انیس کو شک تھا کہ انیلا کا سکندر کی طرف جھکاؤ ہے۔ یہ انیس کا وہم تھا۔ درحقیقت ایسا کوئی معاملہ تھا ہی نہیں۔ بہرحال انیس کی بیمار سوچ کے مطابق انیلا اس سے بے وفائی کر رہی تھی لہٰذا اس نے اپنی بیوی اور اس کے مبینہ آشنا کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرنے کے لیے ایک سازش تیار کی جس کے نتیجے میں اس نے انیلا اور سکندر سے انتقام لینے کے علاوہ پانچ لاکھ کمانے کا بندوبست بھی کرلیا تھا لیکن زرینہ کی ایک مہمانی حرکت نے اس کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا تھا۔

انیس علی نے سکندر کو پھانسنے کے لیے جو چوہے دان استعمال کیا تھا، بالآخر وہ خود اس میں پھنس گیا تھا۔ دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے سے پہلے انسان کو یہ سوچ لینا چاہیے کہ قدرت اس کے لیے بھی کوئی عمیق گڑھا تیار کرسکتی ہے.....!

(تحریر: حسام بٹ)

آدھی رات کے اس وقت اپنی جان پر کھیل کر میں اس میوزیم کے اندر آیا تھا لیکن شیشے کی خالی الماری میرا منہ چڑا رہی تھی۔ کوئی مجھ سے پہلے ہی یہاں موجود ہیرا چوری کر چکا تھا۔ یہ میرے پاس آخری راستہ تھا۔ مجھے لگا میں نے اس نیلی آنکھوں والی چھوٹی لڑکی کو کھو دیا ہے جس نے صبح اسپتال کے ایک کمرے میں مجھ سے پوچھا تھا۔ ''کیا مرنے سے بہت زیادہ درد ہوتا ہے ڈیڈ؟''

''میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا میری این۔'' میں

شارٹ کٹ اختیار کرنے والے بازی گروں کے خطرناک عزائم

کبھی کبھی انسان اپنی تمام ہوشیاری پر بے وقوفی کا پردہ ڈال کر بہت فائدے میں رہتا ہے اور... وہ بھی اپنی قسمت آزمائی کے ہر مرحلے پر کچھ ایسا ہی روپ دھارے اپنی سادگی کا یقین دلاتے ہوئے کامیابی کی چابی مقدر پر لگے لاک پر آزماتا جارہا تھا... یہ اور بات کہ ہر مرحلے کے اختتام پر مزید آزمائش اس کی منتظر رہتی۔

آسان شکار

محمد طاہر عمیر



PakiBooks.com

نے وعدہ تو کیا تھا۔ لگتا تھا اب یہ وعدہ پورا نہیں ہو سکے گا۔

جنونی کیفیت میں، میں نے شیشے کی خالی الماری پر پستول خالی کر دیا۔ کانچ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی ہر طرف سے سائرن کی آوازیں گونج اٹھیں۔ کئی بھاگتے ہوئے قدم اور للکارتی ہوئی آوازیں میرے کانوں میں اتر رہی تھیں۔ میں گھٹنوں کے بل گر گیا۔

حتیٰ کہ میری آنکھ کھل گئی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ ٹیبل کلاک کا الارم بج رہا ہے۔ میں نے لیٹے لیٹے اس پر ہاتھ مار کر اسے خاموش کروایا لیکن اس کے ساتھ ہی میرے بائیں ہاتھ میں درد کی لہریں دوڑ گئیں۔ میں نے دیکھا میری بائیں کلائی پر ایک سفید پٹی بندھی تھی۔ میں گہری سانس لیتا ہوا بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

پھر وہی خواب، پھر وہی منظر، پھر وہی احساس۔ میں اٹھ کر واش روم میں گھس گیا۔ جب میں گرم پانی سے غسل کر کے باہر نکلا تو ذہن فریش ہو چکا تھا۔ اب میرے سامنے ایک پورا دن تھا۔ ہمیشہ کی طرح ناشتے میں کارن فلیکس اور جوس تھا۔ جیسے ہی میں دفتر جانے کے لیے گھر سے باہر نکلا، اسی لمحے ساتھ والے گھر سے مسز اسٹیٹے اپنی کتیا کو ٹہلانے باہر نکلیں اور مجھے دیکھ کر مسکرا کر صبح کا سلام کیا۔ بس اسٹاپ پر میں سات بج کر تیس منٹ پر پہنچا تھا اور بس ٹھیک سات بج کر پینتیس منٹ پر آئی تھی۔ بیس منٹ کا سفر خاموشی سے طے ہوا۔ ہمیشہ کی طرح دفتر میں میری ملاقات سب سے پہلے ایڈم سے ہوئی۔ اپنے کیبن میں داخل ہوتے ہی میں ایسا مصروف ہوا کہ پھر دو بجے لنچ بریک میں ہی باہر نکلا۔ روزانہ کی طرح میں نے ایک ''چیز برگر'' لیا اور بریک کے بعد واپس اپنے کیبن میں آ گیا۔ سہ پہر چار بجے میں نے میٹنگ ہال میں ایک پریزنٹیشن دی۔ ٹھیک پانچ بجے میں دفتر کے کام نمٹا کر باہر نکلا۔ بس اسٹاپ پر پہنچتے ہوئے راستے میں، میں نے کافی کا ایک کپ لیا۔ وہ ایک عام سا دن تھا لیکن جیسے ہی میں اپنی بس میں سوار ہوا، وہ دن عام نہیں رہا۔ میں اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا جب ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں میکس؟''

مخاطب ایک بھورے بالوں والی یورپین لڑکی تھی۔ اس نے سرخ اوورکوٹ پہن رکھا تھا اور ہاتھوں پر سیاہ دستانے تھے۔ اس کے چہرے کی رنگت پیلی تھی جیسے اس میں خون کی کمی ہو۔

''ضرور بیٹھیے۔ یہ سیٹ ریزروڈ نہیں ہے۔ اور ہاں، میرا نام میکس نہیں ہے۔'' میں نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ وہ بڑے اطمینان سے میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

''کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کی حقیقت ہمیں معلوم نہیں ہوتی۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔

''اگر میرے نام کی حقیقت معلوم نہیں تھی تو پھر فرضی نام لے کر پکارنے کا مقصد کیا تھا؟''

''میں اپنی نہیں، تمہاری بات کر رہی تھی میکس۔''

''لیکن میرا نام میکس نہیں ہے۔ میرا نام تو.....'' اس نے میری بات کاٹ دی۔

''تمہارا نام ''پارکر'' نہیں ہے میکس۔'' میں حیران رہ گیا۔

''کیا یہ کسی قسم کا کوئی مذاق ہے؟''

''میرے پاس ایسا بہت کچھ ہے جو مذاق لگے گا لیکن یہ مذاق نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔''

''تم بار بار حقیقت کا لفظ کیوں استعمال کر رہی ہو؟''

''جب ہم ایک نقلی دنیا میں ایک نقلی سفر کرتے ہوئے یوں باتیں کرتے ہیں تو ''حقیقت'' سمجھنے کے لیے اس لفظ کی تکرار ضروری ہو جاتی ہے۔''

''کیسی نقلی دنیا..... اور نقلی سفر سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ہم ایک نقلی دنیا میں ہی تو رہ رہے ہیں جہاں ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔ ذرا غور کرو، پچھلی بار بارش چار دن پہلے ہوئی تھی۔ ٹھیک چھ بج کر پینتالیس منٹ پر..... آج بھی ایسا ہی ہوگا۔'' اس نے رسٹ واچ کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''غور کرنا۔ ٹھیک دس سیکنڈ بعد بارش شروع ہونے والی ہے۔''

میں نے بے اختیار باہر دیکھا۔ جب میں بس میں سوار ہوا تھا تو آسمان صاف تھا لیکن اب وہاں کافی بادل جمع ہو چکے تھے اور ٹھیک دس سیکنڈ بعد بارش شروع ہو گئی۔

''تم اس اتفاق سے کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟''

''یہی کہ یہ اتفاق نہیں ہے۔ یہ طے کیا جا چکا ہے کہ ہر ماہ کے کن مخصوص دنوں میں اور کس مخصوص وقت میں بارش شروع ہوگی اور دس سے بیس منٹ کے دورانیے کے بعد یہ تھم جائے گی۔''

''میں نے کبھی غور نہیں کیا۔'' میں نے کہا۔

''میں نے بھی غور نہیں کیا بلکہ میں جانتی ہوں کہ اس دنیا کو بنانے والے نے بارش کی ٹائمنگ کیا رکھی تھی اور صرف بارش ہی نہیں بلکہ یہاں ہر چیز کا ایک وقت مقرر کیا گیا ہے۔ ہر صبح جب تم دفتر جانے کے لیے گھر سے باہر نکلتے ہو تو عین اسی وقت مسز اسٹیٹے اپنی کتیا کے ساتھ اپنے گھر سے باہر نکل رہی ہوتی ہے۔ تمہارے بس اسٹاپ پر پہنچنے کے ٹھیک پانچ منٹ بعد بس وہاں پہنچتی ہے، چاہے تم جتنا بھی لیٹ ہو جاؤ۔ روٹین کو سمجھو..... تمہیں کبھی محسوس نہیں ہوا کہ تمہارے اردگرد جو ہو رہا ہے یا تم جو کچھ کرتے ہو، وہ بالکل ایک جیسا ہے۔ پچھلے کئی عرصے سے اس میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔ تمہارا دفتر کا دوست ایڈم۔ کیا تم یہ بھی نہیں جانتے کہ کتنے ہفتوں سے وہ ایک ہی سرخ چیک دار شرٹ پہن کر تم سے ملتا ہے اور کسی فضول سے رگبی میچ کا نتیجہ بتاتا ہے۔''

میں اس کی باتوں پر حیران تھا اس لیے نہیں کہ اس کی بتائی گئی ٹائمنگ ٹھیک تھی بلکہ اس لیے کہ وہ میری ذاتی زندگی کے بارے میں بھی بتا رہی تھی۔

''کیا تمہارا تعلق کسی سرکاری ایجنسی سے ہے؟ اور کیا یہ میرے لیے کوئی ٹیسٹ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں لیکن میرے پاس ایسا بہت کچھ ہے جس پر یقین کرنا تمہارے لیے مشکل ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یقین نہ کرنے کی صورت میں نقصان کسے ہوگا؟ مجھے، تمہیں، یا میری این کو؟''

''میری این کون ہے؟'' میں چونکا۔

''تمہاری بیٹی جسے تم اسپتال میں چھوڑ کر یہاں آ گئے ہو۔''

میں دم بخود رہ گیا۔ ''تم میرے خواب کے بارے میں کیسے جانتی ہو؟''

وہ بولی۔ ''وہ خواب نہیں ہے، ایک حقیقت ہے..... ایک ایسی حقیقت جسے تم نے خواب کا لبادہ اوڑھا کر فراموش کر رکھا ہے۔''

''آخر یہ حقیقت ہے کیا؟'' میں زچ ہو کر رہ گیا۔

''یہ زمین، یہ آسمان، یہ شہر، تمہارا گھر..... یہ بس اور اس بس میں سوار تمام انسان..... اور اس شہر میں بسنے والے تمام انسان۔ ان سب کے علاوہ جو باقی بچتا ہے، وہ سب ''حقیقت'' ہے..... یعنی بس ہم دونوں ایک حقیقت ہیں..... لیکن ہماری یہ ملاقات بھی حقیقت نہیں ہے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' میں نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''جب ہم کوئی خواب دیکھتے ہیں تو لگتا ہے کہ ہم اصل میں وہاں موجود ہیں لیکن جب ہم بیدار ہوتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو محض ایک خواب تھا۔''

''تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ ہم اس وقت ایک خواب میں ہیں؟'' میں نے کہا اور فوراً ہی اپنے ہاتھ پر چٹکی کاٹ لی۔ تکلیف کی لہری دوڑ گئی اور مجھے میرے ہی سوال کا جواب ''نفی'' میں مل گیا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

''تم نے ٹھیک سوچا۔ ہم خواب میں نہیں ہیں..... لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہم اصلی دنیا میں بھی نہیں ہیں۔''

''تو در اصل ہم ہیں کہاں؟''

''باقی باتیں تمہارے گھر پر ہوں گی کیونکہ ہم وہاں پہنچ گئے ہیں۔'' اس نے کہا اور عین اسی لمحے بس رک گئی اور ہم دونوں وہیں اتر گئے۔ میں نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ کسی دماغی امراض کے اسپتال سے فرار مریضہ ہو اور میرے لیے کوئی خطرہ بننے والی ہو۔ ہم گھر پہنچ گئے۔ میں نے فریج سے بیئر کے دو ٹن نکالے اور لیونگ روم میں آ گیا جہاں وہ بیٹھی ہوئی تھی۔

''اگر میں تمہیں کہوں کہ بیئر کا یہ ٹن اصل نہیں ہے تو تم یقین کرو گے یا نہیں؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے بیئر کا گھونٹ بھرا۔ اسے حلق سے اتار کر ذائقے کو محسوس کیا اور کہا۔ ''میں آزمانے کے بعد فیصلہ کرتا ہوں اور آزمانے کے بعد مجھے لگتا ہے کہ یہ بیئر ہی ہے اور حقیقت میں ہے۔''

''ضروری نہیں جو ہم دیکھ رہے ہوں وہی اصل ہو۔ ہو سکتا ہے کوئی ہمیں ہماری نظروں سے دنیا کو اس طرح ''دکھا'' رہا ہو کہ ہمیں اصل اور نقل میں تمیز ہی نہ رہے۔''

''ہا..... ایک انسان کو کوئی کیسے اس طرح ''آپریٹ'' کر سکتا ہے۔ ہم مشین نہیں ہیں، ہم اپنے فیصلوں میں آزاد ہیں۔''

''تم نے کبھی ویڈیو گیم کھیلا ہے۔ گیم تو اس کے اندر موجود کھلاڑی کھیلتا ہے لیکن اس کو کنٹرول ہم کرتے ہیں۔ اگر کھلاڑی کے پاس پستول ہو تو در اصل فیصلہ ہم کرتے ہیں کہ اس سے کسی چور کو مارنا چاہیے یا پولیس والے کو۔''

''ہاں، شاید ایسا ہی ہو۔ در اصل مجھے گیمز میں دلچسپی نہیں ہے۔'' میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''کھلاڑی کو دلچسپی ہو یا نہ ہو، اس کو کنٹرول کرنے والے اسے گیم کھیلنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔''

''تم مجھے یہ بتا رہی تھیں کہ ہم ایک اصلی دنیا میں نہیں ہیں تو پھر ہم ہیں کہاں؟'' میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

''ہم ایک گیم کے اندر ہیں میکس اور یہی حقیقت ہے۔''

''میرا نام پارکر ہے اور میں تمہاری حقیقت پر لعنت

بھیجتا ہوں۔ تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ ہم ایک ویڈیو گیم کے اندر زندگی گزار رہے ہیں۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''کوئی عام ویڈیو گیم نہیں، یہ ورچوئل گیم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نیویارک میں نہیں بلکہ ''ورچوئل ورلڈ'' میں بنائے گئے نیویارک کے ''تھری ڈی'' شہر میں رہ رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا نام ''میکس'' ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا نام ''ساشا'' ہے اور ہم دونوں اس گیم کے کردار ہیں جس کا نام ''بینگ بینگ'' ہے۔''

اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ میرا منہ حیرت کے مارے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

☆☆☆

''ورچوئل ورلڈ..... کمپیوٹر کی مدد سے بنائی جانے والی ایسی مجازی دنیا ہے جو ہماری اصلی دنیا کے مانند ہی ہوتی ہے مگر یہ اصلی نہیں ہوتی۔ ہاں اسے ایک اصلی دنیا کے مانند محسوس ضرور کیا جاسکتا ہے۔ اسے ''ورچوئل رینلٹی'' بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ ایک ایسی جگہ ہے جو ہمارے تصور اور حقیقت کے درمیان کا حصہ ہے۔ کمپیوٹر کی مدد سے کسی بھی ملک کا یا کسی بھی شہر کا ہو بہو تھری ڈی نقشہ بنایا جاتا ہے اور پھر اس میں وہ سب ڈالا جاتا ہے جس کی ایک شہر کو ضرورت ہوتی ہے۔ صرف عمارتیں ہی نہیں، یہاں پر پوری زندگی کا جیتا جاگتا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ کمپیوٹر پروگرامنگ کی مدد سے یہاں پر انسانوں کو بسایا جاتا ہے۔ یہاں حکمرانوں کے طریقے، اسٹاک ایکس چینج کا اتار چڑھاؤ، کاروبار کے اصول ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے کہ ہماری اصلی دنیا کے۔ اس کی بہت سی جہتیں ہیں اور ان میں سے ایک شکل ''ورچوئل گیم'' بھی ہے۔ یعنی ایک ایسا ویڈیو گیم جسے کھیلنے والا خود اس کے اندر داخل ہوجاتا ہے اور یہ گیم کسی ریموٹ یا جوائے اسٹکس کے بجائے جسمانی طور پر کھیلا جاتا ہے۔ یہاں کنٹرول ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ ہم بھی ایک ایسے گیم کا حصہ ہیں جسے آج سے پانچ سال پہلے بنایا گیا تھا۔ ہمارے اردگرد کی یہ دنیا اصلی نہیں ہے۔ یہ نیویارک اصلی نہیں ہے بلکہ اصل کی تھری ڈی کاپی ہے۔ یہاں کی عمارتیں، ٹرانسپورٹ، حکومتی مشینری، پولیس، یہاں تک کہ ہمارے علاوہ تمام انسان اصل نہیں ہیں بلکہ ''کمپیوٹر پروگرام'' ہیں۔ کیا یہاں تک بات تمہاری سمجھ میں آگئی ہے؟'' اس نے پوچھا تو میں چونک گیا۔

''ہاں..... نن نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ..... تم یہ کہہ رہی ہو کہ میں اپنی پوری زندگی ایک ایسی دنیا میں جیا ہوں جو اصل نہیں ہے؟ میرے بچپن کے دن، میرے اسکول کالج، میرے دوست، ماں باپ، میری نوکری، میری کامیاب زندگی سب جھوٹ ہے..... سب جعلی ہے؟ اس دنیا میں صرف ہم دو ہی اصل انسان ہیں، باقی سب جھوٹ!''

''صرف ہم دو نہیں..... ہمارے علاوہ آٹھ افراد اور بھی ہیں۔'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''رہی بات تمہارے ماضی کی تو یہ صرف تمہارا احساس ہے۔ گیم کے ہر کھلاڑی کی ایک پروفائل ہوتی ہے جس میں اس کی زندگی کی جھوٹی کہانی لکھی گئی ہوتی ہے۔ کھلاڑی کو یہ کہانی اپنے ماضی کا حصہ لگتی ہے اسی لیے تو وہ حال میں اس کے مطابق عمل کرتا ہے۔ ہمیں اس گیم میں داخل ہوئے چند سال ہی ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے ہم تم اپنی اصلی زندگی میں ہی تھے۔ تم اسے اس انداز سے سمجھ سکتے ہو کہ پہلے سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا..... پھر ایک رات تم سوئے اور جب بیدار ہوئے تو تم اس گیم کے اندر تھے اور تمہیں اس کا احساس تک نہ تھا۔''

''اگر تم مجھ سے مذاق کر رہی ہو تو یہ تمہیں کافی مہنگا پڑے گا۔'' میں نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

''ہم میں سے کسی کو زبردستی اس گیم میں داخل نہیں کیا گیا۔ ہم سب اپنی مرضی سے یہ گیم کھیل رہے ہیں۔''

''کوئی اپنی اصلی دنیا کو چھوڑ کر ایک نقلی اور کمپیوٹر کی بنی ہوئی دنیا میں رہنے کا انتخاب کیوں کرے گا؟'' میں چلایا۔

''کیونکہ جیتنے والے کو ایک سو ملین ڈالرز ملیں گے..... اور ہم میں سے ہر ایک کو پیسے کی ضرورت ہے۔''

''مجھے پیسا نہیں چاہیے۔'' میں نے میز پر مکا مارتے ہوئے کہا۔

''ہاں، تمہیں چاہیے۔ اپنے لیے نہیں بلکہ اپنی بیٹی ''میری این'' کے لیے جسے تم اسپتال میں چھوڑ کر آئے تھے۔'' اب کی بار وہ بھی زور سے بولی اور میں دم بخود رہ گیا۔ مجھے اپنے خواب میں گونجنے والا فقرہ یاد آگیا۔

''کیا مرنے سے بہت زیادہ ڈر لگتا ہے ڈیڈ؟''

''وہ محض خواب نہیں ہے، وہ تمہاری اصلیت ہے۔'' ایک توقف کے بعد وہ بولی۔ ''تمہاری بیٹی کو برین ٹیومر ہے اور تمہارے پاس اس کے علاج کے لیے پیسے نہیں تھے۔ تم نے بہت کوششیں کیں، کچھ قانونی اور کچھ غیر قانونی۔ آخر میں تم نے ایک میوزیم سے ایک بیش قیمت ہیرا چرانے کا سوچا لیکن جب تم وہاں پہنچے تو کوئی اسے تم سے پہلے چرا چکا تھا۔ تم نے بے بسی کے عالم میں

اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دیا۔ وہیں جیل میں تم سے اس گیم کے لوگوں نے رابطہ کیا کیونکہ ان لوگوں کو ایسے بندوں کی ضرورت تھی جنہیں اپنی زندگی کی پروا نہ ہو اور وہ قیدی بھی ہوں۔ تمہیں میری این کے علاج کے لیے پیسے چاہیے تھے اس لیے تم نے فوراً اس گیم میں حصہ لینے کے لیے ہامی بھر لی اور ان لوگوں نے تمہیں جیل سے باہر نکالا اور اس گیم میں داخل کر دیا۔''

''نہیں نہیں..... اگر وہ ایک خواب ہے تو تمہیں کیسے معلوم ہوسکتا ہے؟ اور اگر تمہیں معلوم ہے تو..... مم..... میں کیسے مان لوں کہ ہم ایک ویڈیو گیم کے اندر ہیں۔''

''یہ دنیا اصلی دنیا جیسی ضرور ہے لیکن اس کے اصول اتنے سخت نہیں ہیں جیسا کہ فزکس۔ تم اپنے یقین کو مضبوط رکھتے ہوئے یہاں کچھ ناممکن کام کر سکتے ہو جیسے کہ کشش ثقل سے چھٹکارا۔'' اس نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس کا جسم ہوا میں بلند ہونے لگا۔ میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ اتنی بلند ہوگئی کہ اس کے پیر میرے کندھوں تک آرہے تھے۔

''تم اپنے ذہن میں اس خیال کو راسخ کرلو کہ یہ اصلی دنیا نہیں ہے۔ یہاں پر کشش ثقل نہیں ہے پھر دیکھنا تم بھی ہوا میں بلند ہوسکو گے۔ تجربہ شرط ہے۔''

میں نے کوشش کی لیکن میں خود کو یقین نہیں دلا سکا اور اس کی طرح ہوا میں بلند نہیں ہوسکا۔ وہ دوبارہ نیچے اتر آئی۔

''ہم غیر معمولی رفتار سے بھاگ سکتے ہیں۔ پانی کے اندر سانس لے سکتے ہیں، فائٹ کر سکتے ہیں، ہر قسم کا اسلحہ چلا سکتے ہیں اور بہت کچھ ایسا کر سکتے ہیں جو ہم اصلی دنیا میں نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ہمارا ذہن ہمارے ارادے کا ساتھ دے۔ یہ مشکل نہیں ہے یا صرف کچھ دیر کی تربیت کے بعد تم بھی یہ سب کر سکتے ہو۔''

''ہم سے مراد..... آٹھ افراد ہیں جو یہ گیم کھیل رہے ہیں؟'' میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''آٹھ وہ اور دو ہم..... کل ملا کر دس کھلاڑی۔ اس دنیا میں ہم دس افراد کے علاوہ ہر چیز طے شدہ ہے۔ تم نے غور نہیں کیا۔ تم جب بھی صبح بس اسٹاپ پہنچتے ہو تو ٹھیک پانچ منٹ بعد ایک ہی بس وہاں آتی ہے۔ چاہے تم لیٹ بھی ہوجاؤ۔ اگر تم نے فٹ پاتھ پر پیدل چلتے لوگوں کو دیکھا ہو تو تم محسوس کرو، ان سب کے چلنے کا انداز ایک ہی جیسا ہے۔ بارش، سورج، چاند، موسم اور سڑکوں پر بھاگتی زندگی کا مشاہدہ کرو۔ ان چیزوں پر غور کرنے سے تمہیں یقین آجائے گا کہ یہ اصلی دنیا نہیں ہے۔''

میں نے اپنا سر تھام لیا پھر بیئر کے ٹن کو منہ سے لگا کر اس کا آخری قطرہ تک حلق میں انڈیل لیا اور چند لمحے لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ ایک سنسناہٹ سی سارے جسم میں دوڑ رہی تھی۔

''مطلب ہم جسمانی طور پر اس گیم کے اندر ہیں۔'' میں نے کہا۔

''کسی حد تک۔ ہمارے جسم اصلی دنیا میں نیند کی کیفیت میں ''مین سرور'' سے جڑے ہوئے ہیں۔ ہمیں ذہنی طور پر اس گیم میں داخل کیا گیا ہے۔ ہمارے یہ جسم کمپیوٹر سافٹ ویئر ہیں جنہیں ہمارا دماغ کنٹرول کرتا ہے، بالکل ایسے جیسے ہمارا دماغ ہمارے اصلی جسم کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ ہمارے اصلی جسم نہیں ہیں لیکن ان پر چوٹ لگے تو ہمیں درد بھی ہوگا کیونکہ بہرحال ساری حسیات کا تعلق دماغ سے ہی تو جڑا ہوتا ہے۔'' اس نے تفصیل بتائی۔

''اگر ہم دونوں اس گیم کے کردار ہیں تو یہ باتیں صرف تمہیں کیوں معلوم ہیں..... مجھے کیوں نہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''یہ وہ سوال ہے جس کا مجھے انتظار تھا کیونکہ اسی سوال کی وجہ سے تمہاری یہ حالت ہے۔ سنو میکس..... سوری پارکر۔ ہر ویڈیو گیمز کی کچھ ہدایات ہوتی ہیں۔ گیم کھیلنے سے پہلے انہیں پڑھنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ اس میں اس گیم کی نوعیت اور اس کے بارے میں اہم معلومات درج ہوتی ہیں۔ شاید تم نے کبھی ویڈیو گیم نہیں کھیلا اس لیے تم نے بے وقوفی کی کہ ''انسٹرکشنز'' نہیں پڑھیں۔ اسی لیے تمہاری یادداشت کے ساتھ ایسا مسئلہ ہو رہا ہے۔ لیکن ایک بات یہ بھی ہے کہ جیسے جیسے میں تمہیں بتاتی جارہی ہوں، تمہیں یاد بھی آتا جارہا ہے..... ہے نا؟''

میں نے صرف اثبات میں سر ہلانا کافی سمجھا۔

''تمہارے علاوہ باقی کے سبھی کھلاڑیوں نے وہ ہدایات پڑھی تھیں۔ ان میں لکھا ہوتا ہے کہ اس گیم کے کیا اصول ہیں اور انہیں کیسے کھیلا جائے اور مشن کون کون سے ہیں۔ یہ سب جانتے ہیں ماسوائے تمہارے کیونکہ تم نے ان ہدایات کو نظر انداز کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جیسے ہی تم گیم کے اندر داخل ہوئے، تمہیں یہ یاد ہی نہیں رہا کہ تم اصلی دنیا سے نکل کر کسی نقلی دنیا میں داخل کر دیے گئے ہو۔''

''باقی آٹھ کھلاڑی کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ضروری ہے کہ تمہیں علم ہو کہ یہ گیم دراصل ہے کیا۔ اصل میں یہ ایک آن لائن گیم ہے، مطلب اسے دنیا

بھر کے کروڑوں لوگ براہِ راست ''لائیو'' دیکھ رہے ہیں۔ ہم دس افراد اس گیم میں اپنی بقا کی جنگ لڑنے میں مصروف ہیں۔ ہر فرد کی اپنی اپنی خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں۔ اصل دنیا میں اس گیم کو دیکھنے والے ہم دس افراد پر پیسے لگا رہے ہیں۔ یہ کروڑوں نہیں اربوں ڈالرز کا جوا ہے۔ اس گیم کے بھی ویسے ہی اصول وضوابط ہیں جیسے کہ ہر گیم کے ہوتے ہے۔ ہمارا مشن ہے ''زندگی کی چابی'' کو حاصل کرنا اور اس دنیا میں کہیں ایک ایگزٹ ڈور ہے جسے اس چابی سے ہی کھولا جاسکتا ہے۔ ہم میں سے کوئی ایک فرد ''چابی اور دروازے'' کو تلاش کرے گا اور پھر جو بھی ایک شخص سب سے پہلے اس مخصوص دروازے کو پار کرے گا، وہی فاتح ہوگا۔''

''اور باقی نو افراد کا کیا ہوگا؟''

''کسی ایک کے جیتنے کے بعد یہ گیم ختم ہوجائے گا۔ جیتنے والا اصل دنیا میں ہوش میں آجائے گا جبکہ ہارنے والے..... وہ اصل دنیا میں یا تو پاگل ہوجائیں گے یا پھر کومے میں چلے جائیں گے۔ مرنے کے بھی چانسز ہیں اور ہوسکتا ہے کوئی خوش قسمت بچ بھی جائے۔ یہ یقیناً ایک خطرناک کھیل ہے لیکن اسی لیے تو اس گیم میں ایسے لوگوں کو شامل کیا گیا ہے جنہیں اپنی جان کی بھی پروا نہ تھی۔'' اس نے بڑے رسان سے کہا۔

''اگر میں تمہاری تمام باتوں پر یقین کرلوں تو بتاؤ کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہوگا؟'' ایک توقف کے بعد میں نے پوچھا۔

''تم دو ماہ تک اس گیم سے لاتعلق رہے اور اس دوران ہم نو افراد اس ''چابی اور دروازے'' کے حصول کے لیے کوششیں کرتے رہے۔ بقا کی اس جنگ میں اس وقت سب مارے جاچکے ہیں۔ صرف میں اور تم ہی بچے ہیں۔'' اس کی بات سن کر میں اچھل پڑا۔

''مم..... مطلب..... تم نے باقی آٹھ افراد کو مار ڈالا..... اور چابی تمہارے پاس ہے..... اور اب تم جیتنے کے لیے مجھے مارنے آئی ہو؟''

''ہاں..... اور نہیں۔'' وہ تیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہاں، میں نے باقی آٹھ افراد کو ختم کر دیا ہے۔ سب مارے جاچکے ہیں سوائے میرے اور تمہارے۔ اور ہم دونوں میں سے ہی ایک اس گیم کا فاتح ہوگا۔ میرے پاس ایگزٹ ڈور کا نقشہ ضرور ہے لیکن وہ ''چابی'' نہیں ہے۔ کیونکہ اگر چابی میرے پاس ہوتی تو میں اب تک وہ دروازہ پار کر چکی ہوتی۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں تمہیں یہ ساری باتیں بتانے آتی۔ میرے جیت جانے کے بعد تم خود بخود فنا ہوجاتے۔''

''تو پھر چابی کہاں ہے؟'' میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

اس نے اپنے سیاہ اوورکوٹ کے اندر موجود ہاتھ باہر نکالا جس میں ایک بریٹا پسٹل تھا۔

''چابی تمہارے پاس ہے پارکر۔ وہ مجھے دے دو۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔

☆☆☆

میرے سامنے بھورے بالوں والی ایک لڑکی کھڑی تھی جس نے اپنا نام ساشا بتایا تھا اور ساتھ میں کچھ عجیب سی باتیں بھی لیکن اس وقت سب سے زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں ایک پستول تھا جس کا نشانہ میں تھا۔

''چابی میرے حوالے کردو پارکر۔''

''مم..... میرے پاس چابی کہاں سے آئی۔ مجھے تو اس سارے کھیل اور چابی کے بارے میں پتا ہی کچھ نہیں تھا تو پھر میں کیسے.....'' میں نے بوکھلا کر کہا۔

''میں جانتی ہوں، ہم دو ماہ سے یہ کھیل کھیل رہے ہیں۔ سب سے پہلے میں نے ہی اس چابی کا پتا چلایا۔ یہ چابی ایک میوزیم میں نوادرات کے بیچ رکھی گئی تھی۔ میں نے اسے چرایا لیکن میں جانتی تھی کہ اب سارے کھلاڑی میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔ اس لیے میں نے ایک منصوبہ بنایا۔ ہم سب جانتے تھے کہ تم اس کھیل میں شامل ہونے کے باوجود شامل نہیں ہو۔ اس لیے کسی کو تمہاری پروا نہیں تھی کیونکہ سبھی کا خیال تھا کہ تم ایک بے ضرر کھلاڑی ہو جو مشن میں شامل ہی نہیں، سو ایسے کھلاڑی کو نہ ہی چھیڑا جائے۔ خود میرا بھی یہ خیال تھا لیکن اسی خیال سے مجھے ایک دوسرا خیال آیا۔ میں نے ایک رات یہ چابی تمہارے گھر میں ہی چھپا دی تاکہ کسی کا دھیان اس طرف جائے ہی نہیں، اس کے بعد میں نے نہ صرف ایگزٹ ڈور کا نقشہ حاصل کرلیا بلکہ باقی کھلاڑیوں کو بھی ٹھکانے لگا دیا اور پھر کل جب میں چابی حاصل کرنے تمہارے گھر پہنچی تو چابی وہاں نہیں تھی جہاں میں نے اسے چھپایا تھا۔ میں نے بہت ڈھونڈا لیکن وہ مجھے نہیں ملی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ تمہارے پاس ہی ہے۔ میں نہیں جانتی کہ تم نے یہ کیسے کیا لیکن سچ یہی ہے۔ اب بتاؤ، چابی تمہارے پاس ہی ہے نا؟'' میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر کہا۔

''شش..... شاید تم اس چابی کی بات کر رہی ہو جو مجھے لان کی صفائی کرتے ہوئے ایک کیاری میں دفن چھوٹی سی ڈبیا میں ملی تھی۔ تمہیں معلوم ہے یا نہیں لیکن مجھے نوادرات سے بہت دلچسپی ہے۔ مجھے لگا یہ چابی کسی قدیم خزانے تک پہنچنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس لیے میں نے اسے محفوظ جگہ پر چھپا دیا۔ ایک ایسی جگہ جس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا اور اگر یہ وہی چابی ہے تو میں اسے تمہیں کیسے دے سکتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ میں ہی اس کھیل کا فاتح ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی جیب میں سے اپنا ہاتھ پسٹل سمیت باہر نکالا اور اس پر تان لیا۔ یہ پسٹل میں نے اس وقت جیب میں ڈالا تھا جب گھر آنے کے بعد میں بیئر کے ٹن اٹھانے گیا تھا۔ مجھے یہ عورت خطرناک لگ رہی تھی اور یہی ہوا۔

''اگر تمہارے پاس وہ چابی ہے تو میرے پاس اس مخصوص دروازے کے راستے کا نقشہ ہے..... اور یہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر بے کار ہیں۔ ہم دونوں میں سے ایک کو مرنا ہوگا لیکن جو زندہ رہا، وہ بھی اس گیم سے نکل نہیں پائے گا۔'' اس نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے پر پستول تو تان لیے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی سمجھ گئے تھے کہ اگر ایک مرا تو دوسرے کی زندگی موت سے بھی بدتر ہوگی۔ کیونکہ ہوسکتا ہے پھر وہ ساری عمر اسی گیم میں پھنسا رہ جائے۔

''تمہاری زندگی میری موت ہے لیکن تمہاری موت بھی میری موت ہے۔ کریں تو کیا کریں۔'' اس نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔

''یا تو میں تمہیں ''چابی'' دے دوں یا پھر تم مجھے ''نقشہ'' دے دو..... اور کوئی حل نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''شاید یہی حل ہے۔'' اس نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے کہا۔ ''ہم میں سے کسی ایک کو تو ہار ماننا ہی ہوگی۔'' اور پھر اس نے وہ کیا جو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنا پستول جیب میں ڈال لیا اور اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک ڈائری نکال کر میری طرف اچھال دی۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ یہ ایک ''ڈیجیٹل میپ ڈیوائس'' تھی جس میں گیم کے ایگزٹ ڈور کا راستہ بتایا گیا تھا۔

''میں ہار مانتی ہوں پارکر۔ تم جیت گئے۔''

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''کیا یہ کوئی چال ہے.....؟''

''تم جو بھی سمجھو..... لیکن اس نقلی دنیا کی اصل حقیقت یہ ہے کہ اب چابی اور نقشہ دونوں تمہارے پاس ہیں۔ تم چاہو تو مجھے ختم کرسکتے ہو اور چاہو تو یونہی چھوڑ سکتے ہو۔ دونوں صورتوں میں جیت تمہاری ہوئی۔''

''یہ..... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تم یہ کیوں کر رہی ہو؟'' میں حیران تھا۔

اس کے کندھے ڈھلک گئے۔ ''کیونکہ میں اس گیم میں خود کو نہیں بلکہ تمہیں جتوانے آئی تھی۔'' اس کی یہ بات بھی ایک دھما کا تھا۔

''میں لندن میں تھیٹر اداکارہ تھی..... ایک ناکام اداکارہ۔ فلم میں کام کرنے کی خواہش مجھے ہالی ووڈ لے گئی لیکن وہاں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ جس طرح فلمیں ہمیشہ نقلی مناظر پر فلمائی جاتی ہیں، ایسے ہی فلمی دنیا بھی نقلی بنیادوں اور نقلی ستونوں پر قائم ہوتی ہے۔ یہاں صرف اس کی بات سنی جاتی ہے جو دوسروں سے بلند ہو..... اور بلندی تک پہنچنے کے لیے سیڑھیوں کی نہیں، دوسروں کے سہاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لوگ بلندی سے گرتے ہیں، میں پستی سے اور پستی میں گر گئی۔ میں مشہور ہونے آئی تھی لیکن یہاں مجھے مشہورِ زمانہ ''ایچ آئی وی'' کا وائرس مل گیا۔ میں اس دنیا سے بھاگ نکلی اور چاہا کہ وہاں تک بھاگوں جہاں یہ دنیا ختم ہوتی ہے۔ اسی بھاگ دوڑ میں اس گیم ''بینگ بینگ'' کے لوگوں سے میری ملاقات ہوگئی۔ انہیں ایسے لوگوں کی تلاش تھی جن کو اپنی زندگی کی پروا نہ ہو۔ میں نے سوچا مرنا تو ہے ہی، کیوں نہ کھیل کھیل میں مرا جائے۔ گیم میں داخل ہونے کے بعد میں نے چابی کے حصول کی کوشش کی لیکن اپنے لیے نہیں بلکہ تمہارے لیے۔''

میں ایک بار پھر دم بخود رہ گیا۔ وہ کہے جارہی تھی۔ ''میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں یہ گیم تمہیں جتواؤں گی کیونکہ اس گیم کے دس کھلاڑیوں میں تم واحد کھلاڑی ہو جسے جیت اپنے لیے نہیں بلکہ اپنی بیٹی کے لیے چاہیے تھی۔ کینڈین نژاد جیکب کو جیت کا پیسا اپنے بزنس کے لیے چاہیے تھا۔ اسکاٹ لینڈ کا جیک فرنانڈس عادی مجرم تھا اور وہ اپنا آخری داؤ کھیلنے آیا تھا۔ امریکن ریٹائرڈ کرنل ایڈگر صرف اپنی جنگی جبلت کو تسکین دینے کے لیے اس خونی کھیل میں شامل ہوا تھا۔ افریقن ولیم کیمبل بھی پیسے کے لالچ میں آیا تھا اور سڈنی کا لعل جو بھی جوا نہیں ہارا تھا، وہ اپنی خوش قسمتی کو آزمانے اس کھیل کا حصہ بنا تھا۔ اسی طرح میرینا، بنگ چاؤ اور میکسیکو کا ماریاچی بھی اپنی غربت کی خاطر اس گیم میں داخل ہوئے تھے۔ تم واحد کھلاڑی تھے جسے پیسوں کی ضرورت اپنی بیٹی کی زندگی کے لیے تھی۔ میں تو اس کھیل میں مرنے آئی تھی، سو جا اگر تمہاری مدد کردوں تو شاید اوپر والا اس کام کے بدلے مجھے معاف کردے۔''

ساشا نے ساری تفصیل بتائی۔ میں یک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا لیکن اس کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر نہ پا سکا جس سے مجھے اندازہ ہو کہ وہ سچ کہہ رہی ہے یا جھوٹ لیکن میرے ہاتھ میں پکڑا ڈیجیٹل نقشہ اس کے سچے ہونے کا ثبوت تھا۔

''تم نے مجھے الجھا دیا ہے ساشا۔ اگر یہ سب سچ ہے تو بتانے میں اتنا تامل کیوں۔ ابھی ابھی تم پستول تان کر مجھ سے چابی مانگ رہی تھیں اور ابھی ابھی تم یہ کہہ رہی ہو کہ تم مجھے جتوانا چاہتی تھیں۔''

''یہ سب اس لیے تھا تاکہ تمہیں یقین ہو جائے کہ ہم واقعی ایک ورچوئل ویڈیو گیم میں پھنسے ہیں۔ اگر تم یقین نہ کرتے تو یہی سوچتے رہتے کہ وہ چابی کسی پرانے مدفون خزانے کی ہوگی..... تو کیا ہوتا۔ تم نے گیم کی انسٹرکشنز نہیں پڑھیں اس لیے تمہیں اس سب کے بارے میں یقین دلانے کے لیے یہ طریقہ ضروری تھا جو میں نے اختیار کیا۔''

''ٹھیک ہے..... اب چابی بھی میرے پاس ہے اور نقشہ بھی۔ اب ہمارا اگلا قدم کیا ہوگا؟'' میں نے قدرے سوچ کر پوچھا۔

''گیم ختم ہو چکا ہے، صرف تمہیں دروازے سے باہر نکلنا ہے۔ اور میں چاہتی ہوں کہ تم اس میں مزید دیر نہ کرو۔ ایک بات میں تمہیں بتانا بھول گئی۔ وہ یہ کہ آٹھ افراد کو قتل کرنے کے جرم میں یہاں کی پولیس میرے پیچھے ہے۔ اگر انہوں نے تمہیں میرے ساتھ دیکھ لیا تو تم اس مخصوص دروازے تک پہنچ ہی نہ سکو گے۔ اس لیے جتنی جلدی ہو سکے، یہاں سے چلے جاؤ۔''

''کیا تم میرے ساتھ اس دروازے تک نہیں جاؤ گی؟''

''نہیں..... میں یہاں کی پولیس کو اس وقت تک الجھائے رکھوں گی جب تک تم دروازہ پار کر کے اس گیم کو ختم نہیں کر دیتے تاکہ وہ تمہاری طرف متوجہ نہ ہوں۔'' اس نے یوں کہا جیسے اس نے سب کچھ پہلے سے سوچ رکھا ہو۔ میری آنکھوں میں اس کے لیے شکوک کے سائے کم ہوتے چلے گئے۔

''دروازہ پار کرنے کے بعد تمہارا کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''کھیل ختم پیسا ہضم۔'' وہ زخمی مسکراہٹ سجا کر بولی۔ ''تم زندہ رہو گے اور یقیناً تمہاری بیٹی بھی۔ اور میں..... یا تو کومے میں چلی جاؤں گی یا فوراً مر جاؤں گی اور یہی تو میری قسمت ہے۔ میں جیت کر بھی مروں گی اور ہار کر بھی۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ ''تم جاؤ اب۔ مزید وقت ضائع مت کرو۔ چلے جاؤ یہاں سے پلیز!'' اس نے اپنا رخ بدل لیا۔

میں اٹھ کر کمرے کے دروازے کی طرف چلا گیا پھر پلٹ کر اس سے کہا۔ ''میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ جیت کی رقم سے میں میری این کے ساتھ ساتھ تمہارا علاج بھی کرواؤں گا۔ میں تمہیں بچالوں گا ساشا۔ میں تمہیں بچالوں گا۔''

وہ میری طرف آئی، اس کی آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر بے بسی سے بھرپور مسکان تھی۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''کاش ایسا ہو سکتا لیکن یہ ناممکن ہے اس لیے تم صرف ان چیزوں پر دھیان دو جو تمہاری جیت کے لیے ضروری ہیں۔''

میں نے دروازہ کھول کر باہر نکلنا چاہا لیکن دروازہ کھلتے ہی ایک گیند سی لڑھک کر اندر آ گئی اور پھر ایک آنکھوں کو چندھیا دینے والی بجلی چمکی اور گاڑھے سفید دھوئیں نے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کر پاتا، میرے حواس جاتے رہے۔

☆☆☆

''ہوش میں آؤ پارکر..... ہم اس وقت شدید خطرے میں ہیں۔'' ساشا کی آواز نے مجھے ایک دم بیدار کر دیا۔ میں پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم اس وقت سپاٹ دیواروں والے خالی کمرے میں تھے۔

''ہم کہاں ہیں؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔

''پولیس اسٹیشن..... وہ میری وجہ سے تم تک بھی پہنچ گئے ہیں..... اور یہ اچھی بات نہیں ہے۔ ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہوگا۔'' وہ پُرتشویش لہجے میں بولی۔

''لیکن ہم یہاں سے نکلیں گے کیسے؟'' میں نے کہا۔

''اگر تم نے اس گیم کی انسٹرکشنز پڑھی ہوتیں تو یہ سوال نہ کرتے۔'' ایک توقف کے بعد وہ بولی۔ ''ہر گیم کے کچھ اصول ہوتے ہیں اگر گیم کھیلنے سے پہلے ان کا مطالعہ کر لیا جائے تو بہت آسانی رہتی ہے۔ ہم سب کو ہی ایسی ہدایات پڑھنے کے لیے دی گئی تھیں لیکن تم نے ان کا مطالعہ کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ بہت بڑی نادانی کی تم نے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' میں نے قدرے ندامت سے کہا۔

''بہرحال..... ویڈیو گیمز کا ایک قاعدہ ہوتا ہے۔ ہر

وہ جگہ جہاں ہمیں مشکل پیش آتی ہے یا جہاں کوئی رکاوٹ ہو، وہاں کچھ ایسے کلیوز چھپے ہوتے ہیں جنہیں ڈھونڈ کر یا ان پر عمل کر کے ان رکاوٹوں کو دور کیا جا سکتا ہے۔'' وہ سپاٹ دیواروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''مطلب اس کمرے میں بھی ایسا کچھ ہے جس کی مدد سے ہم یہاں سے باہر نکل سکتے ہیں؟'' میں نے چونک کر کہا اور پھر فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اسے ہاتھ سے تھپتھپانے لگا۔ کچھ دیر بعد ہم نے کمرے کی دیواروں اور فرش کو اچھی طرح ٹھوک بجا کر چیک کر لیا لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

''اب ایک ہی راستہ بچا ہے۔'' اس نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے بھی بغور چھت کی طرف دیکھا اور پھر چونک گیا۔ چھت کے ایک کونے پر ایک چھوٹا سا سیاہ دائرہ بنا تھا جس کے اندر سرخ رنگ کی ایک لکیر سی نظر آ رہی تھی۔ میں نے ساشا کو بتایا کہ شاید یہ کوئی ''سائن'' ہو۔ ساشا نے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کا جسم ہوا میں پرواز کرتا ہوا چھت کے قریب پہنچ گیا۔ میں وہیں کھڑا ساشا کو دیکھتا رہا۔ اس نے اس نشان کو ٹٹولا۔

''یہ جگہ کھوکھلی محسوس ہو رہی ہے۔ میں اسے توڑنے کی کوشش کرتی ہوں۔'' وہ بولی اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اس نے ایک زوردار مکا اس نشان پر دے مارا۔ ایک ہلکا سا دھماکا ہوا اور اس نشان کی جگہ ایک بڑا سا سوراخ نمودار ہو گیا۔ ساشا نے اس سوراخ میں ہاتھ ڈالا اور کچھ نکال کر واپس زمین پر اتر آئی۔ یہ ایک لیزر گن تھی۔

''یہ تو لیزر گن ہے..... اس کا کیا کریں گے؟ کیا اس سے ان دیواروں کو پگھلایا جا سکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ یہ اتنی طاقتور نہیں ہے۔ ہاں مگر ہم اس سے پولیس والوں کو مار کر یہاں سے نکل سکتے ہیں۔'' وہ یہ کہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی اور اسے زور زور سے بجانے لگی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھل گیا اور دو پولیس والے تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ ساشا دروازے کی اوٹ میں ہو گئی تھی اس لیے انہوں نے اپنی گنوں سے مجھے نشانے پر لے رکھا تھا۔ لیکن یہ صورتِ حال زیادہ دیر یونہی نہیں رہی۔ ان کے عقب سے ساشا نے دو بار ٹریگر دبایا۔ کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی۔ نہ لیزر گن کے چلنے کی اور نہ ہی ان دونوں پولیس والوں کے ڈھیر ہو جانے کی لیکن کام پورا ہوا۔ میں نے ان میں سے ایک کی گن اٹھالی۔

''اب ہمیں فل ایکشن میں یہاں سے نکلنا ہے۔ جو سامنے آئے اڑا دو لیکن مارنے کے لیے رکنا نہیں۔ ہمیں اس عمارت سے باہر نکلنا ہے ورنہ اگر یہیں کہیں پھنس گئے تو اس بار یہ گرفتار نہیں کریں گے بلکہ مار ڈالیں گے۔'' اس نے کہا اور پھر ہم ایک ساتھ باہر نکلے۔ میرے ہاتھ میں گن ضرور تھی لیکن اسے چلانے کا موقع ہی نہیں ملا کیونکہ جو بھی ہمارے سامنے آیا ساشا کی لیزر گن کا نشانہ بن گیا۔ ہم راہداری کراس کر کے اوپر جاتی سیڑھیوں پر پہنچے۔ وہاں بھی دو پولیس والے نشانہ بنے۔ سیڑھیوں کے بعد ایک بڑا سا کمرا تھا، یہاں چار افراد تھے۔ تین پولیس والے موقع پر ہی نشانہ بن گئے البتہ ایک باہر بھاگ نکلا اور اس کے باہر نکلتے ہی پولیس کی اس عمارت میں سائرن بج اٹھے۔ ہم بھاگتے ہوئے اس کمرے سے باہر نکلے اور صحن کو پار کرتے ہوئے مین گیٹ کی طرف بڑھے۔ میں تو صرف اندھا دھند بھاگ رہا تھا، ساشا کی لیزر گن بنا رکے بجلی کی طرح چاروں سمت پولیس والوں پر قہر بن کر گر رہی تھی۔ مین گیٹ سے باہر ایک پولیس وین کھڑی تھی۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور جیسے ہی ساشا ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی، میں نے ایکسلریٹر دبا دیا۔ لیکن ابھی کچھ دور ہی گئے ہوں گے کہ میں نے بے اختیار زور سے بریک لگا دیے۔ وین الٹتے الٹتے بچی۔

''کیا ہوا؟'' ساشا چلائی۔

''میرے پاس ڈیجیٹل میپ نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ پولیس والوں کے پاس ہی رہ گیا ہے۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔

''چابی کہاں ہے؟'' وہ چلائی۔

''چابی محفوظ ہے۔'' میں نے فوراً کہا۔

''پھر ٹھیک ہے۔ نقشہ تو مجھے زبانی بھی یاد ہے۔ تم گاڑی چلاؤ۔'' اس نے کہا تو میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ دور سے پولیس کی کاروں کے سائرن بھی سنائی دے رہے تھے۔

''ہمیں اس وین سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں..... یہاں سے وہ دروازہ زیادہ دور نہیں جہاں ہمیں پہنچنا ہے۔'' اس نے کہا اور مجھے راستہ سمجھانے لگی کہ ہمیں کہاں پہنچنا ہے۔ وہ جگہ واقعی زیادہ دور نہیں تھی۔ ہم اگلے پانچ منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ میں نے ساشا کے کہنے پر گاڑی ایک کثیر المنزلہ عمارت کے صدر دروازے پر روکی اور پھر ہم پھرتی سے گاڑی سے اتر کر اس عمارت میں داخل ہو گئے۔ عین اسی لمحے پولیس کی گاڑیاں

بھی وہاں پہنچ گئیں۔ یہاں بہت سے لوگ تھے جو ہمارے ہاتھوں میں گنیں دیکھ کر ایک طرف ہٹتے جا رہے تھے۔ لفٹ تک پہنچتے پہنچتے ساشا کی لیزر گن نے ان دو سیکیورٹی گارڈز کو بھی لمبا لٹا دیا جو ہماری طرف بھاگے آ رہے تھے۔ جس وقت ہماری لفٹ کا دروازہ بند ہو رہا تھا، میں نے کئی پولیس والوں کو عمارت کے اندر گھستے ہوئے دیکھا۔ ساشا نے لفٹ کے پینل پر آخری منزل کا بٹن دبا دیا تھا۔ لفٹ کے رکتے ہی ہم بھاگتے ہوئے نکلے کیونکہ وہاں ایک کے بجائے کئی لفٹس تھیں اس لیے بعید تھا کہ پولیس والے بھی کسی لفٹ میں اوپر ہی آ رہے ہوں۔ ہم راہداری میں بھاگتے ہوئے آخری سرے تک پہنچ گئے۔ اس راہداری میں کئی دروازے نظر آ رہے تھے۔ ساشا نے آخری دروازہ دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے گولیوں کی ایک بوچھاڑ عین اس جگہ پر بری جہاں ہم ایک لمحہ قبل تھے۔ پولیس والے راہداری میں پہنچ گئے تھے۔ ساشا دروازے پر رک کر پولیس پر فائرنگ کرنے لگی اور میں دروازے کے پار آ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ کیونکہ یہ کوئی کمرا نہیں بلکہ ایک اور طویل راہداری تھی جس کی دیواروں، چھت اور فرش پر سفید پینٹ کیا گیا تھا۔ اس راہداری میں بے شمار دروازے تھے جن پر مختلف نمبرز آویزاں کیے گئے تھے۔

''میں انہیں روکتی ہوں۔ تم دس نمبر دروازے کو چابی سے کھولو۔'' ساشا نے چلاتے ہوئے کہا۔ عین اسی لمحے اس کی لیزر گن بھی جواب دے گئی۔ بدلے میں، میں نے اسے وہ گن دے دی جسے میں نے پولیس اسٹیشن سے اٹھایا تھا۔

''گولیاں کم ہیں۔ تم جلدی کرو۔ وہ ہمارے سر پر پہنچ گئے ہیں۔'' ساشا پھر سے چلائی۔

''اوہ..... ہاں..... وہ چابی۔'' میں نے بوکھلاتے ہوئے کہا اور پھر دائیں ہاتھ کی مدد سے اپنی بائیں کلائی پر بندھی پٹی اتارنے لگا۔ پٹی کی ایک تہ میں ایک ننھی سی چابی تھی جسے میں نے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

''جلدی کرو۔ میری گولیاں ختم ہو رہی ہیں۔'' ساشا کی آواز سنائی دی۔ میں نے دس نمبر دروازے کے ننھے سے سوراخ میں چابی ڈالی اور اسے گھمایا۔ چابی ذرا سا گھومی لیکن پھر رک گئی۔ میں نے زور لگایا۔ چابی باہر نکال کر دوبارہ کوشش کی لیکن لاک نہیں کھلا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ دس نمبر دروازہ ہی ہے؟'' میں چلایا۔

''مجھے اچھی طرح پتا ہے۔ یہی تمہارا ایگزٹ ڈور ہے۔''

''لیکن یہ کھل نہیں رہا۔'' میں نے ایک بار پھر کوشش میں ناکام ہوتے ہوئے کہا۔ ساشا نے دروازہ بند کر دیا اور میری طرف بھاگی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''میرے پاس بس چند گولیاں ہی رہ گئی ہیں۔ وہ کسی بھی لمحے اندر آ جائیں گے..... لیکن..... لیکن تم نے دروازہ کیوں نہیں کھولا؟''

''یہ نہیں کھل رہا۔'' میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

''چابی مجھے دو۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

میں نے بے اختیار چابی اسے پکڑا دی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

اس نے چابی لگا کر گھمائی تو واقعی دروازہ نہیں کھلا۔ اس نے جھنجلا کر دروازے کو ایک لات رسید کی اور پھر چابی گھمائی تو کھٹکے کی آواز کے ساتھ ہی لاک کھل گیا۔ اس نے دروازہ دھکیل کر کھول دیا۔ میں دم سادھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ دروازے کے پار دیکھ رہی تھی جہاں گھپ اندھیرا تھا۔ پھر وہ ایک دم میری طرف مڑی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''تم جیت گئے پارکر۔ جاؤ جلدی چلے جاؤ یہاں سے۔''

''تمہارا شکریہ ساشا۔'' میں نے بے اختیار کہا۔

''ہاں ہاں، ٹھیک ہے۔ اب جاؤ۔''

راہداری کے دروازے پر یوں دھماکا ہوا جیسے وہ ابھی ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔

''جاؤ پارکر..... چلے جاؤ۔'' ساشا کی چیخ میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔

☆☆☆

بھورے بالوں والی لڑکی کہہ رہی تھی۔ ''تم نے کبھی ویڈیو گیمز نہیں کھیلے۔ ہر گیم کی کچھ انسٹرکشنز ہوتی ہیں، انہیں پڑھ لیا جائے تو بہت آسانی رہتی ہے۔''

میرے ایک ہاتھ میں چابی اور دوسرے میں ڈیجیٹل میپ ڈیوائس تھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک گیند سی لڑھک کر میرے قدموں میں آ گئی۔ ایک چکا چوندی روشنی نے میری آنکھوں کو چندھیا دیا۔ میں نے بے اختیار اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ''اٹھو پارکر۔'' ایک جھنجوڑتی ہوئی آواز سنائی دی اور میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں اپنے بستر پر لیٹا تھا۔

پھر وہی خواب، پھر وہی منظر، پھر وہی احساس۔ میں جھنجلتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ صبح کے نو بج چکے تھے۔ میں شب بھر کی جاگی کے گاؤن کی ڈوریاں باندھ کر کمرے سے باہر نکلا تو معمول کے مطابق میری بیوی ''لنڈا'' اپنی نوکری پر جا چکی تھی۔ میز پر میرے لیے ناشتا موجود تھا اور ساتھ میں لنڈا کے ہاتھ کی لکھی ایک پرچی بھی۔

''سوری ڈیئر! میں جا رہی ہوں۔ شام کو جلد واپس آؤں گی اور ہم فلم دیکھنے جائیں گے۔ بہت سارا پیار۔''

یہ ایک عام سا دن تھا ہمیشہ کی طرح۔ میں نے ناشتا کیا اور اپنا ٹائپ رائٹر لے کر بیٹھ گیا۔ میرے ادھورے ناول ''بیگ بینگ'' کے تیس صفحات مکمل ہو چکے تھے۔ میگزین کی طرف سے وارننگ آ چکی تھی کہ اس ماہ کی قسط جلدی بھیجو۔ مجھے ہر صورت پچاس صفحات میگزین کے دفتر میں پہنچانے تھے لیکن پچھلے کئی ہفتوں سے میں اب تک صرف تیس صفحات ہی لکھ پایا تھا اور اب کہانی ایک ایسی جگہ آ کر رک گئی تھی کہ اس سے آگے کوئی بہتر خیال ہی نہیں سوجھ رہا تھا۔ کل رات سونے سے پہلے میں نے ایک شاندار خیال سوچا تھا اور اس کی جزئیات پر غور کرنے کے بعد مجھے لگا تھا کہ جہاں کہانی آ کر رک گئی ہے، وہاں سے آگے یہ خیال بہت عمدہ رہے گا اور اب اس وقت میری انگلیاں ٹائپ رائٹر کے بٹن پر تھیں۔ میرے ذہن میں رات کو سوچے ہوئے خیالات گھوم رہے تھے لیکن ہر بار کی طرح مجھے وہی خیال جو رات کو سونے سے پہلے بہت اچھا لگ رہا تھا، اب نہایت فضول محسوس ہو رہا تھا۔

''نہیں۔ یہ تو میرا ناول ہی برباد کر دے گا۔ مجھے کچھ اور سوچنا ہوگا۔'' میں نے ٹائپ رائٹر سے ہاتھ ہٹا کر کرسی کی پشت سے سر لگا دیا۔ دماغ میں کئی چیزیں گھوم رہی تھیں۔ نہا دھو کر آ کر میں نے اٹھ کر میوزک پلیئر آن کر لیا۔ اپنے لیے کافی بنائی اور واپس کرسی پر آ بیٹھا۔ کافی ختم ہو گئی لیکن لکھنے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوئی۔ میں نے خود کو ایک وقفہ دیا۔ میوزک پلیئر بند کیا اور ٹی وی آن کر دیا۔ فٹبال کا میچ چل رہا تھا۔ میچ ختم ہو گیا۔ میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ مجھے یقیناً گھر سے باہر کھلی فضا میں ایک چکر لگانا چاہیے۔ یہ سوچ کر میں اپنے کمرے میں آیا اور اپنا لباس تبدیل کر کے گھر سے باہر نکل آیا۔ باہر تیز دھوپ تھی۔ میں قریب کی مارکیٹ میں آیا اور چند چیزیں خریدنے میں کم از کم ایک گھنٹا برباد کیا۔ واپس آ کر میں نے اپنے لیے لنچ بنایا اور لنچ کے بعد دوبارہ کرسی سنبھال لی۔ انگلیاں ٹائپ رائٹر کے بٹنوں پر تھیں لیکن ذہن خالی تھا۔ میں نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی تو ساتھ میں ایک کاغذ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ میں نے اسے کھولا۔ یہ ایک بینک چیک تھا۔ ایک سو ملین ڈالرز کا میرے نام یعنی ''جوناتھن'' کے نام۔ میں چند لمحے اسے گھورتا رہا اور پھر اسے واپس جیب میں اڑس لیا۔ میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ یہ ناول کے متعلق ہرگز نہیں تھا۔ میں نے ٹائپ رائٹر اور کاغذات کو وہیں چھوڑا اور گھر سے باہر نکل آیا۔ چند فرلانگ پیدل چلنے کے بعد میں ایک بار میں داخل ہوا۔ سہ پہر کے اس وقت یہ بار تقریباً خالی تھا۔ صرف ایک میکسیکن ادھیڑ عمر شخص سر پر کاؤبوائے ہیٹ لگائے بیٹھا اپنے گلاس سے گھونٹ بھر رہا تھا۔ بارٹینڈر مجھے مشروب کا گلاس تھما کر خود پیچھے کہیں چلا گیا۔ میں کونے میں لگے ٹی وی پر بیس بال کا میچ دیکھنے لگا۔

''اگر آج ''انتونیو'' ہوتا تو صورت حال اب تک بدل چکی ہوتی۔'' میرے ساتھ بیٹھے میکسیکن نے اپنی ٹیم کو ہارتے دیکھا تو مایوسی بھرے لہجے میں کہا۔ بار میں میرے اور اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

''یہ انتونیو کے لیے بہت اچھا ہے کہ اس کی ٹیم اس کی غیر موجودگی میں کوئی میچ نہیں جیتتی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو میکسیکن برا سا منہ بنا کر رہ گیا پھر وہ میری طرف ہی متوجہ ہو گیا۔ میں قدرے چونک سا گیا کیونکہ اس کا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا تھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ ہم پہلے بھی کہیں مل چکے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔ میرا نام جان مریا چی ہے مسٹر؟'' اس نے اپنے کاؤبوائے ہیٹ کو چھوتے ہوئے کہا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''جوناتھن۔'' میں نے مصافحے کے لیے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا نام ہے۔ ویسے پارکر بھی اچھا نام تھا تمہارا۔''

''پارکر۔'' میں نے اچنبھے سے کہا۔

''ہاں پارکر..... لیکن پارکر ہو یا جوناتھن، کیا فرق پڑتا ہے۔ پتا نہیں حقیقت میں تمہارا نام کیا ہے۔''

''کیسی حقیقت؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔

''ایک ایسی حقیقت جس پر شاید تم یقین نہ کرو لیکن تمہارے یقین نہ کرنے سے سچ بدل نہیں جائے گا۔'' اس نے اپنے گلاس سے ایک گھونٹ بھرا اور پھر قدرے آگے کو

جھک کر پراسرار لہجے میں بولا۔ ''کیا ہوا اگر میں تم سے کہوں مسٹر جوناتھن کہ ہم اس وقت ایک اصل دنیا میں نہیں ہیں۔ ہم ایک ورچوئل گیم ''بینگ بینگ'' کے کردار ہیں۔''

میں نے چونک کر کہا۔ ''میں سمجھ گیا، تم میرے ناول کی بات کر رہے ہو۔''

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''کون سا ناول۔ کہیں کوئی ناول نہیں ہے۔ نہ تم کچھ لکھتے ہو نہ وہ کہیں چھپتا ہے اور نہ وہ کوئی پڑھتا ہے۔ یہ سب تو محض تمہارے کردار کا حصہ ہے جو تم کسی روبوٹ کی طرح نبھا رہے ہو۔ بنا سوچے بنا جانے۔ کسی مشین کی طرح..... ہر روز..... ایک ہی وقت پر ایک ہی انداز میں۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' میں گڑبڑا گیا۔

''یاد کرو، تمہیں یاد آجائے گا۔ ساشا، چابی اور دروازہ..... میرے دوست! وہ صرف ایک خواب نہیں ہے۔''

میں اچھل پڑا۔

''تم..... میرے خواب کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟''

''میں مکمل نہیں جانتا۔ کوئی بھی نہیں جانتا۔ ہمیں ہمیشہ کچھ باتیں ہی یاد رہتی ہیں لیکن میری بات کا یقین کرو۔ وہ صرف تمہارا ایک خواب نہیں ہے۔ وہ تمہاری ایک زندگی ہے جو تم نے جی ہے، اس گیم میں۔ یاد کرو، ایک چابی، ایک دروازہ۔''

''مم..... میں کیسے مان لوں؟''

''میں نے کہا نا کہ ہم سب کچھ نہیں جانتے۔ اگر تم مجھے اپنا وہ خواب پوری جزئیات کے ساتھ سناؤ تو میں تمہیں تمہارے بارے میں سب کچھ بتا سکتا ہوں۔ میں بتا سکتا ہوں کہ وہاں تمہارے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔''

میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر میں نے اسے اپنا خواب سنانا شروع کیا جس کے مرکزی خیال پر ہی تو میں اپنا ناول لکھ رہا تھا۔ تفصیل سے سن کر اس نے سر ہلایا اور چمکتی آنکھوں سے بولا۔

''اب میں سمجھ گیا ہوں کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔''

''وہ میرے ساتھ نہیں ہوا۔ وہ محض ایک خواب ہے جس پر میں ایک ناول لکھ رہا ہوں۔''

''نہیں، تم کچھ بھی نہیں لکھ رہے۔ تم صرف اسے یاد کرتے ہو۔ تم لکھنا چاہتے ہو لیکن لکھ نہیں پاتے۔ کیونکہ اس سے آگے لکھنے کو کچھ ہے ہی نہیں۔ تم نے وہاں تک لکھا جہاں تک ساشا نے تمہارے لیے دروازہ کھولا تھا۔ وہیں تمہاری کہانی کا اختتام ہو گیا تو تم اس کے آگے کیا لکھ سکتے ہو کیونکہ اس کے آگے کچھ ہوا ہی نہیں۔''

میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

''ساشا نے تمہیں وہی سچ بتایا جو میں بتا رہا ہوں۔ ہم اس وقت ایک گیم کے اندر ہیں۔''

''اگر وہ سب سچ ہے تب بھی اگر وہ ایک گیم تھا تو میں بھی..... میں اسے جیت چکا ہوں۔ ساشا نے کہا تھا کہ گیم جیتنے والے کو سو ملین ڈالرز ملیں گے۔ یہ دیکھو، میرے پاس سو ملین ڈالرز کا چیک ہے۔'' میں نے جیب سے چیک نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

''اگر تم یہ سوچتے ہو کہ صرف ایک ''چابی'' حاصل کر کے تم یہ گیم جیت جاؤ گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ جس گیم کی میں بات کر رہا ہوں وہ گیم نہیں بلکہ اس گیم کا ایک لیول تھا۔ اور اس گیم کے کئی لیولز ہیں۔ پہلے ایک لیول جیکب نے جیتا تھا، بعد میں ساشا نے اور سو ملین کا جو چیک تمہارے پاس ہے، وہ کوئی جیتی ہوئی انعامی رقم نہیں ہے۔ یہ تو محض تمہارے اس لیول کے کردار کا حصہ ہے۔ اب تم نئے لیول پر ہو۔ ویسے بھی اس گیم کو جیتنے والے کو جو انعامی رقم ملے گی وہ سو ملین ڈالرز سے کہیں زیادہ ہے۔'' اس نے کہا۔

''یہ نہیں ہو سکتا۔'' میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

''میں نے کہا نا کہ تمہارے تسلیم نہ کرنے سے حقیقت نہیں بدلا جا سکتا۔''

''تم نے کہا کہ وہ لیول ساشا نے جیتا تھا، یہ جھوٹ ہے۔ وہ میں جیتا تھا۔ میرے پاس چابی تھی اور میں اس دروازے سے نکل گیا تھا۔''

''یہ تمہاری بھول ہے دوست کہ تم وہ لیول جیت گئے تھے۔ یہ سچ ہے کہ آخر میں تم اور ساشا اکیلے رہ گئے تھے۔ اس نے چابی حاصل کر کے کہیں چھپائی تھی جو اتفاق سے تمہیں مل گئی۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے وہ ڈیجیٹل نقشہ حاصل کیا تھا اور چابی لینے تمہارے پاس آئی لیکن اسے چابی نہیں ملی۔ تم نے اسے ایسی جگہ چھپایا تھا کہ ساشا کی تمام تر کوششوں کے باوجود اسے وہ چابی مل نہ سکی لیکن پھر جو کچھ ہوا، وہ سب ساشا کا شاطر پلان تھا۔ اس نے تمہیں نقشہ دے کر اور ایچ آئی وی کی مریضہ بتا کر تمہاری ہمدردی حاصل کی۔ وہ ناکام سہی لیکن کمال کی اداکارہ ہے۔ وہ دوسروں کو بے وقوف بنانے میں ماہر ہے۔ میں نے اس کی پروفائل پڑھی ہے، وہ ایک چالاک لومڑی ہے۔ اس نے تمہیں ایک بہترین کہانی سنائی جس میں سچ بھی تھا اور جھوٹ بھی۔ اس نے تمہیں سچ بتایا کہ ہم اصل دنیا میں نہیں بلکہ

ورچوئل گیم میں ہیں۔ سچ یہ تھا کہ اس نے باقی سب کو ختم کر دیا تھا لیکن جھوٹ یہ تھا کہ وہ مکمل گیم نہیں، صرف اس کا ایک لیول تھا۔ اس نے تمہیں بتایا ہی نہیں کہ یہ گیم کئی لیولز پر مشتمل ہے۔ وہ تم تک پہنچی تو اسے معلوم تھا کہ اس کے پیچھے پولیس ہے۔ چابی نہ مل سکنے کی صورت میں اس نے ہی تمہیں پولیس کے حوالے کیا۔ اس نے ہی تمہیں پولیس کے چنگل سے آزاد بھی کروایا۔ تمہارا اعتماد جیت کر وہی تمہیں ایگزٹ اور تک لے گئی تھی لیکن کاش کہ تم نے انسٹرکشنز پڑھی ہوتیں یا کم از کم اس کا دیا ہوا ڈیجیٹل نقشہ ہی غور سے دیکھا ہوتا۔ ایگزٹ دس نمبر نہیں بلکہ ایک نمبر دروازہ تھا۔ تم دروازہ کھولنے میں اس لیے ناکام ہوئے کیونکہ وہ چابی اس دروازے کی تھی ہی نہیں۔ یاد کرو، تم نے مجھے بتایا کہ دروازہ تم نے نہیں کھولا تھا۔ کھل بھی کیسے سکتا تھا کیونکہ تمہاری چابی اصلی دروازے یعنی نمبر ایک کی تھی۔ اس سے دس نمبر کیسے کھل سکتا تھا پھر ساشا نے تم سے چابی لی اور بڑی مہارت سے اسے چھپا کر دس نمبر دروازہ ایک ماسٹر کی سے کھول کر اس نے تمہیں اس کے اندر بھیجا اور وہ خود تمہاری چابی کی مدد سے دروازہ نمبر ایک سے گزر کر فاتح قرار پائی۔ اس نے وہ نقشہ مجھ سے ہی چھینا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ دروازہ ایک نمبر ہی ہے لیکن چابی نہ ہونے کی وجہ سے میں کچھ نہیں کر سکا اور وہ چالاک لومڑی میرا نقشہ چھین کر لے گئی۔''

''مم..... میں کیسے مان لوں..... یہ..... یہ جھوٹ ہے۔'' میں نے میز پر مکا مارتے ہوئے کہا۔

''تمہیں خواب میں ساشا نظر آتی ہے نا اور دس نمبر والا دروازہ بھی؟'' اس کے سوال پر میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یہی تو اس کھیل کی نشانی ہے کہ ہم اصل دنیا میں نہیں ہیں۔ اس سے پہلے والے لیول میں ہم سب کو ایک خاص ''ہیرا'' چرانا تھا اور اس کی چوری کے لیے سب کھلاڑیوں کو ایک ایک جواز فراہم کیا گیا تھا۔ تمہارا جواز یہ تھا کہ تمہاری ایک فرضی بیٹی میری این تھی جس کے آپریشن کے لیے تمہارے پاس پیسے نہیں تھے اس لیے تم نے چوری کرنی تھی۔ لیکن وہاں جیکب کامیاب ہوا۔ اس نے سب سے پہلے ''ہیرا'' چرا لیا تھا۔ تم پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تھے اور ہم سب دوسرے لیول میں آگئے۔ دوسرے لیول میں تمہیں پہلے لیول کی زندگی خواب کی صورت نظر آتی تھی۔ یہ اس لیے تھا کہ ہم ماضی سے جڑے رہیں۔ اگلے لیول میں ساشا نے تمہیں بے وقوف بنایا اور اب تمہیں اس لیول کی زندگی خواب کی صورت نظر آ رہی ہے۔ ایک لیول جیتنے کے

جذبے کی قدر

ایک عالی دماغ عورت کی صحبت ہر مرد کے لئے اچھی چیز ہے۔ عورتوں کا حُسن نہیں بلکہ اُن کے دلوں میں بھرا ہوا محبت اور ہمدردی کا جذبہ مجھے اُن سے محبت کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

شیکسپیر

مان باپ



بچے گلی میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ گیند ایک مکان کی کھڑکی کا شیشہ توڑتی ہوئی اندر آگئی۔ خاتون خانہ نے جھلا کر دروازہ کھولا لیکن گلی سنسان پڑی تھی۔ انہوں نے گیند اٹھا کر اپنے پاس رکھ لی۔

آدھے گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ خاتون نے دروازہ کھولا۔ دروازے پر ایک بچہ موجود تھا۔ ''معاف کیجیے گا... ہماری غلطی سے شیشہ ٹوٹ گیا۔ وہ دیکھیے... میرے والد نیا شیشہ لگانے کے لیے آرہے ہیں۔'' اس نے گلی کی طرف اشارہ کیا۔ ''اب آپ جلدی سے مجھے گیند دے دیجیے۔''

خاتون نے دیکھا، وہ شخص پتیلا ہاتھ میں لیے، دوسرے ہاتھ میں کھڑکی کے سائز کا شیشہ تھامے ان کے مکان کی طرف آرہا تھا۔

''کوئی بات نہیں بیٹا، گیند لے لو۔'' خاتون نے بچے کو گیند دیتے ہوئے خلیق لہجے میں کہا۔ اتنی دیر میں وہ شخص دروازے پر آگیا تھا۔ بچے نے گیند لی اور فوراً پکڑ ہو گیا۔

اس شخص نے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کی جگہ نیا شیشہ لگایا پھر اس نے خاتون سے کہا: ''پچاس روپے عنایت کیجیے۔''

''کیا... کیسے پچاس روپے؟'' خاتون نے حیرت سے کہا۔

''تم اس بچے کے باپ نہیں ہو؟''

''ہرگز نہیں۔'' اس شخص نے جواب دیا۔ اور پھر چونک کر پوچھا: ''آپ اس کی ماں نہیں ہیں؟''

بعد سب کردار اگلے لیول میں پہنچ جاتے ہیں۔ جس نے لیول جیتا، اس کی انعامی رقم بڑھتی جاتی ہے اور جو ہارے ان کی رقم کم ہوتی جاتی ہے۔ ہر لیول میں ہمارے نام، ہمارے کردار اور مشن مختلف ہوتے ہیں۔ تمہارا نام بھی کبھی میکس تھا تو کبھی پارکر اور اب جوناتھن لیکن تمہارا اصل نام کیا ہے اور تم کیوں اس گیم میں شامل ہوئے، یہ کوئی نہیں جانتا۔ شاید تم خود بھی بھول گئے ہو۔ میں بھی بہت کچھ بھول گیا ہوں۔ پچھلے لیول کے متعلق بھی ہمیں صرف ایک دھندلائے ہوئے خواب کے سوا زیادہ کچھ یاد نہیں رہتا کیونکہ دماغی طور پر ہم جتنے طویل عرصے سے اس گیم کے ساتھ جڑے ہیں، ہمارے ذہن پر اس کے کئی خطرناک اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ہم اس گیم کے دوران ہی پاگل ہوجائیں یا مرجائیں لیکن جب تک زندہ اور ہوش میں ہیں، ہمیں یہ گیم کھیلتے رہنا ہے تاکہ ہماری انعامی رقم بڑھتی رہے۔''

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ رکھا تھا۔ ''لیکن مجھے یہ سب یاد کیوں نہیں ہے؟ کیوں مجھے یاد نہیں کہ میں ایک گیم کے اندر ہوں۔ کیوں مجھے مشن یاد نہیں؟ کیوں مجھے تمہاری طرح اتنی تفصیلات معلوم نہیں..... کیوں، آخر کیوں؟''

''گیم شروع ہونے سے پہلے سب نے ایک دوسرے کی پروفائل کا مطالعہ کیا تھا۔ تمہاری پروفائل میں لکھا ہے کہ تم نے اس گیم میں داخل ہونے سے پہلے اس کی انسٹرکشنز نہیں پڑھی تھیں، شاید اسی وجہ سے تمہیں کچھ یاد نہیں رہتا۔ اس لیے ہر لیول پر جب باقی سب مشن پورا کر رہے ہوتے ہیں، تم اپنی زندگی کو ایک حقیقت سمجھ کر خاموشی سے گزار رہے ہوتے ہو۔'' اس نے کہا۔

''اوہ میرے خدایا! میں کس بات پر یقین کروں اور کس پر نہ کروں۔ اچھا، مجھے یہ بتاؤ کہ اس لیول میں ہمارا مشن کیا ہے؟'' بالآخر میں نے سر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''ہمیں ایک تجوری اور اسے کھولنے والے کوڈ کو تلاش کرنا ہے اور پھر اس تجوری کو کھولنا ہے۔ جو ایسا کرے گا، وہی فاتح ہوگا اور سیدھا فائنل راؤنڈ میں جائے گا۔ باقی سب اگلے کسی لیول پر۔ اور تمہیں مزے کی بات بتاؤں۔'' وہ آگے کو جھکا۔ ''میں نے تجوری کا پتا چلا لیا تھا۔ وہ یہیں اسی بار کے تہ خانے میں ہے اور میں نے اس لیول میں موجود باقی کھلاڑیوں کو بھی مار دیا ہے لیکن.....''

''لیکن کیا؟''

''لیکن مجھے ان میں سے کسی کے پاس بھی وہ کوڈ نہیں ملا۔ میں اس تجوری کا کوڈ نہیں جان سکا۔'' اس نے کہا۔

''اوہ..... تو پھر؟''

''تو پھر یہ کہ سب مر چکے ہیں، سوائے تمہارے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ کوڈ تم جانتے ہو۔'' اس نے اپنی گن میں دھرا ہاتھ اوپر اٹھایا تو اس میں ایک کولٹ پسٹل تھا۔

''بولو..... تم جانتے ہو نا اس کوڈ کے بارے میں؟''

''جب میں یہ ہی نہیں جانتا کہ میں گیم میں ہوں، حقیقت میں تو کوڈ کیسے جان سکتا ہوں۔''

''جیسے تمہارے پاس چابی تھی لیکن تم یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ کس چیز کی چابی ہے۔ ایسے ہی تمہارے پاس وہ کوڈ بھی ہوگا لیکن تمہیں معلوم نہیں ہوگا کہ وہ کوڈ کس لیے ہے۔ مجھے بتاؤ تمہارے پاس کیا کوئی ایسا کوڈ ہے؟''

میں کچھ دیر سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا پھر اچانک میں نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اور اس سے پوچھا۔

''تم ایک راستے پر چلتے ہو..... تمہارے سامنے ایک بھیڑ اور ایک سانپ آجاتا ہے تو تم پہلے کس کا مقابلہ کرو گے؟''

''سانپ کا۔'' وہ فوراً بولا۔

''بالکل ٹھیک..... لیکن کیا ہو کہ جسے تم بھیڑ سمجھ رہے تھے، وہ بھیڑ نہیں بلکہ بھیڑیا ہو۔''

اس کی حیرانی دیدنی تھی لیکن جیب کے اندر میرا ہاتھ پستول کا ٹریگر دبا چکا تھا۔ وہ میز کے اوپر ہی اوندھا گر گیا۔ بار میں ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا، بارٹینڈر بھی نہیں۔ میں نے اس کی لاش کو گھسیٹ کر ایک میز کی اوٹ میں لٹا دیا اور کولے میں بنے بار کے اندرونی دروازے میں گھس گیا۔ چند لمحوں بعد میں..... تہ خانے میں رکھی ہوئی ایک تجوری کے پاس کھڑا تھا۔

''یہ سچ ہے کہ میں نے گیم کی انسٹرکشنز نہیں پڑھی تھیں۔ لیکن یہ جھوٹ ہے کہ میں یہ بھول گیا کہ میں ایک گیم کے اندر ہوں، اور یہ میں تب سے جانتا تھا جب سے یہ گیم شروع ہوا تھا۔ کسی بھی گیم میں آپ کو ایک پلان بنانا پڑتا ہے۔ آپ کے مخالف کھلاڑی بھی پلان بناتے ہیں۔ آپ کا پلان ان سے بہتر نہ ہو تو آپ کبھی بھی جیت نہیں سکتے۔ میرے مخالفین نے بھی پلان بنائے ہوں گے لیکن میں نے اپنا پلان گیم کے اندر آنے کے بعد نہیں بلکہ پہلے سے ہی بنا لیا تھا۔ میں نے انسٹرکشنز جان بوجھ کر نہیں پڑھی تھیں اور گیم میں ایسا برتاؤ کیا کہ سب کو لگا میں ایک بے ضرر بھیڑ ہوں جسے کچھ بھی یاد نہیں، جو کھیل میں شامل ہی نہیں۔ سب نے یہی سوچا کہ یہ تو بے ضرر ہے، باقی سب خطرناک ہیں۔ پہلے سب سے نمٹ لو، آخر میں اس بے ضرر بھیڑ سے نمٹا جائے گا۔ یہی جیکب نے سوچا، یہی ساشا نے اور یہی مریا چی نے۔ جیکب نے سب سے پہلے ہیرا چرا لیا تھا۔ میں اسے روک نہیں سکا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ ہیرا لے کر گیم کی بتائی ہوئی مطلوبہ جگہ پر پہنچتا، میں نے اسے پولیس سے گرفتار کروا دیا اور خود بھی اسی میوزیم میں جا کر پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ پولیس اسٹیشن کے اندر ہی میں نے جیکب کو مار کر ہیرا حاصل کیا اور لیول جیت گیا۔

اور پھر اس کے بعد مجھے معلوم تھا کہ ساشا میرے ساتھ جھوٹ بول رہی ہے۔ وہ میرے لیے غلط دروازہ ہی کھولے گی۔ میں نے اسے مایوس نہیں کیا اور اسے پورا موقع دیا۔

''جاؤ پارکر۔'' دس نمبر دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر وہ چلائی تھی تو اگلے ہی پل میں نے اسے اندر دھکیل کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ میرے پاس میرا پسٹل بھی تھا۔ پولیس سے نمٹ کر میں اصلی دروازے کی طرف آیا، وہ ایک نمبر تھا۔ ساشا سے ڈیجیٹل نقشہ لے کر اسے ایک نظر دیکھتے ہی میں جان گیا تھا کہ دروازہ نمبر ایک ہی میرا ایگزٹ ہے۔ میں نے اپنی کلائی پر لپٹی ہوئی پٹی کھولی تو آخری تہ میں ایک ننھا سا بلیڈ بھی میرے ہاتھ میں آگیا تھا۔ پٹی کے عین نیچے میری کلائی پر ایک ڈیڑھ انچ کے قریب زخم تھا جس کے ٹانکے سوکھ چکے تھے۔ میں نے بلیڈ سے اس زخم کو دوبارہ چیرا اور اپنی کھال کے اندر رکھی وہ ننھی سی ڈبیا نکال لی جس میں اس اصل دروازے کی چابی کی ڈپلیکیٹ رکھی ہوئی تھی۔ میں نے دروازہ نمبر ایک کھولا اور اسے آرام سے پار کر کے جیت گیا اور اب اس لیول پر مجھے یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ تجوری کہاں ہے، البتہ میرے پاس کوڈ تھا۔

میں نے جیب سے سولین ڈالرز والا چیک نکالا اور چیک پر درج نمبر تجوری کے لاک پر آزمائے، وہ کھل گئی۔ میں مسکرا دیا۔

میں جانتا تھا کہ یہ کوڈ ہے اسی لیے میں نے یہ چیک اکاؤنٹ میں جمع نہیں کروایا تھا اور میں جانتا تھا کہ مریا چی تجوری تلاش کر چکا ہے اور اب کوڈ کی تلاش میں ہے۔ اب جبکہ باقی کھلاڑیوں میں کوئی نہیں رہا، صرف میں بچا ہوں تو وہ کوڈ یقیناً میرے پاس ہی ہوگا۔ مریا چی یہی سوچ کر کوڈ لینے میرے پاس پہنچے گا اور وہ پہنچا لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ میں تو خود اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ ہر سہ پہر اس جگہ پر آکر بیٹھتا ہوں کہ شاید مریا چی آگیا ہو۔ اس کے بعد اس نے مجھے یادداشت کا مارا ہوا سمجھ کر ساری تفصیلات بتاتے ہوئے روانی میں یہ بھی بتا دیا کہ تجوری کہاں ہے۔

میں نے تجوری کا دروازہ کھولا۔ اندر ایک ریموٹ پڑا تھا جس پر ایک ہی سرخ بٹن تھا جسے دباتے ہی یہ لیول بھی میری جیت پر ختم ہوجاتا۔

اس گیم کے ہر لیول پر یہی ہوتا ہے۔ یہ سب مشن مکمل کرنے کی خاطر آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور آخر میں ان میں سے ایک میرے پاس پہنچتا ہے اور میں اس سے وہ چھین لیتا ہوں جس کے لیے انہوں نے ایک دوسرے کی جان لے کر اور اپنی جان کی بازی لگا کر کوششیں کی ہوتی ہیں۔ یہ سب کھیلتے رہتے ہیں، لڑتے رہتے ہیں۔ مشن کی کیز (keys) حاصل کرتے رہتے ہیں لیکن آخر میں..... میں جیت جاتا ہوں۔ کیونکہ مجھے سب پتا ہے کہ کون کیا کر رہا ہے اور کون کیا کرنے والا ہے لیکن کوئی یہ نہیں جانتا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کیا کرنے والا ہوں..... کیا کہا۔ دھوکے باز! نہیں جناب! یہ دھوکے بازی نہیں ہے۔ یہ تو چال بازی ہے۔

جیکب، ساشا اور اب مریا چی سے پہلے بھی کئی لوگ اور تھے۔ اگلے لیول پر مجھے یقین ہے کہ ان میں سے ہر کوئی یہ بھول چکا ہوگا کہ میں نے ان کے ساتھ کیا کیا کیونکہ ہر لیول کا اختتام سب کو یاد نہیں رہتا تاکہ کوئی یہ نہ جان سکے کہ کون کتنے لیول جیت رہا ہے۔ ان کے علاوہ بھی جو نئے کردار مجھے اگلے لیولز پر ملنے والے ہیں، وہ میری حقیقت سے ناواقف ہیں اور یہی جانتے ہیں کہ میں تو بے ضرر ہوں۔ لہٰذا مجھ سے آخر میں نمٹا جائے گا۔ ان کے نزدیک میں ایک آسان شکار ہوں لیکن میرے نزدیک سب سے لڑنے کے بجائے آخر میں بچ جانے والا آدمی آسان شکار ثابت ہوتا ہے۔

☆☆☆

نمبل کے دوسری طرف ہاتھ میں تاش کے پتے اور منہ میں سگریٹ دبائے ایک نوجوان نے پراسرار لہجے میں کہا۔

''کیا ہوا گر میں تمہیں بتاؤں کہ یہ سب ایک مصنوعی دنیا ہے۔ ہم ایک ورچوئل ویڈیو گیم کے اندر رہ رہے ہیں؟''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' میں نے چہرے پر دنیا جہان کی حیرت سمیٹتے ہوئے کہا اور دل ہی دل میں ایک قہقہہ لگایا۔ ایسا قہقہہ جو ایک شکاری آسان شکار کے لیے لگاتا ہے۔

(گیم ناٹ اوور)



شہ سخن

❁ غلام حسین اختر.....سرگودھا
دیوار کیا گری مرے کچے مکان کی
لوگوں نے میرے گھر کو رستہ بنالیا

❁ مہوش.....حیدرآباد
کہکشاں چاند ستارے تم ہو
یعنی احباب ہمارے تم ہو
کوئی آواز کہیں سے آئی
یوں لگا جیسے پکارے تم ہو

❁ ظفر علی خان.....لاہور
بچھڑ کے تجھ سے ترِی یاد بھی نہیں آئی
مکاں کی سمت پلٹ کر مکیں نہیں آیا

❁ صفدر علی خان.....کوئٹہ
کیا کروگے اٹھا کے ہاتھوں کو
جب دعا میں اثر نہیں ہوگا
اور سب مل ہی جائیں گے لیکن
باغ میں وہ شجر نہیں ہوگا

❁ ایس سجاد.....اوکاڑہ
پوچھنے کی تو مہلت ہی نہ دی اس نے
وہ لہجہ بدلتا گیا اور ہم اجنبی ہوتے گئے

❁ رمضان پاشا.....گلشن اقبال، کراچی
آنسو بہا بہا کے بھی ہوتے نہیں کم
کتنی امیر ہوتی ہیں آنکھیں غریب کی

❁ زرین خان آفریدی.....حیدرآباد
آہستہ چل اے زندگی کئی قرض چکانا باقی ہے
کچھ درد منانا باقی ہے، کچھ فرض نبھانا باقی ہے

❁ لیلیٰ منصور.....ٹنڈوالہٰ یار
ہم دیکھتے ہیں بنتے بکھرتے ہوئے منظر
سب علم ہے جانا ہے کہاں خاک سے آگے
کب سے ہے مرے ہاتھوں کے اک لمس کا پیاسا
خوشبو بھرا موسم تری پوشاک سے آگے

❁ کہکشاں فردوس.....سکھر
ایک ایک کرکے ستاروں کی طرح ڈوب گئے
ہائے کیا لوگ مرے حلقۂ احباب میں تھے

❁ جنید احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی
چوری کہیں کھلے نہ نسیم بہار کی
خوشبو اڑا کے لائی ہے گیسوئے یار کی

❁ منظر امام.....کراچی
میں تیرے رویّے پہ ابھی رو نہیں سکتا
کچھ لوگ ابھی میری طرف دیکھ رہے ہیں

❁ ظہور الٰہی.....اسلام آباد
نیند کے دشت میں آخر وہ گنوا دے گا مجھے
خواب دیکھے گا نہیں اور جگا دے گا مجھے
جمع ہوجائیں گے سب حال وگزشتہ اک دن
وہ اسی شہر کی گلیوں میں صدا دے گا مجھے

❁ حیدر علی.....راولپنڈی
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو اب وفا کرچلے

❁ کمال انور.....اورنگی ٹاؤن، کراچی
یہ تیری زلفیں ہیں کہ ساون کی گھٹا چھائی ہے
یہ تیرے عارض ہیں کہ پھولوں کو ہنسی آئی ہے

❁ مدحت.....کراچی
جو تیرے لیے وقت سے لڑتے ہیں ابھی تک
ان کو تو خبر ہی ترے آنے کی نہیں ہے
دکھ یہ ہے تو سچائی کا عادی نہیں ورنہ
یہ عمر تجھے خواب دکھانے کی نہیں ہے

❁ درہ ملک.....گلستانِ جوہر، کراچی
ہر جانب بارود بچھا ہے قدموں میں
اور خلقت دیوانی بڑھتی جاتی ہے
خاموشی سے ظلم سہے جاتے ہیں لوگ
کتنی تن آسانی بڑھتی جاتی ہے

❁ نازش ریحان.....لیہ
ہوا کے سامنے دیوار کرنا
یہ کارِ شوق ہے بے کار کرنا

❁ بریرہ.....کراچی
اب اس سے بڑھ کے محبت کا خط کیا ہوگا
سب اجنبی ہیں یہاں رسم و راہ ہوتے ہوئے
ازل سے لوگ مساوات چاہتے ہیں یہاں
غلام ہوتے ہوئے بادشاہ ہوتے ہوئے

❁ انعم کمال.....حیدرآباد
ہم نہ کہتے تھے تجھے وقت بہت ظالم ہے
کیا ہوئے اب وہ ترے ناز اٹھانے والے
سائے میں بیٹھی ہوئی نسل کو معلوم نہیں
دھوپ کی نذر ہوئے پیڑ لگانے والے

❁ مختار انصاری.....پشاور
میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھو
بہہ رہے ہیں قطار میں دریا

❁ خورشید اعظم.....منڈی بہاؤالدین
دن گنیں گے فراق میں تیرے
تو ہمیں کچھ حساب آئے گا

❁ محمد طلحہٰ.....نارتھ کراچی، کراچی
اب کسی پیڑ کی صورت ہوتے
ہم اگر خاک میں بوئے جاتے

❁ امتیاز.....منڈی بہاؤالدین
دلِ واعظ میں کوئی غم نہیں ہے
نظر رکھتا ہے، چشمِ نم نہیں ہے
میں اس کی گفتگو سے بھاگتا ہوں
کہ اس کی ریت میں زمزم نہیں ہے

❁ احسن آفریدی.....میانوالی
کتنے ہی معصوم سروں سے تم نے چھاؤں چھینی ہے
کتنا دکھ پہنچایا تم نے ننھی ننھی جانوں کو!
اتنے بھی سفاک منافق دنیا نے کب دیکھے تھے
کتوں کا منہ چومنے والے قتل کریں انسانوں کو

❁ اویس خان.....بہاولنگر
اب وہ طوفاں ہے نہ وہ شور ہواؤں جیسا
دل کا عالم ہے تیرے بعد خلاؤں جیسا
کاش دنیا میرے احساس کو واپس کردے
خاموشی کا وہی انداز، صداؤں جیسا

❁ ناصر علی.....حیدرآباد
اُن کی خوشبو نہیں جاتی گھر سے
ایک مدت ہوئی مہمان گئے

❁ جہانزیب احمد.....بہاولنگر
پوچھنا ہے پتا ترے گھر کا
کام اتنا ہے بس صبا سے مجھے

❁ محمد اقبال.....کورنگی، کراچی
عجیب شہر ہے یہ اور عجب مسافت ہے
ہر ایک موڑ پہ رستوں کا جال آتا ہے

❁ صبا سحر.....کراچی
درِ قفس سے جب صبا گزرتی ہے
کسے خبر کہ اسیروں پہ کیا گزرتی ہے
تعلق کبھی اس قدر نہ ٹوٹے تھے
کہ تیری یاد بھی ہوکے خفا گزرتی ہے

❁ محمد نعیم.....لاہور
دو قدم کی رفاقت بہت ہے یہاں
دور تک ساتھ جانا ضروری نہیں

PAKSOCIETY.COM

❁ محمد آریز ملک.....گلستانِ جوہر، کراچی
میں سوچتا ہوں بہت دوسروں کے بارے میں
کبھی کبھی مجھے اپنا خیال آتا ہے

❁ ریاض بٹ.....حسن ابدال
جلتے ہیں جس کے لیے تیری آنکھوں کے دیے
ڈھونڈ لایا ہوں وہی گیت میں تیرے لیے

❁ زوہیب احمد ملک.....گلستانِ جوہر، کراچی
دیکھ کر شہر کی یہ ویرانی
مجھ کو تو دشت بھی لگا آباد

❁ زینب خواجہ.....ناظم آباد، کراچی
وقت کی قید سے بھاگا ہوا ہوں
اور تعاقب میں ہیں سائے میرے

❁ محمد اعظم.....جھنگ
تم مرے حال پہ حیران ہوئے
بس یہی بات تو حیرت کی ہے

❁ قدرت اللہ نیازی.....خانیوال
فلک سے کٹ کے زمیں پر گری پتنگیں دیکھ
تو ہجر کاٹنے والوں کی نفسیات سمجھ

❁ احمد خان.....ملتان
شروع دن سے ادھیڑا گیا ہے میرا وجود
جو دکھ رہا ہے اسے میری باقیات سمجھ

❁ ندرت ناصر.....کوئٹہ
توڑا اس نے کچھ اس ادا سے تعلق محسن
کہ ساری عمر ہم اپنا قصور ڈھونڈتے رہے

❁ وزیر محمد خان.....بٹل ہزارہ
بس اک ذرا سی بات تھی لیکن تمام عمر
وہ مجھ کو جاگنے کی سزا دے کے سو گیا

❁ عنبرین.....فیصل آباد
شاید کبھی تو دیکھے گا وہ تم کو جھانک کر
ان کی گلی میں روز تماشا کیا کرو

❁ سنبل.....سرگودھا
مجھ کو تو گردشِ حالات پہ رونا آیا
رونے والے تجھے کس بات پہ رونا آیا

❁ طارق قدیر.....نواب شاہ
اپنے بالوں کی سفیدی سے ڈر لگتا ہے
زندگی اب تیری رفتار سے ڈر لگتا ہے

❁ ناہید یوسف.....اسلام آباد
جانے کیسی ہے کشش بہتے ہوئے پانی میں
ساتھ آنکھیں بھی چلی جاتی ہیں حیرانی میں

❁ سرفراز علی.....کوئٹہ
پھر بھی ہم لوگ گزارے ہی چلے جاتے ہیں
ایک لمحہ بھی نہیں جبکہ گزارے جیسا

❁ فرقان شاہ.....سیالکوٹ
انہی آنکھوں میں سلگتا ہوا صحرا ہے جہاں
اتنا پانی تھا کہ اک شہر یہاں ڈوب گیا

❁ نواز رشید.....میر پور خاص
تم نے کتنی دیر لگا دی پاس ہمارے آنے میں
ہم تبدیل ہوئے بستی میں اور بستی ویرانے میں

❁ شہزاد علی خان.....چنیوٹ
جانے کس لہر میں تھا کوزہ گر
خاک ہوتی رہی ادھر سے ادھر

❁ محمد یعقوب.....رحیم یار خان
تتلی کی طرح اڑتے چلے جاتے ہیں لمحے
پھولوں کی طرح دیکھتے رہتے ہیں انہیں ہم

❁ تاج محمد.....پشاور
ایسے دنیا میں کسی کا بھی گزارہ ہوا ہے
جس طرح ہم نے تجھے دل سے اتارا ہوا ہے

❁ غلام محمد.....پڈعیدن
زندگی دیکھ کہ احسان ترے کتنے ہیں
دل کے ہر داغ کو آئینہ بنائے گئے ہم

کوپن
پرانے شمارہ
اکتوبر 2018

محفلِ شعر و سخن

نام : _____

پتا : _____

''آخر ہم جا کہاں رہے ہیں؟'' ارسلان نے کوئی بارھویں بار مفتاح سے یہ سوال کیا تو وہ جھنجلا گیا اور سخت تادیبی لہجے میں بولا۔

''صبر بھی کسی شے کا نام ہے یار۔ اتنے اتاولے کیوں ہو رہے ہو۔ تمہیں ساتھ ہی تو لے کر جا رہا ہوں، دیکھ لینا کہ کہاں جا رہے ہیں۔''

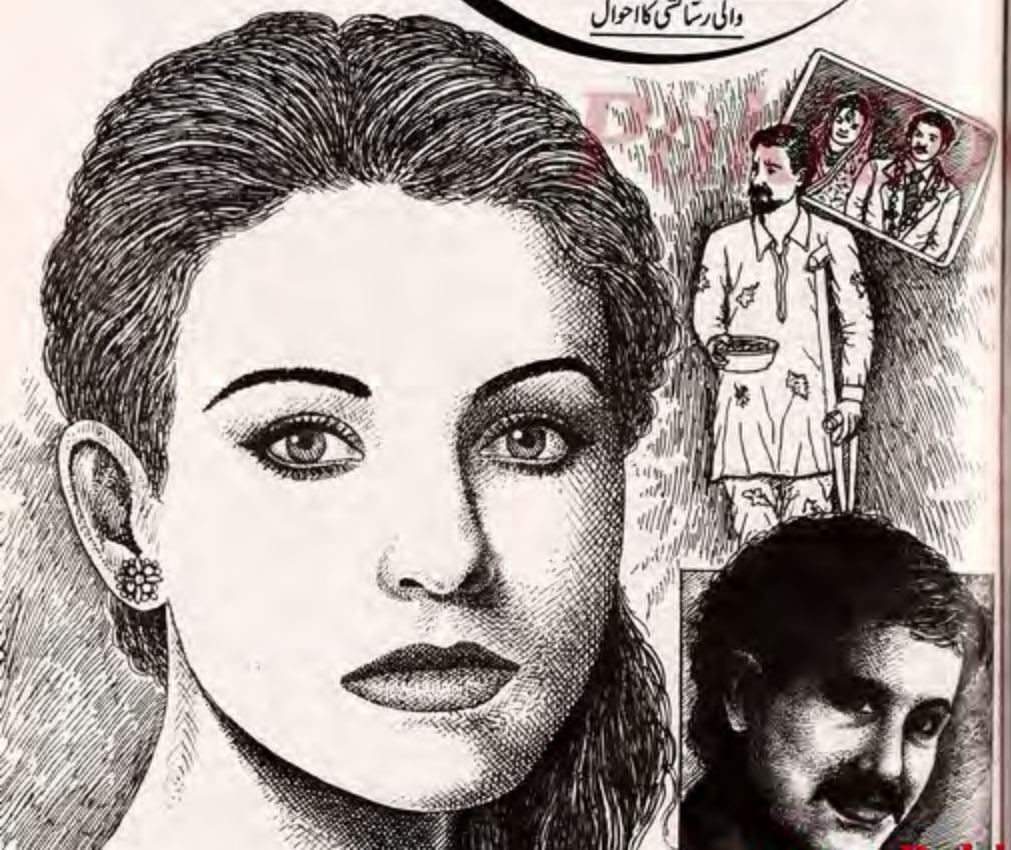
''صبر..... پچھلے پینتالیس منٹ سے تمہاری اس کھٹارا موٹر سائیکل پر سفر کرتے ہوئے میں صبر نہیں تو اور کیا کر رہا

خود غرض

اسما قادری

کچھ لوگ بہت عجیب طرزِ زندگی اختیار کرتے ہیں اور ایسے فیصلہ کن مراحل سے گزرتے ہیں جن میں فوری طور پر کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچنا لازم ہوتا ہے ورنہ وہ اپنے پیروں تلے بچھے کھیل میں ہار جاتے ہیں لیکن... وہ کسی بھی قیمت پر ہارنا نہیں چاہتا تھا لہٰذا اس نے اس کھیل میں دہری چال چلنے کا عزم کیا اور اس بے ایمان شخص تک پہنچ گیا جو کھیلتے کھیلتے جرم کی راہ پر گامزن ہو گیا تھا۔

خونی رشتوں میں محبت اور غرض کے درمیان ہونے والی رسا کشی کا احوال



ہوں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اتنی دیر سے ہم صرف چلے ہی جارہے ہیں، کہیں پہنچ نہیں رہے۔'' ارسلان نے اس کے لہجے کو خاطر میں لائے بغیر دہائی دی۔

''خبردار جو میری وفادار و غم خوار موٹر سائیکل کی شان میں کوئی گستاخی کی۔ ایک یہ ہی تو ہے دنیا میں جس پر مجھے پورا بھروسا ہے۔'' مفتاح نے یوں تڑپ کر ارسلان کو ٹوکا جیسے اس نے اس کی موٹر سائیکل نہیں، محبوبہ دلنواز کی شان میں گستاخی کر دی ہو۔

''وفادار تو پھر بھی کسی حد تک سمجھ آتا ہے لیکن یہ غم خوار کی اصطلاح موٹر سائیکل کے لیے میں زندگی میں پہلی بار سن رہا ہوں۔'' ارسلان اس کے الفاظ میں الجھ گیا۔

''تو کیا جانے ایک بن ماں کے بچے اور کنوارے مرد کی داستانِ الم۔ میں تو اتنا تنہا ہوں کہ رونے کے لیے کسی کا شانہ بھی میسّر نہیں آتا اور جب جی بہت بھر آتا ہے تو اپنی اس پیاری موٹر سائیکل سے لپٹ کر ہی رو لیتا ہوں۔'' مفتاح نے اتنے درد بھرے انداز میں بتایا کہ ارسلان کے آنسو نکلتے نکلتے رہ گئے۔ نکل بھی آتے جو عین وقت پر حلق سے چیخ نہیں نکل گئی ہوتی۔ پینتالیس سے پچاس منٹ کے سفر میں یہ اس کی کوئی بائیسویں چیخ تھی جو صرف اس وقت نکلی تھی جب وہ سیٹ پر سے بری طرح اچھلنے کے بعد واپس اس پر آن ٹکا تھا۔

''کتنا برا رائڈر ہے تُو۔ تیرے پیچھے سوار ہو کر تو میرے سارے انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ تیری اس آثارِ قدیمہ کی موٹر سائیکل پر سواری کرنا تو موت کے کنوئیں میں سفر کرنے کے برابر ہے۔'' ارسلان نے شکایت کی۔

''میں تمہیں آخری بار وارن کر رہا ہوں کہ اب میری موٹر سائیکل کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کرنا ورنہ میں تمہیں Sue کر دوں گا۔'' مفتاح نے اسے دھمکی دی۔

''مگر کیسے؟ اس طرح کے کاموں کے لیے ایک عدد وکیل ہائر کرنا پڑتا ہے جو کہ ظاہر ہے ابا کی کمائی پر پلنے، بڑھنے اور پڑھنے والا کوئی بندہ افورڈ نہیں کر سکتا۔ آخر ہم جا کہاں رہے ہیں؟'' اس بار ارسلان نے دوبارہ پوچھا۔

''اورنگی۔'' اس بار مفتاح نے بھی جواب دینے میں حرج نہ سمجھا کہ اتنا راستہ طے ہو جانے کے بعد ارسلان کے واپس بھاگ جانے کا کوئی خدشہ نہیں رہا تھا۔

''کیا کہا.....؟ کورنگی ٹو اورنگی۔ وہ بھی اس کھچاڑا موٹر سائیکل پر؟'' حیرت و صدمے سے ارسلان کا منہ کھل گیا۔

''مجبوری ہے۔ خالہ نے مجھے جس رشتے والی کے بارے میں بتایا ہے، اس کا دفتر اورنگی میں ہی ہے۔''

''یعنی ہم کسی شادی دفتر جا رہے ہیں..... لیکن کیوں؟''

''شادی دفتروں میں پکوڑے تو بکتے نہیں ہیں اس لیے وہاں جانے کا صاف مطلب ہے کہ ہم تلاشِ رشتہ میں وہاں جا رہے ہیں۔''

''تلاشِ رشتہ..... یعنی تم رومیسہ کی طرف سے بالکل ناامید ہو چکے ہو۔'' ارسلان کی حیرت بالکل حقیقی تھی۔ مفتاح کے بچپن کے دوست کی حیثیت سے وہ جانتا تھا کہ رومیسہ اسے کتنی عزیز تھی۔

''امید تو میں نے اس سے کبھی کوئی باندھی ہی نہیں۔ باندھ بھی لوں تو اس کے ہٹلر ابا کب میری کوئی امید پوری ہونے دیں گے۔ صاف کہہ رکھا ہے انہوں نے کہ جب تک تم دونوں اپنی فیلڈ میں قدم نہیں جما لیتے، اس شادی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں۔ سو میں نہیں سوچ رہا۔ شادی کا سوچ بھی لوں تو یہ نہیں سوچ سکتا کہ پوری کلاس میں سب سے زیادہ پڑھا کو رومیسہ بیگم کچن سمیت میرے پورے گھر کی ذمے داریاں بہ خیر و خوبی اٹھا لیں گی۔''

''اس لیے تم کسی دوسری لڑکی کو اپنے گھر لانے کا سوچ رہے ہو؟'' ارسلان کے لہجے میں حقیقی افسوس تھا۔

''لڑکی..... نہیں، کسی کم عمر لڑکی کی ڈیمانڈ نہیں ہے میری۔ کوئی بیوہ، طلاق یافتہ یا بڑی عمر کی کنواری خاتون سے بھی کام چل جائے گا۔ بس خاتون کو سلیقہ مند اور ذمے دار ہونا چاہیے تاکہ بعد میں وہ رومیسہ کو بھی سنبھال اور سکھا سکیں۔'' اس نے ارسلان کو اپنی ڈیمانڈ بتائی۔

''یعنی اپنی اس حرکت کے بعد تو رومیسہ سے شادی کے پروگرام پر بھی قائم رہنا چاہتا ہے؟'' ارسلان نے اس کی پشت کو گھورا۔

''اس سے شادی کا ارادہ بدل کر مجھے اپنی جان سے جانا ہے کیا؟ یاد نہیں ہے کیا کہ اس نے کیسے بھری کلاس کے سامنے اعلان کیا تھا کہ اگر میں اس سے شادی کے وعدے سے پھرا تو وہ سرِعام مجھے قتل کر دے گی اور مجھے معلوم ہے یار کہ وہ اپنا کہا پورا کرتی ہے۔''

''لیکن مجھے نہیں لگتا کہ وہ تیرے گھر میں پہلے سے کسی خاتون کی موجودگی کو قبول کر سکتی ہے۔'' ارسلان کو حیرت تھی کہ وہ اس معاملے کو اتنا سادہ کیوں سمجھ رہا ہے۔

''ہاں ہے تو تھوڑی سی جیلس ہنڈی مگر کام چور بھی بہت ہے۔ جب دیکھے گی کہ اس کے ہاتھ پیر ہلائے بغیر بھی گھر کے سارے کام ہو رہے ہیں تو کمپرومائز کر لے گی۔ ویسے بھی اسے کون سا چوبیس گھنٹے گھر میں ٹک کر بیٹھنا ہے۔ ڈاکٹر بن رہی ہے تو لازمی ہے کہ پریکٹس بھی کرے گی۔ شام کو میں اسے کہیں گھمانے لے جایا کروں گا اور رات کو ہم آپس میں میٹھی میٹھی سرگوشیاں کریں گے تو پھر اسے فرصت ہی نہیں ملے گی کہ کسی اور طرف توجہ دے سکے۔'' وہ بانک چلاتے چلاتے ہی مستقبل کے سہانے خواب دیکھنے لگا۔

''سارے لاڈ تو اپنی چہیتی رومیسہ کے اٹھائے گا تو وہ بے چاری خاتون اول کیا کرے گی؟'' ارسلان کو دوست کی خود غرضی پر غصہ آیا۔

''وہ ابا کی خدمت کریں گی اور اگر ابا کا موڈ اچھا ہوا تو وہ ان کے لاڈ بھی اٹھا لیں گے۔'' اس کا اطمینان قابلِ دید تھا۔

''ابا..... ابا کیوں اٹھائیں گے اس کے لاڈ؟'' ارسلان کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کا دوست اس حد تک بے غیرت بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے لہجے میں غصے اور صدمے کی کیفیت بڑھ گئی۔

''ساری دنیا کے مرد اپنی بیویوں کے لاڈ اٹھاتے ہیں۔ ابا کو بھی اب احساس ہو گیا ہوگا کہ انہوں نے پہلی بیوی کی قدر نہ کر کے اچھا نہیں کیا۔ اس لیے امید ہے کہ وہ اپنی دوسری بیوی کو زیادہ بہتر طریقے سے رکھیں گے۔'' اس نے جواب دیا تو ارسلان کے ہاتھوں کے سارے طوطے، کوے، کبوتر، عقاب اڑان بھر گئے۔

''تو تُو اپنے ابا کی دوسری شادی کرنے جا رہا ہے؟'' اس نے تصدیق کرنی چاہی۔

''بالکل۔ میں ابا کے ہاتھوں کے پکے بدذائقہ اور جلے بھنے کھانے کھا کھا کر بیزار آ چکا ہوں اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ایک عدد سوتیلی ہی سہی، ماں کے بغیر میرا گزارہ نہیں ہو سکتا۔'' مفتاح نے جس عزم سے جواب دیا، ارسلان نے اتنے ہی اطمینان کی سانس لی کیونکہ وہ تو یہ سوچ سوچ کر ہی دبلا ہوا جا رہا تھا کہ مفتاح شادی سے پہلے ہی بیچاری پر سوتن لانے جا رہا ہے۔

''خیال تو اچھا ہے لیکن کیا تُو نے اپنے ابا سے اجازت لے لی ہے؟''

''تو فکر نہ کر۔ مجھے اندازہ ہے کہ ابا انکار نہیں کریں گے۔ میں نے کسی دانشور کا یہ قول پڑھا تھا کہ مرد کے دل میں دوسری شادی کی خواہش پہلی شادی کے فوراً بعد ہی پیدا ہو جاتی ہے اور میرے ابا کے پاس تو جواز بھی ہے کہ بیگم کے مرحومہ ہو جانے کے بعد وہ بالکل تنہا رہ گئے ہیں۔''

''میں سوچ رہا ہوں کہ تیری امی کی روح عالمِ بالا میں کس بری طرح تڑپ رہی ہوگی کہ ان کا اکلوتا فرزندِ ارجمند ان کے انتقال کے محض آٹھ ماہ بعد ہی اپنے باپ کی دوسری شادی کروانے پر تلا ہوا ہے۔'' ارسلان نے اس کی توجہ ایک اہم پہلو کی طرف دلوائی۔ پھر مزید کہا۔

''بہت بڑا بدمعاش اور ٹانک باز ہے تو۔ اب مجھے کوئی شک نہیں رہا کہ تو اپنے ابا کو دوسری شادی کے لیے قائل کر کے چھوڑے گا۔''

''مان گیا نا میری صلاحیتوں کو..... اب دیکھ میں کیسے آگے کے معاملات بھی طے کرتا ہوں۔'' مفتاح نے بائنگ شیشے کے اس دروازے کے عین سامنے روکی جس پر سرخ پینٹ سے جلی حروف میں ''سنگم میرج بیورو'' درج تھا۔

☆☆☆

مفتاح کے ابا کی عمر پچاس سال سے زائد نہیں تھی۔ وہ گورنمنٹ ملازم تھے اور جسمانی اعتبار سے بالکل چاق و چوبند تھے۔ ان کی شریکِ حیات دو سال کی طویل بیماری جھیلنے کے بعد اس دنیا سے گئی تھیں اور اب وہ حقیقتاً بالکل تنہا رہ گئے تھے۔ مفتاح بظاہر لاابالی لیکن حساس طبیعت کا لڑکا تھا۔ اسے اپنے ابا کی تنہائی کا احساس تھا اور اس بات کو بھی سمجھتا تھا کہ انہیں عمر کے اس حصے میں ایک رفیق کی ضرورت ہے۔ بیوی سے بڑھ کر رفیقۂ حیات کوئی نہیں ہو سکتا تھا اس لیے اس نے اس بات کو انا کا مسئلہ نہیں بنایا کہ اپنی ماں کی جگہ کسی اور عورت کو اپنے گھر میں کیسے برداشت کروں اور نہ ہی دنیا والوں کی باتوں سے ڈرا۔ ابا کو بھی اس نے ان مسائل میں الجھنے نہیں دیا اور قائل کر کے دم لیا کہ اس گھر کو ایک عورت اور انہیں بیوی کی ضرورت ہے۔ ابا قائل ہو گئے تو تلاشِ رشتہ کا کام مزید شد و مد سے شروع ہو گیا۔ میرج بیورو چلانے والی خاتون نے اسے صاف بتا دیا تھا کہ وہ اپنے پاس رشتے کے لیے آنے والے خواتین و حضرات کی آپس میں ملاقات کروا کر سارے معاملات ان پر چھوڑ دیتی ہیں اور خود کسی قسم کی ذمے داری نہیں لیتیں۔ اس لیے یہ دونوں پارٹیوں کی اپنی ذمے داری ہوتی ہے کہ وہ رشتہ قائم کرنے سے پہلے ایک دوسرے کے بارے میں تحقیق کر لیں۔ مفتاح کے لیے یہ ایسا کوئی خاص سنگین ایشو نہیں تھا۔ اس کے خیال میں ابا کوئی الھڑ دوشیزہ تو تھے نہیں کہ شادی کے نام پر کوئی دھوکے سے ان پر قبضہ کر لے۔ میرج بیورو اورنگی میں تھا اور میرج بیورو والی آنٹی کے پاس دستیاب زیادہ تر رشتے بھی اورنگی ہی میں تھے چنانچہ وہ ارسلان کی ہائے وائے اور طعن و تشنیع کو نظر انداز کیے اس طرف عازمِ سفر تھا۔ ابا نے ایسے کسی سلسلے میں ساتھ دینے سے صاف انکار کرتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ جب کوئی رشتہ فائنل ہو جائے تو انہیں بتا دیا جائے، چنانچہ مفتاح اپنے سب سے قریبی دوست ارسلان کو اس کی ہزاروں دہائیوں کے

باوجود گھسیٹے پھرتا تھا۔ ان کے پاس روزینہ آنٹی (میرج بیورو کی مالکن) کا دیا ہوا ایک ایڈریس موجود تھا جس پر پہنچنے کے لیے وہ تگ ودو کر رہے تھے۔ آخر پوچھتے ہوئے وہ ساٹھ گز کے ایک چھوٹے سے گھر کے دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ دروازے پر گھنٹی کا بٹن نظر نہیں آرہا تھا اس لیے پیاس سے نڈھال ارسلان نے بلاتکلف زوردار دستک دے ڈالی۔ دستک اتنی بلند تھی کہ مفتاح کو یقین تھا کہ اس چھوٹے سے گھر کے مکین دہل گئے ہوں گے لیکن اس کے خدشات کے برعکس وہاں کوئی اثر ہی نہیں ہوا اور ارسلان کو ایک بار پھر اسی بلند آہنگ میں دستک دینی پڑی۔ اس بار نتیجہ مثبت نکلا اور تقریباً ستائیس اٹھائیس سال کے ایک شخص نے دروازہ کھولا۔ جھینپے ہوئے مفتاح نے مناسب الفاظ میں اسے اپنی آمد کا مقصد بتایا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ بڑے جوش سے بولا۔

''پلیز اندر آجائیے۔ میرے پاس روزینہ آپا کا فون آیا تھا اور انہوں نے آج کسی وقت آپ لوگوں کی آمد سے آگاہ کر دیا تھا لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ شام کے بجائے دن میں ہی آجائیں گے۔ بہرحال اندر آجائیے۔'' اس نے انہیں اندر آنے کی اجازت دے دی اور خود ایک طرف ہوگیا۔

''آپ لوگوں کے ساتھ کوئی خاتون تشریف نہیں لائیں؟'' ڈرائنگ روم کی طرز پر سجے ہوئے ایک کمرے میں انہیں بٹھانے کے بعد اس نے ان سے دریافت کیا۔

''گھر میں کوئی خاتون ہوتیں تو یہ اپنے ابا کے لیے رشتے کیوں دیکھتا پھرتا۔'' ارسلان کی زبان میں کھجلی ہوئی اور لٹھ مارنے والے انداز میں اسے جواب دیا۔ اصل میں اسے غصہ آرہا تھا کہ یہ بندہ اتنی گرمی میں آنے والوں کو ٹھنڈا پوچھنے کے بجائے تحقیق وتفتیش کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ اس کے اس انداز پر مفتاح نے چپکے سے اس کی پسلی میں کہنی ماری اور خود نہایت سنجیدہ شکل بنا کر بولا۔

''ابھی پہلا مرحلہ ہے تو میں اور میرا یہ دوست آئے ہیں۔ سلسلہ آگے بڑھا تو میں معاملات طے کرنے کے لیے اپنی خالہ کو لے کر آؤں گا۔ اصل میں کورنگی سے اورنگی آنے کے لیے اتنا طویل فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے کہ سب کانوں کو ہاتھ لگا لیتے ہیں۔''

''واقعی یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اچھا آپ لوگ بیٹھیں میں آپا سے کہتا ہوں کہ آپ لوگوں کے لیے کوئی ٹھنڈا وغیرہ تیار کریں۔'' آخر کار اس نے ارسلان کے دل کی بات کہہ ہی دی اور اٹھ کر گھر کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا۔ گھر تھا ہی کتنا بڑا۔ انہیں یہاں بیٹھے بیٹھے بھی اندر کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں اور توجہ ظاہر نہ کرنے کے لیے وہ ادھر ادھر دیکھ رہے تھے لیکن اس نوبائی نو کے کمرے کا جائزہ لینے کے لیے بھی کچھ خاص موجود نہیں تھا۔ پلاسٹک کی چار کرسیاں، لکڑی کی ایک میز، دیوار پر لگی برسوں پرانی کلاک اور ایک دھندلی سی سینری۔ بس یہی کل سامان تھا اس کمرے میں اور اسی سے کمرا بھر گیا تھا۔ ٹھنڈے کے لیے اندرونی حصے میں جانے والا جلد ہی واپس آگیا اور گفتگو کا سلسلہ ایک بار پھر آگے بڑھا۔ ایک دوسرے کا ذرا تفصیلی تعارف حاصل کیا گیا۔ اس نے اپنا نام سلیم بتایا اور متوقع دُلہا یعنی ابا کے بارے میں ان سے معلومات حاصل کرتا رہا۔ اپنے بارے میں اس نے بتایا۔

''ہم چھ بہن بھائی ہیں۔ رفعت آپا سب سے بڑی اور میں سب سے چھوٹا ہوں۔ ہمارے والدین کا آپا کی نوجوانی میں ہی انتقال ہوگیا تھا۔ والدین کے بعد آپا نے ہی ماں باپ بن کر ہمیں سنبھالا۔ نوکری بھی کی اور گھر کی ذمے داریاں بھی اٹھائیں۔ ان ذمے داریوں کو اٹھاتے ہوئے انہوں نے اپنا آپ نظر انداز کر ڈالا اور شادی کی عمر نکل جانے کی پروا کیے بغیر اپنے فرائض ادا کرتی رہیں۔ دو بہنیں تھیں، انہیں ان کے گھر کا کیا۔ بھائیوں کے لیے دُلہنیں لے کر آئیں اور ان دُلہنوں نے آتے ہی بھائیوں سمیت پورے گھر پر قبضہ کرلیا۔ بھائیوں کی نظریں بدلیں تو ہمارے لیے اپنے ہی گھر میں رہنا مشکل ہوگیا۔ خاص طور پر آپا دونوں بھاوجوں کی نظروں میں کھٹکنے لگیں۔ انہوں نے باقاعدہ آپا پر الزام لگایا کہ ان کی اپنی شادی تو ہوئی نہیں اس لیے دوسروں سے جلتی ہیں اور انہیں سکھ سے نہیں رہنے دیتیں۔ میں نے آپا کی اس بے عزتی پر ان کی جانب سے آواز اٹھانے کی کوشش کی تو گستاخ اور زبان دراز قرار پایا۔ ایسے حالات میں، میں نے یہی مناسب سمجھا کہ آپا کو اس کشادہ گھر سے جس کے مکینوں کے دل تنگ تھے، کہیں اور منتقل کردوں۔ چنانچہ اپنی گنجائش کے مطابق میں نے یہ چھوٹا سا گھر لے لیا ہے جہاں ہم دونوں بہن بھائی بہت سکون سے رہتے ہیں لیکن دو بھاوجیں لانے کے تلخ تجربے کے باوجود اب آپا میری شادی کروانے پر کمربستہ تھیں۔ میں نے بھی شرط رکھ دی کہ پہلے آپ کو آپ کے گھر کا کروں گا پھر اپنی شادی کا سوچوں گا۔ آپا اس شرط پر بہت جز بز ہوئیں۔ بڑی مخالفت کی، دلیلیں دیں کہ اس عمر میں میری شادی کروا کر میرا مذاق بنواؤ گے لیکن میں نہیں مانا اور صاف کہہ دیا کہ اگر آپ نے شادی نہیں کی تو میں بھی زندگی بھر کنوارا رہوں گا۔ میری اس دھمکی نے کام دکھایا اور اب میں روزینہ آپا کی وساطت سے آپا کے لیے کسی معقول رشتے کی تلاش میں ہوں۔'' سلیم نامی وہ لڑکا جو عمر میں ان دونوں سے چند سال ہی بڑا تھا، انہیں کھل کر اپنے حالات کے بارے میں بتاتا چلا گیا۔ اسی وقت دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی اور سلیم کو ٹھنڈا لے جانے کے لیے پکارا گیا۔

''اندر آجائیں آپا..... پردے کی کوئی بات نہیں ہے۔'' سلیم نے جواب دیا تو قدموں کی چاپ سنائی دی اور وہ جھجکتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ مفتاح نے اور ارسلان نے کھڑے ہوکر ان کا استقبال کرنے کے ساتھ ساتھ طائرانہ جائزہ بھی لے ڈالا۔ چالیس سے بیالیس سال عمر، گندمی رنگت، مناسب نین نقش، قدرے فربہ لیکن کسا ہوا جسم۔ میک اپ سے بے نیاز اور ہلکے رنگ کے لان کے جوڑے میں ملبوس وہ خاتون بالکل ویسی ہی تھیں جیسی عموماً سفید پوش طبقے کی خواتین ہوتی ہیں۔ ان دونوں نے انہیں ادب سے سلام کیا تو وہ آہستہ سے جواب دے کر چھوٹے بھائی کے اشارے پر چوکھی خالی کرسی پر ٹک گئیں۔ ہاتھ میں تھامی ٹرے انہوں نے پہلے ہی لکڑی کی میز پر رکھ دی تھی۔ ٹرے میں شربت کے گلاسوں کے ساتھ گھر میں تیار کردہ فرنچ فرائز، سموسوں اور بسکٹس کی پلیٹیں بھی نظر آرہی تھیں۔ ارسلان ندیدوں کی طرح ان چیزوں کو تکنے لگا اور سلیم کے دعوت دینے پر بلاتکلف ہر شے سے انصاف شروع کردیا۔ کھانے کے ساتھ اس کی زبان بھی تیز رفتاری سے چل رہی تھی اور وہ ایک ایک شے کی تعریف کرتے ہوئے اسے اپنے معدے میں منتقل کرتا جارہا تھا۔ مفتاح البتہ خلافِ عادت سنجیدگی اور بربادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاتون سے چھوٹے موٹے سوالات کرکے ان کے بارے میں معلومات حاصل کررہا تھا۔

انہوں نے صرف ایف اے تک تعلیم حاصل کی تھی اور اس تعلیم کے سہارے گھر چلانے کے لیے گارمنٹس فیکٹریوں اور کارخانوں میں ملازمت کرنے کے ساتھ ساتھ گھر پر بھی ٹیوشن پڑھانے اور سلائی کرنے جیسے کام کرتی رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ ایک محنت کرنے والی عورت کے ہاتھ تھے جو دیکھنے میں زیادہ خوبصورت اور نرم وملائم نہیں تھے لیکن جن کی عظمت کو دل تسلیم کرتا تھا۔ مفتاح نے وہاں سے رخصت ہونے سے قبل ابا کے جملہ کوائف پر مشتمل لفافے میں رکھا ایک کاغذ سلیم کے حوالے کیا اور اس سے کہا کہ وہ اپنے طور پر اس کے ابا کے بارے میں معلومات حاصل کرکے جب چاہے اس سے رابطہ کرسکتا ہے تاکہ اس سلسلے کو آگے بڑھایا جاسکے۔ سلیم نے بہت خوش دلی سے انہیں وہاں سے رخصت کیا اور اس کی آپا کی سنجیدہ آنکھوں میں بھی کچھ رنگ ہلکورے لیتے نظر آنے لگے۔

''میری مان یار مفتاح تو اس گھر کی دہلیز پکڑ لے۔ خاتون کے ہاتھوں میں اتنا ذائقہ ہے کہ تیری سگی ماں کے ہاتھوں میں بھی اتنا ذائقہ نہیں تھا۔ میرے تو عیش ہوجائیں گے۔ روزانہ کباب سٹڈی اسٹڈی کے بہانے تیرے گھر آکر دھرنا دے دیا کروں گا۔''

مفتاح نے بائک اسٹارٹ کرکے آگے بڑھائی تو ارسلان کی زبان بھی اسٹارٹ ہوگئی۔ مفتاح اسے کوئی کرارا سا جواب دینا چاہتا تھا کہ گلی کے نکڑ پر اچانک نمودار ہونے والے ایک فقیر کی وجہ سے بریک لگانے پڑے۔ سیاہ بوسیدہ چغے میں ملبوس ابھی، کھچڑی ڈاڑھی اور بالوں والا وہ فقیر تنگ گلی کے دہانے پر بالکل درمیان میں کھڑا تھا۔

''دیکھ کر نہیں چل سکتے۔ اندھے ہوگیا ہے ابھی ٹکر ہوجاتی تو.....'' مفتاح بری طرح جھنجلایا۔

''میں تو سچ مچ اندھا ہوں، پر تم کیوں آنکھیں ہوتے ہوئے نہیں دیکھتے؟'' فقیر نے کہیں دور نظریں جمائے ہوئے جواب دیا تو وہ شرمندہ ہوگیا۔

''معاف کرنا بابا! میرا دھیان ذرا بٹا ہوا تھا اور تم بھی بالکل اچانک ہی سامنے آگئے۔'' اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہتے ہوئے پچاس کا نوٹ جیب سے نکال کر فقیر کے ہاتھ پر رکھا۔

''حادثے اچانک ہی آدمی کی زندگی میں آتے ہیں۔ تو بڑا بھولا ہے اور یہ دنیا بڑی چالاک۔ فقیر کا مشورہ مان تو آنکھیں کھلی رکھ اور دھوکا نہ کھا۔ میری بے نور آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ تو دھوکا کھانے جارہا ہے۔'' فقیر قدرے جلالی انداز میں بولا اور پچاس کا نوٹ دبوچ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے دور نکل گیا۔ مفتاح اور ارسلان دم بخود اسے جاتا ہوا دیکھتے رہے۔

''یہ کیا ہے یار مفتاح..... مجھے تو لگتا ہے کوئی بدشگونی ہوگئی ہے۔'' فقیر نظروں سے اوجھل ہوگیا تو ارسلان نے قدرے سہمے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔

''کیا ہوگیا ہے یار..... میڈیکل کے اسٹوڈنٹ ہوکر ایسی دقیانوسی باتیں کررہے ہو۔'' مفتاح نے خود کو سنبھال کر اسے ٹوکا اور دوبارہ بائک اسٹارٹ کرنے لگا۔

''ایسے لوگوں کی بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے یار! ان فقیروں میں ہی سے بعض بہت پہنچے ہوئے بندے بھی ہوتے ہیں۔ ذرا سوچ کہ ایک ایسے موقع پر جبکہ ہم ایک اہم

کام انجام دے کر واپس جا رہے ہیں، یہ بندہ ہم سے کیوں ٹکرایا؟'' ارسلان وہم میں پڑ چکا تھا۔

''کچھ نہیں ہے یار! ان فقیروں وغیرہ میں سے بعض بڑے چالاک اور ڈراما باز ہوتے ہیں۔ لوگوں کی نفسیات سے کھیل کر مال بٹورنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' مفتاح نے اسے ٹالا۔

''لیکن وہ بندہ تو مال بٹورنے کے لیے رکا ہی نہیں اور اپنی کہہ کر جو تو نے دیا تھا، لے کر خاموشی سے چلتا بنا۔'' ارسلان نے اس کی دلیل رد کی۔

''اب میں کیا کہہ سکتا ہوں یار! میں نے کون سا فقیریات میں پی ایچ ڈی کر رکھا ہے جو فقیروں کے رویّوں پر روشنی ڈالتا پھروں۔ میں تو بس تجھ سے ہی درخواست کرسکتا ہوں کہ بے شک تیرا منہ اچھا نہیں ہے لیکن اپنے منہ سے اچھی بات نکال اور میرے اکلوتے ابا کی دوسری شادی ہونے دے تاکہ میں بھی چھٹی کے دن ان کے لیے رشتے دیکھنے کی مشقت سے بچ کر دن چڑھے تک لمبی تان کر سو سکوں۔'' اس نے حسبِ عادت ہونے والے واقعے کو زیادہ سر پر سوار نہیں کیا اور بظاہر بڑی لجاجت سے ارسلان سے درخواست کی۔

''تو تنہا یہ مشقت نہیں کر رہا ہے۔ میرے بھی کئی اتوار تیرے ساتھ کورنگی ٹو اورنگی سفر میں برباد ہوئے ہیں اس لیے میں بھی جلد تیرے ابا کے نمٹ جانے کا خواہش مند ہوں۔''

اس کی باتوں کو خوش دلی سے سنتا مفتاح مطمئن تھا کہ ارسلان فقیر والے موضوع کو بھول چکا ہے۔

☆☆☆

مفتاح کا ابا کے بارے میں اندازہ درست تھا۔ تنہائی اور دہری ذمے داریوں سے نمٹنے کے لیے انہیں واقعی رفیقۂ حیات کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ مفتاح نے خالہ کے ذریعے ان سے شادی کے موضوع پر گفتگو چھیڑی تو ابتدا میں تو وہ خوب گرجے برسے اور ناہنجار اولاد کو خوب باتیں سنائیں جو اس عمر میں ان کی دوسری شادی کروانے پر تلا بیٹھا تھا لیکن اس گرج برس کے بعد مطلع صاف ہوگیا اور خالہ کے دلائل اور مفتاح کی گزارش کے آگے انہوں نے جلد ہی ہتھیار ڈال دیے۔ میرج بیورو والی روزینہ آنٹی سے مفتاح رفعت کی ایک تصویر لے کر آیا تھا۔ تصویر کوئی چھ سات برس پرانی رہی ہوگی جس پر فوٹو گرافر نے بھی اپنی مہارت دکھائی تھی اس لیے مفتاح کے اندازے کے مطابق ابا دیکھتے ہی لٹو ہوگئے لیکن بظاہر متانت سے بولے۔

''شکل وغیرہ کا کیا کرنا ہے بھئی۔ میں نے مفتاح کی خواہش اور گھر کی ابتر حالت کو دیکھتے ہوئے عقدِ ثانی کے لیے ہامی بھری ہے اس لیے میرے لیے یہی کافی ہے کہ خاتون اس گھر کو طریقے سے سنبھال لیں۔'' مفتاح نے اپنی کامیابی پر خود کو خیالوں خیالوں میں تھپکی دیتے ہوئے آگے کے مراحل طے کرنا شروع کردیے۔ سلیم نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ بے شک وہ سب سے الگ رہتا ہے لیکن آپا کی شادی کے معاملات طے کرنے میں بڑے بھائی بہنوں کو شامل رکھنا اس کی ایک معاشرتی مجبوری ہوگی چنانچہ اس نے سلیم کو فون کردیا کہ اتوار کی شام اپنے خاندان کے چیدہ چیدہ افراد کے ساتھ آکر بردکھوے کی کارروائی ادا کرجائے۔

جس روز لڑکی والوں نے آنا تھا اس نے ارسلان کے ساتھ مل کر خصوصی انتظامات کیے۔ چھڑوں کے گھر بے ترتیبی دور کرنے کے لیے ارسلان اپنے گھر کام کرنے والی ماسی کی منت سماجت کرکے اسے ایک دن کے بدلے پورے مہینے کی تنخواہ دینے کا وعدہ کرکے لے آیا۔ ماسی نے ماتھے پر سوسو بل ڈال کر گھر کی حالت بہتر کرنے میں ان کی مدد کی اور آخر میں احسان جتا کر گئی کہ اس نے صرف ایک مہینے کی تنخواہ کے بدلے سال بھر کی صفائی کا کام نمٹایا ہے۔

کھانے پینے کی اشیا مفتاح ایک بہت اچھی بیکری سے لے آیا جبکہ ابا کو بھی ان کی نہ نہ کے باوجود خاصی محنت کرکے نکھار دیا گیا۔ یہ مہمانوں کی آمد سے کچھ دیر پہلے کی بات تھی۔ مفتاح نہا کر کپڑے بدلنے کے بعد آئینے کے سامنے کھڑا بال سنوار رہا تھا کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا تو اسکرین پر اجنبی نمبر جگمگا رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کرلی۔

''بہت بڑی غلطی کرنے جا رہے ہو تم! ساری زندگی پچھتاؤ گے۔'' اس کے ہیلو کہتے ہی دوسری طرف سے بلا تمہید کہا جانے لگا۔

''جی، کون صاحب بات کر رہے ہیں اور کس سے بات کرنی ہے؟'' مفتاح چونکا اور نہایت سنجیدہ لہجے میں سوال کیا۔

''کون کہہ رہا ہے اسے چھوڑو میاں اور یہ غور کرو کہ کیا کہا جا رہا ہے۔'' بولنے والا ایسا لگتا تھا کہ کلے میں پان کی گلوری دبا کر بات کر رہا ہے۔

''آپ ڈھنگ سے کھل کر ارشاد فرمائیں تو میں آپ کی اس نصیحت پر عمل کرنے کی بھی کوشش کر دیکھوں گا۔'' مفتاح نے تند لہجے میں جواب دیا۔

''کھل کر ہی بات کر رہے ہیں۔ اب تم جان کر انجان بنو تو الگ بات ہے۔ بس اتنا جان لو کہ وہ بہت لالچی لوگ ہیں اور عورت بھی بڑی کرپٹ ہے۔ تم خوامخواہ اس عمر میں اپنے باپ کے سر میں خاک ڈلواؤ گے۔'' کہنے والے نے اپنی بات کہی اور کھٹ سے فون بند کردیا۔ اس کال کے بعد مفتاح عجیب الجھن میں پڑ گیا۔ جس نمبر سے کال کی گئی تھی، اس کی کھوج لگائی تو پتا چلا کسی پی سی او کا نمبر تھا۔ مہمانوں کی آمد سے پہلے اس طرح کی کال بڑی معنی خیز تھی۔ اسے خیال آیا کہ ممکن ہے رفعت اور اس کے خاندان سے دشمنی رکھنے والا کوئی شخص ہوگا جو اس رشتے کو ہونے سے روکنا چاہتا ہے اس لیے اس طرح کی باتیں کر گیا ہے۔ وہ رفعت اور سلیم دونوں سے ایک ہی ملاقات میں خاصا متاثر ہوا تھا۔ ان کی سادگی اور سچائی اسے اچھی لگی تھی اس لیے دل سے خواہش مند تھا کہ اس خاندان سے ان کا رشتہ جڑ جائے۔ اس نے اس کال کو نظر انداز کردینے کا فیصلہ کیا اور ارسلان کو بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ مہمان اپنے مقررہ وقت پر آئے تو ان کی تعداد متوقع تعداد سے بہت کم تھی۔ سلیم کے ہمراہ بس ایک مرد اور خاتون ہی آئے تھے جن کا سلیم نے اپنے بڑے بھائی اور بہن کی حیثیت سے تعارف کروایا۔ باقی اہلِ خانہ کے بارے میں استفسار پر اس نے معذرت کرلی کہ دیگر لوگ اپنی نجی مصروفیات کی بنا پر اس موقع پر شریک نہیں ہوسکے ہیں اور بڑے بھائی اور بہن کو ہی اپنی نمائندگی سونپ دی ہے۔ مفتاح اور ارسلان نے مل کر سگھڑ بیبیوں کی طرح معزز مہمانوں کی خاطر مدارت کی۔ ابا جو کہ آج اپنی اصل عمر سے دو چار برس کم ہی لگ رہے تھے، بڑی متانت سے مہمانوں سے ملے۔ نہایت خوشگوار ماحول میں چائے پی چکنے کے بعد رفعت کے بڑے بھائی کلیم نے گفتگو کا باقاعدہ سلسلہ چھیڑا اور سنجیدہ شکل بنا کر ابا سے بولے۔

''رشتہ تو تقریباً طے ہی سمجھیں لیکن اس سے قبل کچھ اہم معاملات طے ہونے ضروری ہیں۔ وہ طے ہوجائیں تو ہماری طرف سے ہاں ہوگی۔''

''جی ارشاد فرمائیں۔'' ابا ہمہ تن گوش ہوئے۔

''بات یہ ہے کہ بے شک یہ آپ کی دوسری شادی ہے لیکن ہماری آپا کنواری ہیں اور ظاہر ہے ان کے دل میں کچھ ارمان بھی ہوں گے تو ہم چاہتے ہیں کہ سادگی کے نام پر آپا کے ارمانوں کا خون نہ ہو۔''

''آپ کی بات ٹھیک ہے لیکن اب میں اس عمر میں باجے گاجے کے ساتھ تو برات لانے سے رہا۔ میری جگ ہنسائی ہوگی۔'' ابا نے فوراً اعتراض کیا۔

''ارے نہیں جناب! آپ غلط سمجھے۔ غیر ضروری دھوم دھام تو ہم بھی نہیں چاہتے لیکن اتنی خواہش ضرور ہے کہ جیسے عام طور پر لڑکیوں کی اہتمام سے بری وغیرہ آتی ہے ویسے ہی آپا کے لیے بھی آئے اور انہیں یہ احساس نہ ہو کہ کسی دوسری شادی کرنے والے سے بیاہنے کی وجہ سے ان کے ساتھ کنجوسی برتی گئی ہے۔''

''آپ فکر نہیں کریں کلیم بھائی! ایسی کوئی کمی نہیں ہوگی۔ میری خالہ بری جہیز وغیرہ تیار کرنے میں مہارت رکھتی ہیں۔ وہ سارا اہتمام کردیں گی۔'' مفتاح کو ڈر محسوس ہوا کہ کہیں ابا انکار نہ کردیں اس لیے خود ہی جلدی سے ہامی بھر لی۔

''بہتر ہوگا کہ شاپنگ کے معاملے میں آپا کو ساتھ رکھا جائے۔ ہر ایک کی اپنی ذاتی پسند ہوتی ہے اس لیے مناسب یہی ہے کہ جس کو برتنا ہے، وہی اپنی پسند سے چیزیں خریدے ورنہ خوامخواہ پیسے کا زیاں ہوگا۔'' اس بار ساتھ آئی بہن صاحبہ نے لقمہ دیا۔

''بات تو آپ کی ٹھیک ہے، چلیں ایسا ہی کرلیں گے۔'' مفتاح اس وقت پوری طرح ابا کے بزرگ کا کردار ادا کر رہا تھا اور انہیں کچھ بولنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔

''دوسرا معاملہ اس سے بھی زیادہ اہم اور سنجیدہ نوعیت کا ہے۔ ہم اپنی کنواری بہن کو ایک جوان بیٹے کے باپ سے بیاہنے جا رہے ہیں اس لیے ہمارے بہت سے تحفظات ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ کچھ ایسے اقدامات کیے جائیں جو ہمیں بہن کے مستقبل کی طرف سے قدرے بے فکر کردیں۔'' کلیم صاحب نے گلا کھنکھار کر گفتگو کے سلسلے کو آگے بڑھایا اور کسی خاص بات کے لیے تمہید باندھنے لگے۔

''کس قسم کا تحفظ درکار ہے آپ کو؟'' ابا نے انہیں گہری نظروں سے دیکھا۔

''دیکھیں بھائی صاحب! میری بات کا غلط مطلب مت لیجیے گا اور خود کو ہماری جگہ رکھ کر سچویشن کو سمجھنے کی کوشش کیجیے گا۔ ہمارے دل میں بہت سے خدشات اور اندیشے ہیں۔ کچھ حقائق پر بھی نظر ہے۔ بعض باتیں کہنے میں بری لگتی ہیں لیکن حقیقت پسند لوگ انہیں نظر انداز کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ میں بھی کچھ ایسا ہی آدمی ہوں اور پیشگی معذرت کے ساتھ آپ سے اس حساس موضوع پر بات کرنے جا رہا ہوں۔''

''آپ فرمایئے، میں کوشش کروں گا کہ آپ کی ہر بات کو غیر جانبداری اور حقیقت پسندی کے ساتھ سمجھ

سکوں۔'' کلیم کی تمہید سے بیزار ابا نے اسے حوصلہ دیا۔

''جی شکریہ۔ بات یہ ہے کہ ہم سوچ رہے ہیں آپ کا ایک جوان بیٹا ہے اور بے شک آپ اس کی رضامندی سے عقدِ ثانی کر رہے ہیں لیکن آگے جا کر چار چھ سال بعد لاڈلی ہے کہ آپ بیٹے کی شادی بھی کریں گے اور اس وقت صورتِ حال بدل جائے گی۔ آج کل کی لڑکیاں سگی ساسوں کو برداشت نہیں کرتیں تو پھر سوتیلی ساس کو کون برداشت کرے گا۔ نتیجہ ناچاقی اور تلخیوں کی صورت میں نکلے گا اور اکلوتے بیٹے کی طرف فطری جھکاؤ کی وجہ سے آپ بھی زوجہ کا زیادہ ساتھ نہیں دے پائیں گے..... تو ایسے وقت میں آپا کے پاس اپنے قدم مضبوطی سے جمائے رکھنے کے لیے کوئی سہارا تو ہونا چاہیے۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ اس مکان کا آدھا حصہ آپا کے نام کردیں۔'' بلی آخر تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔

''میرا بیٹا ایسا ناہنجار نہیں ہے۔ اسے رشتوں کا احترام کرنا آتا ہے۔'' ابا ان کے مطالبے پر ذرا خفا ہوئے۔

''بے شک ایسا ہی ہوگا لیکن وقت کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ آج کل تو یہ حالات ہیں کہ جوان جہان لوگ دیکھتے دیکھتے چٹ پٹ ہو جاتے ہیں۔ اللہ آپ کو لمبی عمر عطا کرے، میرے منہ میں خاک لیکن فرض کریں کہ آپ کو کچھ ہو گیا تو ہماری آپا کا کیا ہوگا؟ ان کے پاس اتنا سہارا تو ہونا چاہیے کہ اپنی چھت کے نیچے عزت سے بیٹھ کر دو وقت کی چٹنی روٹی کھا سکیں۔'' وہ اتنے سلیقے سے بات کر رہا تھا کہ ابا سمیت مفتاح اور ارسلان بھی کچھ کہنے سے قاصر تھے۔ مفتاح کے دل میں ایک بار اس گمنام فون کال کا خیال آیا تھا جس کے کالر نے ان لوگوں کو لالچی قرار دیا تھا لیکن کلیم جو باتیں کر رہا تھا، اس میں لالچ سے زیادہ فکرمندی کا تاثر تھا اور یہ بات سمجھ آ رہی تھی کہ ایک بھائی اپنی بہن کا مستقبل محفوظ دیکھنا چاہتا ہے۔

''میں اس معاملے پر غور کر کے آپ کو جواب دوں گا۔ اگر آپ کو کچھ اور بھی کہنا ہو تو کہہ دیں۔'' اس بار مفتاح خاموش تھا اور ابا سنجیدہ چہرے کے ساتھ کلیم سے مخاطب تھے۔

''اور تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔ آپ خود ماشاء اللہ سمجھدار آدمی ہیں اور اس بات کا شعور رکھتے ہوں گے کہ وقتِ نکاح معقول حق مہر ادا کرنا آپ کا شرعی فرض ہے۔ وہ دور گزر گیا جب چند ہزار کا حق مہر مقرر کیا جاتا تھا۔ آج کل پیسے کی قدر کم ہو گئی ہے اس لیے مہر بھی لاکھوں میں ہی رکھا جاتا ہے۔ ہماری دونوں چھوٹی بہنوں کے حق مہر پانچ پانچ لاکھ رکھے گئے تھے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ آپا کا حق مہر بھی اتنا ہی ہونا چاہیے۔''

''پانچ لاکھ تو بہت زیادہ ہیں۔ میری پہلی اہلیہ کا حق مہر پچیس ہزار روپے تھا۔'' ابا نے بڑی بے ساختگی سے اعتراض کیا۔

''یہ بھی تو دیکھیے کہ پچیس چھبیس سال پہلے پچیس ہزار کی ویلیو کیا تھی؟ اس وقت کے پچیس ہزار تو اب کے پندرہ بیس لاکھ کے برابر حیثیت رکھتے ہیں۔ اس حساب سے تو ہم پانچ لاکھ مہر کم ہی رکھ رہے ہیں۔'' وہاں جواب تیار تھا۔ یہ تینوں اپنا سا منہ لے کر رہ گئے کہ بات اتنی بھی غلط نہیں تھی۔

''آپ اتنا کیوں سوچ رہے ہیں بھائی صاحب! یہ سارے تو رشتہ طے کرتے وقت کے چونچلے ہیں۔ عورت کو کچھ دے دلا دینے سے مرد کا کچھ نہیں بگڑتا۔ عورت کو سب لے کر کہاں جانا ہوتا ہے۔ شوہر کے گھر میں رہ کر اس کی مرضی سے ہی خرچ کرتی ہے۔ میرے شوہر نے نکاح کے وقت مجھے جو پانچ لاکھ مہر دیا تھا، کونسا میں اسے اپنے پچھلوں کو دے آئی۔ چار چھ مہینے رقم بینک میں پڑی رہی اس کے بعد میاں نے کاروبار میں لگانے کے بہانے لی تو آج تک کاروبار میں ہی لگی ہوئی ہے۔ نہ انہوں نے کبھی دی، نہ میں نے مانگی۔ مجھے رقم کا کرنا بھی کیا ہے۔ رہنا، کھانا پینا، پہننا سب شوہر کے ذمے ہے۔ مجھے ان پر اور انہیں مجھ پر بھروسا ہے اور شادی کے وقت جو شرطیں ورطیں رکھی گئی تھیں، ان کا کوئی ذکر بھی نہیں ہوتا۔ اصل زندگی تو میاں بیوی کو اپنی انڈر اسٹینڈنگ سے ہی گزارنا ہوتی ہے۔ لڑکی والے تھوڑی بہت شرائط پہلے اس لیے رکھتے ہیں کہ اپنی لڑکی کے مستقبل کے لیے فکرمند ہوتے ہیں۔'' اس بار ساتھ آئی بہن نے گفتگو میں دخل دیا اور ابا کو سمجھانے لگیں۔ ساتھ آیا چھوٹا بھائی سلیم، منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھا تھا اور سر کو دائیں بائیں گھماتا کبھی بھائی تو کبھی بہن کے ارشادات سن رہا تھا۔

''آپ نے بجا فرمایا لیکن اس طرح کے معاملات ایسے ہی تو طے نہیں ہوتے۔ آپ ہمیں آپس میں صلاح مشورے کے لیے تھوڑا سا وقت دیں پھر ہم آپ کو کوئی حتمی جواب دے سکیں گے۔'' ابا نے سلیقے سے انہیں جواب دیا تو وہ جانے کے لیے پر تولنے لگے۔ رخصت ہوتے ہوئے سلیم، مفتاح کے کان میں کہہ گیا۔

''آپ جلد کوئی فیصلہ کر لیجیے گا۔ روزینہ آپا نے ہمیں دو مزید رشتے اور بھی بتائے ہیں لیکن آپ لوگ ہمیں اچھے لگے تھے تو ہم نے سوچا کہ یہیں بات بن جائے تو اچھی بات ہے۔''

معزز مہمانوں کے جانے کے بعد ارسلان بھی اپنے گھر رخصت ہو گیا اور مفتاح اور ابا ایک دوسرے کے روبرو بیٹھ گئے۔ ایک بار پھر ساری گفتگو کا تجزیہ کیا جانے لگا۔ کبھی لگتا کہ وہ لوگ لالچی ہیں۔ کبھی ان کے دلائل درست محسوس ہوتے اور خیال آتا کہ وہ لوگ صرف اندیشوں اور خدشات کے سبب ایسی شرائط بیان کر گئے ہیں۔ رشتہ ابا اور مفتاح دونوں کو ہی پسند آیا تھا اس لیے انکار کرنے میں بھی تامل تھا۔ آخر مفتاح نے ہی فیصلہ سنایا اور بولا۔

''آپ ان لوگوں کی شرائط قبول کر لیں ابا! رفعت آنٹی اچھی خاتون ہیں۔ ہمارے گھر آ کر ہمارے ساتھ رہیں گی تو ہمیں بھی جان لیں گی اور انشاء اللہ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ ویسے بھی مجھے گھر کا یا پیسوں کا کوئی لالچ نہیں ہے۔ آپ مجھے بہترین تعلیم دلوا رہے ہیں، میرے لیے یہی کافی ہے۔ آگے میں اسکالرشپ پر باہر جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو بہت کمالوں گا لیکن اس وقت اصل مسئلہ اس گھر اور آپ کی تنہائی کا ہے۔ آپ کو ایک اچھا ساتھی مل جائے گا تو میں اپنے فیوچر کے لیے زیادہ آزادی سے ہاتھ پیر مار سکوں گا۔''

''میں سمجھتا ہوں بیٹا! مجھے معلوم ہے کہ تمہاری اڑان کورنگی سے بہت آگے ہے۔ رومیسہ بھی شاید شادی ہو کر اس جگہ آنا پسند نہ کرے لیکن ایک باپ کی حیثیت سے مجھے تمہاری فکر تو ہے نا اور میں نہیں چاہتا کہ تمہارا حق کسی اور کو ملے۔'' ابا اس وقت بالکل بچے سچے والے ابا بنے اس کے لیے فکرمند تھے۔

''بیکار کی باتیں مت سوچیں پیارے ابا۔ بس ہاں کر دیں۔ باقی مستقبل میں جو کچھ ہونا ہے، وہ وقت کے ساتھ خود ہی سامنے آ جائے گا۔'' مفتاح نے ان کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیتے ہوئے کہا تو ان کے پاس مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں بچی اور وہ ہولے سے اس کی پیٹھ تھپک کر رہ گئے۔

☆☆☆

ان کی طرف سے ہاں ہوتے ہی باقی مراحل بڑی تیزی سے انجام پانے لگے تھے۔ خالہ نے رفعت کو شاپنگ کروانے کی ذمے داری سنبھال لی تھی اور رفعت کی طرف سے خاصے اطمینان کا اظہار کیا تھا البتہ وہ ان کی بہن سے نالاں رہتی تھیں جو مستقل خریداری میں شامل رہتی تھی اور ہمیشہ مہنگی سے مہنگی چیز پر ہاتھ رکھتی تھی۔ مفتاح کو رفعت کی بہن سے غرض نہیں تھی اور یہ اطمینان کافی تھا کہ رفعت خود معقول خاتون ہیں۔ اس کا یہ اطمینان اس وقت رخصت ہوا جب ایک دن وہ ابا کے بلاوے پر ان کے کمرے میں گیا اور ابا نے ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے لفافے کے اندر موجود تصویر نکالی اور اسے دیکھنے لگا۔ تصویر خاصی پرانی تھی اور اس کے رنگ بھی کافی حد تک خراب ہو چکے تھے لیکن تصویر میں نوجوان رفعت دلہن کے روپ میں نک سک سے تیار ٹو پیس سوٹ میں ملبوس مونچھوں والے ایک سانولے سلونے لڑکے کے ساتھ بانہوں میں بانہیں ڈال کر کھڑی صاف پہچانی جا رہی تھیں۔ مفتاح نے تصویر کو پلٹ کر اس کی پشت پر دیکھا تو وہاں لکھا تھا۔

''رفعت خاتون اپنی پہلی شادی کے موقع پر.....''

مفتاح کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ رفعت کی پہلی شادی اتنا مسئلہ نہیں تھی لیکن بات جھوٹ کی تھی۔ ان لوگوں پر رفعت کو غیر شادی شدہ ظاہر کیا گیا تھا اور یہاں وہ دلہن بنی کسی کے ساتھ کھڑی مسکرا رہی تھیں۔

''کیا کہتے ہیں آپ..... ان لوگوں سے بات کی جائے؟'' آخر بڑی ہمت کر کے اس نے ابا سے مشورہ لینے کی جسارت کی۔

''مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو؟ تم میرے بزرگ بنے بیٹھے ہو تو تم ہی کوئی فیصلہ کرو۔'' ابا کا انداز روٹھا ہوا تھا اور اس سے واقعی ایسے ناراض تھے جیسے اپنی شادی کا معاملہ بزرگوں پر چھوڑ دینے والا کوئی لڑکا، عین وقت پر غیر معقول بات سامنے آنے پر منہ پھلا لیتا ہے کہ تم لوگوں نے میرے سارے ارمانوں پر پانی پھیر دیا۔

''میں کچھ سوچتا ہوں۔'' مفتاح نے ان سے کہا اور سیدھا ارسلان کی طرف دوڑا۔ مشورہ درکار تھا اس لیے تصویر کے ساتھ ہی ٹیلی فونک گفتگو اور بعد میں آنے والے چند میسیجز کے بارے میں بھی اسے آگاہ کر دیا۔

''تو نے ان ساری باتوں کو نظر انداز کر کے ٹھیک نہیں کیا مفتاح۔ یہاں لوگوں کو انکل کی دوسری شادی پر ہی باتیں بنانے کے لیے ایک چٹخارے دار موضوع ملا ہوا ہے اور اب اگر کوئی ایسی ویسی بات سامنے آ گئی تو مزید ان کا مذاق اڑایا جائے گا۔'' ارسلان نے اسے سرزنش کی۔

''لوگوں کو تو رہنے دے یار! لوگوں کو شعور ہی نہیں ہے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔ اللہ کے بنائے ہوئے قوانین فطرت کو چھوڑ کر خود ساختہ رسم و رواج میں گھرے ہوئے ہیں اور نت نئے مسائل کو بھگت رہے ہیں۔ تو ہی بتا کہ ایک مرد جو کہ بیوی رکھنا افورڈ بھی کر سکتا ہے، اس کی دوسری شادی ہونے میں آخر ایسی کیا برائی ہے کہ اس کا مذاق اڑایا جائے؟ میں نے کتنے ایسے کیسز دیکھے ہیں کہ پہلی بیوی کے

مرنے کے بعد جوان اولاد کی موجودگی اور معاشرتی دباؤ کی وجہ سے مرد دوسری شادی نہیں کرسکا اور پھر فطری تقاضوں سے ہار کر اپنے ہی گھر کی بہو بیٹیوں پر نیت خراب کر بیٹھا۔ فطرت سے انحراف میں کبھی بھلائی نہیں ہوتی یار اِس لیے میں نے روشن خیالی اور کشادہ دلی کا ثبوت دیا اور خود سے ابا کی دوسری شادی کی بات چھیڑی۔ مجھے دنیا کی نہیں، اپنے ابا کی فکر ہے اور اب بھی میں صرف اسی لیے تجھ سے مشورہ کرنے آیا ہوں کہ ابا کو کوئی صدمہ نہ پہنچے۔ وہ ذہنی طور پر رفعت آنٹی کو شریک حیات کے طور پر قبول کرنے کے لیے تیار ہو چکے ہیں، ایسے میں صرف ایک ہفتہ پہلے اس رشتے کو ختم کردینا ان کے لیے نقصان دہ ہوگا۔ مجھے ڈر ہے کہ اس رشتے کو ختم کردینے کی صورت میں وہ پھر کبھی دوسری شادی پر راضی نہیں ہوں گے۔'' ارسلان کی سرزنش کا جواب مفتاح نے ایک تقریر کی صورت میں دیا۔

''اے کاش اللہ مجھے بھی تیرے جیسا بیٹا دے۔'' ارسلان نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔

''تجھے تو ایک عدد بیوی ہی مل جائے تو بہت ہے۔ تو میرے جیسے بیٹے اور دوسری شادی کے خواب کہاں دیکھ رہا ہے۔'' مفتاح نے بلاتکلف اسے ٹوکا تو وہ اسے گھورنے لگا اور دانت کچکچا کر بولا۔

''تیرے اس رویّے پر میں تجھے اپنے دوستوں کی فہرست سے خارج کردیتا لیکن اس وقت انکل کی وجہ سے مجبور ہوں۔ اس نازک وقت میں، میں انہیں تجھ جیسے نامعقول کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔ اس لیے فی الحال یہ دوستی جاری رہے گی۔'' ارسلان نے احسان جتانے والے انداز میں اعلان کیا اور اگلے ہی لمحے دونوں دوست سر جوڑ کر بیٹھے تھے کہ اس مسئلے کا کیا حل نکالا جائے۔

☆☆☆

''آیئے رفعت آنٹی! ہم دونوں مستقبل کے ماں بیٹا کہیں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں اور ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں۔ شاپنگ میں میری خالہ اور آپ کی بہن کو بڑی مہارت حاصل ہے، اس لیے آپ کی شمولیت کے بغیر بھی یہ خواتین اس کام کو بخوبی سرانجام دے ڈالیں گی۔'' وہ آج بطورِ خاص شاپنگ کے لیے خالہ کے ساتھ آیا تھا اور اب رفعت کو علیحدگی میں بات چیت کے لیے گھیرنے کا انتظام کر رہا تھا۔ رفعت نے اس کی دعوت پر انکار نہیں کیا۔ تھوڑا مسکراتی، تھوڑا شرماتی اس کے ساتھ چائے پینے کے لیے رک گئیں۔ مفتاح نے محسوس کیا تھا کہ پہلی ملاقات کے مقابلے میں ان کے اندر تبدیلی آئی ہے۔ اس روز کے مقابلے میں آج نیچرل میک اپ، ہلکی پھلکی جیولری اور ذرا کھلتے ہوئے رنگ کے جوڑے میں وہ زیادہ فریش اور اپنی عمر سے کم لگ رہی تھیں۔ آنکھوں میں بھی گہری سنجیدگی کی جگہ کچھ نئے رنگ نظر آرہے تھے جو اس بات کا اعلان تھے کہ وہ خوش ہیں۔

''آپ اس رشتے پر خوش ہیں نا؟'' ان کے روبرو بیٹھ کر مفتاح بے ساختہ ان سے یہ سوال پوچھ بیٹھا۔

''ناخوش ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے۔'' انہوں نے مسکرا کر اس کی بات کا جواب دیا پھر قدرے جھجکتے ہوئے بولیں۔

''میں خود تم سے یا تمہارے فادر سے بات کرنا چاہ رہی تھی لیکن رابطے کا ذریعہ سمجھ نہیں آیا۔ چھوٹے بہن بھائیوں سے فون نمبر مانگتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ اچھا ہوا آج تم نے خود ملاقات کا یہ موقع نکال لیا، ورنہ میرے دل پر بوجھ رہتا کہ شادی سے پہلے کچھ اہم باتیں کلیئر نہیں ہوسکیں۔''

''کیسی باتیں؟ میرے خیال میں تو آپ کے گھر والوں نے تقریباً سارے اہم معاملات اچھی طرح طے کرلیے تھے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز در آیا۔

''میں ان معاملات کے سلسلے میں ہی وضاحت کرنا چاہتی تھی۔ میرے بھائی بہن نے جتنی بھی اور جو بھی شرطیں عائد کیں، ان کے پیچھے میری محبت اور مفادات کے تحفظ کے سوا کوئی بات نہیں ہے۔ خاص طور پر میرے دل میں کوئی لالچ نہیں ہے، نہ ہی میں سمجھتی ہوں کہ معاشی تحفظ، رشتوں کی مضبوطی میں کوئی کردار ادا کرسکتا ہے اس لیے تم اور تمہارے فادر اس سلسلے میں بے فکر رہیں۔ جو کچھ میرے نام لکھوایا گیا ہے، وہ تم لوگوں کا ہی رہے گا..... بالکل ویسے ہی جیسے ایک باوفا بیوی اور محبت کرنے والی ماں کی کل متاع اپنے شریک حیات اور اولاد کے لیے ہوتی ہے۔'' ان کے الفاظ ہی نہیں لہجے کی سچائی نے بھی مفتاح کو متاثر کیا لیکن دل میں چبھی پھانس تو بہرحال نکالنا ہی تھی اس لیے جیب سے لفافہ نکال کر تصویر ان کے سامنے رکھ دی۔

''ارے..... یہ تصویر تمہارے پاس کہاں سے آئی؟'' وہ تصویر دیکھ کر چونک گئیں۔ مفتاح نے نوٹ کیا کہ ان کے چہرے پر صرف حیرت کے تاثرات تھے..... اس پر گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ کا نام ونشان نہیں تھا جو کسی جھوٹ بولنے والے کے چہرے پر اپنا جھوٹ پکڑے جانے کی صورت میں نظر آتی ہے۔

''یہ تصویر میری زندگی کی خوبصورت یادوں میں سے ایک ہے۔ میں جب جب اس تصویر کو دیکھتی ہوں، اپنی اور صائم کی محبت تازہ ہوتی محسوس کرتی ہوں۔'' اس کی طرف سے بے پروا وہ تصویر پر نظریں جمائے مسکراتی ہوئی بولتی جارہی تھیں۔

''اس روز میری جس سہیلی نے مجھے دلہن بنایا تھا، وہ دیر تک میری بلائیں لیتی رہی تھی اور یہ صائم..... یہ تو اتنی بدمعاش تھی کہ سب کے سامنے صاف بول گئی تھی کہ اگر میں لڑکا ہوتی تو آج سچ مچ تجھ سے نکاح پڑھا کر تجھے اپنے گھر لے جاتی۔ میری ہر کالج فیلو نے اس روز میری تعریف کی تھی اور کہتی رہی تھی کہ رفعت! جب تم سچ مچ دلہن بنو گی تو غضب ڈھاؤ گی لیکن قسمت نے جوانی میں دلہن بننے کا موقع ہی نہیں دیا اور میں ذمے داریوں کے بوجھ تلے دبی اپنے سارے ارمان بھلا بیٹھی۔'' ان کے لبوں پر مسکراہٹ لیکن لہجے میں ہلکا ہلکا درد تھا۔

''آپ کی یہ تصویر کس موقع کی ہے؟'' الجھے الجھے مفتاح کو معقول الفاظ میں سوال کرنے کا موقع مل ہی گیا۔

''کالج کے ایک فنکشن کی۔ میں اس وقت فرسٹ ایئر میں تھی جب سہیلیوں کے بے حد اصرار پر ایک ڈرامے کے لیے رول پلے کرنی کی ہامی بھری تھی۔ اس ڈرامے میں میرے مقابل ہیرو کا کردار میری سہیلی صائمہ جسے ہم اس کی مردانہ عادتوں اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے صائم کہتے تھے، نے ادا کیا تھا۔ تم دیکھو کیسی بالکل لڑکا لگ رہی ہے۔ صرف مونچھیں اور مردانہ لباس نے ہی اسے بالکل لڑکا بنا دیا تھا۔ اب سنا ہے شادی کر کے تین بچوں کی اماں جان بن چکی ہے۔ میں دل میں اسے بہت یاد کرتی ہوں لیکن زندگی میں مصروفیت اتنی رہی کہ دوستوں سے رابطہ رکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ وہ سب بھی اپنی اپنی زندگیوں میں گم ہو کر مجھے بھول بھال گئی ہوں گی۔'' وہ بڑی روانی سے کہتی جارہی تھیں اور مفتاح کو یقین تھا کہ سچ ہی کہہ رہی ہیں، جب ہی بڑی مشکل سے ان سے کہہ سکا۔

''رفعت آنٹی! پلیز اس تصویر کو پلٹ کر اس کی بیک پر لکھی تحریر پڑھ لیں۔'' رفعت نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''یہ کل ہی کسی نے ابا کو ڈاک سے بھیجی ہے۔ اس سے پہلے مجھے بھی مختلف طریقوں سے یہ پیغام دیا گیا کہ آپ سے ابا کی شادی نہ کروائی جائے۔ اب آپ ہی اس گتھی کو سلجھائیں کہ آپ کا ایسا کونسا دشمن ہے جو آپ کی شادی کو رکوانا چاہتا ہے؟'' مفتاح بول رہا تھا اور رفعت مسلسل نفی میں سر ہلا رہی تھیں۔ آخر سر تھام کر بولیں۔

''میری تو کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ مجھے تو زندگی میں دوستیاں نبھانے کی بھی فرصت نہیں ملی تو دشمن کہاں سے بناتی۔''

''آپ اپنے ذہن پر ذرا زور دیں۔ بعض اوقات ہمارے قریبی لوگ بھی ہماری خوشیوں کے دشمن بن جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ سگے بھائی بہنوں کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا۔'' مفتاح کو اب اس شخص تک پہنچنے کی بے چینی تھی جو یہ سب کر رہا تھا اس لیے رفعت پر زور دیا۔

''تم غلط سوچ رہے ہو۔ بھائی بہنوں پر تو شک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور رہیں بھاوجیں..... تو وہ مزاج کی ذرا تیز ضرور ہیں لیکن سازشی طبیعت کی مالک نہیں۔ مجھے مر کر اپنے رب کو منہ دکھانا ہے اس لیے کسی پر ایسا بہتان کیوں باندھوں۔'' وہ قطعی ایسی کوئی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

''ٹھیک ہے تو پھر میں ہی کھوج لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ سے صرف اتنی درخواست ہے کہ اس بات کا کسی سے ذکر مت کیجیے گا تاکہ دشمن ہوشیار نہ ہوجائے۔''

''ٹھیک ہے، جیسا تم کہو لیکن میرے دل میں تو ہول اٹھنے لگے ہیں۔ ان سازشوں کی وجہ سے اگر شادی رک گئی تو میری بڑی جگ ہنسائی ہوگی۔ پہلے ہی لوگ مجھے بڈھی گھوڑی لال لگام کا خطاب دے رہے ہیں۔'' وہ خاصی سہم گئی تھیں۔

''لوگوں کی پروا نہ کریں۔ لوگوں کا تو کام ہی باتیں بنانا ہوتا ہے۔'' مفتاح نے انہیں تسلی دی۔

''لوگوں کی پروا کیسے نہ کریں۔ یہ لوگ ہی تو ہوتے ہیں جو ہم سے زیادہ ہماری زندگیوں کو جی رہے ہوتے ہیں۔'' ان کے چہرے کی تازگی ماند پڑ چکی تھی اور وہ اداس نظر آنے لگی تھیں۔

''مجھے اپنا بیٹا مان لیں پھر دیکھیے گا میں کیسے آپ کو آپ کی زندگی جینا سکھاتا ہوں۔''

''جسے اتنا پیارا اور قابل پلا پلایا بیٹا مل رہا ہو، وہ کیسے انکار کرسکتا ہے۔'' وہ مفتاح کی بات پر مسکرا کر بولیں تو گویا چاند بدلی سے باہر آگیا۔

''ابا ہیں خوش قسمت۔ دوسری بار میں بھی زبردست بیوی مل رہی ہے۔'' سنجیدہ مواقع پر بھی جو اس انداز میں سوچ سکتا ہو، وہ مفتاح کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا۔

☆☆☆

''تیری دوستی نبھانے کے لیے میں نے جتنی بار کورنگی ٹو اورنگی سفر کیا ہے، وہ بھی تیری اس کھٹارا بائک پر سوچتا ہوں اس کے بجائے سائیکل پر بیٹھ کر دنیا کا چکر لگانے نکل کھڑا ہوتا تو کم از کم گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں نام تو آجاتا۔'' آج ایک بار پھر ارسلان اس کے پیچھے موٹر سائیکل پر سوار تھا اور اس کا دہائیاں دینے کا سلسلہ جاری ہو چکا تھا۔

''ابا کی شادی سے نمٹ کر یہ کام بھی کر ڈالنا لیکن مجھ سے لکھوالے کہ تجھ جیسا کاہل، کاہلی کے ریکارڈ توڑنے کے علاوہ دنیا کا کوئی دوسرا ریکارڈ نہیں توڑ سکتا۔''

''میں..... میں کاہل ہوں۔ میں جو چھٹی کے دن خواب خرگوش کے مزے لینے کے بجائے صبح صبح تیرے ساتھ دنیا کے اس مشکل ترین سفر پر نکل کھڑا ہوا ہوں..... میں کاہل ہوں؟'' ارسلان کو اس کی بات سے شدید صدمہ پہنچا۔

''تو اور کیا ..... اور پھر ساری ساری رات فلمیں دیکھتا رہتا ہے۔''

''بس، میں نے فیصلہ سنا دیا ہے کہ آج میں آخری بار تیرے ساتھ اورنگی جا رہا ہوں۔ آئندہ اگر تو نے یہ سفر کرنا ہو تو کسی زاہد و پارسا دوست کا انتظام کر لینا۔'' اس بار ارسلان نے سچ مچ ناراض ہونے کا اعلان کر ڈالا۔

''اوہو، اس کا مطلب ہے کہ تو ابا کی برات میں شرکت نہیں کرے گا۔ میں تو گواہان میں تیرا نام ڈلوانے کا سوچ رہا تھا۔''

''میں نے تیرے ساتھ اورنگی جانے سے انکار کیا ہے، برات کے ساتھ نہیں۔ برات میں تو میں ضرور جاؤں گا ورنہ میرے بغیر انکل اداس ہو جائیں گے۔'' ارسلان نے ترنت جواب دیا اور یوں حسب معمول ان کی نوک جھوک میں راستہ کٹ ہی گیا۔ مطلوبہ جگہ پہنچ کر انہوں نے علاقے میں گھومنا شروع کر دیا اور اپنے مطلوبہ چہرے کو تلاش کرنے لگے۔ یہ چہرہ کسی حسینہ ماہ جبینہ کا نہیں بلکہ ایک عدد فقیر کا تھا۔ آخر کار ظہر کی نماز کے وقت وہ انہیں مسجد کے باہر بیٹھا صدا لگاتا نظر آ گیا۔

''پیارے، لنگڑے فقیر کو، کوئی صدقہ خیرات دیتے جاؤ بابا۔ اللہ تمہاری نمازیں قبول کرے گا۔''

''پہلے تو تم اندھے فقیر تھے، آج لنگڑے کیسے بن گئے؟'' ارسلان نے اس کے قریب جا کر حیرت سے پوچھا۔

''اندھا سمجھ کر لوگ مجھے کھوٹے سکے اور پھٹے ہوئے نوٹ دے جاتے تھے اس لیے اب میں لنگڑا بن گیا ہوں۔ لوگوں کی بے ایمانی سے نمٹنے کا یہی راستہ تھا میرے پاس۔''

''واقعی دنیا بڑی بے ایمان ہو گئی ہے۔ فقیروں کو بھی دھوکا دے دیتی ہے۔'' ارسلان نے زور و شور سے اس کی تائید کی۔ مفتاح دور کھڑا جائزہ لیتا رہا۔

''تم بولو کہ تمہیں اپن سے کیا کام ہے؟ ایویں تو تم یہاں کھڑے میرے دھندے کا ٹیم (ٹائم) خراب نہیں کر رہے ہو گے۔'' فقیر اس کی ہمدردی سے زیادہ متاثر نہیں ہوا اور کھوجتی ہوئی نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

''زیادہ بڑا کام نہیں ہے بابا۔ بس یہیں قریب میں ایک لڑکی رہتی ہے۔ میرے گھر والے آج اس کے لیے میرا رشتہ لے کر آنے والے ہیں۔ تم اس کے گھر کے باہر دھرنا دے کر بیٹھ جانا اور جیسے ہی میرے گھر والے رخصت ہوں، لڑکی کے گھر جا کر بشارت دے دینا کہ ان کی لڑکی کا نصیب کھل گیا ہے، ہاں کرنے میں ذرا دیر نہ لگائیں۔''

''میں کیوں کروں تمہارا یہ کام ..... مجھے بھلا اس جھوٹ کا کیا فائدہ ہوگا؟'' فقیر نے مکاری سے پوچھا۔

''فائدہ یہ ہوگا۔'' ارسلان نے پرس کھول کر اسے لال ہرے نوٹوں کی جھلک دکھائی۔

''ٹھیک ہے تو پھر اپنے کو اس لڑکی کا گھر دکھا دو اور سمجھو تمہارا بیڑا پار ہو گیا۔ اس فیلڈ میں تمہیں اپنے سے زیادہ تجربہ کار بندہ کوئی نہیں ملے گا۔'' نوٹ دیکھ کر فقیر ترنگ میں آ گیا اور اپنے لنگڑے پن کو بھول کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

''میرے پاس بائک ہے، اس پر چلتے ہیں۔''

ارسلان نے اس طرف اشارہ کیا جہاں مفتاح موٹر سائیکل سمیت کھڑا تھا۔ آج اس نے خاص طور پر ہیلمٹ لگا رکھا تھا تاکہ فقیر کی یادداشت میں اگر اس کا چہرہ موجود ہو تو اسے پہچان نہ سکے۔ فقیر کو فرار کا موقع نہ دینے کے لیے دونوں نے اسے اپنے درمیان میں بٹھایا۔

''اتنے نوٹ کما کر کیا کرو گے؟ فقیروں کو تو سنا ہے دنیا کے مال سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔'' مفتاح بالکل خاموشی سے موٹر سائیکل چلا رہا تھا اور ارسلان نے فقیر کو باتوں میں لگائے رکھنے کا فریضہ سنبھال رکھا تھا۔

''وہ پرانے زمانے کے فقیروں کا ذکر ہوگا، اپنے زمانے میں ایسے دھندا نہیں چلتا۔ ٹھیے پر بیٹھنے کے لیے بھی پولیس کو بھتا دینا پڑتا ہے۔'' اس نے صاف گوئی سے جواب دیا اور پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم نے تو کہا تھا کہ لڑکی کا گھر پاس میں ہی ہے اور اتنی دور لے آئے ہو مجھے۔''

''سچی باتیں بھی پرانے زمانوں میں کی جاتی تھیں بھائی فقیر۔ اب تو ہر طرف جھوٹ ہی کا بول بالا ہے۔ ضرورت پڑنے پر سچ اگلوانا پڑتا ہے۔ جیسا کہ ہم تم سے اگلوائیں گے۔'' ارسلان نے دیکھ لیا تھا کہ اب وہ محفوظ جگہ پر پہنچ چکے ہیں اس لیے فلسفیانہ لہجے میں سچ بولنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔

''کیا مطلب؟'' فقیر بوکھلایا اور مدد کے لیے ادھر ادھر دیکھا لیکن اس ویرانے میں دور تک پھیلی پہاڑیوں اور ان پر بہت دور دور نظر آتے اِکا دُکا گھروں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''مطلب یہ کہ تمہیں ایک عدد سچ بولنا ہے اور وہ بھی بلا معاوضہ۔ معاوضے کی خواہش کرو گے تو ہرے نیلے نوٹوں کے بجائے اپنا بوتھا ہرا نیلا کروا بیٹھو گے۔'' مفتاح نے بائک روک دی اور ہیلمٹ اتارتے ہوئے خوفناک لہجے میں غرا کر بولا۔ ردِعمل میں فقیر کی آنکھیں پھیل گئیں لیکن تھوڑی سی تگ و دو کے بعد وہ ان کے سامنے سچ اگل چکا تھا۔

☆☆☆

''جی فرمایئے۔ آپ نے مجھے کس ضروری بات کے لیے بلوایا تھا؟'' چائے کے ہوٹل میں مفتاح کے مقابل بیٹھا ہوا سلیم قدرے متفکر سا اس سے پوچھ رہا تھا۔

''شادی کے سلسلے میں ہی کچھ اہم معاملات طے کرنے تھے۔'' مفتاح نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''کیسے معاملات؟ سارے معاملات تو بھائی جان اور باجی سے طے ہو چکے تھے۔'' وہ چونکا۔

''سارے نہیں آدھے۔ اب تک جو معاملات طے ہوئے ہیں ان میں صرف آپ کی طرف سے عائد کردہ شرائط شامل ہیں، آخر ہم یعنی لڑکے والوں کی بھی تو کچھ شرائط ہوں گی یا نہیں۔''

''کیسی شرائط؟'' بااخلاق سلیم کا لہجہ بگڑا۔

''زیادہ شرائط نہیں ہیں۔ بس ایک ہی شرط ہے کہ آپ لوگ سلامی میں ابا کو کار دیں گے۔''

''کار..... دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تم لوگوں کا؟'' سلیم اس کی شرط سن کر بدکا۔

''اس میں دماغ خراب ہونے کی کیا بات ہے۔ آپ لوگوں نے جتنی شرائط رکھیں، اس میں اپنی بہن کا مفاد دیکھا۔ ہماری شرط میں آپ کی بہن اور ابا دونوں کا فائدہ ہے۔ اب آپ ہی سوچیں کہ شادی کے بعد آپ کی بہن کا میکے آنا جانا تو لگا رہے گا۔ کیا وہ کورنگی ٹو اورنگی کا یہ طویل سفر بس میں طے کیا کریں گی؟ موٹر سائیکل تو میرے ابا چلاتے ہی نہیں ہیں اور رکشا ٹیکسی والوں کے نخرے بہت ہیں اس لیے میں نے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ سلامی میں ابا کے لیے کار مانگ لی جائے۔ آخر آپ تین تین بھائی ہیں۔ بہنیں بھی اچھے گھروں میں بیاہی ہوئی ہیں تو کیا آپ سب مل کر اپنی پیاری بہن کو ایک کار نہیں دے سکتے؟''

''اپنی بہن کے لیے ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں لیکن منہ سے مانگنے والے لالچی لوگوں میں ان کا رشتہ کر کے ان کی زندگی برباد نہیں کر سکتے۔'' سلیم اس کی بات سن کر لال پیلا ہونے لگا۔

''بری بات ہے، جب آپ لوگوں نے شرطیں عائد کی تھیں تو ہم نے تو آپ کو لالچی نہیں کہا تھا۔'' مفتاح نے سکون سے اسے ٹوکا۔

''تو کہہ دیتے نا بلکہ رشتے سے انکار کر دیتے۔ خیر اب بھی دیر نہیں ہوئی۔ اب میں اس رشتے سے انکار کر دیتا ہوں۔'' سلیم کا غصہ مزید بڑھ گیا۔

''یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں مسٹر سلیم کہ آپ کو یہ رشتہ ختم کروانے میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟ ایک طرف آپ میرج بیورو کے ذریعے اپنی بہن کی شادی کروانے کے لیے تگ و دو کرتے ہیں تو دوسری طرف ان کا رشتہ ختم کروانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں..... آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟'' مفتاح کے سوال پر سلیم بری طرح گڑبڑا گیا لیکن خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے بگڑ کر بولا۔

''یہ آپ کس قسم کی بے ہودہ گفتگو کر رہے ہیں؟''

''آپ یہ ویڈیو دیکھیں تو شاید آپ کو میری گفتگو سمجھ آ جائے۔'' مفتاح نے اپنا موبائل اس کے سامنے کر دیا جس پر فقیر کے بیان پر مشتمل ویڈیو چل رہی تھی۔ اس بیان سے واضح ہو رہا تھا کہ سلیم نے ہی اپنے گھر کے باہر فقیر کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ ان کے دلوں میں رشتے سے متعلق شکوک و شبہات پیدا کر دے۔

''بات صرف یہیں تک نہیں سلیم صاحب! آپ نے فون کالز اور میسیجز کے ذریعے بھی اس رشتے کو رد کرنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ مجھ پر کسی بات کا اثر نہیں ہو رہا تو اپنی بہن کے کالج کے فنکشن کی تصویر ایک عدد جھوٹ کے ساتھ ابا کو روانہ کر دی۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ اپنی ہی بہن کے ساتھ یہ دشمنی کیوں کر رہے ہیں؟'' مفتاح نے کڑے تیوروں کے ساتھ اسے آڑھے ہاتھوں لیا۔ اس کے سوالات پر پہلے تو سلیم گم صم بیٹھا رہا پھر کسی بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ رونے کا سیشن ختم ہوا تو وہ سچ بولنے پر آمادہ ہوا۔ اس نے

جو کچھ بتایا، اس کا لب لباب یہ تھا۔

ماں باپ کی اچانک موت نے سب سے چھوٹے سلیم کو عدم تحفظ کا شکار کر دیا تھا اور وہ آپا کی صورت میں ہی ماں باپ کو کھوجتا رہتا تھا۔ آپا بھی اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود اسے سب سے زیادہ وقت اور توجہ دیتی تھیں۔ وہ آپا کی محبت میں اس حد تک پوزیسو تھا کہ دوسرے بہن بھائیوں کو بھی ان کے نزدیک نہیں آنے دیتا تھا۔ بہن بھائی بھی اس کو چھوٹا جان کر نظر انداز کر دیتے تھے لیکن انہیں اندازہ نہیں تھا کہ سلیم کی یہ انتہا پسندی ایک ناسور کی طرح اس کے وجود میں جڑ پکڑ چکی ہے۔ وقت گزرا، سب جوان ہو گئے اور شادیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو آپا کو بڑے بھائیوں نے ملازمت ترک کر کے گھر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ سارا دن مصروف رہنے والی آپا کو فراغت ملی تو دل بہلانے کے لیے ننھے منے بھتیجا بھتیجی کے ساتھ وقت گزارنے لگیں۔ ان کے ساتھ کھیلنا، ان کی چھوٹی چھوٹی فرمائشیں پوری کرنا اور ان کی معصوم شرارتوں سے لطف اندوز ہونا انہیں بہت اچھا لگتا تھا لیکن سلیم کو خود پر سے آپا کی توجہ ہٹنا اچھا نہیں لگا اور اس نے آپا کو سب سے دور کرنے کے لیے سازشوں کے تانے بانے بننا شروع کر دیے۔ بھابیوں کے دل میں آپا کے لیے اور آپا کے دل میں بھابیوں کے لیے منفی جذبات ابھارے اور اس صورتِ حال کے حل کے لیے خود ہی علیحدہ گھر لے کر رہنے کی تجویز پیش کر دی۔ یوں وہ لوگ اورنگی کے ایک چھوٹے سے گھر میں منتقل ہو گئے۔ یہاں آپا کی روزینہ آنٹی سے دوستی ہو گئی اور انہوں نے آپا سمیت سلیم پر زور ڈالنا شروع کر دیا کہ اب بھی رفعت کا گھر بسانے کی تدبیر کی جا سکتی ہے۔ سلیم پر اس سلسلے میں انہوں نے خاص طور پر بہت دباؤ ڈالا۔ یوں طوعاً و کرہاً وہ آپا کے لیے رشتے دیکھنے کے لیے تیار ہو گیا لیکن علاقے میں گھومنے والے ایک فقیر سے ساز باز کر کے یہ انتظام کر لیا کہ رشتے کے لیے آنے والوں کے دل میں ایسا وہم ڈال دیا جائے کہ وہ لوگ خود ہی انکار کر دیں۔ دو بار اس کی یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی لیکن تیسری بار مفتاح جیسے ڈھیٹ سے واسطہ پڑ گیا جو نہ تو فقیر کی باتوں میں آیا اور نہ ہی اس کی گمنام فون کالز اور میسجز سے بدکا۔ بڑے بھائی کلیم کو آپا کے تحفظ کے نام پر وہ شرائط پیش کرنے کے لیے بھی اسی نے آمادہ کیا تھا تاکہ انہیں لالچی جان کر مفتاح اور ابا خود ہی انکار کر دیں لیکن دونوں نے کلیم کی بات کو مثبت رخ سے سمجھا اور رشتہ طے ہو ہی گیا۔ رشتہ طے ہو چکنے کے بعد اس نے کاری اور فیصلہ کن ضرب لگانے کے لیے ابا کو آپا کے خزانے میں سے نکال کر وہ تصویر ارسال کر دی۔ اسے یقین تھا کہ اس کے بعد تو رشتہ ٹوٹا ہی ٹوٹا لیکن یہاں رشتہ نہیں ٹوٹا تھا، اس کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا۔

''میرا آپ کو مشورہ ہے سلیم صاحب کہ آپ کسی ماہرِ نفسیات سے اپنا علاج کروائیں اور آپا کا پلو چھوڑ کر اپنے لیے ایک عدد دلہن لے آئیں۔ جب آپ کی اپنی فیملی ہو گی تو خود ہی آپ کا دھیان اپنی آپا کی طرف سے ہٹ جائے گا اور آپ اپنی اس خود غرضی پر شرمندگی محسوس کریں گے کہ اپنی خاطر آپ نے پہلے ہی بہت زیادہ قربانیاں دینے والی اپنی آپا کو زندگی کی خوشیوں سے محروم رکھنے کی کوشش کی تھی۔'' مفتاح نے ساری بات سن کر بغیر لحاظ کے اسے کھری کھری سنائیں۔

''شرمندہ تو میں اب بھی ہوں لیکن میرے دل کو یہ اطمینان ہے کہ میری آپا کا ناتا ایسے لوگوں سے جڑنے جا رہا ہے جو سمجھدار ہی نہیں، اعلیٰ ظرف بھی ہیں۔ کیا میں امید رکھوں کہ آپ اپنی اس اعلیٰ ظرفی کو برقرار رکھتے ہوئے آپا کو کبھی ان باتوں کا علم نہیں ہونے دیں گے؟'' سلیم نے اس سے سوال کیا تو وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا اور تحمل سے بولا۔

''میں رشتوں کے اعتماد اور احترام پر یقین رکھنے والا شخص ہوں سلیم صاحب اور ہرگز نہیں چاہوں گا کہ آپ کی آپا ہمارے گھر آنے سے پہلے رشتوں پر سے اپنا اعتبار کھو کر آئیں اس لیے قصوروار ہوتے ہوئے بھی آپ کے لیے معافی کا وعدہ کرتا ہوں۔''

''بہت بہت شکریہ مفتاح! تم نے عمر میں چھوٹے ہو کر مجھے جو سبق دیا ہے، اسے میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ تم اتنے اعلیٰ ظرف ہو کہ اپنے ابا کی خوشیوں کے لیے اپنے گھر میں اپنی ماں کی جگہ دوسری عورت کو دینے کے لیے تیار ہو اور میں اپنی ہی ماں جیسی بہن کی خوشیوں کی راہ میں روڑے اٹکا رہا تھا۔'' سلیم کی آنکھیں ایک بار پھر بھیگ گئیں۔

''جو ہوا اسے بھول جائیں سلیم صاحب اور کوشش کیجیے کہ آئندہ لایعنی توہمات و خدشات میں گھرنے کے بجائے رشتوں کو پورے احترام و اعتماد کے ساتھ نبھا سکیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے ابا کو آپ بہت اچھا بہنوئی پائیں گے۔'' مفتاح نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے اسے یقین دہانی کروائی تو وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا اس سے اجازت لے کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔



تماشا

منظر امام

یہ حقیقت ہے کہ ظاہری آنکھ تو محض تماشوں میں مصروف و مسرور ہوتی ہے مگر باطنی آنکھ نہ تماشوں کی متلاشی ہوتی ہے نہ ہی کسی سرور کی منتظر، وہ تو کیا... اور کیوں ہو رہا ہے کے مابین کڑوی کسیلی حقیقتوں کی کھوج میں رہتی ہے۔ وہ بھی جتنا ان باتوں کی گہرائی میں اترتا جا رہا تھا اتنا ہی اس کی بے چین روح کو سکون ملتا جا رہا تھا۔

بصارت اور بصیرت کے مابین دلچسپ معرکہ آرائی

وہ صرف تین مہینے کا تھا جب اسے ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا تھا۔

ڈاکٹر بہت دیر تک چیک کرتا رہا پھر اس نے اعلان کر دیا۔

''سوری..... روشنی کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ بچہ نابینا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایسی خرابی ہے جس کا علاج ابھی تک ممکن نہیں ہو سکا ہے۔ اگر کوئی معجزہ ہی ہو جائے تو بات دوسری ہے۔''

اس کے گھر والے آخری امید کے طور پر اسے ڈاکٹر چھاگلہ کے پاس لے کر آئے تھے جو اس ملک کا بہت بڑا آنکھوں کا ڈاکٹر تھا۔ ویسے انہیں اس کی پیدائش کے وقت ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں نور نہیں ہے۔

اس بچے کا نام نورر کھا گیا تھا۔ بے نور آنکھوں والا نور۔

حمید اور مقصودہ کے تین بچے اور بھی تھے لیکن وہ تینوں نارمل تھے۔ روشن آنکھوں والے..... جو دنیا کو دیکھ سکتے تھے لیکن یہ جو بچہ پیدا ہوا اس کے لیے دنیا ایک تاریک وادی کے علاوہ کچھ نہیں تھی۔

مقصودہ کو اس سے بہت محبت تھی۔ جب کوئی اس کے پاس آ کر افسوس کا اظہار کرتا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ ''خدا کے لیے تم لوگ ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب وہ دنیا کو دیکھنے کے قابل ہو جائے گا۔''

انہوں نے ڈاکٹر چھاگلہ کی بہت تعریف سن رکھی تھی۔ بہت امیدیں لے کر اس کے پاس آئے تھے لیکن اس نے بھی جواب دے دیا تھا۔ اس کے بعد کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

دونوں میاں بیوی سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ اب کیا ہو۔ کیا کرنا ہے؟ ان کے تینوں بچوں کو اسکول میں داخل کروا دیا گیا تھا۔ نور اگرچہ ابھی بہت چھوٹا تھا لیکن اس کی فکر تو کرنی تھی۔ کیا بنے گا اس کا؟

خیر اس مرحلے میں ابھی بہت دیر تھی۔ ابھی تو اسے بڑا ہونا تھا۔ اس کے بعد ہی سوچنا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ مقصودہ کے لیے اس کی پرورش آسان نہیں تھی۔ تینوں نارمل بچوں کو اس نے اپنے سینے سے لگا کر پالا تھا۔ لیکن اس بے نور کے لیے اس کے پاس سوائے دعاؤں کے اور کچھ نہیں تھا۔

یہی حال حمید کا تھا۔ وہ نور کا باپ تھا۔ اس کا نام اس کے دادا نے اس وقت رکھا تھا، جب نور کی پیدائش میں چار پانچ مہینے تھے۔ اس نے حمید سے کہا تھا۔ ”دیکھو بیٹا! میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ میں بہت بیمار رہنے لگا ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ میں آنے والے کو دیکھ نہ سکوں لیکن اس کا نام نور رکھنا..... نور حمید۔“

تو اس طرح نور کی پیدائش سے پہلے ہی اس کا نام رکھ دیا گیا تھا۔

کچھ لوگوں نے مذاق بھی اڑایا تھا۔ ”کمال کر دیا تم لوگوں نے..... وہ بے چارہ دیکھ تو سکتا نہیں اور تم لوگوں نے اس کا نام نور رکھ دیا ہے۔“

اس وقت حمید کہا کرتا۔ ”دیکھو، ایک تو یہ نام میرے ابا نے اپنی موت سے پہلے رکھا تھا اور دوسری بات یہ ہے کہ مجھے نہ جانے کیوں یقین ہے کہ میرا بچہ نور ثابت ہوگا۔“

اس کی پرورش کے مراحل بہت سخت تھے۔

جب وہ کچھ بڑا ہوا تو اس کو دنیا کا کچھ پتا نہیں تھا۔ دونوں میاں بیوی اس کی حالت دیکھ کر خون کے آنسو رویا کرتے تھے۔

جب وہ اس قابل ہوا کہ اسے کچھ پڑھایا جائے تو سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا کہ کہاں پڑھایا جائے۔ حمید کو بتایا گیا کہ ایسے بچوں کو بریل سسٹم کی مدد سے پڑھایا جاتا ہے۔ حمید دو تین اسکولوں میں گیا بھی لیکن ان اسکولوں کی فیسیں اتنی تھیں کہ اس کی برداشت سے باہر تھیں۔

”ارے بھائی کیا ضرورت ہے اس بے چارے پر اتنی رقم خرچ کرنے کی۔ اتنے پیسے اپنے دوسرے بچوں پر خرچ کرو تو کام بھی آئے گا۔“

”تو پھر نور کا کیا کروں؟ کیا کہیں پھینک دوں اس کو؟“

”نہیں بھائی۔ آسان طریقہ یہ ہے کہ اسے کسی مدرسے میں ڈال دو۔ قرآن حفظ کر کے کچھ نہ کچھ کرہی لے گا۔“

دونوں میاں بیوی پھر سوچ میں پڑ گئے کیا کرنا تھا اور کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا۔ پھر یہی طے ہوا کہ اسے کسی مدرسے ہی میں ڈال دیا جائے۔

حمید قاری اظہر کے پاس پہنچ گیا۔

قاری صاحب نے اس کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔ ”کوئی بات نہیں۔ تم اپنے بچے کو ہمارے پاس بھیج دو۔ خدا نے چاہا تو ہم اس کی تعلیم و تربیت میں کوئی کمی نہیں رکھیں گے۔“

نور کو اس مدرسے میں داخل کروا دیا گیا۔

اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اسے کہاں بھیجا جا رہا ہے اور اسکول اور مدرسے میں فرق کیا ہوتا ہے۔ اس وقت اس کی عمر چار سال کی تھی۔ ایک بات یہ دیکھی گئی تھی کہ اس کا حافظہ بلا کا تھا۔ مقصودہ اور حمید نے اسے کئی سورتیں یاد کرا دی تھیں جنہیں وہ بڑی روانی سے سنا دیا کرتا تھا۔ اسے جو کچھ بھی یاد کرایا جاتا، وہ اسے یاد ہو جاتا تھا۔

ایک دن قاری صاحب ان کے گھر آ گئے۔ انہوں نے حمید سے کہا۔ ”آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کے گھر نور جیسے بچے نے جنم لیا ہے۔ میں نے اس میں وہ خوبی دیکھ لی ہے جو ہمارے اسلاف کے عالموں میں ہوا کرتی تھی۔“

”کیا واقعی؟“ حمید نے حیرت ظاہر کی۔

”جی ہاں۔ آپ ذرا اس سے دعائیں سن لیں۔ اس کا حافظہ بے مثال ہے۔ بس ایک بار جو یاد کر لے وہ اس کے ذہن پر نقش ہو جاتا ہے۔“

”جی ہاں۔ یہ خوبی تو ہم بھی دیکھ چکے ہیں۔“ حمید نے کہا۔

یہ پہلا موقع تھا جب حمید نے نور پر فخر محسوس کیا تھا۔ تشکر کے احساس سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس نے جب مقصودہ کو بتایا تو وہ بھی خدا کا شکر ادا کرنے لگی۔

حمید کو اپنے دونوں بیٹوں کی طرف سے مایوسی ہونے لگی تھی۔ اسکول میں ان کی رپورٹ اچھی نہیں تھی۔ وہ بہت کند ذہن تھے۔ ان کا مستقبل مخدوش ہونے لگا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ نور نے قرآن حفظ کر لیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر نو سال تھی۔

حمید اور مقصودہ نے اس موقع پر ایک دعوت بھی کر دی تھی۔ اس وقت نور کے بڑے بھائی نے کہا۔ وہ اس قسم کے اہتمام پر بہت ناراض ہو رہا تھا۔ ”ابا کیا ضرورت تھی اس قسم کی دعوت کرنے کی۔ نور کو کرنا ہی کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ کسی مسجد میں جا کر بیٹھ جائے گا اور کیا ہوگا؟“

حمید اور مقصودہ ایسی باتیں سن کر خاموش رہ جاتے۔ نور

کے بھائی نور سے کہا کرتے تھے۔ ”یار! تمہیں کیا معلوم کہ دنیا میں کیا کیا ہے۔ کتنی رنگینی ہے۔ کتنی خوبصورتی ہے۔ تم کو تو یہ بھی نہیں معلوم ہوگا کہ رنگ کیا ہوتے ہیں۔ اچھا چلو۔ یہ بتا دو کہ پرندے کیا ہوتے ہیں؟“

”پرندے میری روح میں پرواز کرتے ہیں بھائی۔“ نور کہا کرتا۔

”ایسے کون سے پرندے ہیں جو تمہاری روح میں پرواز کرتے ہیں؟“

”یہ تم نہیں سمجھو گے اور میں تمہیں دکھا نہیں سکتا۔“

دونوں بھائی حمید سے کہتے۔ ”ابا! یہ نور کیا کہتا رہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پرندے اس کی روح میں پرواز کرتے ہیں۔ اور دنیا کے سارے رنگ اس کے اندر ہیں۔“

”بیٹا! اس کی سمجھ میں جو بھی آ جائے، وہ بولتا رہتا ہے۔“ حمید جواب دیتا۔ ”تم لوگ اس کا دل مت توڑا کرو۔ اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہا کرو۔“

حمید ہی نہیں، خود قاری صاحب کا بھی نور کے بارے میں یہی خیال تھا، سوائے رشید کے۔ جو حمید کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ حمید اور اس کی بیوی اس بچے کی محبت میں پاگل ہو رہے ہیں۔ اسے ایک سپر نیچرل چیز سمجھ لیا گیا ہے۔

حمید جب نور کے غیر معمولی حافظے کے بارے میں بتاتا تو وہ یہی کہتا۔ ”بھائی صاحب! یہ بھی ایسی کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ قدرت جب کسی سے کوئی حس لے لیتی ہے تو اس کے بجائے اور بھی کچھ عطا کر دیتی ہے۔ اب اسی سے اندازہ کر لیں کہ نابینا لوگوں کے ہاتھوں میں آ کر رنگ بولنے لگتے ہیں۔ وہ رنگ بتا دیتے ہیں کہ یہ سرخ ہے یا نیلا۔ بس اس بات کو اس حد تک ہی رہنے دو۔ ورنہ اس کی ساکھ پیر فقیر جیسی ہو جائے گی۔ کم عقیدہ لوگ اس کو نہ جانے کیا سمجھنے لگیں گے۔“

حمید خاموش ہو جاتا۔

ایک بار اسے یہ مشورہ دیا گیا کہ تم جس بچے پر اتنا خرچ کرتے ہو، اس سے دوسرے صحت مند بچوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔

”تو پھر کیا کروں؟“

”سیدھی سی بات ہے۔ اسے کسی مدرسے میں لگا دو۔ وہاں بیٹھ کر بچوں کو قرآن پڑھا دیا کرے گا۔ زندگی کسی نہ کسی طرح گزر جائے گی۔“

”یہ تو میں کوشش کر ہی رہا ہوں۔“

”تو بس یہی لائن اس کے لیے بہتر ہے۔“

نور کے کانوں میں بھی یہ باتیں پڑتی رہتی تھیں۔

ایک دن اس نے حمید سے کہا۔ ”بابا! لوگ لائن کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ اندر کی آنکھیں کھل جانے کے سلسلے کو لائن تو نہیں کہتے۔ یہ تو خدا کی طرف سے ایک بصارت ہوتی ہے۔“

”لوگوں کو بولنے دو بیٹا۔“ حمید کہتا۔

نور جب مدرسے میں وہاں کے معلم کے ہمراہ بچوں کو قرآن پاک پڑھانے لگا تو سب نے یہی کہا کہ آخر نور کو یہی سب کرنا تھا۔ اس کی زندگی اسی میں ہے۔ قدرت نے اس کے لیے ایک راستہ مقرر کر دیا ہے۔ اس کو اب زندگی بھر اسی راستے پر چلنا ہوگا۔

لوگوں کا جو بھی کہنا ہو، حمید اور اس کی بیوی اور خود نور بھی بہت خوش تھا۔ حمید نے اس دن بہت سے لوگوں کی دعوت بھی کی تھی۔ جس دن نور کو سند ملی تھی۔ وہ اپنی سند کو ہاتھ میں لیے اس کے حروف پر اپنی انگلیاں پھیر رہا تھا کہ اس کا چاچا رشید اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ ”نور! تمہیں کیا نظر آئے گا۔ تمہارے لیے تو یہ ایک کاغذ کا ٹکڑا ہے۔“

”نہیں چاچا! مجھے بہت کچھ نظر آ رہا ہے۔ میرے اندر کی آنکھیں بہت دور تک دیکھ سکتی ہیں۔“

”اچھا..... اور کیا دیکھ رہی ہیں تمہارے اندر کی آنکھیں!“ رشید نے مذاق اڑانے والے لہجے میں پوچھا۔

اس وقت اچانک نور کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ”چاچا! اس وقت میری آنکھیں منیر کو دیکھ رہی ہیں، وہ یونیورسٹی سے آتے ہوئے بائیک سے سلپ ہو کر زخمی ہو گیا ہے۔“

رشید ہنس دیا۔ اس نے حمید کو آواز دی۔ ”حمید بھائی! تمہارا بیٹا تو دلی ہو گیا ہے۔“

نور ایک طرف جا چکا تھا۔

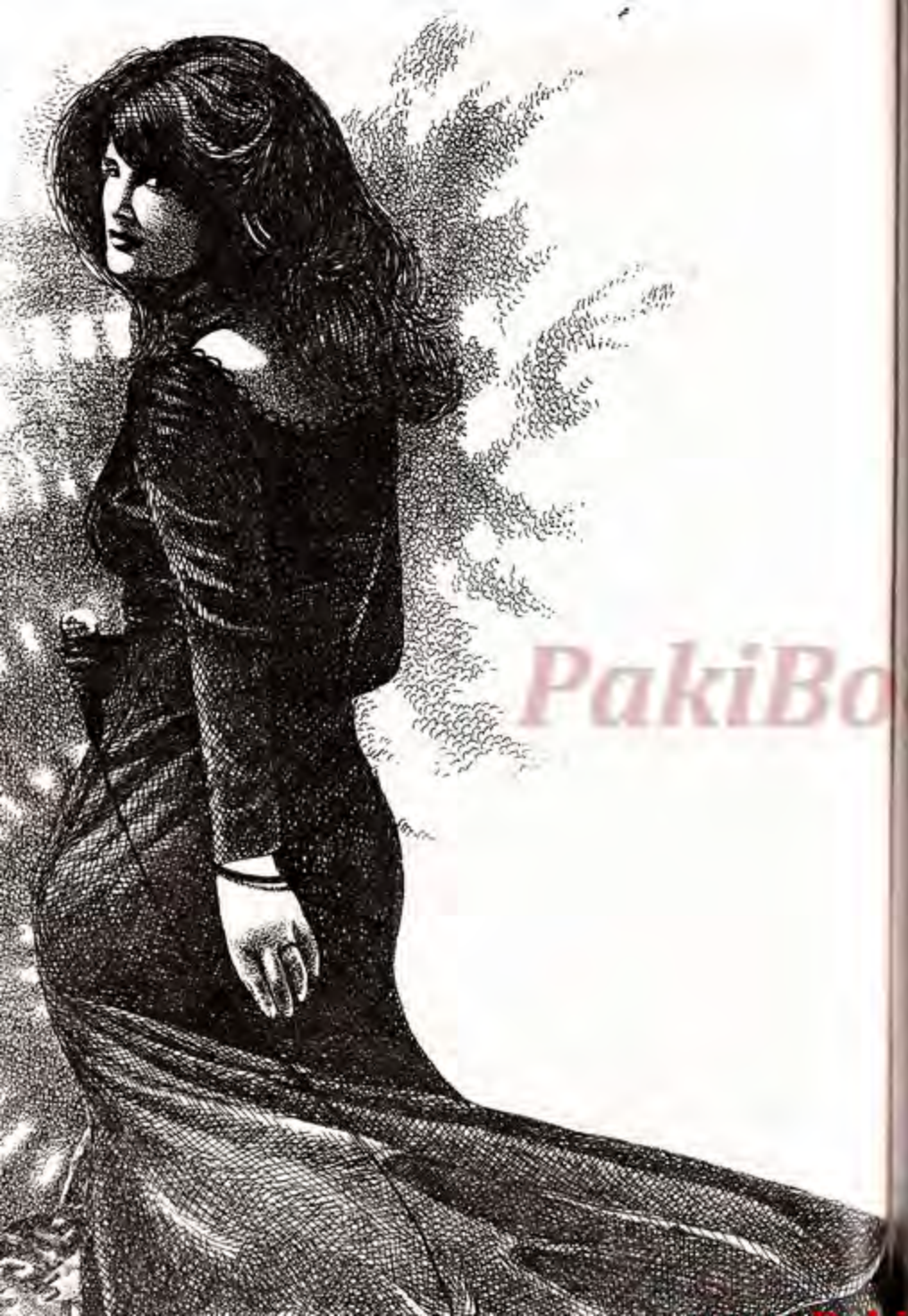
کچھ ہی دیر گزری تھی کہ رشید دوڑتا ہوا حمید کے پاس آ گیا۔ وہ بہت بدحواس ہو رہا تھا۔ ”حمید بھائی! تمہارے بیٹے کی منحوس زبان کھا گئی میرے بیٹے کو۔ اس کی بائیک سلپ ہو گئی تھی۔ وہ ہاسپٹل میں ہے۔“

رشید دوڑتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

حمید نے نور کا ہاتھ تھام لیا۔ ”بیٹا! یہ سب کیا ہے؟ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”بابا! رشید چاچا باہر کی آنکھوں سے وہ دیکھتے ہیں جو ان کے سامنے ہوتا ہے اور میں وہ دیکھتا ہوں جو آنکھیں بنانے والا مجھے دکھاتا ہے۔ میں بند آنکھوں سے اصلی دنیا دیکھتا ہوں اور دوسرے لوگ کھلی آنکھوں سے مصنوعی دنیا دیکھتے ہیں۔“

”ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کر کوئی..... ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی۔“



قسط نمبر: 18

وقت

حُسام بٹ

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب تھا۔ ایک ایسے پرعزم بازی گر کی بازی گری ..... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

وقت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن ... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمر رواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھاؤ ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن ... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہو جائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی نہیں دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحے کا اسیر تھا... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی، اس کے باوجود اس کی داستانِ حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔

PakiBooks.Site



گذشتہ اقساط کا خلاصہ

اس کا نام اسد علی رکھا گیا جسے ''علی'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو علی سلطان کی نگہداشت میں پایا۔ علی سلطان ٹیکساس (امریکا) کا ایک معتبر کاروباری شخص تھا۔ ایک حادثے نے علی سلطان کو وہیل چیئر تک محدود کر دیا تھا۔ اس کی اپنی بیوی رینا میگڈالین سے علیحدگی ہو چکی تھی۔ وقتِ رخصت رینا اپنی اکلوتی بیٹی نتھنی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ علی سلطان نے اپنی اور علی کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ رکھی ہوئی تھی اور بچپن سے جوانی تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام تر اخراجات اٹھائے تھے۔ وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد ایسا برتاؤ کرتا تھا جو اسے انکل کہتا تھا۔ اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں سیکڑوں سوالات اس کے ساتھ ہی پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ اس نے جب بھی اپنے محسن و مربی انکل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس بردبار شخص نے نہایت ہی خوب صورتی سے اسے ٹال دیا۔ یہ تشنگی علی کے تجسس کو ہوا دیتی تھی لہٰذا نتیجے کے طور پر اس کا ذہن بے سمت سوچوں کے جالے میں الجھ کر رہ جاتا تھا مگر اس اضطرابی کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سفر کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی تھی۔ کالج میں قدم رکھتے ہی اس نے ٹیکساس کے علاقے اینگلٹن میں واقع ''سرکل اے'' نامی ایک اسٹور پر جز وقتی ملازمت کر لی تھی۔ بیس سال کی عمر میں جب علی نے سائیکالوجی میں بیچلر ڈگری حاصل کر لی تو نت نئے ہنگامے اس کے تعاقب میں لگ گئے۔ ایک روز دو میکسیکن لڑکے ڈکیتی کی نیت سے ''سرکل اے'' میں گھس آئے۔ تمام کیش لوٹنے کے بعد وہ ڈکیت علی کے ساتھ موجود سیلز مین نظار کو شوٹ کر گئے۔ پولیس نے شک کی بنیاد پر علی کو بھی شاملِ تفتیش کر لیا۔ بعد ازاں ان دونوں میکسیکن ڈکیت کوئنٹس (ایری زونا) سے گرفتار کر لیا گیا۔ علی کا کالج لیک جیکسن (ٹیکساس) میں تھا جبکہ علی سلطان کی رہائش بے سٹی (ٹیکساس) میں تھی۔ علی ایک ہوٹل میں رہتا تھا اور لیک جیکسن کے اکثر ریسٹورنٹس میں اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ''وِلی لاؤنج'' نامی ایک ریسٹورنٹ میں ہسپانوی دوشیزہ شارو اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اس نے علی کے دردِل پر دستک دی تو اس کی زندگی میں بہار اتر آئی۔ ایک رات وِلی لاؤنج میں جب لیونارڈو نامی ایک میکسیکن غنڈے اور اس کے حواریوں نے شارو سے بدتمیزی کی کوشش کی تو علی بیچ میں کود پڑا۔ اس مار ماری کو ایک امیر و کبیر اسپینش لیڈی ڈیلفینا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ علی کو تھما کر رخصت ہو گئی..... اس واقعے کے بعد گویا لیونارڈو سے علی کی دشمنی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔ لیونارڈو نے اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے شارو کو ٹارگٹ کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ وِلی لاؤنج والے ناخوشگوار واقعے کی بنا پر علی نے شارو کی ریسٹورنٹ والی جاب چھڑوا کر اسے انکل سلطان کی خدمت کے لیے گھر میں رکھ لیا تھا۔ ایک روز جب شارو اسٹیٹے اسٹورز سے گروسری خرید نے گئی تو لیونارڈو نے اسے اغوا کر لیا۔ علی نے شارو کی تلاش میں ہمت نہ ہاری اور شارو کو ڈھونڈ تا رہا بالآخر ایک رات لیونارڈو کا ایک قریبی ساتھی پیلو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ علی نے طیش کے عالم میں مار مار کر پیلو کو ادھ موا کر دیا۔ آئندہ روز پیلو کے قتل کی خبر لیک جیکسن اور اس کے قرب و جوار میں گردش کر رہی تھی۔ پولیس قاتل کی تلاش میں تھی۔ لیک جیکسن میں مزید قیام خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لہٰذا علی نے انکل سلطان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور لیک جیکسن سے یوسٹن پہنچ گیا۔ اس سنگین صورتِ حال میں علی نے ڈیلفینا سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ رابطہ ہونے پر ڈیلفینا نے علی کی کتھا سننے کے بعد کہا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے تک باہر کی دنیا سے کٹ کر اس کے ساتھ بنگلے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔ راضی ہونے پر ان بہتر گھنٹوں میں ہر پل علی پر حیرتوں کا ایک نیا در وا ہوتا رہا۔ ڈیلفینا بہت اونچی پہنچ کی مالک ایک پراسرار لیڈی تھی۔ اس نے اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے علی کو پیلو مرڈر کیس سے اس طرح نکال لیا جیسے مکھن سے بال ..... علاوہ ازیں ڈیلفینا نے ٹھوس ثبوت کی مدد سے علی کو بتایا کہ لیونارڈو، شارو کو اغوا کر کے کیوبا کے شہر ہوانا لے گیا ہے جہاں وہ شارو کو عصمت فروشی کے جہنم میں جھونکنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ڈیلفینا نے علی کو یقین دلایا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کر دے تو وہ شارو کو صحیح سلامت واپس لے آئے گی۔ شارو کے حصول کی خاطر علی ڈیلفینا کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گیا۔ پرسنٹن ہالو والے اس بنگلے میں ڈیلفینا کی سنگت میں گزرنے والے وہ طلسم ہوش ربا بہتر گھنٹے بڑے رنگین، سنگین، رومان پرور اور ناقابلِ یقین تھے۔ ڈیلفینا کی شخصیت کسی معمے سے کم نہ تھی..... اس پرمستزاد، ڈیلفینا نے اپنے ہی ایسی دو پراسرار شخصیات ربی آنزک باروخ لاؤ اور یما اپیل بام سے علی کی ملاقات بھی کروا دی۔ تب علی پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام افراد یہودیوں کی ایک سیکرٹ اور بہت طاقتور سوسائٹی ''اسکل اینڈ بونز'' سے تعلق رکھتے تھے جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔ یہ لوگ خود کو زمینی خدا سمجھتے تھے۔ انہیں علی کے ہم عمر ایک ایسے نوجوان کی تلاش تھی جس کی ماں مسلمان اور باپ عیسائی تھا۔ انہیں شک تھا کہ علی وہی نوجوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ ڈیلفینا کی تمنا تھی کہ علی ان کی شرائط پر صاد کرتے ہوئے ''اسکل اینڈ بونز'' کی رکنیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کر دے لیکن علی نے ڈیلفینا کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور ڈیلس سے بے بسی اپنے انکل کے پاس آ گیا۔ یہاں حالات کی ایک نئی کروٹ اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ انکل نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے دیرینہ اور سربستہ راز سے آگاہ کر دیا۔ علی سلطان کے مطابق، انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) سے نیویارک (امریکا) مرزا عامر بیگ کے پاس پہنچایا گیا تھا۔ مرزا عامر بیگ، علی سلطان کا دوست تھا۔ اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کر دیا

تھا۔ علی سلطان نے ایک گارجین کی حیثیت سے انیس برس تک علی کی پرورش کی تھی۔ اس سلسلے میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں مقیم ایک نیک خاتون برداشت کر رہی تھیں مگر پچھلے چند ماہ سے اچانک کراچی سے یہ رقم آنا بند ہو گئی تھی جس سے مرزا عامر نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہے چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ علی کو فی الفور کراچی روانہ ہو جانا چاہیے۔ علی سلطان اور مرزا عامر بیگ مذکورہ خاتون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ ہے۔ مرزا عامر بیگ نے علی کو چند ایسے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس خاتون کو تلاش کر سکتا تھا۔ علی نے تیاری کی اور یوسٹن سے کراچی آ گیا۔ علی کی دوست عظیم نامی نوجوان سے ہو گئی۔ عظیم نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے علی کی والدہ کا پتا لگا لیا اور انہیں گھر لے آیا۔ علی کی ملاقات اپنی ماں سے ہو گئی۔ علی کو اپنی ماں کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا اور وہ دشمنوں سے انتقام لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ علی ماں کے بنگلے پر رہنے لگا۔ وہیں اسے اطلاع ملی کہ انکل علی سلطان کا دل کے دورے کے سبب انتقال ہو گیا ہے۔ علی نے ماں کو امریکا ساتھ لے جانے کے لیے ویزٹ ویزا کے حصول کے لیے کوشش شروع کر دی۔ کچھ نامعلوم افراد نے حملہ کر کے علی کی والدہ کو قتل کر دیا۔ علی نے تہیہ کر لیا کہ وہ ماں کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچائے گا۔ علی نے تمام حقیقت بینا کو بھی بتا دی۔ وہ علی کی اچھی دوست اور ہمراز بن گئی تھی۔ علی کو اس کی رہائشگاہ کے پتے پر ایک خط ملا جس میں اس کی ماں کے قتل کا اعتراف کیا گیا تھا۔ علی نے نادر شاہ کو چیک کرنے کا ارادہ کیا۔ علی نے عظیم کے ساتھ مل کر منصوبہ بنایا کہ نادر شاہ کو اغوا کر کے اس سے سچ اگلوایا جائے۔ عظیم نے کچھ لوگوں کو پیسے دے کر نادر شاہ کو اغوا کرایا۔ تاہم اس میں سے ایک شخص نے عظیم کو کال کر کے بتایا کہ ان کے آدمیوں کو پولیس نے گھیر لیا ہے۔ نادر شاہ اور اغوا کنندگان پولیس کی تحویل میں پہنچ گئے تھے۔ علی نے فوری طور پر بنگلا چھوڑ دیا اور بینا کے ہمراہ اس کے فلیٹ پر آ گیا۔ علی نے بنگلے پر جمشید کو چھوڑا تھا اور خاص نظر رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ علی کو دو جرمن شیفرڈ کی مدد سے تلاش کیا جا رہا تھا۔ اس کے درِ پردہ ڈیلفینا کا ہی ہاتھ تھا۔ وہ کسی بھی طرح علی کو قابو کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے پولیس کو پیچھے لگا دیا تھا جو بڑی شد و مد سے علی کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ علی نے نادر شاہ کو سبق سکھانے کے لیے اسے قابو کیا اور بدترین تشدد کر کے اسے محتاجی کی زندگی گزارنے کے لیے چھوڑ دیا اور اپنی ماں کے بنگلے کو نذرِ آتش کر دیا۔ علی کو ایک عورت کی مدد سے ٹریس کر لیا گیا اور نامعلوم جگہ پر پہنچا دیا گیا۔ وہاں ایک شخص ملا جس نے علی کو بتایا کہ وہ راس آئی لینڈ پر ہے جہاں اسے چالیس دن گزارنے ہیں۔ وہیں اسے ایک لڑکی کایا مل گئی جس سے دوستی ہونے پر اس نے بتایا کہ وہ اسکل اینڈ بونز کے لیے کام کرتی ہے اور اسے جان بوجھ کر وہاں بھیجا گیا ہے۔ علی کایا کے ساتھ آئی لینڈ کی سیر کے لیے نکلا کہ اچانک کایا کا پیر برف میں دھنس گیا علی، کایا کی مدد کے لیے آگے بڑھا تو وہ بھی برف میں دھنستا چلا گیا۔ اسے لگا کہ اس کا آخری وقت آ گیا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں نے کلمہ پڑھ لیا.....!

ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اہلِ ایمان کو یہ نیک کام کرتے رہنا چاہیے۔ کیا پتا، کب اور کس موڑ پر زندگی کی شام ہو جائے۔ جو اس دنیا میں آیا ہے اسے ایک روز واپس بھی جانا ہے لیکن میں نے ان سنگین لمحات میں موت کے خوف سے کلمہ نہیں پڑھا تھا۔ دماغ کا دیا ہوا یہ سگنل اپنی جگہ اہمیت کا حامل تھا..... ''اسد علی! کلمہ پڑھ لو۔ تمہارا آخری وقت آ گیا ہے۔''

جب سے میں نے دل کے ساتھ یارانہ گانٹھا تھا، دماغ کے مشوروں پر توجہ دینا چھوڑ دی تھی۔ اس نازک ترین صورتِ حال میں دل مجھے سمجھا رہا تھا۔

''اسد علی! ڈوبنا اور ابھرنا زندگی کا حصہ ہے۔ جو ڈوبنا نہیں جانتا وہ کبھی ابھر نہیں سکتا۔ موت کا ایک دن معین ہے۔ اس سے ایک لمحہ پہلے یا بعد کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا چنانچہ موت سے خوف زدہ ہونا سراسر بزدلی ہے۔ جب یہ آئے گی تو پھر کسی کی نہیں سنے گی اور جب تک نہیں آتی، انسان کو اپنی حفاظت اور سلامتی کی خاطر جدوجہد جاری رکھنا چاہیے۔ جو ذات شہ رگ سے بھی قریب ہے جب تک اس کی طرف سے بلاوا نہیں آ جاتا، وہی بچائے گا اور ہر حال میں بچائے گا.....!''

دل کے حوصلہ دلانے سے مجھے بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ رگ و پے میں ایک عجیب سی توانائی جاگ اٹھی تھی۔ میں نے اپنے منجمد ہوتے ہوئے بدن کے اندر حرارت دوڑتی محسوس کی۔ جی ایم سر نے مجھے دل کے استعمال کا ہنر سکھا دیا تھا۔ میں وقتاً فوقتاً اپنے محسوسات سے کام لینے کی مشق کرتا رہتا تھا اور ہر بار میں نے حیرت انگیز نتائج حاصل کیے تھے۔ رفتہ رفتہ اس تکنیک میں مجھے مہارت حاصل ہوتی جا رہی تھی۔ جی ایم سر میرے لیے ایک روحانی پیشوا، ایک گرو کی حیثیت رکھتے تھے۔ میں نے ان کی بات پر عمل کرتے ہوئے دماغ کی آواز کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال باہر کیا پھر دل کے مفید مشوروں پر توجہ مرکوز کر دی۔ اگلے ہی لمحے میرے ہاتھ پاؤں حرکت

میں آگئے۔

میں ایک پرفیکٹ تیراک ہوں لیکن جیسے ہی میں اس مصیبت میں گرفتار ہوا تو یکا یک سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہوکر رہ گئی تھی۔ برف کی بالائی سطح کسی چٹان کے مانند سخت تھی پھر میں قدرے نرم برف تک جا پہنچا تھا اور اس برف نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ میں بھربھری برف کے اندر دھنستا چلا گیا تھا اور بالآخر پانی میں جا اترا تھا۔

یہ میری زندگی کا ایک ہولناک تجربہ تھا جو کسی افتاد کی طرح اچانک ہی سر پر آن پڑا تھا لیکن بھلا ہو دل کا جس نے پلک جھپکتے میں میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ میں نے پڑھ اور سن رکھا تھا..... ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت..... مگر دل کی معاونت اس سہارے سے کہیں آگے کی چیز تھی۔ میں یخ بستہ برفیلے پانی کے اندر تھا اور..... میرا لہنما، میرا دل میرے اندر تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرکے اپنی تمام تر توجہ دل پر مرکوز کردی اور مراقبے ایسی کیفیت میں چلا گیا۔

یہ بڑا عجیب اور نرالا مراقبہ تھا۔ مراقبے اور استغراق میں عموماً انسان کسی ایک جگہ بیٹھ کر دھیان گیان کرتا ہے لیکن اس وقت میرے ہاتھ پاؤں مسلسل حرکت میں تھے۔ دماغ کہاں تھا، یہ مجھے نہیں معلوم۔ میں تو خود فراموشی کی حالت میں تیر رہا تھا اور تیرتا چلا جارہا تھا۔ ان لمحات میں میری توجہ کا مرکز ومحور میرا دل تھا جو دھڑک دھڑک کر میری راہنمائی کررہا تھا۔ اس کی دھڑکن میرے حوصلے کی مہمیز اور میری توانائی کو بڑھاتی چلی جارہی تھی۔ میرے محسوسات پوری طرح فعال تھے اور صدا بن کر میرے اندر اس طرح گونج رہے تھے۔

''جب انسان کسی ٹرین میں مجوسفر ہو اور مذکورہ ٹرین کو کسی طویل سرنگ سے گزرنا پڑے تو اس دوران میں ٹرین سے باہر چاروں جانب گھپ اندھیرے کا راج ہوتا ہے لیکن ٹرین کے اندر کی لائٹس آن رہتی ہیں جو ٹرین کو ''یقین'' دلاتی رہتی ہیں کہ سرنگ چاہے کتنی بھی تاریک اور طویل کیوں نہ ہو وہ اس کے دوسرے کنارے تک ضرور پہنچے گی۔ انسان کو بھی ٹرین کی ''سوچ'' کے مطابق اس بات کا یقین رکھنا چاہیے کہ اس کی زندگی کی مشکلات چاہے کتنی بھی زیادہ کیوں نہ ہوں، اسے اپنے اندر امید کا دیا روشن رکھنا چاہیے۔ تمام مشکلات کو ایک نہ ایک دن ختم ہو جانا ہے.....''

میں ہر اندیشے اور خوف کو خود سے میلوں دور رکھ کر دل کی ہدایات کو پوری توجہ سے سن رہا تھا اور نتائج کی پروا کیے بغیر ہاتھ پاؤں کی حرکات سے مسلسل سوئمنگ کرتا چلا جارہا تھا۔

باہر کی فضا اور پانی کے اندر کے درجۂ حرارت میں مجھے نمایاں فرق محسوس ہورہا تھا۔ جب ہم ہٹ سے نکلے تھے تو درجۂ حرارت منفی بیس ڈگری سینٹی گریڈ تھا اور اب اس درجۂ حرارت میں کافی اضافہ ہوچکا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق اس وقت پانی کا درجۂ حرارت منفی دس سے پانچ ڈگری سینٹی گریڈ کے درمیان تھا۔ واقعتاً ایسا تھا یا یہ میرے مراقبے کا اعجاز تھا، میں سردست اس بارے میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ ویسے میں نے یہ سن رکھا تھا کہ گہرے پانی میں درجۂ حرارت نسبتاً کم ہوتا ہے۔

''تمہارے پاس نہ تو اسپیڈو (تیراکی کا جانگیا) ہے، نہ سوئم سوٹ اور نہ ہی سوئمنگ فنس۔ تم اپنے پاس سوئمنگ گاگلز رکھتے ہو، نہ سوئمنگ کیپ اور نہ ہی ڈوم ایر پلگز (Dome Earplugs) جو تمہارے کانوں میں پانی کو جانے سے روک سکیں۔ تمہاری پشت پر آکسیجن کا سلینڈر بھی نہیں بندھا ہوا لیکن نہ تو تمہاری ناک اور کان میں پانی جائے گا اور نہ ہی تمہارے پھیپھڑے دغا دیں گے.....'' دل مسلسل میری ہمت بندھانے میں لگا ہوا تھا۔ ''جو ہے، جہاں ہے اور جیسا ہے کی بنیاد پر تمہیں اپنا سفر جاری رکھنا ہے۔ اسی میں تمہاری سلامتی، اسی میں تمہاری بقا ہے۔ اگر تم اسی طرح ہاتھ پاؤں چلاتے جاؤ گے تو تمہاری باطنی آنکھ روشن ہوجائے گی جو اس یخ بستہ ٹھنڈے ٹھار پانی کے اندر تمہارے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔''

میں پوری توجہ سے اپنے دل کی باتیں سن رہا تھا۔ دفعتاً مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے اندر کوئی جنریٹر آن ہوچکا ہو۔ میری بند آنکھوں کے پیچھے تیز روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا اور آن واحد میں میری بصارت، بصیرت میں بدل گئی۔ میری ظاہرہ دونوں آنکھیں بند تھیں اور باطنی آنکھ کھل گئی تھی جو پانی کی گہرائی میں مجھے بڑی وضاحت کے ساتھ خوب صورت مناظر دکھا رہی تھی۔ آناً فاناً میں میرا مراقبہ، مکاشفہ میں بدل گیا تھا۔ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے میں نیشنل جیوگرافک کی کوئی دستاویزی فلم دیکھ رہا ہوں۔

میری باطنی آنکھ کے سامنے بڑا دلکش اور نظر فریب منظر تھا۔ میں نے متعدد اقسام کی مچھلیوں اور دیگر آبی مخلوق کو ادھر ادھر بھاگتے دوڑتے ہوئے یعنی تیرتے ہوئے دیکھا۔ سب سے حسین نظارہ جیلی فش اور سی ارچن کا تھا۔ میں کسی بھی نظارے کو دیکھنے کے لیے کسی مقام پر رکا نہیں۔ میرے ہاتھ پاؤں مسلسل حرکت میں تھے اور میں سوئمنگ کرتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتا چلا جارہا تھا۔

اچانک میں چونک گیا۔ ایک سالمن شارک (Salmon Shark) بڑی تیز رفتاری سے میری سمت آرہی تھی لیکن حیرت انگیز طور پر ان لمحات میں مجھے اس خونی شارک سے ذرا سا بھی ڈر محسوس نہیں ہوا۔ میرے اندر جو جنریٹر آن ہوا تھا اس کی توانائی نے میرے خوف کو ناپید کردیا تھا۔ سالمن کے کھلے ہوئے جبڑے اور آرے کے دندانوں جیسے تیز دانتوں کو دیکھ کر میں ذرا سا بھی نہیں گھبرایا تھا۔ سالمن جس تیز رفتاری سے میری طرف آئی تھی اسی رفتار کے ساتھ وہ میرے نزدیک سے گزر گئی۔ اگر اس گوشت خور مچھلی نے مجھے دیکھا ہوتا تو فوراً سے پیشتر وہ اپنے خونی دانتوں میں میرے جسم کا سواستیاناس مار کر مجھے اپنے معدے میں اتار چکی ہوتی۔

باطنی آنکھ سے دیکھنے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ زندگی میں دوبارہ کبھی اس حیرت آفریں تجربے سے گزروں گا یا نہیں۔ بہرحال، یہ جو کچھ بھی تھا، انتہائی شاندار اور ناقابلِ فراموش تھا۔ میں ان لمحات کو کبھی بھول نہیں سکتا تھا۔

میرے ہاتھ پاؤں بڑے اعتماد، جرأت اور ہمت کے ساتھ تیراکی کا عمل جاری رکھے ہوئے تھے کہ مجھے ایک عجیب وغریب تجربے سے گزرنا پڑا۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی میرے قریب، میرے متوازی سوئمنگ کررہا ہو۔ پہلی مرتبہ میرے رگ وپے میں سراسیمگی سی دوڑ گئی جس نے لمحے بھر کے لیے دل پر سے میری توجہ ہٹا دی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دماغ نے میرے اندر سرگوشی کی۔

''شاید سالمن شارک لوٹ آئی ہے اور میرا تیاپانچا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے یا شاید یہ کوئی کھڑونبل ''اورکا'' ہے.....!''

متعدد پُراندیش اور خدشات سے بھرپور مہلک خیالات نے میری سوچ کو الجھا کر رکھ دیا تھا جس کے نتیجے میں میرے محسوسات منتشر ہوکر رہ گئے۔ دل سے رابطہ منقطع ہوا تو میں نے اپنی کمر کے گرد کسی چیز کو حمائل ہوتے محسوس کیا۔ شاید کوئی آکٹوپس مجھے اپنی جکڑ میں لینے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ انٹارکٹیکا کے برفیلے پانی کی تہ میں زہریلے آکٹوپس بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ احساس رونگٹے کھڑے کردینے والا تھا۔ میں نے یکبارگی آنکھیں کھول دیں۔

یہ میری ایک بے ساختہ اضطراری حرکت تھی جو مجھے پیر دعذاب کرگئی۔ میں نے جیسے ہی آنکھیں کھولیں، مجھے آنکھوں کے اندر برچھیاں سی چبھتی محسوس ہوئیں۔ یوں لگا جیسے کسی نے میری آنکھوں میں آہنی میخیں ٹھونک دی ہوں۔ یہ درحقیقت یخ بستہ پانی کی کارفرمائی تھی جس نے آنکھیں کھلتے ہی اپنی زور آوری کا احساس دلا دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنا پورا بدن سن ہوتا محسوس ہوا۔ دل سے رابطہ منقطع ہونے کے باعث مجھے کچھ دکھائی، کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے زندگی سے میرا ناتا ٹوٹ گیا ہو۔ میرے چاروں طرف تاریکی کا بسیرا اور سناٹے کا راج تھا۔ پھر اسی تاریکی اور سناٹے میں میرا دماغ ڈوبتا چلا گیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے تین چار افراد کو اپنے اوپر جھکے ہوئے پایا۔ ان کے چہرے جنگلیوں جیسے تھے۔ بے ترتیب بڑھی ہوئی ڈاڑھیوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ انہوں نے مہینوں سے شیو نہیں بنایا ہوگا۔ مجھے آنکھ کھولتے دیکھا تو ان میں سے ایک نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''اٹھ کر کھڑے ہوجاؤ۔ اگر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو چیر کر رکھ دوں گا۔''

دھمکی دینے والے شخص کے ہاتھ میں مجھے ایک تیز دھار والا چاقو بھی نظر آیا۔ میں نے چپ چاپ اس کی ہدایت پر عمل کیا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے جس انداز میں چاقو کو پکڑ رکھا تھا اس سے مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ چاقوزنی اس کا شعبہ نہیں تھا۔

''ہاتھ گردن کے پیچھے باندھ لو..... فوراً'' چاقو بردار نے کرخت لہجے میں مجھے نیا حکم دیا اور میرے عقب میں آگیا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس شخص کی ہدایت پر عمل کیا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنی گردن کے پیچھے باندھ لیے۔ اس نے چاقو کی نوک کو میری کمر کے ساتھ لگاتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''چپ چاپ چلتے رہو.....''

اس کے ساتھی آگے چل رہے تھے۔ اس وقت ہم ملق ودق برف زار میں تھے۔ چاروں جانب سفید جمی ہوئی برف ہی برف نظر آرہی تھی۔ میں نے سست روی سے قدم اٹھاتے ہوئے اپنے عقب میں موجود چاقوبردار سے پوچھا۔

''تم لوگ کون ہو اور مجھے کہاں لے جارہے ہو؟''

''تمہیں ہمارے ساتھ جہاز تک جانا ہوگا۔'' اس نے یہ دستور کرخت لہجے میں جواب دیا۔ ''اور..... ہم کون ہیں، یہ تمہیں وہیں جاکر پتا چلے گا۔''

''تم کس جہاز کی بات کررہے ہو؟'' میں نے

چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے سوال کیا۔ ''مجھے تو یہاں کوئی جہاز دکھائی نہیں دے رہا.....!''

''ہمارا جہاز اس گلیشیئر کی دوسری جانب ہے۔'' وہ ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''بس، اب اور کوئی سوال نہیں۔''

بات کے اختتام پر اس نے چاقو کی نوک میری کمر میں چبھو کر یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ مجھے خاموشی سے اس کی ہدایت پر عمل کرنا ہے۔

جہاز اور گلیشیئر کے ذکر نے میرے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑا دی۔ آج صبح جب میں کایا کے ساتھ ہٹ سے نکلا تھا تو میں نے دور ایک گلیشیئر کی چوٹی پر کسی ہوائی جہاز کی دم جیسی کوئی چیز دیکھی تھی کایا نے جسے میرا وہم قرار دیا تھا۔ کایا کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا دل دکھنے لگا۔ میں نے آخری بار کایا کو بڑی نازک حالت میں دیکھا تھا۔ وہ بھربھری برف کے اندر دھنستی چلی جا رہی تھی اور اس کے لبوں پر یہ فریاد تھی..... ''علی! ادھر آؤ۔ برف نے میرے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ میرے شوز برف کے اندر دھنس چکے ہیں۔ پلیز، میری مدد کرو۔''

''اے..... تم رک کیوں گئے.....؟'' عقب میں موجود چاقو بردار کی للکار میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''سیدھی طرح چلتے ہو یا یہیں کاٹ کر برف میں دبا دوں۔''

کایا کی بے بسی اور بے کسی نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ اس وقت کہاں اور کس حال میں ہوگی۔ میں اسے نظر انداز کر کے کسی کے ساتھ کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے پہلی فرصت میں کایا کو تلاش کرنا تھا اور ہر قیمت پر تلاش کرنا تھا۔

''لگتا ہے، شرافت کی زبان تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔'' چاقو بردار نے غراہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''تمہارے پاؤں میں پہیے لگانے کے لیے مجھے چاقو کو استعمال کرنا پڑے گا.....''

پھر اس سے پہلے کہ وہ جنگلی اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حرکت میں آتا، میں نے سیکنڈ کے دسویں حصے میں ایک اٹھک بیٹھک لگائی۔

چاقو بردار مجھ سے ایسی کسی حرکت کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ وہ بوکھلا کر رہ گیا۔ میں نے اٹھک بیٹھک کے اختتام پر بڑی سرعت سے اپنا رخ پھیر لیا تھا۔ اب ہم دونوں روبرو تھے۔ کل اس کے کہ وہ اس بدلتی ہوئی صورتِ حال کو سمجھ پاتا، میں نے اس کے تھوبڑے پر ایک زوردار مکا جڑ دیا۔

وہ مجھ سے ایسے کسی عمل کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ علاوہ ازیں وہ پیشہ ور چاقو زن بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میرے پنچ نے اس کے چودہ طبق گل کر دیے۔ اس کے حلق سے ایک دردناک آواز خارج ہوئی اور چاقو اس کے ہاتھ سے نکل کر برف پر جا گرا۔ پھر پھسلتے ہوئے اس کے ساتھیوں کی سمت چلا گیا۔

مجھ سے مار کھانے والا دوبارہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے تیور خاصے خطرناک دکھائی دیتے تھے۔ وہ مجھ سے اپنی ہزیمت کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے مجھ پر جست لگا دی اور مجھے لیتے ہوئے برف پر جا گرا۔ میں نیچے اور وہ میرے اوپر تھا۔ اس نے وحشیانہ انداز میں میری گردن دبانے کی کوشش کی۔ میں بھلا اس کی اس کوشش کو کیسے کامیاب ہونے دیتا۔

میں نے اس کے ناف کے مقام پر پاؤں رکھ کر پوری قوت سے اسے ہوا میں اچھال دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ پرواز کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے اوپر جا گرا۔ اس دوران میں، میں اٹھ کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ لوگ مجھ سے چند قدم کی دوری پر تھے اور ان کے چہرے غضب ناک ہو رہے تھے۔ وہ مجھ سے ایسے، جرأت کے مظاہرے کی امید نہیں رکھتے تھے۔ وہ اپنے ایک ساتھی کو میرے ہاتھوں پٹتے دیکھ چکے تھے لہٰذا اب کی بار وہ باجماعت مجھ پر حملہ آور ہوئے۔

میں زیرِ آب جس نوعیت کے سنگین حالات سے گزر کر یہاں تک پہنچا تھا اس نے مجھے تقریباً ادھ موا کر دیا تھا۔ ابھی میں نے چاقو بردار جنگلی سے نمٹنے کے لیے جس پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا وہ حیرت انگیز تھی ..... شاید یہ ''جان پر بن آئی'' کا کمال تھا۔ ایک عام انسان سات آٹھ فٹ سے زیادہ لمبی چھلانگ نہیں لگا سکتا لیکن اگر کسی عام انسان کے پیچھے شکاری کتے لگے ہوں تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے دس بارہ فٹ چوڑی کھائی کو بھی پھلانگ جاتا ہے۔ جان پر بن آئے تو انسان ناممکن کو ممکن کر دکھاتا ہے۔ میں بھی ان لمحات میں اسی قسم کے حالات سے گزر رہا تھا لہٰذا اسلامی اور بقا کا آٹو سسٹم میرے اندر فعال ہو گیا تھا۔

وہ تمام کے تمام ایک ساتھ مجھ پر پل پڑے تھے لیکن جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ وہ مجھے نہ تو زدوکوب کر رہے تھے اور نہ ہی کسی نے میرے جسم کے کسی حصے پر چاقو کا کوئی چرکا لگایا تھا۔ ان کی حتی الامکان کوشش تھی کہ مجھے قابو میں کر لیں جیسے ڈر ہو کہ اگر انہوں نے فی الفور مجھے اپنی گرفت میں نہیں لیا تو میں بھاگ جاؤں گا۔ میں جیسا سوچ

1987ء سے خدمت میں مصروف

ہومیو کلینک

LEUCODERMA-VITILIGO

تمام جلدی بیماریوں کا مؤثر اور بے ضرر علاج

STEROIDS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ایوارڈز ہولڈر اجمل زیدی برانڈ کے دورانیہ پاکستان کا مستقل پروگرام





ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD



AWARD OF BEST ACHIEVEMENT



AWARD PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد

9-اپریل تا 30 مئی
9-اگست تا 30 ستمبر
9-دسمبر تا 30 جنوری

مکان نمبر 62، سٹریٹ نمبر 20، سیکٹر G-8/1
سرینا چوک (ضلعی چوک) اسلام آباد
فون (051)32331725
موبائل 0300-8566188

پشاور

یکم فروری تا 11 فروری
یکم جون تا 11 جون
یکم اکتوبر تا 11-اکتوبر

ہوٹل لائن
جی ٹی روڈ نزد بشقری چوک پشاور شہر
موبائل: 0300-8566188

لاہور

14-فروری تا 27 فروری
14-جون تا 27 جون
14-اکتوبر تا 27-اکتوبر

گلف سینٹر
آفس نمبر 16
فیروز پور روڈ مزنگ چونگی
نزد والائیڈ بینک لاہور
موبائل نمبر 0300-8566188

کراچی

13-مارچ تا 27 مارچ
13-جولائی تا 27 جولائی
13-نومبر تا 27 نومبر

نیو ٹون سینٹر
آفس 706، 7 فلور شاہراہ فیصل
نرسری اسٹاپ جینک
الفلاح اورایم سی بی
موبائل 0300-8566188

ملتان

28 مارچ تا 6-اپریل
28 جولائی تا 6-اگست
28 نومبر تا 7 دسمبر

ہوٹل سلور سینڈ
ریلوے روڈ، نزد چوک عزیز ہوٹل ملتان
فون: 62-4518061 (061)
4582803 (0300-8566188)

رہا تھا، اگلے ہی لمحے اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔

''یہ کم بخت ایسے نہیں مانے گا۔'' ایک رعب دار آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''اسے اٹھا کر لے چلو.....''

پھر میں نے محسوس کیا کہ انہوں نے مل جل کر مجھے کندھوں پر اٹھا لیا تھا۔ میں ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کر رہا تھا مگر مجھے اس سعی میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے ایک فوری خیال کے تحت کروٹ لے کر خود کو نیچے گرانے کی کوشش کی تاکہ خود کو ان جنگلیوں کی گرفت سے آزاد کرا سکوں۔ اسی لمحے فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔

یہ کسی ہیوی گن کا فائر تھا۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی بیک وقت دو تین کام ہوئے۔ نمبر ایک، مجھے خود کو نیچے گرانے کی اپنی کوشش میں صد فیصد کامیابی حاصل ہوئی کیونکہ فائر کی ہیبت ناک آواز نے ان وحشیوں کی گرفت کو بہت کمزور کر دیا تھا لہٰذا وہ مجھے اپنے قابو میں نہ رکھ سکے۔ نتیجتاً میں منہ کے بل ٹھنڈی ٹھار برفیلی زمین پر آن گرا تھا۔ نمبر دو، فائر کی آواز نے ان جنگلیوں کو بے پناہ خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ مجھے بھول کر اپنی فکر میں لگ گئے تھے۔ نمبر تین، انہوں نے مجھے اس انداز میں نظر انداز کیا جیسے... بہ زبانِ خاموشی کہہ رہے ہوں..... ''تم تو جاؤ بھاڑ میں۔'' پھر انہوں نے ایک جانب دوڑ لگا دی تھی۔

میں نے خود کو سنبھالا اور گردن اٹھا کر اس سمت دیکھا جدھر سے فائر کی آواز گونجی تھی۔ دھندلکی فضا میں مجھے کسی انسان کا ہیولا نظر آیا جو تیز رفتاری سے بھاگتے ہوئے میری جانب آ رہا تھا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مذکورہ ہیولے پر نگاہ جما دی۔ تھوڑی ہی دیر میں، میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ پستہ قامت پاکٹ سائز پٹاخہ حسینہ کایا تھی۔ میرے سینے سے ایک آسودہ اور اطمینان بخش سانس خارج ہوئی۔

''مالک! تیرا لاکھ لاکھ شکر۔'' میں نے بے اختیار بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''بے شک بچانے والا مارنے والے سے زیادہ طاقتور ہے..... بے شک!''

کایا کو زندہ... سلامت دیکھ کر میری جان میں جان آئی تھی ورنہ میری آنکھوں نے جو آخری نظارہ دیکھا تھا اس میں وہ کسمپرسی کی حالت میں مجھ سے زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔ جلد ہی وہ میرے نزدیک پہنچ گئی۔ میں نے اس کے ہاتھ میں طاقتور ریوالور میگنم 44 دیکھا۔ یقیناً اسی گن سے اس نے ہوائی فائر کر کے ان جنگلیوں کو راہِ فرار دکھائی تھی۔

وہ سرتاپا میرا جائزہ لینے کے بعد تشکرانہ لہجے میں بولی۔ ''تھینکس جیہووا!''

''تمہیں بخیریت دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔'' میں نے اپنے دلی جذبات اس تک پہنچاتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم نے فائر نہ کیا ہوتا تو آج ان لوگوں نے مجھے چھوڑنا نہیں تھا۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے گن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ ریوالور تمہارے پاس کہاں سے آ گیا۔ یہ تو ادھر ہٹ میں پڑا ہوا تھا؟''

میرے استفسار کے جواب میں کایا نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں مجھے بتایا کہ اس نے مجھے بھنور برف کے اندر دھنستے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میرے بعد وہ بھی زیرِ آب چلی گئی تھی لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور ٹھنڈے ٹھار پانی میں لگاتار سوئمنگ کرتی چلی گئی پھر اسی جدوجہد میں اس نے مجھے پالیا۔ اس نے ایک بازو سے میری کمر کو سہارا دیا اور مجھے اپنے ساتھ لیے ہوئے وہ ایک کھلے مقام سے باہر نکل آئی۔ پھر اس نے مجھے بتایا کہ وہ نیوزی لینڈ کی ایک ماہر تیراک ہے۔

''تم نے تو مردوں سے زیادہ ہمت اور جرأت کا مظاہرہ کیا ہے کایا۔'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔''

وہ شاکی نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولی۔ ''دوست کی جان بچانا کوئی احسان والی بات نہیں ہوتی۔ میں نے جو کچھ کیا وہ تمہاری دوستی میں کیا ہے علی اور.....'' تھوڑی دیر رک کر اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر خواب ناک لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''اگر زندگی میں تمہاری سلامتی کی خاطر مجھے اپنی جان بھی دینا پڑی تو میں ایک لمحے کے لیے بھی سوچ بچار سے کام نہیں لوں گی۔''

''شکریہ کایا۔ میں تمہارے جذبات کو سمجھ سکتا ہوں اور تہِ دل سے ان کی قدر بھی کرتا ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ممنونیت بھرے انداز میں کہا۔ ''انشاءاللہ..... ہماری دوستی زندگی کی آخری سانس تک قائم و دائم رہے گی۔''

''جب میں نے تمہیں دریا کے پانی سے باہر نکالا تو تم بے ہوش ہو چکے تھے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بتانے لگی۔ ''پانی کے اندر تو میں تمہیں کسی طرح کھینچ کھانچ کر یہاں تک لے آئی تھی لیکن میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ میں تمہیں اٹھا کر ہٹ تک لے جاؤں لہٰذا میں تمہیں یہیں چھوڑ کر ایک خاص مقصد سے ہٹ کی طرف چلی گئی تھی۔''

''خاص مقصد.....'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی

طرف دیکھا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں؟''

''ہٹ کے اسٹور روم میں، میں نے لکڑی کا ایک تختہ دیوار کے ساتھ کھڑا دیکھا تھا جیسا کہ کسی دروازے کا پٹ ہوتا ہے۔ میں نے اس مستطیل تختے کے ایک سرے پر دو آہنی کنڈے بھی لگے دیکھے تھے اور وہاں ایک مضبوط رسی بھی رکھی مجھے نظر آئی تھی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''میں نے یہی سوچا تھا کہ اس تختے کے کنڈوں میں رسی باندھ کر میں اسے سلیج بنا لوں گی پھر اس سلیج پر تمہیں ڈال کر ہٹ تک لے آؤں گی۔ برف کے اوپر سلیج کو پھسلانا تمہیں کندھے پر اٹھا کر لانے سے کہیں آسان کام تھا۔''

کایا نے میری خاطر جو کچھ کرنے کا سوچا تھا، میں اس پاکٹ سائز نیوزی لینڈر سے اس کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ بے شک! کایا کا ارادہ اور عزم میرے تصور سے آگے کی چیز تھا۔ اس نے خود کو آئرن لیڈی ثابت کر دیا تھا۔

''کایا.....!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے عقیدت بھرے انداز میں کہا۔ ''مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے۔''

''لیکن میرا منصوبہ ادھورا رہ گیا۔'' وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''میں اس تختے کو کھینچ کر تھوڑی دور تک چلی تھی کہ مجھے تمہارے اردگرد آدم خوروں کی ایک ٹولی نظر آئی.....'' اس نے میگنم 44 کولٹ اینا کونڈا ریوالور کو میری نگاہ کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ ''اچھا ہوا، میں ہٹ کے اسٹور روم سے احتیاطاً اسے بھی اٹھا لائی تھی۔ میں نے ان بدمعاشوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے ہوائی فائر کیا تو وہ تمہیں چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ دیکھ لو، اب وہ دور دور تک تمہیں نظر نہیں آئیں گے۔''

میں نے پلٹ کر اس سمت دیکھا جدھر وہ جنگلی گئے تھے۔ کایا کا کہا بالکل درست تھا۔ اس جانب مجھے کہیں بھی ان کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دیے۔ وہ اس طرح غائب ہو گئے تھے جیسے کبھی اس طرف آئے ہی نہ ہوں۔

''تم نے ان لوگوں کے لیے ''آدم خور'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔ ''لیکن انہوں نے تو مجھے کچھ اور ہی بتایا تھا۔''

''انہوں نے تمہیں کیا بتایا تھا؟'' وہ حیرت بھری نظر سے مجھے تکنے لگی۔

''انہوں نے کسی جہاز کا ذکر کیا تھا جو اس دیوہیکل گلیشیر کے عقب میں کہیں کھڑا ہے۔'' میں نے ہیبت طاری کر دینے والی جسامت کے مالک برفانی تودے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ مجھے اپنے ساتھ وہاں لے جانا چاہتے تھے۔''

''اور تم سمجھ رہے ہو کہ وہ لوگ وہاں پر تمہارے ساتھ رسی کی بازی لگانے کا ارادہ رکھتے تھے۔'' وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''جب ہم ہٹ سے نکلے تھے تو تمہیں اسی گلیشیئر کی چوٹی پر کسی ہوائی جہاز کی دم بھی نظر آئی تھی۔ اب وہ دم کہاں غائب ہو گئی.....؟''

میں نے بے ساختہ پلٹ کر مذکورہ گلیشیئر کی جانب دیکھا۔ کایا بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ گلیشیئر کی چوٹی پر ہوائی جہاز کی دم کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے متذبذب انداز میں کایا کی طرف دیکھا تو وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''جس طرح صحرا میں سراب انسان کی آنکھ کو دھوکا دیتا ہے۔ وہ تیز چمک دار ریت کو پانی سمجھ لیتا ہے اور اپنے خشک حلق کو تر کرنے کے لیے اسی جانب قدم بڑھانے لگتا ہے بالکل اسی طرح انٹارکٹیکا کے برف زار میں بھی انسان کی آنکھ کو کئی طرح کے دھوکے ہوتے ہیں۔ درجۂ حرارت انسان کی برداشت کی حد سے بڑھ جائے یا کم ہو جائے تو اس کا دماغ نارمل انداز میں سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہتا لہٰذا انسانی آنکھ کو مختلف نوعیت کے سرابوں سے سامنا کرنا پڑتا ہے اور جہاں تک ان آدم خوروں کا تعلق ہے تو.....'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''جیسے صحرائی قزاق اور سمندری قزاق ہوتے ہیں ایسے ہی یہ لوگ برفانی قزاق ہیں۔ یہ برفانی تودوں کے اندر اپنے لیے محفوظ پناہ گاہیں بنا لیتے ہیں۔ زیادہ تر ان کے ٹھکانے وہ گپھائیں ہیں جو درجۂ حرارت کی ڈرامائی تبدیلیوں کے باعث مختلف گلیشیئرز کے اندر بن جاتی ہیں۔ یہ لوگ گروہوں کی صورت زندگی گزارتے ہیں اور صرف شکار کی غرض سے یہ اپنی پناہ گاہوں سے باہر نکلتے ہیں۔''

''اوہ.....'' میں نے تشویش بھری نظر سے کایا کو دیکھا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج یہ میری تکا بوٹی سے انجوائے کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔''

''میں تو ایسا ہی سمجھتی ہوں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ''اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ وہ تمہیں ڈولہا بنانے لے جا رہے تھے تو میں تمہاری خوش فہمی پر افسوس ہی کر سکتی ہوں۔ دنیا میں پائے جانے والے تمام جانداروں میں سے انسان کا گوشت سب سے زیادہ لذیذ اور مزیدار ہوتا ہے۔

جب کسی انسان کے اندر سے انسانیت نکل جاتی ہے تو وہ سب سے پہلے اپنے جیسے دوسرے انسان کی بوٹی نوچنے کی کوشش کرتا ہے۔"

میں حیرت بھری نظر سے کایا کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے بڑی سنجیدہ اور گہری بات کہہ دی تھی۔ اس چلبلی شریر لڑکی سے مجھے ایسی فکر انگیز گفتگو کی توقع نہیں تھی۔ میں یہ تسلیم کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا کہ کایا نے بہت کم وقت میں مجھے بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ اس کی بہادری، ہمت، جرأت اور بالغ سوچ نے میری نگاہ میں اس کی اہمیت کو بہت زیادہ بڑھا دیا تھا۔

"تھوڑی دیر پہلے تم نے بتایا تھا کہ جب تم نے مجھے دریا کے پانی سے باہر نکالا تو میں بے ہوش ہو چکا تھا۔" میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہاں تو مجھے کوئی دریا نظر نہیں آ رہا.....؟"

اس نے سرد مست میرے سوال کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور میرے قریب آتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی۔ "ہم نہ تو پینگوئن اور ٹراؤٹ مچھلی کھاتے ہیں اور نہ ہی ہم نے اپنے جسموں پر کوئی مخصوص تیل مل رکھا ہے جو اس ظالم درجۂ حرارت کی دست برد سے محفوظ رہیں گے۔ اگر کچھ دیر مزید یونہی کھلی فضا میں کھڑے رہ کر ہم باتیں بناتے رہے تو پھر ہم بھی جم کر اسی برف زار کا حصہ بن جائیں گے لہٰذا ہمیں جلد از جلد اپنے ہٹ تک پہنچنا ہوگا۔"

میں نے ریڈیم ڈائل سوئس واچ پر نگاہ دوڑائی۔ اس وقت دوپہر کا ایک بج رہا تھا اور درجۂ حرارت تھا منفی دس ڈگری سینٹی گریڈ۔ میں نے پوچھا۔

"کایا! تمہارے اندازے کے مطابق یہاں سے ہمارا ہٹ کتنی دوری پر ہے؟"

وہ میرے بازو کو پکڑ کر اپنے کندھے پر رکھتے ہوئے بولی۔ "زیادہ سے زیادہ بیس منٹ کی مسافت پر ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے سہارا دینے کا ارادہ رکھتی تھی۔ کایا کا قد چونکہ کافی کم تھا اس لیے اس کا کندھا میری بغل تک تو نہ پہنچ سکا البتہ وہ میرے سائے میں آ گئی جیسے دھوپ یا بارش سے بچنے کے لیے کوئی چھتری کے نیچے آ جاتا ہے۔ میں نے کایا کی اس پُرخلوص کوشش پر پیار بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا اور معتدل انداز میں کہا۔

"کایا! میں چل سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے..... تو پھر چلو۔" وہ سادگی سے بولی اور قدم آگے بڑھا دیے۔

"کایا!" میں نے اسے پکارا۔ "میری دوست ٹھنڈے پانیوں میں پانی کے بہاؤ کی مخالف سمت میں تیرنے والی ٹراؤٹ مچھلی (Trout)..... آؤ، میری پشت پر سوار ہو جاؤ۔ میں تمہارے لیے سلیج بن جاتا ہوں۔"

"ہم اس وقت جس نوعیت کی سچویشن میں ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے جسم مسلسل حرکت میں رہیں۔" وہ رکے بغیر بولی۔ "اگر میں تمہاری پشت پر سوار ہو گئی تو مجھے بہت سکون ملے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ آرام کی اس حالت میں سکون کہیں ابدی نہ ثابت ہو جائے....." لمحاتی توقف کر کے اس نے گردن موڑ کر تیکھی نظر سے مجھے دیکھا اور بڑے کھلے ڈلے انداز میں بولی۔

"ویسے تمہاری پیشکش بڑی رومینٹک ہے۔ میں ہٹ میں جا کر ضرور ٹرائی کروں گی۔"

"میری یہ آفر ہر جگہ اور ہر وقت کے لیے ہے۔" میں نے بھی معنی خیز انداز میں کہا۔ "پشت تو کیا، تمہارے جیسی پورٹیبل حسینہ کو تو اٹھا کر دل میں بھی بٹھایا جا سکتا ہے....."

"تم بہت رومینٹک ہو علی۔" وہ سحر زدہ لہجے میں بولی۔ "کیا تمام پاکستانی مرد ایسے ہی زبردست اور متاثر کن شخصیت کے مالک ہوتے ہیں؟"

کایا نے یہ بڑا عجیب سوال کیا تھا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا جواب دوں۔ میں نے بات گھماتے ہوئے پوچھ لیا۔

"کیا آج سے پہلے بھی تمہارا کسی پاکستانی مرد سے واسطہ نہیں پڑا؟"

"نہیں....." وہ دوٹوک انداز میں بولی۔ "یہ میرا پہلا تجربہ ہے۔"

"یہ درست ہے کہ پاکستانی مرد بہت زیادہ رومینٹک، بہت زیادہ محبت کرنے والے اور بہت زیادہ خیال رکھنے والے ہوتے ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن ان کے اندر ایک ایسی عادت بھی ہوتی ہے جو آزاد خیال معاشرے کی پروردہ خواتین کو پسند نہیں آتی۔"

وہ رک گئی پھر پُرتجسس نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "ایسی کون سی عادت ہے؟"

"وہ جس عورت سے محبت کرتے ہیں اسے اپنی جاگیر بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ اس عورت کو اپنی ذات تک محدود کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ وہ اپنی عورت کو غیر مردوں کے ساتھ کھلم کھلا میل جول کی اجازت نہیں دیتے۔"

"خاصے مشکل ہوتے ہیں.....!" اس نے گول مول بات کی اور دوبارہ قدم اٹھانے لگی۔

میں نے بھی اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "سچی محبت خالص رومانس کو پانے کے لیے کچھ تو قربانی دینا ہی پڑتی ہے۔ صادق جذبے پلیٹ میں سجے ہوئے تو ملتے نہیں.....!"

"شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔" اس نے سرسری انداز میں کہا پھر گفتگو کا زاویہ بدلتے ہوئے بولی۔ "وہ تمہیں برف کی پتلی سی لکیر نظر آ رہی ہے نا.....!" بات کے اختتام پر اس نے ایک جانب اشارہ بھی کر دیا۔

میں نے مذکورہ سمت میں دیکھا اور اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں..... نظر آ رہی ہے۔"

"ہم اسی پانی کی لکیر کے اندر سے ابھر کر باہر آئے ہیں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "اور میں نے "دریا" کا لفظ بھی اسی پانی کے لیے استعمال کیا تھا حالانکہ یہ دریا نہیں ہے۔"

"دریا نہیں تو پھر کیا ہے؟" میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"یہ دراصل بحیرۂ راس (Ross sea) ہے جو موسم سرما کی وجہ سے جم کر ایک نالی کی شکل اختیار کر چکا ہے۔" وہ میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ "اس سمندر کو تم بحرالکاہل کی جنوبی بڑھوتری بھی کہہ سکتے ہو۔ بحرالکاہل (Pacific Ocean) کا یہ انتہائی جنوبی حصہ چونکہ انٹارکٹیکا کے راس آئی لینڈ کے پہلو میں واقع ہے اس لیے اسے "راس سی" کہا جاتا ہے۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے اس چوبی تختے کے پاس پہنچ گئے، تھوڑی دیر پہلے کایا نے جس کا ذکر کیا تھا۔ مجھے بھی وہ کسی دروازے کا پٹ ہی لگا۔ لمبائی کے رخ اس کی ایک سائیڈ پر قبضوں کے نشانات یہ ثابت کرتے تھے کہ... وہ کبھی کسی دروازے کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ اس تختے کی چوڑائی والے ایک حصے پر دو آہنی کنڈے بھی لگے ہوئے تھے۔ فوری طور پر میرے ذہن میں ایک اچھوتا آئیڈیا آیا۔ یہ تختہ میں نے کبھی اسٹور روم کی ایک دیوار کے ساتھ کھڑا دیکھا تھا تاہم اس وقت میں نے اس تختے پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔

اس مقام سے ہمارا ہٹ دس بارہ منٹ کی مسافت پر تھا۔ میں نے رسی کو ان کنڈوں کے اندر سے گزارا پھر اسے برف پر پھسلاتے ہوئے ہٹ تک لے آیا۔ آج صبح لگ بھگ ساڑھے نو بجے ہم دونوں ہٹ سے نکلے تھے اور دس بجے ہم ایک جیسے حادثے کا شکار ہو کر برف کے نیچے ٹھنڈے ٹھار سمندر میں چلے گئے تھے۔ مالک کا شکر کہ دن کے دو بجے سے پہلے ہم صحیح سلامت اپنے ہٹ میں پہنچ گئے تھے۔

☆☆☆

ہٹ میں آنے کے بعد سب سے پہلے ہم نے اپنے لباس میں تبدیل کیے پھر کایا نے مجھے بیڈ پر چت لٹا کر میرے زخم کا معائنہ کیا۔ وہ ایک تجربہ کار نرس تھی اور سوسائٹی والوں نے اسے میری نگہداشت کے لیے اس ہٹ میں پلانٹ کیا تھا۔ یہ الگ بات کہ میرے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے بعد اس کے اندر کا موسم بدل گیا تھا۔

"تم کافی سخت جان ہو علی!" اس نے میرے زخم کو اچھی طرح چیک کرنے کے بعد فتویٰ جاری کر دیا۔ "حیرت انگیز طور پر تمہارا زخم بہت تیزی سے نارمل ہو رہا ہے۔ آج کے دن میں تم جن حالات سے گزرے ہو اس میں زخم کے خراب ہونے کا اندیشہ موجود تھا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہارے اندر بیماری سے لڑنے کی بے پناہ قوت موجود ہے جسے امیونٹی یعنی قوتِ مزاحمت یا قوتِ مدافعت کہا جاتا ہے۔"

"کیا تم ابھی میری ڈریسنگ کر رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔ "تمہارے خیال میں مجھے اور کتنی بینڈیج کروانا ہوں گی؟"

"یس! میں ابھی تمہاری فریش ڈریسنگ کر رہی ہوں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "اور میں سمجھتی ہوں، اس کے بعد ایک بینڈیج مزید کرنا ہوگی۔"

میں نے اطمینان بھری سانس خارج کی۔

ہم دونوں نے مل کر کچن میں کھانا تیار کیا۔ آپ اسے کھانے کی کاک ٹیل سمجھ لیں۔ ہم نے پورج، نوڈلز کے اندر کاجو، پستے اور بادام ڈال کر ایک مقوی ڈش بنائی تھی جس کا ذائقہ بالکل نیا تھا اور یہ ہمارے جسموں میں توانائی بھرنے کے لیے بہت مفید ثابت ہونے والی تھی۔ ان لمحات میں ہمیں توانائی کی اشد ضرورت تھی۔

جب ہم کھانا بنا رہے تھے تو میں نے اسٹور روم کو لاک کر کے چابی اپنی جیب میں ڈال لی تھی۔ یہ میری ایک بلا سوچی سمجھی حرکت تھی۔ مجھے اس وقت بالکل معلوم نہیں تھا کہ میں نے ایسا کیوں کیا تھا۔ بس، یہ سب غیر ارادی طور پر مجھ سے ہو گیا تھا۔ کھانے کے بعد ہم نے بیڈ روم میں بیٹھ کر کافی کا دور چلایا اور ہمارے بیچ بات چیت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

"صبح سے اب تک کسی دھماکے یا گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی نہیں دی۔" میں نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ

ہوا کہ پچھلی رات اس برف زار میں جو کچھ بھی ہوا، وہ سلسلہ اب رک چکا ہے۔"

"ہاں۔ مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "اور اس کا ایک مطلب اور بھی ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے بتایا۔ "اب فضا کا درجۂ حرارت رفتہ رفتہ گرنے لگے گا اور رات تک یہ اپنی پہلے والی ڈگری پر چلا جائے گا۔"

"ہاں، مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "تم نے کیا بتایا تھا..... تمہارے ساتھی کب تمہیں لینے آئیں گے؟"

"میرے ساتھی نہیں بلکہ میرا ساتھی!" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں بولی۔ "کرائسٹ چرچ سے صرف ایک بندہ میرے ساتھ یہاں آیا ہے۔"

"عم..... مگر..... پہلے تو تم نے مجھے کچھ اور بتایا تھا۔" میں نے الجھن بھری نظر سے اسے دیکھا۔ "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تم نے اپنے ساتھیوں کی تعداد تین بتائی تھی..... آسکر، اولیور اور آئیلا جو اس وقت اسکاٹ بیس پر ٹھہرے ہوئے ہیں اور تم سب لوگ اکتیس جولائی کو ایک ساتھ واپس کرائسٹ چرچ کے لیے پرواز کرنے والے ہو؟"

"ہاں۔ میں نے تم سے ایسا ہی کہا تھا۔" وہ بدستور پُراعتماد لہجے میں بولی۔ "لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنے بیان میں کئی جگہ غلط بیانی کی تھی۔"

"کایا! تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟" میں نے احتجاجی لہجے میں استفسار کیا۔ "کیا تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟"

"علی! اگر مجھے تم پر بھروسا نہ ہوتا تو میں تمہیں راس سی کے برفیلے پانی سے باہر نہ نکالتی۔" وہ میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولی۔ "لیکن جب میں نے تمہیں اپنے ساتھیوں کی کہانی سنائی اس وقت میں سوسائٹی کی طرف تھی۔ میں نے تم سے جو بھی کہا، وہ سوسائٹی کا حکم تھا۔ میں ایسا کرنے کی پابند تھی۔"

"اور اب کس طرف ہو؟" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اب میں تمہاری طرف ہوں۔" وہ خلوص انداز میں بولی۔

"اسکل اینڈ بونز سے بے وفائی کا انجام جانتی ہو؟"

"اچھی طرح جانتی ہوں۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "غداری، نافرمانی اور بے وفائی کا مطلب ہے، بلیک کارڈ۔"

"بلیک کارڈ؟" میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "میں کچھ بھی نہیں سمجھا۔"

"اسکل اینڈ بونز سیکرٹ سوسائٹی کے ہر کھیل اور ورنگ استعمال ہوتے ہیں۔ جس طرح ہاکی کے کھیل میں کھلاڑیوں کی غلطیوں پر انہیں مختلف رنگ کے کارڈز دکھائے جاتے ہیں مگر اس سوسائٹی میں صرف دو کارڈز ہیں۔ ریڈ اینڈ وہائٹ۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "بلیک کارڈ کا مطلب ہے موت اور وہائٹ زندگی کی علامت ہے۔ سوسائٹی اپنے وفادار ممبرز کو زندگی کی ہر نعمت سے مالا مال کر دیتی ہے اور بے وفائی کا انجام دردناک موت ہے۔ میں جانتی ہوں، جلد یا بدیر انہیں میری غداری کا علم ہو جائے گا پھر وہ کسی شوٹر کو میری جان لینے کے لیے بھیج دیں گے۔ وہ یہی چاہتے ہیں، کر لیتے ہیں۔"

میں حیرت بھری نظر سے یک ٹک کایا کو دیکھ رہا تھا۔ اسکل اینڈ بونز کے بارے میں مجھے ڈھیروں معلومات حاصل تھیں لیکن ظاہر ہے، میں اس سوسائٹی کے معاملات میں کایا سے زیادہ نہیں جانتا تھا۔ میری دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اس نے سوسائٹی کے حوالے سے مجھے بہت ہی اہم اور رازدارانہ باتیں بتائیں۔ جب وہ خاموش ہوئی تو میں نے ٹوٹے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"اب تم میری طرف کیوں ہو؟"

"اس لیے کہ تم ایک سچے اور کھرے انسان ہو۔" وہ ٹھوس انداز میں بولی۔

"کیا تم نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا؟" میں نے سوال کیا۔

"ہرگز نہیں!" وہ پوری قطعیت سے بولی۔ "میں نے اندر رہ کر سوسائٹی کے معاملات کو بہت گہرائی تک دیکھا ہے۔ یہ لوگ شیطان کے چیلے ہیں۔ یہ اینٹی کرائسٹ ہیں۔ میں نے انہیں بہت ہی غلیظ اور خبیث پایا ہے۔ میں سمجھتی ہوں، جیہووا نے تمہیں رحمت کا فرشتہ بنا کر میری زندگی میں اتارا ہے۔ تمہاری وجہ سے میرے اندر بدلاؤ آیا ہے۔ مجھے لگتا ہے، قدرت تمہاری مدد سے میرے کردہ اور ناکردہ گناہوں کو دھونا چاہتی ہے اور جہاں تک زندگی اور موت کا تعلق ہے تو وہ جیہووا کے ہاتھ میں ہے۔ میرے ذہن میں ایک بے داغ منصوبہ ہے۔ اگر تم میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جاؤ تو ہم یہ آسانی اس برف زار سے نکل کر دنیا کی بھیڑ میں کہیں بھی گم ہو سکتے ہیں۔"

"انٹرسٹنگ.....!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "کیا تمہیں یہ بہت آسان لگتا ہے؟"

"اگر تم میرا ساتھ دو گے تو بالکل آسان!" وہ پُرعزم لہجے میں بولی۔

"ڈن....." میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ "میں تمہارا ساتھ دوں گا۔"

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا پھر میری ہتھیلی پر اپنے انگارا سے دہکتے ہوئے بولی۔ "تھینک یو علی۔"

"تمہارا منصوبہ کیا ہے؟" میں نے گمبھیر انداز میں استفسار کیا۔

وہ بتانے لگی۔ "ہم صرف دو افراد کرائسٹ چرچ (ایوزی لینڈ) سے اسکاٹ بیس (انٹارکٹیکا) آئے تھے یعنی میں اور آسکر۔ آسکر اس وقت اسکاٹ بیس پر ٹھہرا ہوا ہے اور میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میری طرح آسکر بھی سوسائٹی کا ممبر ہے....."

"کیا یہ سچ ہے کہ تم لوگ بوئنگ C-17 گلوب ماسٹر طیارے پر سوار ہو کر یہاں آئے ہو؟" میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔ "اور اسی طیارے کے لیے اکتیس جولائی کو تمہاری واپسی ہوگی؟"

"یہ بات صد فیصد درست ہے۔" وہ مجھے یقین دلاتے ہوئے بولی۔ "اور میرا منصوبہ یہ ہے کہ آسکر کسی بھی حالت میں یہاں رہ جائے اور تم میرے ساتھ کرائسٹ چرچ چلے جاؤ، آسکر بن کر..... بعد کی بعد میں دیکھیں گے۔"

"اور یہ ہوگا کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔" وہ معنی خیز نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

"ڈونٹ وری، ہو جائے گا۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "یہ بتاؤ، آسکر یہاں کب آئے گا؟"

"تیس جولائی کی صبح کسی بھی وقت۔" اس نے جواب دیا۔ "سلیج پر سوار ہو کر وہ اس ہٹ تک پہنچے گا۔ اس کے بعد کی کہانی وہی ہے کہ وہ اپنی گم شدہ ساتھی یعنی مجھے اپنے ساتھ لے جائے گا۔"

"یہ ہسکی ڈاگز والی سلیج ہوگی؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "کتوں کی مدد سے چلائی جانے والی سلیج (Sledge) اب رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی ہیں۔ ان کی جگہ انجن والی آٹو سلیج نے لینا شروع کر دی ہے۔ آسکر ایک آٹو سلیج کو ڈرائیو کر کے یہاں پہنچے گا۔ اس سلیج کی شکل ٹینک سے مشابہ ہے لیکن اس کے نیچے آہنی چین بیلٹ کی جگہ کمانی دار چوبی پیڈ لگے ہوتے ہیں جو برف کی سطح پر پھسلتے ہیں۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے آٹو سلیج چلانا آتی ہے۔"

"میں پریشان نہیں بلکہ حیران ہوں کہ تمہیں کتنا کچھ چلانا آتا ہے۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے، پیدا ہوتے ہی تم نے کچھ نہ کچھ چلانا شروع کر دیا تھا۔"

"ابھی تو تم صرف حیران ہی ہو۔" وہ معنی خیز نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ "جب تمہیں چلاؤں گی تو دیکھتے کے دیکھتے رہ جاؤ گے۔"

"وہ تو میں اب بھی دیکھ رہا ہوں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے کہا۔ "بہت کم وقت میں مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تمہارے پٹاخہ بدن میں کتنی بارود بھری ہوئی ہے۔ بس، تم اتنا بتا دو کہ مجھے کیا کرنا ہے؟"

"تمہیں آسکر کی جگہ لینا ہے۔" وہ گمبھیر انداز میں بولی۔ "اور یہ کوئی زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ تم قد کاٹھ اور جسامت میں آسکر کے بہت قریب ہو۔ جب آسکر کو کسی بھی حالت میں اس برف زار میں رہنا ہے تو اس کی آئی ڈی اور پاسپورٹ وغیرہ تمہارے پاس آ جائے گا۔ ان ڈاکیومینٹس میں تکنیکی تبدیلیاں کرنا میرا کام ہے۔ تم صرف آسکر کی ایکٹنگ کرتے جانا۔ باقی میں سنبھال لوں گی۔"

اس کے بعد کایا نے مجھے آسکر کی عادات واطوار، نشست و برخاست اور بات چیت کے انداز کے بارے میں تفصیلاً سمجھا دیا۔ اب ہمارے درمیان کبھی ختم نہ ہونے والی گہری دوستی کا رشتہ قائم ہو چکا تھا لہٰذا میں نے بھی اسے اپنے بارے میں سب کچھ تو نہیں مگر کافی کچھ بتا دیا۔ میری کہانی میں جاوید واسطی، مرزا عامر بیگ، علی سلطان، ٹفٹی، شارو، ڈیلفینا، بینا کا ذکر بھی آیا پھر یہ کہانی میرے والدین حیدر علی اور سلمیٰ حیدر سے ہوتے ہوئے چنگیز خان تک جا پہنچی۔ کایا نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر کہا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہارا دشمن نمبر ون چنگیز خان ترکی کی کسی جیل سے نکل کر یہاں آ جائے گا اور وہ بھی آج ہی.....؟"

"یہ یقین مجھے تمہارے آقاؤں نے دلایا ہے۔" میں نے اس کی تسلی کی خاطر بتایا۔ "وہ لوگ میرا دل جیتنے کے لیے مجھے چنگیز خان کا تحفہ دیں گے اور ان کا وعدہ یہ ہے کہ پچیس جولائی یعنی آج کی تاریخ ختم ہونے سے پہلے چنگیز خان میرے ہٹ کے دروازے پر ہوگا اور تم اچھی طرح جانتی ہو، تمہارے آقا جو کہتے ہیں، وہ کر کے بھی دکھاتے

ہیں لہٰذا آج نصف شب سے پہلے کسی بھی وقت میرا یہ دشمن یہاں پہنچ جائے گا۔''

''ہاں، میں جانتی ہوں کہ وہ لوگ کتنے بااختیار اور کتنے بااقتدار ہیں۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''لیکن علی! میری تم سے ایک درخواست ہے۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیسی درخواست؟''

''تم سے دوستی کے بعد میں تمہاری طرف آگئی ہوں چنانچہ وہ لوگ میرے آقا نہیں رہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''تمہیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا۔ اس ذکر سے مجھے تکلیف پہنچتی ہے۔''

''اگرچہ دوستی میں ایکسکیوزمی، پلیز، تھینک یو اور سوری کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی پھر بھی آئیم ایکسٹریملی سوری کایا۔'' میں نے اس کی جانب جھکتے ہوئے صدق دل سے کہا۔ ''میں آئندہ اس چیز کا دھیان رکھوں گا کہ میرے الفاظ سے تمہارے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے۔''

''اٹس اوکے۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولی۔

اس کے موڈ کو بحال کرنے کے لیے مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے ٹٹولنے والے انداز میں استفسار کیا۔ ''کایا! تم نے کب سے نہیں پی؟''

''جب سے تم نے منع کیا ہے۔'' وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولی۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا پینے کو من نہیں کرتا؟''

''من تو کرتا ہے مگر پیوں گی نہیں۔'' اس نے اٹل لہجے میں کہا۔ ''تم نے شرط ہی ایسی عائد کردی ہے علی.....''

بات کے اختتام پر اس نے بڑی جاذب نظر سے مجھے دیکھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں نشہ سا تیرتا دکھائی دیا۔ پتا نہیں، یہ نیند کا خمار تھا یا جذبات کا بخار بہرحال، میں نے خود کو اس کی مدھ بھری آنکھوں میں ڈوبتا ہوا محسوس کیا۔ میں نے مخمور لہجے میں دریافت کیا۔

''کیا تمہاری نظر میں میری شرط کی اتنی زیادہ اہمیت ہے؟''

''میری نگاہ میں تم پورے کے پورے اہم ہو علی۔'' وہ ایک طویل جماہی لیتے ہوئے بولی۔ ''تم نے کہا، جب میرے نزدیک رہنا ہو تو بوتل کو ہاتھ نہیں لگانا۔ میں تو ہر پل، ہر لمحہ تمہاری قربت میں گزارنا چاہتی ہوں پھر پینے کی گنجائش کہاں نکلتی ہے.....؟''

جذبات کی شدت سے اس کی آواز بوجھل ہو رہی تھی۔ مرد کی سب سے بڑی کمزوری فرماں برداری ہے۔ وہ اطاعت گزار عورت کے لیے اپنا تن، من، دھن..... سب کچھ قربان کردیتا ہے۔ وہ پاکٹ سائز نیوزی لینڈر، چینی کی گڑیا بھی مجھے اپنی فرماں برداری کا یقین دلا رہی تھی۔

میں نے اس کی خمار آلود آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کایا! تمہیں بہت زور کی نیند آرہی ہے۔ آؤ، میں تمہیں سلا دیتا ہوں۔''

اس نے ایک تو بہ شکن انگڑائی لی پھر معنی خیز انداز میں بولی۔ ''مگر میری بھی ایک شرط ہے۔''

''آج تمہاری ہر شرط منظور ہے۔'' میں نے کایا کی گردن اور گھٹنوں کے نیچے سے بازو ڈال کر اسے گود میں اٹھالیا اور پوچھا۔ ''اب بتاؤ، کیا چاہتی ہو؟''

''میں تو تمہیں چاہتی ہوں۔'' وہ معصومیت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔

میں نے کایا کو گود میں اٹھائے اٹھائے اپنا چہرہ اس کے چہرے پر جھکا دیا پھر اس کے شنگرفی ہونٹوں کی تپش کو اپنے اندر اتارنے کے بعد پوچھا۔

''کیا آج تم نے سگریٹ پی ہے؟''

''ہاں پی ہے۔'' وہ گردن کو اثباتی جنبش دے کر تبسم ریز لہجے میں بولی۔ ''اگر تم کہو گے تو میں اسموکنگ بھی چھوڑ دوں گی۔''

''نہیں!'' میں نے گردن کو نفی میں حرکت دی۔ ''تمہارے انگارا ہونٹوں سے اٹھنے والی تمباکو کی مخصوص مہک میں ایک عجیب سا نشہ ہے۔ یہ خمار مناسب تناسب کے ساتھ برقرار رہنا چاہیے۔''

وہ میری سانسوں میں اپنی سانسیں ملاتے ہوئے مدہوشی بھرے لہجے میں بولی۔ ''آج ہم دونوں ایک ہی سلیپنگ بیگ میں گھس کر سوئیں گے۔''

''ڈن!'' میں نے یک لفظی جواب پر اکتفا کیا۔

انسان ساری زندگی نت نئے تجربے کرتا رہتا ہے۔ دل میں جگہ رکھنے والوں کے لیے ماحول خود بخود گنجائش پیدا کردیتا ہے۔ ان نشاط انگیز ساعتوں کا تجربہ بڑا ہیجان خیز اور سنسنی آمیز ثابت ہوا۔ ہم دونوں سونے کی کوشش میں ایک دوسرے کو جگاتے رہے۔ کچھ لمحات ایسے بھی ہوتے ہیں جب بے آرامی میں آرام محسوس ہوتا ہے۔ ہم بھی ایسے ہی تریاق لمحات کے اسیر بن کر رہ گئے تھے۔

☆☆☆

میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ دستک کی آواز سے میری آنکھ کھلی تھی یا آنکھ کھلنے کے بعد دستک کی آواز نے

میری سماعت تک رسائی حاصل کی تھی۔ بہرکیف میں نے سنا، کوئی بڑے زور و شور سے ہٹ کا داخلی دروازہ دھڑ دھڑا رہا تھا۔ اس آواز کو سن کر میرے ذہن میں ایک ہی نام چمکا اور وہ نام تھا میرے دشمن، خبیث الاخبث، نظفہ ناتصدیق چنگیز خان کا۔

میں نے چشم زدن میں بستر چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا لیکن اس فیصلے کو بروئے عمل لانے کے لیے مجھے خاصی جدوجہد کرنا پڑی۔ ان لمحات میں، میں ''میں تو چھوڑتا ہوں، کمبل نہیں چھوڑتا'' ایسی صورتِ حال سے دوچار تھا۔ سلیپنگ بیگ کو میں نے بیڈ کے اوپر ڈال لیا تھا اور ہم دونوں اس سلیپنگ بیگ کے اندر بھرے ہوئے تھے۔ کایا گہری نیند میں کسی جونک کے مانند میرے وجود میں پیوست تھی، میں نے بہ مشکل تمام خود کو کھینچ تان کر اس بیگ کے اندر سے نکالا۔

کایا نے حالتِ نیند میں ''اوں، آں'' کی آوازیں نکالیں پھر سلیپنگ بیگ کے اندر اس کے خراٹوں کی آواز ابھرنے لگی۔ میں نے دستی گھڑی میں وقت دیکھا۔ اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے گویا میں نے چار گھنٹے کی نیند لے لی تھی۔ اس دوران میں وقفے وقفے سے ہٹ کے بیرونی دروازے پر دھواں دھار دستک کا عمل جاری تھا۔ میں ذہنی طور پر پوری طرح تیار ہو کر بیڈ روم سے نکل آیا۔

جب میں نے دروازہ وا کیا تو کھلے ہوئے دروازے پر مجھے جو چہرہ نظر آیا، وہ میری توقع پر پورا اترتا تھا۔ میں نے اس شیطان ابن شیطان کو پہچاننے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی۔ نیل کریمر نے اپنے لیپ ٹاپ پر مجھے اس بدذات کی فوٹو دکھائی تھی۔ میں نے اندرونی جذبات پر قابو رکھتے ہوئے معتدل انداز میں پوچھا۔

''بھائی! تم کون ہو اور میرا دروازہ کیوں بجا رہے ہو؟''

مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات نمودار ہوئے تھے۔ وہ چند لمحات تک سوچتی ہوئی گہری نظر سے مجھے تکتا رہا پھر منت ریز لہجے میں بولا۔

''نوجوان! میرا نام پیڈرو ہے۔ میں ایک راستہ بھٹکا ہوا مسافر ہوں۔ کیا تم مجھے اپنے ہٹ میں پناہ دے سکتے ہو؟ میں رات گزارنے کے بعد صبح یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

''اگر صرف رات گزارنے کا مسئلہ ہے تو میں تمہیں اس کی اجازت دے سکتا ہوں۔'' میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''لیکن اس سے زیادہ نہیں۔''

''مجھے منظور ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔

میں نے اس کے لیے راستہ چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''اندر آجاؤ۔''

اس کمبخت نے اپنا تعارف ''پیڈرو'' کے نام سے کرایا تھا لیکن میں اس کی اصلیت کو اچھی طرح جانتا تھا۔ نیل کریمر نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا وہ دو دن کی مدت پوری ہونے سے چار گھنٹے پہلے ہی ایفا ہوگیا تھا۔ میرا انتہائی مطلوب بندہ اس وقت میری دسترس میں تھا۔

میں اسے اپنے ساتھ کچن میں لے آیا پھر ایک کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھ جاؤ۔''

وہ بیٹھ گیا اور ٹٹولتی ہوئی نگاہ سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے سامنے دوسری کرسی سنبھال لی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''تمہیں بھوک تو لگ رہی ہوگی؟''

''ہاں!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں اس وقت سخت بھوک محسوس کر رہا ہوں۔''

''مسٹر پیڈرو! کھانے کے لیے تمہیں لگ بھگ ایک گھنٹے تک انتظار... کرنا ہوگا۔'' میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، میں ایک گھنٹے سے زیادہ بھی انتظار کرلوں گا۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''نوجوان! تمہارا بہت شکریہ۔ تم نے مصیبت کی ان گھڑیوں میں مجھے اپنے پاس پناہ دی۔''

گفتگو کے دوران میں وہ مسلسل کھوجتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا بھی چلا جارہا تھا جیسے کچھ یاد کرنے اور میرے اندر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں اس کی ٹٹول کا سبب جانتا تھا۔ ماں نے مجھے بتایا تھا کہ میں عادات واطوار اور شکل صورت میں اپنے باپ کی کاپی ہوں۔ اس مردود کو میرے اندر حیدر علی دکھائی دے رہا تھا۔ میرا جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ اپنے باپ کے قاتل اور اپنی ماں کی بربادی کے ذمے دار اس شخص کا گلا دبا دوں لیکن میری نظر میں وہ اتنی آسان موت کا حق دار نہیں تھا۔ میں تو اسے ایک تاریخی عبرت ناک، رونگٹے کھڑے کردینے والی موت مارنے کا ارادہ باندھے بیٹھا تھا۔

''لیکن یہ پناہ صرف ایک رات کی ہے۔'' میں نے اپنے ذہن میں ابلتے ہوئے انتقامی لاوے کو شانتی کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔ ''کل تمہیں یہاں سے رخصت ہونا پڑے گا۔ میں اس ہٹ میں جتنا اہم کام کر رہا ہوں اس میں یہاں کسی غیر متعلق شخص کی موجودگی کی گنجائش نہیں نکلتی۔''

''اوہ.....'' وہ ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے بولا۔

دن میں، میں نے اور کایا نے یہ طے کرلیا تھا کہ چنگیز خان کی آمد پر اپنے حوالے سے ہم نے اسے کیسے ٹیکل کرنا ہے۔ وہ اس وقت مخصوص برفانی گرم لباس میں ملبوس تھا تاہم میں نے اس کے پاس کسی قسم کا کوئی سفری بیگ یا دوسرا سامان نہیں دیکھا تھا۔ وہ بات کرتے ہوئے مسلسل مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھ لیا۔

''مسٹر پیڈرو! تم مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟ تمہارے ساتھ کوئی پرابلم ہے کیا؟''

''میرے ساتھ تو اس وقت ایک ہی پرابلم ہے کہ میں اپنی راہ سے بھٹک کر اس طرف آنکلا ہوں۔'' وہ متذبذب لہجے میں بولا۔ ''اور پتا نہیں کیوں، مجھے ایسا محسوس ہورہا ہے کہ میں نے پہلے بھی کہیں تمہیں دیکھا ہے۔''

''اس دنیا میں ملتی جلتی صورتوں والے سیکڑوں افراد موجود ہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور میں نے سن رکھا ہے کہ ایک جیسی شکل والے، ایک وقت میں، دنیا میں تیرہ افراد پائے جاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے، تم نے مجھ سے مشابہ کسی شخص کو دیکھ رکھا ہو۔ ویسے مجھے ایک بات کا یقین ہے کہ آج ہم پہلی بار مل رہے ہیں۔''

''ہوسکتا ہے، تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔'' وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔ ''بائی دا وے..... تم اس ہٹ پر کون سا اہم کام کررہے ہو؟''

''میں پیشے کے اعتبار سے ایک ڈاکٹر ہوں اور میرا تعلق میکمرڈو اسٹیشن سے ہے۔'' میں نے سوچی سمجھی کہانی بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''میکمرڈو اسٹیشن یہاں سے لگ بھگ آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ ایک امریکی ریسرچ سینٹر ہے۔ میں ایک بہت ہی خاص قسم کے خطرناک وائرس پر ریسرچ کررہا ہوں اس لیے مجھے اسٹیشن سے دور اس الگ تھلگ ہٹ میں ٹھہر کر چند تجربات کرنا ہیں۔ ڈانگو وائرس بہت ہی موذی اور مہلک ہے۔''

''کیا یہ بھی کوئی کانگو وائرس ٹائپ کا کوئی جراثیم ہے؟'' وہ میری باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔

''تمہارا اندازہ درست ہے مسٹر پیڈرو۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا اور پوچھا۔ ''تم کس مقصد سے اس ویران برف زار میں بھٹکتے پھر رہے ہو؟''

''میں اس دور دراز برفانی علاقے کی سیر کرنے آیا تھا اور بدقسمتی سے میں بھٹک کر تمہارے ہٹ کی طرف نکل آیا۔'' وہ ایک رٹی ہوئی کہانی مجھے سنانے لگا۔ ''میرا تعلق اشوایا سے ہے۔''

اشوایا (Ushuaia) ارجنٹائن کا ایک خوب صورت ساحلی شہر ہے۔ آباد دنیا کا یہ آخری جنوبی کنارہ ہے۔ اگر موسم کلیئر ہو تو اشوایا سے دو گھنٹے کی فلائٹ کے ذریعے انٹارکٹیکا پہنچا جاسکتا ہے لیکن میں جانتا تھا کہ چنگیز خان کا اشوایا یا ارجنٹائن سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ اگر میں چاہتا تو ایک منٹ میں اس مکار کے جھوٹ کی قلعی کھول سکتا تھا۔ لیکن یہ ہلکی پھلکی ندامت اور شرمندگی کا احساس دلانا اس کے شایانِ شان نہیں تھا۔ وہ تو میرے ہاتھوں ''ویری اسپیشل'' سلوک کا مستحق تھا۔

''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے سنجیدہ مگر تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''آج کی رات تم میرے مہمان ہو اور میں یقین دلاتا ہوں کہ یہ رات اس ہٹ میں تم بالکل محفوظ رہو گے.....'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اب میں کھانا تیار کروں گا۔''

اسی لمحے بیڈروم کے اندر سے کایا کی آواز آئی۔ ''علی! تم کہاں ہو؟''

پیڈرو (چنگیز خان) نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''یہ میری اسسٹنٹ کایا ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ ادھر لیبارٹری میں کام کررہی ہے۔ اس نے مجھے شارٹ نیم ''علی'' سے پکارا ہے۔ میرا پورا نام حارث علی ہے..... ڈاکٹر حارث علی!'' پھر میں نے بیڈروم کی طرف منہ کرکے بہ آوازِ بلند کہا۔

''کایا! میں کچن میں ایک مہمان کے لیے کھانا تیار کررہا ہوں۔''

''کون مہمان؟'' کایا نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''ہے ایک بھولا بھٹکا مسافر۔'' میں نے سرسری انداز میں اسے بتایا۔ ''یہ آج کی رات ادھر ہی بسر کرے گا۔ تم لیبارٹری سے نکل کر ادھر ہی آجاؤ اور کھانا تیار کرنے میں میری مدد کرو۔''

''ٹھیک ہے، میں آتی ہوں۔'' کایا نے کہا۔

میں چولہے اور دیگچی کے ساتھ مصروف ہوگیا۔ میں اپنے رویے سے ایسا ظاہر کررہا تھا جیسے میں چنگیز خان کو واقعی ایک بھٹکا ہوا مسافر سمجھ رہا ہوں اور اس کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہوں۔ وہ تعاون آمیز لہجے میں مستفسر ہوا۔

''ڈاکٹر حارث! کیا میں بھی تمہاری کچھ مدد کروں؟''

''ارے نہیں پیڈرو۔ تم تو ایک رات کے مہمان ہو۔'' میں نے معنی خیز نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میزبانی

کا کام، میزبان ہی کو کرنے دو۔''

''اگر میں اپنے مہربان میزبان کا ہاتھ بٹاؤں گا تو مجھے خوشی ہوگی۔'' وہ امید بھرے لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے۔ مہمان کی خوشی کا خیال رکھنا مجھ پر لازم ہے۔'' میں نے اس کی فرمائش کے جواب میں کہا۔ ''میں تم سے ایک دوسرا کام لے لیتا ہوں۔''

''دوسرا کام؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''مجھے ویکس (Wax) والی ایک ڈوری تیار کرنا ہے جو وائرس والے تجربے میں استعمال ہوگی۔'' میں نے کوکنگ کا کام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس ڈوری کی مدد سے میں سیل اور پینگوئن کا شکار کروں گا پھر ان جانوروں پر خطرناک ڈانگو وائرس کا تجربہ کیا جائے گا۔ یہ ڈوری تیار کرنا بہت آسان ہے.....'' تھوڑی دیر کو رک کر میں نے دیگچی میں چمچہ چلایا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں ایک برتن میں، شہد کی مکھیوں کے چھتے سے حاصل ہونے والے ویکس یعنی موم کو پگھلاؤں گا پھر یہ پگھلا ہوا موم اور ایک رسی تمہارے حوالے کردوں گا۔'' میں نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اس رسی کو پگھلے ہوئے موم میں ڈبو کر ہلاتے جانا۔ اس طرح اس رسی پر موم کی تہ چڑھ جائے گی۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''ہاں..... یہ تو بہت آسان ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس طرح وہ رسی ایک موم بتی کی شکل اختیار کرلے گی۔''

''پرفیکٹ!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''بس، اب تم اس کام کے لیے تیار ہوجاؤ۔''

میں نے ہنی ویب (شہد کی مکھیوں کا چھتا) اسٹور روم میں پڑا دیکھا تھا اور اس چھتے کی موجودگی ہی نے میرے ذہن میں اس اچھوتے آئیڈیا کو ابھارا تھا۔ سقراط نے زہر کا پیالہ اپنے ہاتھوں سے تیار کیا تھا۔ میری خواہش تھی کہ چنگیز خان کی دردناک موت کی تیاری میں کچھ حصہ اس خبیث کے اپنے ہاتھوں کا بھی ہو۔

کایا نے کھانا تیار کرنے میں میری مدد کی۔ اس دوران میں چنگیز خان نے میرے حسبِ منشا موم کی ڈوری تیار کردی تھی۔ پھر ہم تینوں نے کچن ہی میں بیٹھ کر پیٹ پوجا کی۔ انتہائی سرد موسم کی وجہ سے بہت جلدی بھوک لگ جاتی تھی۔ ہم نے آج دوپہر میں ڈٹ کر کھایا تھا لیکن جب سو کر اٹھے تو پیٹ خالی تھا۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو میں نے کایا سے کہا۔

''ادھر لیبارٹری میں جو ایک ایکسٹرا سلیپنگ بیگ رکھا ہوا ہے، وہ تم لاکر یہاں کچن میں ڈال دو۔ ہمارا مہمان پیڈرو آج کی رات ادھر ہی آرام کرے گا۔''

کایا نے اثبات میں گردن ہلائی اور کچن سے نکل کر بیڈروم کی طرف بڑھ گئی۔

بیڈروم کو ہم نے ''لیبارٹری'' کا نام دے دیا تھا تاکہ چنگیز خان اس طرف جانے کی کوشش نہ کرے۔ یہ سب کچھ احتیاط کے پیشِ نظر کیا گیا تھا تاکہ اس شیطان کو مجھ پر کسی قسم کا شک نہ ہو۔ میں اسے جن عذاب ناک لمحات سے گزارنے کا ارادہ رکھتا تھا اس کا تقاضا یہی تھا کہ وہ بے خبری میں مبتلا رہے اور تاریک راہوں میں مارا جائے۔ اس ہٹ کے مختلف کونوں کھدروں میں جو بھی الٹی سیدھی اور آڑھی ٹیڑھی چیزیں دستیاب تھیں، ان میں چنیدہ اشیا کو میں اپنے مقصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔

کچن کے اندر اتنی گنجائش تھی کہ اس کی ایک دیوار کے ساتھ سلیپنگ بیگ کو بچھایا جاسکتا تھا۔ اس وقت رات کے دس بجنے والے تھے۔ کایا نے بیگ کو کچن میں پہنچا دیا تو میں نے اس سے کہا۔

''کایا! تم لیبارٹری میں جاکر اپنے کام سے لگ جاؤ۔ میں مہمان کی آخری خدمت کرکے تمہارے پاس آتا ہوں۔''

وہ کوئی سوال کیے بغیر وہاں سے چلی گئی۔

''تم لوگ کہاں سوگے؟'' چنگیز خان المعروف بہ مسٹر پیڈرو نے مجھ سے سوال کیا۔

میں نے جواب دیا۔ ''ہم نے اپنے لیے ادھر لیبارٹری کے اندر ہی سلیپنگ بیگ سیٹ کررکھے ہیں۔''

وہ اپنے سلیپنگ بیگ کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ''ڈاکٹر حارث! اب تم میری کون سی خدمت کرنے والے ہو؟''

میں نے ایک برتن میں نوڈلز کا پیکٹ پٹا مسالا اور پانی ڈال کر اسے چولہے پر چڑھا دیا اور چولہے کے شعلے کو دھیما رکھا۔ دراصل یہ کیروسین آئل سے جلنے والا ایک اسٹوو تھا لیکن اسے چولہا کہنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

''مسٹر پیڈرو! تم نے کھلی فضا میں اچھا خاصا وقت گزارا ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں کی ٹھنڈ تمہاری ہڈیوں میں رچ بس گئی ہوگی۔ اس وقت یہاں کا درجۂ حرارت منفی بیس ڈگری سینٹی گریڈ ہے۔ جوں جوں رات آگے بڑھے گی، درجۂ حرارت گرتا چلا

جائے گا۔ اس ہٹ کو ایک خاص تھرمل سسٹم کی مدد سے زندہ رہنے کے قابل بنایا گیا ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ سونے سے پہلے تم لوبسٹر کارن سوپ ضرور پیو.....''

''لوبسٹر (Lobster) کا سوپ!'' اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔ ''یہ جھینگا مچھلی تو بہت گرم تاثیر رکھتی ہے۔''

''لوبسٹر مچھلی ہے یا جھینگا، اس بحث میں پڑنے کا نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ ہی کوئی ضرورت۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''ہاں، دو پنجوں اور آٹھ ٹانگوں والا یہ سمندری جاندار پروں اور شرمپ (جھینگا) سے گہری مشابہت رکھتا ہے اور تاثیر میں بے انتہا گرم ہوتا ہے۔ اس کا سوپ تمہاری ہڈیوں میں بیٹھی ہوئی ٹھنڈ کو نکال دے گا۔ اگر تم نے یہ سوپ نہیں پیا تو صبح تک تمہارے تمام جوڑ جام ہوجائیں گے اور تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔''

''میں یہ سوپ ضرور پیوں گا۔'' وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا پھر اس نے سلیپنگ بیگ کے اندر گھسنے کے بعد اضافہ کیا۔ ''مجھے تو اب بھی اپنے جسم کی تمام ہڈیاں سن ہوتی محسوس ہو رہی ہیں۔''

''سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' میں نے اس کے لیے اسپیشل ڈش تیار کرتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔ ''یہ سوپ جیسے ہی تمہارے معدے میں اترے گا، تمہیں اپنے اندر طاقت اور توانائی کا ایک طوفان کروٹ لیتا محسوس ہوگا۔ ساری ہڈیاں اور جوڑ، تمام رگ اور پٹھے کسی جوان آدمی کی طرح ورکنگ کنڈیشن میں آجائیں گے۔''

''تھینک یو ڈاکٹر۔'' وہ ممنونیت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم بہت وضع دار میزبان ہو۔ تمہیں میری مجبوری اور ضرورت کا کتنا خیال ہے۔''

''مسٹر پیڈرو! تم ایک رات کے مہمان ہو۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں تمہاری خاطر اتنا تو کرہی سکتا ہوں۔''

وہ تشکرانہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''لوبسٹر کارن سوپ کا نام میں نے پہلی مرتبہ سنا ہے۔''

''یہ ایک بہت ہی اسپیشل سوپ ہے۔'' میں نے سوپ والے برتن میں چمچہ چلاتے ہوئے کہا۔ لمحاتی توقف کرکے میں نے چنگیز خان کی طرف دیکھا پھر مذکورہ نیم گرم سوپ کو ایک پیالے میں انڈیلنے کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''سوپ تیار ہے۔ تم نے آج پہلی بار لوبسٹر کارن سوپ کا نام سنا اور فوراً سے پیشتر تمہیں یہ سوپ پینے کو بھی مل گیا۔ انجوائے کرو۔''

''ویری گڈ.....'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں تمہارا احسان مند رہوں گا اور اس مہمان نوازی کو ساری زندگی یاد رکھوں گا۔''

''لو، اسے ایک ہی سانس میں حلق سے نیچے اتار لو۔'' میں نے پیالہ اس کی سمت بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اگر چسکیاں لینے لگے تو یہ ماحول کی ٹھنڈ کے باعث پیالے کے اندر ہی جم جائے گا۔ یہ اس وقت نیم گرم ہے۔ تم بہ آسانی اسے ایک ہی سانس میں پی لوگے۔''

وہ سلیپنگ بیگ کے اندر اٹھ کر بیٹھ گیا پھر میرے ہاتھ سے سوپ والا پیالہ لے کر اس نے منہ سے لگالیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ غٹاغٹ تمام سوپ پی گیا پھر خالی پیالہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''لوبسٹر کارن سوپ کا ذائقہ عجیب سا تھا۔ میں نے ایسا سوپ پہلے کبھی نہیں پیا۔''

''انسان زندگی میں کوئی بھی نیا کام پہلی مرتبہ ہی کرتا ہے۔'' میں نے سوپ والے پیالے کو کھنگال کر شیلف پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''پھر رفتہ رفتہ وہ اس چیز کا عادی ہوجاتا ہے۔ اب تم اس سلیپنگ بیگ کے اندر گہری نیند سوجاؤ..... میں بھی سونے جارہا ہوں۔ صبح ناشتے پر ملاقات ہوگی..... گڈ نائٹ!''

''گڈ نائٹ ڈاکٹر!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا اور چہرے کو سلیپنگ بیگ کے اندر چھپالیا۔

میں بڑے اطمینان کے ساتھ بیڈ روم کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

کایا میرے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو اس نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''کیا رہا.....؟''

''بندہ بڑے سکون سے سلیپنگ بیگ کے اندر گھس کر سو رہا ہے۔'' میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

''علی! وہ تمہارا شکار ہے۔'' وہ تشویش بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہم دونوں تو ادھر بیڈ روم کے اندر بند ہیں۔ اگر وہ ہٹ سے فرار ہوگیا تو.....؟''

''وہ کہیں نہیں جائے گا۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس ہٹ میں اس کے لیے جتنا آرام اور سکون ہے وہ باہر کی یخ بستہ ٹھنڈی ٹھار کھلی فضا میں کہاں، اگر اس کا فرار کا ارادہ ہوتا تو وہ ادھر کا رخ ہی کیوں کرتا.....؟'' لمحاتی توقف کرکے میں نے معنی خیز نظر سے اس کی طرف دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے اس کی جتنی خدمت کی ہے اس کے بعد تو وہ باقی کی زندگی اسی ہٹ میں مہمان بن کر رہنے کی خواہش کررہا ہوگا۔''

کایا نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میرے پراسرار انداز نے اس کے اندر کھلبلی مچادی تھی۔ بے حد تشویش بھرے لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''جب میں کچن سے نکلی تو تم نے کہا تھا کہ تم مہمان کی آخری خدمت کرنے کے بعد میرے پاس آؤ گے۔ بتاؤ، تم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟''

''میں نے لوبسٹر کارن سوپ سے اس کی تواضع کی ہے۔'' میں نے بتایا۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' اس نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''اس ہٹ میں نہ تو لوبسٹر ہے اور نہ ہی کارن.....؟''

''لوبسٹر کے بارے میں، میں نے اس چند گھنٹوں کے مہمان سے غلط بیانی کی ہے۔'' میں نے بہ دستور گمبھیر لہجے میں کہا۔

''اور کارن.....؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ''کارن بھی تو نہیں ہے اس ہٹ میں!''

''میں نے سوپ کے اندر خیالی لوبسٹر اور کارن فلور ڈالا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے علاوہ پانی اور نوڈلز کا مسالا.....''

''ایک منٹ!'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ ''اس ہٹ میں کارن، کارن فلور، کارن گرینز یا کارن آئل..... کچھ بھی نہیں ہے۔ کیا تم مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کررہے ہو؟''

''نہیں!'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''میں نے کارن فلور کا نعم البدل سوپ میں ڈالا تھا۔ وہ مجھے اسٹور روم میں ایک ڈبے میں رکھا ملا تھا۔ ہوسکتا ہے، اس ہٹ کی دیواروں کی فلنگ کے لیے کبھی یہاں لایا گیا ہو۔''

''تم کس آلٹرنیٹو کی بات کررہے ہو؟'' وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں بولی۔ ''میرے تو کچھ پلے نہیں پڑ رہا.....!''

''میں پی او پی (POP) کی بات کررہا ہوں۔'' میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کایا کو بتایا۔ ''میں نے کارن فلور کی جگہ سوپ میں پی او پی ڈال کر مہمان کو پلا دیا ہے۔''

''او مائی گاش.....!'' وہ متوحش نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولی۔ ''تم نے پلاسٹر آف پیرس (پی او پی) اسے پلا دیا ہے؟''

''یس!'' میں نے بڑی رسان سے جواب دیا۔

''پی او پی تو اس کے معدے میں پہنچتے ہی جم کر سخت ہوگیا ہوگا۔'' وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ''اس بڈھے کی موت تو اب یقینی ہے۔''

''درست کہا۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اس خبیث بڈھے کی موت کے یقینی ہونے میں تو کسی شک وشبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی لیکن یہ موت پی او پی سے واقع نہیں ہوگی۔ وہ میرا شکار ہے۔ میرے ہاتھوں سے مرے گا اور میری مرضی کے طریقے سے.....''

''کیا تم اس کے ساتھ اس سے زیادہ سنگین بھی کچھ کرنے والے ہو؟''

''یہ تو شروعات ہے کایا۔'' میں نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آگے آگے دیکھتی جاؤ، ہوتا ہے کیا۔ اس ہٹ میں کئی ایک ایسی بیکار چیزیں پڑی ہیں جنہیں کافی عرصے سے کام میں نہیں لایا گیا۔ ان میں سے بعض اشیا کو میں اس بڈھے پر آزماؤں گا۔ پی او پی تو اسٹارٹر کی حیثیت کا حامل ہے۔ اس کے بعد تو ایک سے بڑھ کر ایک ''لذیذ'' ڈش آنے والی ہے۔''

''تم اتنے سفاک اور ظالم بھی ہوسکتے ہو.....!'' وہ بے یقینی سے مجھے تکنے لگی۔

''چنگیز خان جیسے معاشرتی ناسوروں کے لیے میں ایسا ہی ہوں کایا۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایسے لوگوں کے لیے میرے دل میں کوئی نرمی نہیں ہے۔ چنگیز خان کوئی گلی محلے کا چھوٹا موٹا جرائم پیشہ شخص نہیں ہے۔ میں تمہیں اس شیطان کے بارے میں کافی کچھ بتاچکا ہوں۔ یہ بدنام زمانہ انٹرنیشنل اسمگلر ہے۔ انٹرپول کافی عرصے سے اس کی تلاش میں تھی۔ اس کی گرفتاری ایک انٹرنیشنل نیوز بن گئی تھی۔ یہ ترکی میں پکڑا گیا تھا لہٰذا اسے استنبول کی ایک جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ ترکی میں ڈرگ ٹریفکنگ کی سزا سب سے زیادہ سخت ہے۔ منشیات کے اسمگلر کو قاتل سے بھی زیادہ سنگین اور خطرناک مجرم سمجھا جاتا ہے۔ تم ذرا تصور کرو.....'' میں نے لمحاتی توقف کرکے گہری نظر سے کایا کو دیکھا پھر خواب ناک لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس بدبخت نے منشیات کی لعنت کو پوری دنیا میں پھیلا کر جن ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کی رگوں میں زہر بھرا ہے ان کا کیا قصور تھا؟ میں نے تو ابھی صرف اس کے معدے میں تھوڑا سا پی او پی ہی بھرا ہے۔ یہ مردود میری نظر میں کسی رحم، کسی معافی اور کسی نرمی کا مستحق نہیں۔ اس کا

عبرت ناک انجام میرا ذاتی مسئلہ بھی ہے۔ یہ میرے باپ کا قاتل ہے اور اسی نے میری ماں کی زندگی برباد کر ڈالی تھی۔ میں اس برف زار میں اس کا وہ بھیانک حشر کروں گا کہ مستقبل قریب کا کوئی مؤرخ اس کی موت کو قلم بند کرتے ہوئے کانپ اٹھے گا اور تم..... یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھو گی۔''

''علی.....!'' کایا نے چونک کر ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے اچانک اسے کوئی بات یاد آگئی ہو۔ ''اسٹور روم کے اندر اسلحے کی اچھی خاصی مقدار رکھی ہوئی ہے۔ اگر اس بڈھے نے وہاں سے کوئی خطرناک گن اٹھالی اور اس کے بل بوتے پر ہمیں زیر کرنے کی کوشش کی تو.....''

''وہ ایسا نہیں کرسکتا۔'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی چٹانی لہجے میں کہا پھر جیب سے ایک چابی نکال کر اسے دکھاتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''میں نے اسٹور روم کو لاک کر دیا ہے۔ اگر چنگیز خان نے اس کے بند دروازے پر طبع آزمائی کرنے کی کوشش کی تو میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پینگوئن، اسکوا اور البٹر اس کو کھلا دوں گا۔ وہ میرا شکار ہے اور میں اس کا شکاری اور..... آج رات کی یہی سب سے بڑی حقیقت ہے۔''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر بیڈ روم کے باہر چنگیز خان کی اذیت ناک آواز ابھری۔ ''ڈاکٹر..... دروازہ کھولو۔ میرے پیٹ میں شدید تکلیف ہے.....''

بات کے اختتام پر اس نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے معنی خیز نظر سے کایا کی جانب دیکھا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بڈھے کو تیار کرنے کا وقت آگیا ہے.....!''

''کیسی تیاری؟'' وہ تذبذب بھری نگاہ سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ بیڈ روم کے دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی پھر چنگیز خان کرب بھرے لہجے میں بولا۔

''ڈاکٹر..... پلیز میری مدد کرو۔ میں درد سے مرا جارہا ہوں۔''

''میں اس خبیث بڈھے کی مدد کرنے جارہا ہوں۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور اس کام میں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی کیونکہ تم ایک تجربہ کار نرس ہو۔ میں اس کا آپریشن کروں گا اور بعد از جراحی کے معاملات تمہیں دیکھنا ہیں۔ ٹھیک دس منٹ کے بعد تم بھی کچن میں آجانا۔''

''او کے.....!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''مسٹر پیڈرو!'' میں نے دروازے کی سمت منہ کر کے بہ آواز بلند کہا۔ ''تم کچن میں پہنچو۔ میں آرہا ہوں۔ میں تمہارے درد کا شافی علاج کردوں گا۔''

''تمہارے ارادے مجھے خاصے خطرناک لگ رہے ہیں.....'' وہ متوحش نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''نیک لوگوں کے لیے میرے دل میں نیک ارادے جنم لیتے ہیں اور بدافراد کے لیے بدترین۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''تم نے آج تک نامور اور تجربہ کار ڈاکٹروں کے ساتھ کام کیا ہے۔ آج ایک صد فیصد تکنیکی جنگلی ڈاکٹر کا کمال دیکھنا.....!''

میں بیڈ روم سے نکل کر کچن میں آگیا۔ میری ہدایت پر چنگیز خان مجھ سے پہلے وہاں پہنچ چکا تھا۔ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''کیا ہوا مسٹر پیڈرو.....؟''

وہ اپنے پیٹ کو سہلاتے ہوئے اذیت بھری آواز میں بولا۔ ''یہاں شدید قسم کی تکلیف ہو رہی ہے۔''

''تم لیٹ جاؤ۔'' میں نے ایک ماہر ڈاکٹر کے انداز میں کہا۔ ''میں چیک کرتا ہوں۔''

وہ کسی روبوٹ کے مانند حرکت کرتے ہوئے سلیپنگ بیگ کے اوپر ہی دراز ہوگیا۔ میں نے اس کے نزدیک بیٹھ کر اس کے پیٹ کے اوپر سے گرم لباس کو ہٹایا پھر پیٹ کے مختلف حصوں کو دبا کر ''چیک'' کرنے لگا۔

''یہ تو پتھر کی طرح سخت ہو رہا ہے۔'' میں نے تشویش آمیز انداز میں کہا۔ ''مجھے تو یہ موسم اور آب و ہوا کا اثر لگتا ہے۔ اس ہٹ میں جب میں نیا نیا آیا تھا تو مجھے بھی اسی نوعیت کی تکلیف ہوئی تھی لیکن تم فکر نہیں کرو۔ میں تمہیں ایک زود اثر مکسچر پلاؤں گا جس سے پیٹ کی سختی رفتہ رفتہ کم ہوجائے گی۔ ہمیں بھی ہفتے میں ایک دو بار یہ دوا... استعمال کرنا پڑتی ہے۔ اس کا ذائقہ اچھا نہیں ہے مگر یہ تمہیں تکلیف سے نجات دلا دے گی۔''

''ذائقے کو گولی مارو ڈاکٹر.....'' وہ درد کی شدت سے دُہرا ہوتے ہوئے کراہا۔ ''تم جو بھی دوا مجھے پلاؤ گے، میں پی لوں گا۔''

''شاباش!'' میں نے اس کا پیٹ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''میں مکسچر لے کر آرہا ہوں۔ تم اٹھ کر بیٹھ جاؤ۔''

پھر میں چنگیز خان کو وہیں سلیپنگ بیگ کے اوپر

تکلیف میں مبتلا چھوڑ کر اسٹور روم میں آیا اور ایک لیٹر والی کانچ کی بوتل اٹھا کر واپس اپنے ''مریض'' کے پاس پہنچ گیا۔ مذکورہ بوتل گردن تک ایک بے رنگ محلول سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے وہ بوتل چنگیز خان کی جانب بڑھاتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''اگر تم چاہتے ہو کہ پیٹ کی تکلیف سے تمہیں چھٹکارا مل جائے تو آنکھیں بند کر کے اس بوتل کے مکسچر کو غٹا غٹ پی جاؤ۔''

''پوری بوتل ایک ساتھ.....؟'' اس نے ایک ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

دوسرے ہاتھ سے اس نے اپنے پتھر کے مانند پیٹ کو دبا رکھا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ٹھوس لہجے میں سوال کیا۔

''تم اپنے پیٹ کے درد کو ایک ساتھ ہی رفع کرنا چاہتے ہو یا قسطوں میں؟''

''ایک ساتھ.....'' وہ جلدی سے بولا۔

''بس تو پھر پوری بوتل ایک ساتھ۔''

اس نے بوتل میرے ہاتھ سے لے لی پھر منہ کی طرف لے جاتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''اس مکسچر میں سے تو مٹی کے تیل جیسی بو آرہی ہے.....''

میرے جی میں تو آئی کہ کہہ دوں..... ''گدھے کے بچے! یہ مٹی کا تیل ہی تو ہے۔'' لیکن میں نے ایسا نہیں کہا اور ''ٹام اینڈ جیری'' کے کھیل کو آگے بڑھاتے ہوئے اس کی تسلی کے لیے بتایا۔

''مسٹر پیڈرو! میں تمہاری سونگھنے کی حس کو چیلنج نہیں کروں گا۔ تمہاری ناک کے سگنل ایک دم درست ہیں لیکن اس بوتل کے اندر مٹی کا تیل نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جن جڑی بوٹیوں سے یہ مکسچر تیار کیا گیا ہے وہ صرف ایسے علاقے میں اگتی ہیں جہاں زمین کے نیچے یا اردگرد تیل کے ذخائر موجود ہوں اس لیے اس مکسچر کے اندر ایسی بو شامل ہوگئی ہے۔ ویسے اگر تمہارے ذہن میں شک والی کوئی بات ہے تو بوتل مجھے واپس دے دو اور.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے سفاک لہجے میں اضافہ کیا۔

''اور پیٹ پکڑ کر تکلیف کی شدت کے باعث چیختے چلاتے رہو۔''

چنگیز خان کے معدے میں پی او پی پوری طرح جم کر پتھر کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اس عظیم سختی کی وجہ سے اس کے پیٹ میں شدید نوعیت کی اینٹھن ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے زندگی میں اس نے کبھی ایسی تکلیف نہیں سہی ہوگی۔ وہ جس مشکل صورتِ حال سے دوچار تھا اس نے چنگیز خان کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا۔

''نہیں، نہیں..... میں اس دوا... کو پی رہا ہوں..... مجھے اس ظالم درد سے نجات چاہیے اور اس مقصد کے لیے میں کچھ بھی کرسکتا ہوں.....''

پھر اپنی آنکھیں بند کر کے ایک ہی سانس میں کیروسین آئل (مٹی کے تیل) کی پونی بوتل کو زود اثر نجات دہندہ دوا سمجھ کر اپنے معدے میں اتار لیا۔

اسی وقت کایا بھی کچن میں پہنچ گئی۔

میں نے خالی بوتل چنگیز خان کے ہاتھ سے لے کر کایا کی جانب بڑھاتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

''میں نے مسٹر پیڈرو کو ایک خاص الخاص دوا... پلا دی ہے۔ اب یہ تھوڑی دیر میں ٹھیک ہوجائے گا۔''

کایا نے بوتل کو ہاتھ میں لے کر سونگھا تو وہ گھور کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کچھ کہتی، ایک مکروہ آواز کے ساتھ چنگیز خان نے قے کر دی۔

اس قے نے چنگیز خان کے لباس کو خراب کر دیا تھا۔ میں نے قے کی برآمدات کا جائزہ لیا۔ اس کے اندر کھانے کی مختلف اشیا کے ٹکڑے دکھائی دے رہے تھے لیکن پی او پی نے اس کے معدے کے اندر جو ''وہائٹ ہاؤس'' تعمیر کیا تھا، اس کی ٹوٹ پھوٹ کے آثار کہیں نظر نہیں آتے تھے۔ ابھی قے میں جو کچھ نکلا تھا اس میں غالب حصہ اسپیشل دوا... (کیروسین آئل) کا تھا اور خوراک کے وہ ذرات تھے جو وہائٹ ہاؤس کا حصہ بننے سے رہ گئے تھے۔

''لگتا ہے، مکسچر نے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اب تھوڑی ہی دیر میں مسٹر پیڈرو کی تکلیف غائب ہوجائے گی۔''

پھر میں نے کایا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم پیڈرو کا خیال رکھو۔ میں اس کے آرام کا بندوبست کرتا ہوں.....''

میں ایک مرتبہ پھر اسٹور روم میں گھس گیا۔ اب کی بار جو میں باہر نکلا تو میرے ساتھ کنڈوں والا لکڑی کا تختہ، ایک مضبوط رسی، موم لگی ڈوری اور ماسکنگ ٹیپ بھی تھا۔ ماسکنگ ٹیپ (Masking Tape) کو عموماً کارٹن کی پیکنگ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ماسکنگ ٹیپ کی گرفت بڑی مضبوط ہوتی ہے۔

کایا میرے ارادوں کو کماحقہ، بھانپ چکی تھی لہٰذا اس کے فرنچ کٹ ہونٹوں پر ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ میں نے تمام سامان کو کچن کے ایک کونے میں رکھا پھر شیلف کی جانب

بڑھ گیا۔ شیلف کے اوپر سے میں نے دو ماچس کی ڈبیا اٹھا کر اپنی جیب میں ڈالیں اور وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔

''مسٹر پیڈرو! اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

''اس الٹی نے میرے حلق میں مرچیں بھر دی ہیں۔'' وہ بے چارگی سے بولا۔

''اور تمہاری دوا نے میری سانسوں میں مٹی کے تیل کی بو بسا دی ہے لیکن پیٹ کا درد جوں کا توں ہے۔ یہ تکلیف اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی۔''

''اور کمپنجر پلاؤں؟'' میں نے بے حد سفاکی سے پوچھا۔

''نہیں..... ہرگز نہیں۔'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔

''ادمائی گاڈ.....'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ کایا نے پوچھا۔ ''کیا ہوا علی؟''

''یہ گتے کا ڈبا دیکھو.....'' میں نے شیلف کے اوپر سے ایک ڈبا اٹھا کر کایا کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے متوحش لہجے میں کہا۔

''یہ تو پلاسٹر آف پیرس والا ڈبا ہے.....'' کایا نے کہا پھر مصنوعی حیرت سے پوچھا۔ ''کیا ہوا اس ڈبے کو؟''

''میں نے..... مسٹر پیڈرو کے سوپ میں.....'' میں نے دھماکا کرتے ہوئے بتایا۔ ''کارن فلور کی جگہ غلطی سے پلاسٹر آف پیرس ڈال دیا تھا.....!''

''کیا بکواس کر رہے ہو ڈاکٹر!'' چنگیز خان سلیپنگ بیگ کے اوپر اس طرح اچھلا جیسے کسی نے اس کی تشریف پر گیارہ ہزار وولٹ کا کرنٹ لگا دیا ہو۔ ''الو کے پٹھے..... تم نے مجھے سفید سیمنٹ پلا دیا جو میرے معدے میں پہنچ کر جم چکا ہے۔ تم کو کس گدھے نے ڈاکٹر بنایا ہے؟''

''اس گدھے کا نام ہے چنگیز خان.....!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اور وہ گدھے تم ہو..... میں تمہاری خاطر صرف ایک رات کے لیے ڈاکٹر بنا ہوں.....''

''کون ہو تم؟'' وہ بے حد محتاط اور سہمی ہوئی نظر سے مجھے گھورنے لگا۔ ''مجھے کیسے جانتے ہو.....؟''

''حیدر علی کا نام سنا ہے تم نے؟'' میں نے اس کے قریب آتے ہوئے بے رحم لہجے میں سوال کیا۔

''مجھے تمہارے چہرے میں اس کی جھلک نظر آئی تھی۔'' وہ بے حد حیران لہجے میں بولا۔ ''اسی لیے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے مگر وہ تو.....''

''وہ تو کیا.....؟'' وہ بولتے بولتے رکا تو میں نے کڑوے لہجے میں پوچھا۔ ''تم یہی کہنا چاہتے ہو نا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ تم نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا.....؟''

اس کی آنکھوں میں خوف امڈ آیا۔ ''مم..... مگر تم کون ہو؟'' اس نے بکھری ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''خچر الاخچار! میں حیدر علی کی روح ہوں۔'' میں نے چنگیز خان کے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کرتے ہوئے خوں خوار لہجے میں کہا۔ ''میں نے تمہارے ایک ساتھی کے ڈی خان کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھجوا دیا ہے۔ اس کی بیوی سلطانہ آج کل کراچی کی گلیوں میں بھیک مانگتی پھر رہی ہے۔ تمہارے دوسرے ساتھی جابر فیضی کا بھی بڑا حسرت ناک انجام ہونے والا ہے۔ محتسب اعلیٰ کے حضور جابر فیضی کے خلاف بہت ساری فائلیں کھل چکی ہیں۔ اب وہ وقت دور نہیں جب فیضی کی سیاست کا بھٹا بیٹھ جائے گا مگر مجھے کے ڈی خان اور فیضی سے کوئی سروکار نہیں۔ میرا اصل ٹارگٹ تم ہو چنگیز خان جس نے میرے باپ کو قتل کیا اور میری ماں کو ذلت و رسوائی کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور کیا۔''

''کک..... کیا تم حیدر علی اور سلمیٰ کی اولاد ہو.....؟'' وہ بے یقینی سے مجھے تکنے لگا۔

''ہاں! میرا نام اسد علی ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا۔ ''میں پچھلے بیس سال سے انتقام کی آگ میں جل رہا ہوں اور آج یہ عظیم آگ ٹھنڈی ہو جائے گی..... انار کلی کے برف زار سے نہیں بلکہ تمہاری موت سے۔''

''کیا یہ براعظم انار کلی کا ہے.....؟'' اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا۔

''ہاں! یہ سرد جہنم ہے۔'' میں نے نفرت بھری نظر سے اسے گھورا۔ ''اور یہاں سے میں تمہیں بھڑکتے ہوئے گرم جہنم میں شفٹ کرنے والا ہوں۔''

اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ میری دھمکی خالی خولی نہیں ہے۔ میں جو کہہ رہا ہوں وہ کر بھی دکھاؤں گا۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''مگر حیدر علی کی تو کوئی اولاد نہیں تھی.....!''

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے اور اس غلط فہمی کو آج میں تمہارے بدن کے ہر چھوٹے بڑے سوراخ سے نکال باہر کروں گا۔'' میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''کوئی نہیں جانتا کہ میری ماں نے ایک سال کی عمر میں مجھے تم جیسے شیطانوں کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے امریکا بھجوا دیا تھا۔ میری

پرورش اور تعلیم و تربیت امریکا میں ہوئی ہے اور میں وہاں کا سٹیزن بھی ہوں۔ میرے چند بااثر خیر خواہوں نے تمہیں ترکی کی جیل سے نکال کر یہاں پہنچایا ہے۔ تم ان کی طرف سے میرے لیے ایک تحفہ ہو اور..... آج کی رات میں اس تحفے سے انجوائے کروں گا۔''

صورتِ حال کی نزاکت کو اس نے اچھی طرح بھانپ لیا تھا۔ اسے بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ میں اسے چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ موقع محل کی مناسبت سے وہ منت سماجت پر اتر آیا۔

''بیٹا.....!''

اس نے بولنا شروع کیا ہی تھا کہ میں نے اس کے منحوس چہرے پر ایک ٹھڈا رسید کیا۔ ''مجھے بیٹا مت کہو گندی نالی کے کیڑے ورنہ میں تمہاری زبان کو گدی سے کھینچ لوں گا۔''

وہ منشیات اور گولڈ کا انٹرنیشنل اسمگلر تھا۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا تھا اور بھانت بھانت کے لوگوں کو اس نے انگلیوں پر نچایا تھا۔ اس نے ایک زمانہ، ایک دنیا دیکھ رکھی تھی لیکن ان بے رحم لمحات میں، میں اسے جس دنیا کی سیر کرانے کا ارادہ رکھتا تھا وہ اس کی برداشت سے باہر تھی۔ اپنے سامنے مجسم موت کو کھڑے دیکھ کر اس کا پتا پانی ہو رہا تھا۔

''مجھے سلمیٰ بہن کے پاس لے چلو۔'' وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر منت ریز لہجے میں بولا۔ ''میں اس کے قدموں پر سر رکھ کر رحم کی بھیک مانگوں گا.....''

''سلمیٰ بہن!'' میں نے دانت کچکچائے اور اس لعین کے تھوبڑے پر طوفانی مکوں کی برسات کر دی۔ ''تم کس منہ سے میری ماں کو بہن کہہ رہے ہو؟ کیا کوئی بھائی اپنی بہن کی عزت کا سودا کرتا ہے، اسے بدی کی راہ پر چلنے کے لیے مجبور کرتا ہے؟'' مجھ پر ایک جنون سا سوار ہو گیا تھا۔ ''میری ماں ایک عظیم عورت تھی۔ اگر آج وہ زندہ ہوتی اور تم اسی طرح گڑگڑا کر اس سے زندگی کی بھیک مانگتے تو عین ممکن تھا، وہ تمہیں معاف کر دیتیں لیکن میں ہرگز ہرگز تمہیں معاف نہیں کر سکتا.....'' پھر میں کایا کی جانب متوجہ ہوا۔

''کایا!'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''مریض کے آپریشن کا وقت ہو گیا ہے۔ کیا تم تیار ہو؟''

''یس سر!'' وہ ایک مستعد اسسٹنٹ کی طرح جلدی سے بولی۔

''تختے کو سلیپنگ بیگ کے برابر میں بچھا دو۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''چنگیز خان کے معدے میں، معدے ہی کے سائز کی پتھری ہوئی ہے۔ مجھے اس کا پیٹ چاک کرنا پڑے گا۔''

''پلیز..... مجھے معاف کر دو۔'' وہ میرے پاؤں کو چھو کر منت سماجت کرنے لگا۔ ''مجھے سلمیٰ کے پاس لے چلو۔ میں.....''

''میں نے کہا نا، میری ماں اب اس دنیا میں باقی نہیں ہے۔'' میں نے نفرت بھرے انداز میں اس کے منہ پر تھوک دیا۔ ''ایک مکار اسٹیٹ ایجنٹ نادر شاہ نے دولت کے لالچ میں میری ماں کی ٹارگٹ کلنگ کروا دی ہے۔ میں نے نادر شاہ کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ تاریخ کی کتابوں میں لازمی رقم کیا جائے گا تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت اس سے درسِ عبرت حاصل کیا جا سکے اور اب..... تمہاری باری ہے۔''

یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ ہزار منت خوشامد کے باوجود بھی میرے دل و دماغ میں اس کے لیے شمہ بھر گنجائش نہیں نکالی جا سکتی، چنگیز خان نے اٹھ کر دروازے کی جانب دوڑ لگا دی۔ اس کے پاس اپنے بچاؤ کا صرف یہی ایک راستہ بچا تھا۔

بھلا میں اسے فرار کی اجازت کیسے دے سکتا تھا۔ میں نے بجلی کی سرعت سے حرکت کر کے اس کی ٹانگوں میں ٹانگ پھنسا دی۔ اگلے ہی لمحے وہ منہ کے بل ٹھنڈے ٹھار فرش پر پڑا تکلیف کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ انسان کی

تبدیل

بات یہ ہے کہ بہت کم لوگ جی داری سے ادھیڑ پن کا مقابلہ کر پاتے ہیں۔ غبی ہوں تو اس کے وجود سے ہی منحرف اور ذرا ذہین ہوں تو پہلا سفید بال نظر پڑتے ہی اپنی کایا کو ماضی کی اندھی سرنگ کے خنک اندھیروں میں ٹھنڈا ہونے کے لیے ڈال دیتے ہیں اور وہاں سے نکلنے کا نام نہیں لیتے جب تک کہ وقت ان کے سروں پر برف کے گالے نہ بکھیر دے۔ بال سفید کرنے کے لیے اگرچہ کسی تیاگ اور تپسیا کی ضرورت نہیں۔ تاہم ایک رچی بسی باوقار سپردگی کے ساتھ بوڑھے ہونے کا فن اور ایک آن کے ساتھ پسپا ہونے کے پینترے بڑی مشکل سے آتے ہیں اور ایک بڑھاپے پر ہی موقوف نہیں، حسن اور جوانی سے بہرہ یاب ہونے کا سلیقہ بھی کچھ کچھ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب واہ ایک گہری آہ اور آہ ایک لمبی کراہ میں بدل چکی ہوتی ہے۔

PakiBooks.Site

یہ فطرت ہے کہ وہ بڑی مصیبت کے نازل ہوتے ہی چھوٹی پریشانی کو بھول جاتا ہے۔ اگر آپ اپنے گھٹنے کی تکلیف سے پریشان ہوں اور اسی وقت آپ کے کان یا دانت میں درد جاگ اٹھے تو گھٹنے کی تکلیف کا احساس فوراً سے پیشتر زائل ہوجائے گا۔ ان نازک گھڑیوں میں چنگیز خان کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ میں تابڑتوڑ حملوں کی مدد سے اسے جس اذیت سے گزار رہا تھا ان لمحات میں وہ اپنے پیٹ کی اینٹھن کو فراموش کر بیٹھا تھا۔

وہ بہ مشکل تمام کچن کے فرش سے اٹھا اور دوبارہ دروازے کی طرف کا رخ کیا۔ میں نے ایک اسٹیپ لے کر اس کی پشت پر ایک زوردار کک رسید کردی۔

غم وغصے نے میری کک کے اندر اتنی زیادہ توانائی بھر دی تھی کہ چنگیز خان کسی حقیر تنکے کے مانند اڑ کر کچن کی چوبی دیوار سے جا ٹکرایا پھر زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''اپنے پیٹ کے اندر چند گھنٹوں کی پرگینسی کو لے کر کہاں جارہے ہو؟ پی او پی کی گوری چٹی اولاد کی ڈیلیوری اسی میٹرنٹی ہوم میں ہونا ہے..... ڈاکٹر حارث علی کے ہاتھوں!''

میں نے اپنے ظالمانہ رویّے سے اس کے فرار کے تمام دروازے بند کردیے تھے۔ میرے جابرانہ انداز نے اس کے بچاؤ کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' ایسی صورتِ حال سے دوچار تھا۔ اس نے ''مرتا، کیا نہ کرتا'' کے مصداق ایک مرتبہ پھر بھاگنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے لات گھونسوں پر رکھ لیا۔

میرے سابق دھواں دھار حملوں نے اس کا چہرہ لہولہان کر رکھا تھا۔ میں نے ستیاناس پر اکتفا نہیں کیا اور چنگیز خان کا سواستیاناس مارنے میں لگ گیا۔ جب انسان کا حوصلہ ٹوٹ جائے، امید بجھ جائے اور سامنے سفاک موت کھڑی نظر آئے تو پھر وہ کسی مزاحمت کے قابل نہیں رہتا۔ وہ بھی اسی قسم کے حالات سے دوچار تھا۔

مجھ سے بری طرح پٹنے کے بعد وہ چاروں خانے چت ہوکر ہانپنے لگا۔ میں ایک بار پھر اسے اپنے زوردار ٹھڈوں پر رکھنا چاہتا تھا کہ مجھے اپنے عقب میں کایا کی آواز سنائی۔

''علی! تمہارے لیے بہت زیادہ فزیکل ایکسرسائز مناسب نہیں ہے۔''

میں فوراً سے پیشتر اس کے اشارے کو سمجھ گیا۔ میں نے مڑکر اس کی طرف دیکھا پھر گہری سنجیدگی سے کہا۔

''اوکے میم..... آؤ، میری مدد کرو۔ اس ناپاک جانور کو تختے پر لٹانا ہوگا تاکہ میں اپنا کام شروع کرسکوں۔''

وہ چپ چاپ میرے نزدیک چلی آئی۔ پھر ہم دونوں نے ڈنڈا ڈولی کرکے چنگیز خان کو اٹھا کر چوبی تختے پر ڈال دیا۔ اس کی حالت دیدنی تھی۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ میں اس کا پیٹ پھاڑنے کا ارادہ رکھتا ہوں لیکن میری پلاننگ کچھ اور ہی تھی۔ میں تختے کے قریب ہی بیٹھ گیا اور کایا سے پوچھا۔

''تمہارا وہ میگنم ریوالور کہاں ہے جس سے اب تک تم درجن بھر سے زیادہ بندے پھڑکا چکی ہو؟''

''وہ ادھر بیڈروم..... میرا مطلب ہے، لیبارٹری کے اندر رکھا ہے۔''

''لیبارٹری، لیبارٹری بہت کھیل لیا۔'' میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''تم بیڈروم میں جاؤ اور میگنم 44 کولٹ ریوالور لے آؤ۔''

کایا نے کوئی سوال کیے بغیر فوراً میرے حکم کی تعمیل کردی۔ چنگیز خان نے کایا کے ہاتھ میں خطرناک اینا کونڈا ریوالور دیکھا تو وہ رحم طلب انداز میں گھگیایا۔

''پلیز..... مجھے مت مارو۔ تم جو کہو گے، میں کرنے کو تیار ہوں۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر پوچھا۔ ''پکا؟''

''بالکل پکا!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''بتاؤ، مجھے کیا کرنا ہے۔ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''میں چاہتا ہوں.....'' میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ''تم ایک منٹ کے اندر خود ہی غیرت سے مرجاؤ تاکہ مجھے تمہارے پلید خون سے اپنے ہاتھ گندے نہ کرنا پڑیں۔''

''یہ کیا بکواس ہے؟'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''ابھی بتاتا ہوں۔'' میں نے کھا جانے والی نظر سے چنگیز خان کو گھورا پھر کایا کی جانب دیکھتے ہوئے سنگین لہجے میں اضافہ کیا۔

''میں اپنا کام شروع کررہا ہوں۔ اگر یہ غلیظ حیوان میرے کام میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کرے تو میرے آرڈر کا انتظار نہیں کرنا۔ تم نے فوراً اسے 44 کیلیبر کی گولی سے اڑا دینا ہے۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا؟''

''اچھی طرح سمجھ گئی۔'' اس نے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹایا پھر اپنا کونڈا کی چار انچ لمبی خوفناک نال کا رخ چنگیز خان کی جانب موڑتے ہوئے بڑی دلیری سے بولی۔ ''تم بے فکری سے اپنے کام میں مصروف ہوجاؤ۔ میں اپنے فرض سے کوتاہی نہیں کروں گی۔ اگر اس خبیث بڈھے نے چوں

بھی کی تو میں میگنم کا پورا چیمبر اس کے ناپاک وجود میں اتار دوں گی۔''

''جیو شیر کی بچی!'' میں نے ستائشی نظر سے کایا کی طرف دیکھا۔ ''مجھے تم سے ایسی ہی بہادری کی توقع تھی۔''

پھر میں نے ماسکنگ ٹیپ کا رول اٹھالیا اور ساڑھے تین ہزار سال پیچھے چلا گیا۔ یہ فرعون کا دور تھا۔ میں نے ماسکنگ ٹیپ کی مدد سے چنگیز خان کو ممی بنانے کا عمل شروع کردیا۔ سب سے پہلے میں نے اس کے دونوں بازوؤں کو پہلو سے لگا کر پاؤں سے گردن تک اس کے بدن پر ماسکنگ ٹیپ لپیٹ دی۔ پھر سر کی باری آئی۔ لگ بھگ پندرہ منٹ کی کارگزاری کے بعد میں نے چنگیز خان کو ایک غیر مصری ممی میں تبدیل کردیا۔ صرف اس کے جسم کے چار حصوں کو میں نے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ نمبر ایک، اس کی عیاش آنکھیں..... تاکہ اس کی موت سے پہلے میں وہاں ابھرنے والے بے کسی، بے بسی اور بے چارگی کے تاثرات کو دیکھ کر اپنا کلیجا ٹھنڈا کرسکوں۔ نمبر دو، اس کے نامراد کان..... تاکہ میری زبان سے خارج ہونے والے تیزاب آلود الفاظ اس کی سماعت کو گلا کر رکھ دیں۔ نمبر تین، اس کی کمینی ناک..... تاکہ وہ اپنے گوشت کے جلنے کی بدبو کو سونگھ سکے۔ نمبر چار، اس کا منحوس منہ..... تاکہ میں اپنے کام کو فائنل ٹچ لگا سکوں.....''

میں نے کھانا پکانے والی لکڑی کی ڈوئی (چھوٹا چمچہ) کو کسی ای این ٹی اسپیشلسٹ کے ٹنگ ڈیپریسنٹ کی طرح استعمال کرکے چنگیز خان کا منہ کھلوایا پھر آدھی بوتل کیروسین آئل کی اس کے حلق میں انڈیل دی۔ دیسی ٹنگ ڈیپریسنٹ (Tongue depressant) یعنی لکڑی کی ڈوئی نے بہت اچھا کام کیا تھا۔ کیروسین آئل کو حلق سے گزر کر معدے تک پہنچنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔

اب کی بار اس نے قے نہیں کی۔ شاید اس کے معدے نے بھی حالات کی سنگینی کو محسوس کرکے اپنی ''زبان'' پر ''تالا'' ڈال لیا تھا اور کوئی صدائے احتجاج بلند کرنے کے بجائے اس نے خود کو وقت کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تھا۔

میں نے موم نگی ڈوری کو دہرا، تہرا اور چوہرا کرکے اس کی ایک بتی سی بات لی۔ اس ایک فٹ طویل بتی کو میں نے ٹنگ ڈیپریسنٹ کی مدد سے چنگیز خان کے حلق میں اتارا اور اس کا دو انچ کا ایک سرا منہ سے باہر رہنے دیا۔ اس کے بعد میں نے اس کے ہونٹوں کو بھی ماسکنگ ٹیپ سے سیل بند کردیا۔ اس دوران میں، میں اپنا غصہ نکالنے کے لیے اس شیطان کو ماڈرن اینڈ کلاسیکل مغلظات میں بھی تولتا چلا جارہا تھا۔

سب سے آخر میں، میں نے چنگیز خان کی ممی کو مضبوط رسی کی مدد سے چوبی تختے پر کس کر باندھ دیا پھر کایا کی طرف دیکھتے ہوئے گمبھیر انداز میں کہا۔

''جنازہ تیار ہے۔ آؤ، اسے اٹھا کر باہر لے چلیں۔ یہ اس قابل تو نہیں کہ اس کی نمازِ جنازہ ادا کی جائے۔ ہاں، البتہ راس آئی لینڈ کے برفیلے میدان میں اس کی چتا ضرور جلائی جاسکتی ہے۔''

کایا نے میری بھرپور مدد کی اور ہم دونوں چنگیز خان کی ''ممی میت'' کو اٹھا کر ہٹ سے باہر نکل آئے پھر پچاس قدم آگے جاکر میں نے تختے کو نیم بستہ برفیلی زمین پر رکھ دیا۔ اس کے بعد میں نے جیب سے ماچس نکالی اور چنگیز خان کے ہونٹوں سے باہر نکلی ہوئی دو انچ لمبی بتی کو آگ دکھادی۔

میرا انداز مع جلانے کا ساتھا لیکن بعد میں نے چنگیز خان کی زندگی کا چراغ گل کرنے کا اہتمام کردیا تھا۔ ان لمحات میں چنگیز خان کی آنکھوں میں پھیلی ہوئی وحشت اور دہشت الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہے۔ آپ اگر میرے بیان کو ذہن میں رکھ کر چشم تصور کو تھوڑی سی زحمت دیں گے تو یہ عبرت ناک منظر آپ کے دماغ میں روشن ہوجائے گا۔

میری نگاہ میں چنگیز خان اس سے زیادہ برے سلوک کا مستحق تھا مگر میں نے اپنی بساط اور اوقات کے مطابق اسے ''خراجِ تحسین'' پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر چوبی تختے اور چنگیز خان کے لباس پر کیروسین آئل نہ گرا ہوا ہوتا تو موم چڑھی بتی کے شعلے نے دھیرے دھیرے اس کے منہ کے اندر پہنچ کر حلق تک رسائی حاصل کرنا تھی لیکن یہ ''دھیرے دھیرے'' دیکھتے ہی دیکھتے آناً فاناً میں بدل گیا اور سرکش آگ نے چنگیز خان کی ممی سمیت چوبی تختے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس برف زار نے اپنی زندگی میں ایسا نظارہ کاہے کو دیکھا ہوگا۔

آگ کی خوفناک لپٹیں اپنی گرفت میں آئی ہوئی ہر شے کو جلا کر خاکستر کرنے میں تندہی سے مصروف تھیں۔ وہاں کی فضا میں انسانی گوشت کے جلنے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں چنگیز خان کی چتا سے چند قدموں کی دوری پر کھڑا اپنے کلیجے میں ٹھنڈک اتار رہا تھا۔ آج میں نے اپنے باپ کی دردناک موت اور اپنی ماں کی ذلت آمیز بربادی کا انتقام لے لیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ روزِ محشر جب مجھے اٹھایا جائے گا اور اپنے والدین سے جب میرا سامنا ہوگا تو میری نگاہ

ندامت کے بوجھ سے جھکے گی نہیں بلکہ میرا سر فخر سے بلند ہوجائے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ چنگیز خان میرا دشمن نمبر ون تھا اور میں نے اس کا حساب چکتا کردیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے ان ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کا بھی انتقام لے لیا تھا جو چنگیز خان کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئے تھے۔ کسی ایک شخص نے تو چنگیز خان کو اس بھیانک انجام تک پہنچانا تھا اور خوش قسمتی سے قدرت نے یہ موقع مجھے فراہم کردیا تھا۔

''سب ختم ہوگیا علی!'' مجھے اپنے پہلو میں کایا کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''آؤ، اب ہٹ میں چلتے ہیں۔''

میرے رگ و پے میں اس قدر شانتی بھر گئی تھی کہ میں نے کوئی سوال کیے بغیر کایا کے سنگ ہٹ کی جانب قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

رات نے اپنی آخری منزل پر قدم رکھ دیا تھا۔ میں آنکھیں موندے کایا کی گود میں کچھ اس انداز سے لیٹا ہوا تھا کہ میرا سر اس کی ران کے اوپر رکھا تھا اور وہ اپنے گھٹنے کی مخصوص حرکت سے مجھے بڑا فرحت بخش جھولا دے رہی تھی جیسے مائیں اپنے بچوں کو سلانے کے لیے کرتی ہیں۔ کایا کا یہ دلار بھرا عمل مجھے بہت اچھا محسوس ہو رہا تھا۔ اچانک اس نے میرے کالر کے اندر ہاتھ ڈال کر میری پیٹھ کو سہلانا شروع کردیا۔ آپوں آپ میرا دھیان بینا کی طرف چلا گیا۔

چند روز پیشتر سی سائڈ والے اپارٹمنٹ میں ایک رات بینا نے بڑی کاریگری کے ساتھ اپنے ایک بازو کو میری کمر کے نیچے سے گزار کر میری پیٹھ پر ڈیلفینا کے ظلم و ستم کا کھوج لگانے کی کوشش کی تھی اور میرے زخموں کی ڈریسنگ کا ارادہ بھی ظاہر کیا تھا۔ کایا ایک تجربہ کار نرس تھی۔ اس کی کارروائی میں پُرکاری تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کایا کس نیت سے میری پیٹھ سہلا رہی تھی۔ بہرحال، اس کے مرمریں ہاتھ کی پراسرار حرکات و سکنات میں کیف و سرور بھرا ہوا تھا۔ میں آنکھیں بند کیے ان نشاط انگیز لمحات سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

''علی!'' وہ میرے اوپر جھکتے ہوئے مخمور آواز میں بولی۔ ''تم بہت اچھے ہو۔''

مجھے اس کی سانسوں کی تپش اپنے چہرے پر محسوس ہوئی تاہم میں نے آنکھوں کو بدستور بند رکھتے ہوئے بوجھل آواز میں کہا۔ ''کایا..... آئی ایم سوری.....''

اس نے میری پیشانی پر ایک طویل بوسہ دیا پھر پوچھا۔ ''کس بات کی سوری؟''

''میں نے تمہارے سامنے بربریت کا مظاہرہ کیا۔'' میرے لہجے سے ندامت ٹپکتی تھی۔

''یہ تمہارا عین فطری ردِعمل تھا۔'' وہ مسلسل میری پیٹھ کو سہلاتی چلی جارہی تھی۔ ''قدرت نے چرندوں گائے، بھینس، بکری وغیرہ کے دانت چپٹے بنائے ہیں کیونکہ انہیں گھاس پھونس سے اپنا پیٹ بھرنا ہوتا ہے جبکہ درندوں شیر، چیتا، بھیڑیا کے دانت نوک دار ہوتے ہیں کیونکہ یہ گوشت خور جانور ہیں مگر انسان کے اندر قدرت نے یہ دونوں خاصیتیں رکھی ہیں۔ اس کے سامنے کے دانت چپٹے اور دونوں اطراف کے دانت نکیلے ہیں۔ یہ بیک وقت سبزی خور بھی ہے اور گوشت خور بھی اور اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک درندہ بھی چھپا ہوا ہے جو بعض مخصوص حالات میں نکل کر سامنے آجاتا ہے۔ اس موقع پر انسان کسی درندے کے مانند وحشی اور خوں خوار ہوجاتا ہے۔ تم نے خبیث بڈھے کے ساتھ جو کچھ کیا اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ کاش.....''

وہ بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہوگئی۔ میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔ ''کایا! کاش کیا؟''

''کاش! میرے اندر کا درندہ بھی کبھی جاگ اٹھے.....'' وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے حسرت بھرے لہجے میں بولی۔ ''تاکہ میں بھی اپنے دشمن کو ایک یادگار بھیانک موت مار سکوں.....''

میں نے یکبارگی آنکھیں کھول دیں اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کایا کی بات نے میرے تن بدن میں کھلبلی مچا دی تھی۔ میں نے اسے شانوں سے تھام کر اس کی آنکھوں میں جھانکا پھر سرسراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''تمہارا دشمن کون ہے؟''

اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں پھر دونوں آنکھوں کے گوشوں سے آنسو نکل کر اس کے گالوں پر رینگ گئے۔ میں نے اس کے کندھوں کو جھنجوڑتے ہوئے اپنے سوال کو دہرایا۔

''کایا! مجھے بتاؤ..... کون ہے تمہارا دشمن؟''

وہ سسک اٹھی پھر بلک بلک کر رونے لگی۔ اس کی یہ کیفیت میری سمجھ سے بالاتر تھی، میں یک ٹک اسے دیکھتا چلا گیا.....!

امنگوں، حوصلوں اور آہوں کے بیچ رلاتی، کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدھر گیت سناتی اس ناقابلِ فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں



پرانی غلطی

ڈاکٹر شیر شاہ سید

PakiBooks.net

کہتے ہیں جب اونٹ خود پہاڑ تلے آتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کی ذات کس قدر معمولی اور کمزور ہے۔ وہ بھی... جو خود کو وقت کا شہنشاہ سمجھ بیٹھا تھا اور کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا... جب اپنے دل پر ذرا سا بوجھ آیا تو ادراک ہوا کہ کبھی اس نے بھی ایک ایسی ہی غلطی کی تھی جس کی سزا شاید اسے اب قدرت دے رہی ہے۔

متوازن زندگی میں غیر متوازن صورت حال کا تماشا

میں نے ساجدہ کو غور سے دیکھا۔ وہ تھکی ہوئی کسی دیوی کی طرح معصوم لگ رہی تھی۔ چہرے پر تھکن کے ساتھ ساتھ ایک عجب طرح کا اطمینان بھی تھا۔ وہ بے حس، بے ہوش، بے خبر سو رہی تھی۔ دنیا و مافیہا سے لاعلم گہری نیند میں نہ جانے کن خوابوں کی نگری میں کھوئی ہوئی تھی۔

تھکا ہوا تو میں بھی تھا مگر ایک ایسی بات ہوگئی تھی جس نے میری نیند اڑا دی۔ بار بار میرے دل پر کچوکے سے لگتے اور ذہن ماؤف ہوجاتا۔ کتنی کامیاب زندگی تھی میری۔ خوبصورت سگھڑ، امیر ماں باپ کی بیٹی جو میری بیوی بنی۔ میں خود ایک انتہائی کامیاب تاجر۔ کیا کمی تھی میری زندگی

میں؟ ایک بھرپور کامیاب زندگی گزاری تھی میں نے مگر آج جو کچھ ہوا اور جیسے ہوا، اس نے جیسے میرے دل کو ریزہ ریزہ کردیا۔ چین لٹ گیا اور نیند ایسی غائب ہوئی کہ لگتا تھا اب کبھی نہیں سو پاؤں گا۔ کیا تھا یہ؟ احساسِ ندامت..... شرمندگی؟ اتنے سال کے بعد؟

میں نے ساجدہ کو غور سے دیکھا۔ معصوم سا چہرہ، اس عمر میں بھی اس میں غضب کی جاذبیت تھی۔ موٹے موٹے ہونٹ اور ستواں ناک کا امتزاج ایسا تھا کہ آدمی پاگل ہوجائے۔ کوئی تو وجہ تھی کہ میں اس کو دیکھنے کے بعد کسی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ نہیں سکا تھا۔ میرے دل نے کہا کہ اس کے سرہانے بیٹھ جاؤں، اپنے ہاتھوں سے اس کے بکھرے ہوئے بالوں کو سنواروں، اس کی پلکوں کو چھولوں، ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹ کو دیکھتا رہوں..... وہ تھی ہی ایسی۔ گزشتہ ستائیس سالوں میں ایک دن ایسا نہیں گزرا تھا جب میں نے اس سے محبت نہیں کی تھی، اسے نہیں چاہا تھا۔ ایک لمحہ بھی ایسا نہیں تھا جب وہ میرے ساتھ نہیں تھی اور ایک دن بھی مجھے احساس نہیں ہوا کہ میں اسے کبھی کوئی دکھ دے سکتا ہوں یا تکلیف پہنچا سکتا ہوں مگر آج جو کچھ ہوا، اس کے بعد میں اندر ہی اندر جل رہا تھا، پگھل رہا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر کہ مجھ سے نادانستگی میں کیا ہوگیا۔ میرے غرور اور انا سے بنی ہوئی دیواریریت کی طرح ڈھے گئی تھی۔

تیس سال پہلے میں نے ساجدہ کو ایک معروف شاپنگ سینٹر میں دیکھا جب وہ اپنے ڈرائیور کے ساتھ تیز تیز چلتی ہوئی جوتے کی دکان سے نکلی تھی۔ میں ایک جائنیز ریسٹورنٹ میں دوپہر کا کھانا کھا کر نکلا اور اپنی گاڑی اسٹارٹ کر کے سگریٹ سلگا رہا تھا۔ اس نے تو مجھے نہیں دیکھا مگر میں اسے دیکھتا ہی چلا گیا۔ کسی چیز کی کمی نہیں تھی اس میں۔ میں نے تصور، خوابوں اور خیالوں میں جو لڑکی بسائی ہوئی تھی، یہ وہی تھی۔

اس کی گاڑی میری گاڑی سے ذرا آگے پارک تھی۔ جیسے ہی اس کے ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے چلا، ویسے ہی میں نے اپنی گاڑی اس کے پیچھے ڈال دی۔ بغیر سوچے سمجھے بس دل کے اشارے پر۔

وہ وہاں سے گزرتے ہوئے بہادر آباد کی چورنگی سے شرف آباد کی طرف مڑ کر ایک گلی کے خوبصورت سے بنگلے پر رک گئی تھی۔ میں نے بھی گاڑی اس کی گاڑی سے ذرا پیچھے کھڑی کردی۔ دروازہ کھول کر وہ اتری اور جیسے میری آنکھوں میں تیرتی ہوئی وہ چھپ سے کالے گیٹ کے چھوٹے دروازے کو کھول کر اپنے گھر میں داخل ہوگئی تھی۔

تیس بتیس سالوں پہلے والا شرف آباد رہائشی علاقہ تھا جسے بلڈروں کی نظر کھا گئی۔ پیسے کے لالچ نے اب پوری سوسائٹی کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ خوبصورت بنے ہوئے رہائشی مکانات جہاں چار سے آٹھ لوگ سہولت سے رہتے تھے، دیکھتے دیکھتے کئی منزلہ عمارتوں اور فلیٹوں کے کمپلیکس میں بدل گئے ہیں۔ بھونڈے فلیٹس، خراب سیڑھیاں اور بے ہنگم نقشے بناتے وقت شاید یہ سوچا بھی نہیں گیا کہ یہ کیسے نظر آئیں گے، ہوا کہاں سے آئے گی، دھوپ کہاں سے گزرے گی، لوگ کیسے رہیں گے، سامنے کیسا لگے گا۔

یہاں مکان بیچنے والوں نے جانتے ہوئے مہنگا بیچا، خریدنے والوں نے اپنے پلان کے مطابق کوڑیوں کے دام ہی لگائے، پھر تین تین منزلہ اپارٹمنٹ بلاک کی اجازت لے کر چھ چھ آٹھ آٹھ منزلہ عمارتیں بنا ڈالیں۔ شہر میں تو آبادکاروں کی ایک زبردست مافیا کام کر رہی ہے۔

ان بدشکل بے عمل عمارتوں میں بے شمار لوگ رہنے کے لیے آگئے ہیں۔ جہاں پر خوبصورت بنگلے کے ساتھ لان کا تصور تھا، درخت تھے، پودے، پیڑوں اور پھلوں کی بہار تھی..... وہاں فلیٹس بن گئے تھے، جنہیں لوہے کی جالیوں میں قید کردیا گیا تھا۔ ہر کھڑکی دروازہ، روشندان، بالکونی، سیڑھی کو ان لوہے کی جالیوں میں پھنسا دیا گیا ہے۔ ان فلیٹوں میں رہنے والوں کو شہری زندگی کے بنیادی اصول تک نہیں پتا۔ گندگی، کوڑے کے ڈھیر، پانی کی بوتلیں اور چیونگم کے جابجا نشانات جہالت، لاعلمی اور بے حسی کی خبریں دے رہے ہوتے ہیں۔

اس دن گھر دیکھ کر میں واپس آگیا کہ ایک ضروری میٹنگ میں جانا تھا مگر دوسرے دن صبح صبح میں دوبارہ اس کے گھر سے ذرا ہٹ کر اپنی گاڑی سمیت کھڑا ہوگیا۔ صبح سویرے ساڑھے سات، آٹھ بجے کا وقت تھا۔ آتے جاتے لوگ دیکھ کر گزر رہے تھے مگر کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں اپنی کار میں بیٹھا اس گھر سے نکلنے والی لڑکی کا انتظار کر رہا ہوں۔ پہلے تو میں اخبار پڑھتا رہا جب انگلش اخبار کی خاص خاص چیزیں پڑھ ڈالیں تو گاڑی سے اتر کر ٹہلتا ہوا روڈ کی جانب گیا کہ آتے جاتے کسی اخبار والے سے ایک اردو اخبار بھی لے آؤں۔ میں کچھ اس طرح سے گیا کہ وہ گھر نظر سے نہ اوجھل ہو۔ راستے میں ہی مجھے سائیکل پر سوار اخبار والا مل گیا اور اخبار لے کر میں واپس گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ ساجدہ کے گھر کا گیٹ کھلا۔ ساجدہ کے ابو گاڑی گیٹ سے نکال کر باہر آئے اور وہ گیٹ کو بند

کر کے گاڑی میں ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ نیلے شلوار قمیص میں نیلے ہی رنگ کے دوپٹے کے ساتھ وہ مجھے پہلے دن سے بھی زیادہ حسین لگی تھی۔ میرا مقصد پورا ہوگیا۔ میں اسے ایک دفعہ پھر غور سے نظر بھر کے دیکھنا چاہتا تھا۔ رات بھر وہ میرے خیالوں میں بھٹکتی رہی۔ اب تو مجھے صرف فیصلہ کرنا تھا اور اس فیصلے سے پہلے میں اسے صبح صبح دیکھنا چاہتا تھا۔ میری نانی کہتی تھیں کہ جو عورت صبح خوبصورت نظر آتی ہے، وہ حقیقت میں خوبصورت ہوتی ہے اور جو عورت شام کو خوبصورت لگتی ہے، وہ بناوٹ ہوتی ہے۔ نہ جانے اس میں کتنی حقیقت ہے لیکن سچ بات یہ تھی کہ ساجدہ صبح بھی خوبصورت تھی اور شام کو بھی حسین۔

اسی شام میں نے اپنی خواہش کا اظہار اپنی بہن اور ماں باپ سے کردیا۔ میری ماں فوراً ہی تیار ہوگئی تھیں کہ آخرکار میں نے شادی کے لیے ہاں تو کردی کیونکہ باوجود گھر والوں کے اصرار کے مجھے کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی تھی۔ وجہ کوئی نہیں تھی، بس یہ ہوا کہ کسی نے کلک نہیں کیا۔

شادی میں تھوڑا مسئلہ ضرور ہوا جس کی مجھے امید نہیں تھی۔

ہوا یہ کہ جب میری ماں اور دونوں بہنیں ساجدہ کے گھر مٹھائی کے ساتھ پیغام لے کر پہنچیں تو ہمیں امید تھی کہ وہ لوگ فوراً ہی ہاں کردیں گے۔ صرف ڈر یہ تھا کہ اگر اس کی منگنی ہوئی ہوگی یا اگر کسی سے نکاح ہو چکا ہوگا تو ہم لوگ کیا کریں گے۔ یہ سوچنا ضروری تھا کیونکہ خوبصورت لڑکیوں کی شادی فوراً ہی ہوجاتی ہے۔ جلد ہی رشتے آنا شروع ہوجاتے ہیں اور ماں باپ کی بھی کوشش ہوتی ہے کہ لڑکیاں سسرال چلی جائیں، چاہے تعلیم ہی چھوڑنا پڑے۔ کون انتظار کرتا ہے۔ یہ میں نے سوچا ضرور تھا مگر اس سے آگے نہیں سوچ سکا تھا اور امید یہی تھی کہ اس کا رشتہ وغیرہ کہیں نہیں لگا ہوگا۔ خوش قسمتی سے ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کے رشتے ضرور آئے مگر ان کے گھر والوں نے کسی کو بھی ہاں نہیں کی تھی۔ شاید میری قسمت اچھی تھی۔

میرے گھر والوں کو ساجدہ کے گھر میں عزت دی گئی۔ اس کی امی بہت اچھے طریقے سے ملیں مگر نہ جانے کیوں اس کے ابو کا رویہ کچھ زیادہ دوستانہ نہیں تھا۔ اس وقت مجھے یہ سب کچھ بہت بُرا لگا۔ انہوں نے میرے بارے میں بہت سارے ضروری غیر ضروری سوالات کر ڈالے۔ باجی کی بات سے مجھے اندازہ ہوا کہ شاید وہ ہمارے رشتے کے پیغام پر کچھ زیادہ خوش نہیں تھے۔ باجی نے کہا کہ اگر باپ ہی راضی نہیں ہوگا تو رشتہ منظور کرانا بڑا مشکل ہوجائے گا۔

اس وقت مجھے بڈھے پر غصہ بہت آیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے دل میں سوچا کہ شرافت کا زمانہ ہی نہیں ہے۔ میں نے کوئی عشق نہیں لڑایا۔ یونیورسٹی جا کر ساجدہ پر راہ چلتے ڈورے نہیں ڈالے، اس کی کسی سہیلی کے بھائی کو تلاش کر کے اس تک پہنچا نہیں، تحائف کی بارش نہیں کی، غلط باتوں سے اسے بہلایا، پھسلایا نہیں، یہ سب کچھ اس زمانے کے مروجہ طریقے تھے۔ یہی کر رہے تھے لڑکے مگر میرے پاس اس قسم کے طریقوں کے لیے نہ وقت تھا اور نہ ہی میں نے اس طرح کی کوئی منصوبہ بندی کی تھی۔ مجھے یہ بھی پتا تھا کہ میں اچھی شکل صورت کا مالک، اچھے اطوار والا بندہ ہوں۔ لڑکیوں کے لیے میں کچھ کشش بھی رکھتا تھا۔ تعلیم یافتہ تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ مالی و معاشی طور پر خوشحال بھی تھا۔ یہ بات میری سمجھ سے باہر تھی کہ میں انہیں قابلِ قبول کیوں نہیں۔ میرا غصہ ناجائز تو نہیں تھا۔

میرا خیال تھا کہ میرا رشتہ پہنچتے ہی وہ لوگ خوش ہوجائیں گے۔ کیا کمی تھی مجھ میں۔ فوراً ہی راضی ہوجائیں گے اور چٹ منگنی پٹ بیاہ جیسا سلسلہ ہوگا۔ شاید میں اپنے آپ کو کچھ زیادہ ہی اہمیت دے رہا تھا مگر ایسا بھی نہیں ہونا چاہیے تھا جیسے میری کوئی اہمیت ہی نہیں۔ حالات و واقعات پر میری کوئی گرفت تھی اور نہ کوئی اختیار۔ بڑے میاں کا اپنا دماغ تھا۔ میری بہنوں نے بتایا کہ ساجدہ کی امی کا رویہ بڑا دوستانہ ہے مگر ساجدہ کے ابو کے رویے نے مجھے کافی مایوس کیا تھا۔

ہفتے بھر کے انتظار کے بعد میری بہن نے ساجدہ کی امی سے فون پر بات کی تو انہوں نے بتایا کہ ابھی تک وہ لوگ کچھ فیصلہ نہیں کر پائے ہیں اور ساجدہ کے ابو میرے بارے میں تحقیقات کر رہے ہیں، معلومات جمع کر رہے ہیں، اتنا تو حق ہے نا بیٹی ہمیں۔ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

مجھے غصہ آیا۔ تحقیقات کرنا تو ان کی ذمے داری تھی اور ان کا حق بھی۔ کوئی اپنی بیٹی کی شادی بغیر سوچے سمجھے اور تحقیقات کے کیسے کرسکتا ہے۔ مگر میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی مجھے رد کرسکتا ہے، کچھ اس قسم کا مغرور تھا میں۔ صحیح یا غلط میں ایسا ہی تھا۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں کم عمری میں ہی پے در پے کئی کامیابیاں حاصل کرتا ہوا اپنے ابا جان کے چھوٹے سے کاروبار کو بہت تیزی سے اوپر لے گیا تھا۔ بے شمار خاندانوں کے لوگ اپنی بیٹیوں کی شادی مجھ سے کرنا چاہتے تھے۔ دفتر میں بھی اور دفتر کے باہر بھی۔ کتنے والدین نے اپنی اس

خواہش کا اظہار میرے ابا اور اماں جان سے کیا تھا۔ ایسا بھی ہوا تھا کہ کئی قبول صورت لڑکیاں خود ہی راستے میں آگئیں۔ اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کیا مگر سچی بات یہ ہے کہ کوئی بھی اچھی نہیں لگی۔ کوئی بھی کلک نہیں ہوئی اور اب جب یہ لڑکی کلک ہوئی تو بڑے میاں نے مسائل کھڑے کردیے تھے۔

زندگی میں پہلی دفعہ میں پریشان ہوا۔ زندگی میں پہلی دفعہ جو آدمی مجھے بُرا لگا" وہ ساجدہ کے ابو تھے۔ سمجھتے کیا ہیں اپنے آپ کو؟ میرے دل میں کئی وسوسوں نے جنم لیا۔ میں ہر صورت اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ ساجدہ کے بغیر میری زندگی مشکل ہوجائے گی۔ مجھے وہ اچھی لگی تھی اور مجھے اس سے ہی شادی کرنا تھی۔

ایک دن وہ میرے ابو سے ملنے ان کے آفس بھی چلے آئے۔ نہ جانے بوڑھوں کے درمیان کیا بات چیت ہوئی، گھنٹے بھر تک کہ دونوں کے بعد ان کے گھر سے رشتے کی قبولی کا پیغام آگیا۔

ہم لوگوں کی خوشی اپنی جگہ فطری تھی۔ میرے گھر والوں نے زور وشور سے شادی کی تیاریاں شروع کیں۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ بڑے میاں نے مجھ سے کوئی بات نہ کی اور نہ ہی مجھ سے ملے، اس میں بھی مجھے کچھ بے عزتی کا سا احساس ہوا، نہ جانے کیوں۔

پھر ہماری شادی ہوگئی۔ ساجدہ کو پہلے دن سے ہی دیوی بنا کر رکھا میں نے۔ اسے چاہا دل سے اور اسے حاصل کرنے کے بعد ایک دن کے لیے بھی اپنے سے جدا نہ کرنے کی قسمیں کھائیں۔ وہ تھی ہی ایسی۔

مجھے یاد ہے کہ شادی کے ساتویں آٹھویں دن میں ساجدہ کے ساتھ اس کے گھر گیا تھا۔ رات گئے تک باتیں ہوتی رہیں۔ اس کی بہن سے، اس کے بھائی سے، اس کے ماں باپ سے، وقت تیزی سے نکلتا چلا گیا تھا۔ شادی کے فوراً بعد اس قسم کی ملاقاتوں، دعوتوں کا اپنا مزہ ہوتا ہے، نئے رشتے بنتے ہیں کہ ان کی بنیادیں رکھی جارہی ہوتی ہیں۔ نئی امیدیں ہوتی ہیں، نئے چراغ جلتے ہیں، ایک طرح کا لطیف احساس ہوتا ہے۔

شاید رات کے گیارہ بجے تھے جب ہم اٹھنے لگے تو چلتے چلتے ساجدہ کے ابا نے کہا تھا کہ آج رک جاؤ بیٹی۔ دونوں ہی رک جاؤ، کل چلے جانا۔ بڑی مشکل سے عادت ہوگی تمہارے بنا رہنے کی۔ مجھے ان کا دھندلا دھندلا سا مہربان چہرہ یاد ہے اور یہ بھی یاد ہے کہ میں نے کیا سوچا اور کیا، کیا تھا۔ ساجدہ نے میری طرف دیکھا اور اس وقت تو جیسے میرے اندر آگ لگ گئی، نہ جانے کیوں؟ اور اس سے پہلے کہ کوئی اور بات ہوتی، میں نے فوراً ہی کہہ دیا کہ نہیں، ہم دونوں کو ابھی گھر جانا ہے۔ مجھے اب احساس ہوتا ہے کہ بہت سخت اور خشک رویہ تھا میرا۔ میں نے کسی کا کوئی بھی لحاظ نہیں کیا اور ہم گھر چلے آئے۔ پھر بھی ایسا نہیں ہوا کہ بڑے میاں نے ہمیں رات کو روکنے کی کوشش کی ہو۔

ہمارے بچے ہوئے، دو بیٹے ایک بیٹی۔ وقت نکلتا گیا، سب بڑے ہوتے گئے۔ میرے ابو کا انتقال ہوگیا۔ ساجدہ کے ابو بھی دنیا سے چلے گئے لیکن جتنے سالوں بھی وہ زندہ رہے، مجھے ان کی آنکھوں میں ساجدہ کی محبت کی شمع جلتی نظر آتی رہی۔ شاید کوئی دن ایسا نہیں ہوتا ہوگا جب وہ فون پر اس سے بات نہیں کرتے ہوں گے۔ ایک خاص قسم کا رشتہ تھا باپ بیٹی کے درمیان۔ ایسا ہی ہوتا ہے ہمارے سماج میں۔ لگتا ہے کہ بیٹیاں ماؤں سے قریب ہوتی ہیں۔ ان سے وہ ہر طرح کی بات کرلیتی ہیں۔ ایک طرح سے دوست وراز دار ہوتی ہیں ان کی مگر بیٹیوں کا اپنے باپوں سے بھی ایک رشتہ ہوتا ہے بہت مختلف، بالکل الگ۔ شاید انہیں الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہ ہو۔ اسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے جیسے ساجدہ اور ساجدہ کے ابو کے درمیان تھا۔

ستائیس سالوں کے بعد میری بیٹی کی شادی ہوئی۔ وہ رخصت ہوگئی اور آج شادی کے آٹھویں دن ہمارے گھر آئی تھی۔ میری بیٹی میری اور ساجدہ کی محبت کی پہلی نشانی..... خاص طور پر مجھ سے ملنے آئی تھی۔ چار گھنٹے کی گپ شپ کے بعد جب وہ جانے لگی تو بے اختیار میں کہہ بیٹھا کہ بیٹی آج کی رات ٹھہر جاؤ، کل چلی جانا۔ میں خود چھوڑ دوں گا تمہیں۔

"مگر بابا مجھے جانا ہوگا۔" اس نے راحیل کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا تھا۔

ستائیس سال ایک سیکنڈ میں میرے سامنے سے گزر گئے۔ ساجدہ کا وہ پُرامید چہرہ، اس کے والد کے محبت بھرے چہرے پر خواہش کی چادر اور میرا رُکھائی سے منع کر دینا۔ ساجدہ کی بے بسی اور ساجدہ کے ابا کی خاموشی میرے سینے میں خنجر کی طرح اندر تک دھستی چلی گئی۔ یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ بجلی کی رفتار سے تیز جھماکوں کے ساتھ وہ تصویر میرے ذہن پر گرجتی گونجتی رہی۔

آج وہ میرے سامنے بستر پر بے سدھ سوئی ہوئی تھی، تھکی ہاری مگر چین سے اور میں بے چین تھا اور مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ ستائیس سال پرانی غلطی کی معافی مانگ سکوں۔

رات کے بارہ بج چکے تھے اور محفل برخاست ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ مہمان پُرسکون تھے اور میزبان رائن بھی ہشاش بشاش نظر آرہا تھا۔ باہر برف باری بھی شروع ہوچکی تھی لیکن ابھی اتنی نہیں تھی کہ راستے بند ہوجاتے۔ مہمانوں کے جم کر تھمنے کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ صبح اتوار کا روز تھا۔ اپنی اپنی بیویوں سے اکتائے ہوئے شوہروں کا گھر جانے کا کوئی موڈ نظر نہیں آرہا تھا۔ ایسے میں مردوں کے دل پسند موضوع پر بحث چھڑ گئی۔ یعنی کہ عورت..... اپنی یا کسی کی بھی..... اس موضوع کی شروعات ادلیور نے کی تھی۔

"جب ربیکا کسی اور کی تھی تو مجھ پر ایک ہی دھن سوار تھی، اسے حاصل کرنے کی..... مجھے لگتا تھا کہ اگر مجھے وہ نہ ملی تو میں مرجاؤں گا۔" ادلیور نے بات کے درمیان توقف کیا۔

دوست سے دشمن بن جانے والے شریک زندگی کی بے مثال اداکاری

کبھی کبھی پتا ہی نہیں چلتا کہ انسان اپنی اصل زندگی میں کہاں اداکاری کررہا ہے اور کب حقیقی زندگی میں جی رہا ہے... کچھ ایسا ہی ڈھونگ اس نے بھی رچایا جسے زندگی کی ہر آسائش حاصل تھی۔ شوہر کی بھرپور محبت اور سب سے بڑھ کر اندھا اعتماد حاصل تھا مگر کیا کیجیے کہ اس اندھے اعتماد کو اس نے سچ مچ اندھا سمجھ لیا اور یہی اس کی بھول تھی کہ کسی کو کچھ نظر نہیں آرہا... اور پھر ایک دن اس کی اداکاری اور حقیقت کُھل کر سب کے سامنے آگئی۔

اداکارہ

ایمل رضا



"پھر.....؟"

"پھر وہ مجھے مل گئی اور اب سوچتا ہوں کہ میں مر ہی جاتا تو بہتر تھا۔" یہ کہنے کی دیر تھی کہ حسب توقع یہ بات سن کر سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ شیشے کے جام ٹوٹتے ٹوٹتے بچے.....اور سب ایک دوسرے پر لڑھک گئے۔

"میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ جب میگن میری گرل فرینڈ تھی تو اس کے دانتوں پر بریسز لگے ہوئے تھے جنہوں نے دو سال بعد اترنا تھا۔ مجھے لگا صرف دو سال کی ہی تو بات ہے، ہم اپنی شادی میں کیوں دیر کریں۔ ہم نے شادی کر لی۔ دو سال بعد اس کے بریسز اتر گئے.....اور تب مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ میں نے اسے صرف اتنا کہا کہ وہ دانت ٹھیک ہو جانے کے باوجود بھی پھر سے بریسز لگوا لے کیونکہ وہ بریسز میں تو پھر بھی ٹھیک لگتی ہے لیکن بنا بریسز کے.....ہماری محبت اس دن کے بعد سے ختم ہو گئی۔"

سب ہنستے ہنستے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرنے لگے۔

"آپ کیا کہیں گے جناب.....؟" ہمارے میزبان نے سینٹ کو مخاطب کیا جو بھید بھری خاموشی اور مدھم مسکراہٹ کے ساتھ محفل میں موجود تھے لیکن کسی بات میں حصہ نہیں لے رہے تھے۔ حاضر ہوتے ہوئے بھی غیر حاضر اور انجان سے تھے۔

"آپ تو دانشور ہیں۔ بڑے بڑے ضخیم ناول لکھے ہیں آپ نے.....آپ اس ہستی اور عظیم راز جسے عورت کہتے ہیں، اس کے بارے میں کیا کہیں گے؟ آج تک کوئی اس راز تک پہنچ پایا ہے.....یا سب بس دعوے دار بننے کے ہی شوقین ہیں؟" میزبان رائن نے کہہ کر سب کی طرف تائید طلب نظروں سے دیکھا۔ سینٹ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"ارے یہ سمجھ چکے ہوتے تو اپنی بیوی کو اس طرح چھوڑتے.....؟" کسی ایک نے لقمہ دیا۔

"اچھا موضوع چھیڑ دیا آپ نے.....آج تو بتا ہی دیں جناب.....کہ کیوں چھوڑا آپ نے کیتھرین کو.....جبکہ آپ دونوں کی محبت تو قابلِ دید تھی۔ ہماری بیویاں تو اکثر ہمیں آپ دونوں کی مثالیں دیا کرتی تھیں کہ محبت ہو تو ان جیسی.....پھر اچانک.....؟ کیا یہ معما ایک ایسے انسان کے لیے بھی معما ہی رہا جو اپنے ناولوں کے دیباچوں میں کہتا پھرتا ہے کہ اس کی تمام حسیات بیدار ہیں اور قدرت کو سمجھنے کا مرحلہ وہ بہت پہلے اپنے بچپن ہی میں طے کر چکا ہے۔ کیا وہ قدرت کی ایک مخلوق.....عورت کی ذات پر تصرف حاصل نہ کر سکا اور اس کی ذہنیت سے نابلد رہا.....؟" رائن نے کہا۔

ہم جانتے تھے کہ رائن نے اتنی لمبی تمہید سینٹ کو اکسانے کے لیے ہی باندھی تھی تاکہ سینٹ جو کیتھرین کے معاملے میں ہمیشہ خاموش ہو جاتا تھا، آج خاموش نہ رہے۔ خلاف توقع رائن کا حربہ کام کر گیا۔

"ہاں.....شاید ایسا ہی ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ میں ایک دانشور ہوں، بڑا نہ سہی لیکن اتنا ادنیٰ بھی نہیں.....میں قدرت کو سمجھتا ہوں۔ اس کی ایک ایک چیز کو جانتا ہوں، مانتا ہوں لیکن پھر مجھے لگنے لگا کہ نہیں.....میں "عورت" کو کبھی نہیں سمجھ سکتا.....یہی وجہ ہے کہ پچھلے پانچ سالوں میں، میں نے جو بھی ناول لکھے ہیں ان میں کسی بھی عورت کا ذکر نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے جس چیز کو میں سمجھ نہیں سکا اسے دوسروں کو کیسے سمجھاؤں گا۔ خصوصاً عورت جب بیوی کا روپ دھار لیتی ہے تو اور ابہام پرست دکھنے لگتی ہے۔ عورت محبوبہ ہو تو بات اور ہوتی ہے۔ وہ آپ کی ہوتی ہے اور آپ اس کے.....لیکن شادی کے بعد ایک چھت تلے دونوں ایک ہو جائیں تو نہ جانے کیوں ذہن سے دور دور رہتے ہیں۔ کیتھرین کی بات کروں تو وہ بیوی بننے کے بعد بھی میری محبوبہ ہی رہی.....اسے چھوڑنے تک میں اس سے شدید ترین محبت کرتا رہا اور وہ بھی مجھ سے.....شاید....." سینٹ نے افسردگی سے "شاید" کہہ کر جام سے ایک لمبا گھونٹ بھرا۔ اس کی اداسی نے اس کے چہرے کا اور پوری محفل کا کچھ یوں احاطہ کر لیا کہ ہم میں سے کوئی کچھ نہیں بول سکا۔

"مجھے وہ دن آج بھی یاد ہے جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ ہولی ڈے ان کے پُرشکوہ ہال میں..... جہاں میرا ایک دوست مجھے لے گیا تھا۔ وہاں ایک فیشن شو تھا۔ میں نے کبھی اس طرح کے شوز اٹینڈ نہیں کیے۔ میں شروع سے ہی تنہائی پسند رہا ہوں، ہجوم میں بھی تنہا.....خیر وہاں مجھے کیتھرین نظر آئی۔ ریمپ پر واک کرتے ہوئے۔ اس نے سفید لمبا گاؤن پہنا ہوا تھا جس کی ٹیل دو ننھی لڑکیوں نے سنبھال رکھی تھی۔ اس عروسی لباس میں وہ بلا شبہ بہت خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ یہ پہلی بار تھا کہ مجھ جیسے مجرد مرد کو کسی مخالف جنس کی کشش محسوس ہوئی تھی۔

"باوجود کوشش کے بھی مجھے گرین روم تک جا کر اس سے ملنے کی اجازت نہ مل سکی.....میرا دوست مجھے ہال کے دوسرے بیرونی دروازے کی طرف لے گیا جہاں سے شو کے اراکین خاموشی سے عوام کے ہجوم سے بچ کر نکل رہے تھے۔

میری نظریں وہاں اس کو تلاش کرتی رہیں.....پھر پارکنگ ایریا میں وہ مجھے جینز اور وائٹ ٹاپ میں نظر آئی۔ میں بے اختیار ہی اس کی طرف بڑھا اور اس کے قریب پہنچ کر سمجھ نہ سکا کہ بات کرنے کا آغاز کیسے کروں۔

"آٹو گراف پلیز....." اپنی لکھنے والی نوٹ بک میں سے ایک کاغذ میں نے اس کی طرف بڑھایا۔ کار کے دروازے میں چابی لگاتے ہوئے اس نے رخ موڑا۔ سنہری بال لہرائے اور اپنی لمبی پلکیں اٹھا کر اس نے میری طرف دیکھا جن کا میک اپ ابھی اترا نہ تھا۔ اور وہ نظر.....اُف.....میرے ذہن نے ہزاروں ناول اسی ایک لمحے میں تخلیق کر ڈالے.....چمکتی آنکھوں میں جیسے ریشم کے بادبانوں والی کشتیاں تیر رہی تھیں.....ایک لمحہ بھی نہ لگا اور میں سرتاپا اس کے حسن کا دیوانہ ہو گیا۔ وہ مسکرائی اور اس نے کاغذ پر اپنے دستخط کرنے کے بجائے اپنے ہونٹ ثبت کر دیے۔ سرخ ہونٹ.....سرخ بیگونیا کے پھولوں جیسے ہونٹ.....جن میں سے وصل کے لمحوں کی خوشبو آتی ہے۔

"وہ کاغذ اب بھی میرے پاس موجود ہے۔ اس میں پہلے بوسے کی سی کشش ہے۔ آپ تو جانتے ہیں نا کہ پہلا بوسہ کس قدر دلفریب ہوتا ہے۔ مدتوں یاد رہنے والا..... جیسے پہلا دھوکا.....

"سوچا تھا اپنا پہلا آٹو گراف جسے بھی دوں گی ایسے ہی دوں گی۔" اس نے میری فق صورت کا مشاہدہ کر کے کاغذ پر ثبت اپنے سرخ ہونٹوں کے عکس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ میں مسکرا دیا۔ میری مسکراہٹ ایک لاابالی لڑکے کی سی تھی۔ اس میں سنجیدگی نہیں تھی۔ میں سوچتا ہوں اس دن سے ہی کیتھرین مجھ پر حاوی رہی.....اس کے سامنے میں اس سے دس سال بڑا ہونے کے باوجود بھی ایک لڑکا ہی رہا۔ آنے والے وقتوں میں بھی۔ ایسا لڑکا جو سارے تجربات کر لینے میں عجلت کا شکار ہوتا ہے۔

"ہماری اگلی ملاقات ایک ہوٹل میں ہوئی تھی جو آنے والی زندگی کا اہم پیش خیمہ ثابت ہوئی تھی۔ ہمیں پتا ہی نہیں چلا کہ ہم کب ایک ہو گئے۔ اس کی شفاف... جلد نے میرے اندر ایسا فسوں برپا کیا کہ میں اس کا اور پبلشر میرا دیوانہ ہو گیا۔

"آپ کہاں وقت گزار رہے ہیں آج کل.....؟" میرا پبلشر مجھ سے ایک ہی سوال کرتا تھا۔

"یہاں نیویارک میں ہی.....کیوں.....؟"

"آپ جس بھی ماحول میں رہ رہے ہیں، اسے مت بدلیے گا۔ آپ ناول نہیں لکھ رہے، آپ لوگوں کو وہ ان دیکھی جنت دکھا رہے ہیں جس میں حوریں ہی حوریں ہیں۔" میں مسکرا دیا اور یہ بات کیتھرین کو بھی بتائی۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔" میں اس کی تعریف کرتا اور وہ ایک بوسہ میری نذر کرتی.....میری زندگی ان دنوں خوشیوں سے پُر تھی۔ ہم ایک ہی گھر میں رہنے لگے تھے۔ ایک ہی کمرے میں.....میں اس کے فیشن شوز اٹینڈ کرتا جیسے میری زندگی کی اصل دلچسپی یہی ہو.....وہ بھی میرے ساتھ کتابوں کی تعارفی تقریبات میں جاتی جبکہ میں جانتا بھی تھا کہ اسے کتابوں سے ایسی کوئی خاص رغبت نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ میرے مسودے پڑھتی، مجھے مفید مشورے دیتی.....کرداروں کے اختتام کو لے کر مجھے اکساتی کہ میں اختتام، کہانی کو مدنظر رکھ کر نہ کروں بلکہ ان کرداروں کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر کروں۔ میں نے ہمیشہ ایسا ہی کیا۔ مصنف کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتا لیکن اس کے مشورے اتنے مکمل لگتے تھے کہ مجھے لگتا تھا کہانی کا جو خاکہ میرے ذہن میں اترا تھا، وہ کیتھرین کے ذہن میں مکمل ہوا ہے۔

"اکثر وہ لیٹ نائٹ پارٹی کا کہہ کر جاتی اور پھر اچانک سے ہی واپس آ جاتی.....نہ جانے کیسے اسے پتا چل جاتا تھا کہ مجھے اس کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات مجھے ایسا لگتا کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔ کوئی جادوگرنی ہے جسے بروقت یہ پتا چل جاتا ہے کہ مجھے اس کی قربت کی طلب ہے۔

"ایک بار وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ مشرق کے ٹور پر گئی تھی۔ ایک ماہ کا ٹور تھا۔ میں نے سوچا تھا میں اس دوران اپنا نیا ناول مکمل کر لوں گا کہ ایک ہفتے بعد ہی طبیعت عجیب مکدر سی ہو گئی۔ کسی کام کو کرنے میں دل نہ لگا۔ کھانے پینے میں بھی تفریح نہ محسوس ہوئی.....اوپر سے دوستوں نے مل کر رومینٹک مووی دیکھنے کا پروگرام بنا لیا جسے دیکھ کر میں مزید ادھورے پن کا شکار ہو گیا۔ گھر آیا تو توقع کے خلاف سامنے کیتھرین موجود تھی۔

"تم.....یہاں کیسے؟" میں حیران کیسے نہ ہوتا۔

"اس سب کو چھوڑو.....یہ بتاؤ کہ مجھے ہی یاد کر رہے تھے نا....." وہ مجھے صوفے پر گرا کر خود مجھ پر لد گئی۔

"ہاں....." میں کسی ٹرانس کے زیر اثر بولا۔

"مجھے سیر کرتے کرتے احساس ہوا کہ تمہیں آج رات میری ضرورت ہے اور میں فلائٹ پکڑ کر فوراً آ گئی۔" وہ اپنی انگلیاں میری بھوؤں کے کنارے پر پھیرنے لگی۔ میں اس

کے زیر بدن ایسے بیٹھا تھا جیسے پتھر کا بنا ہوں۔ اس کی انگلیاں پھسلتے پھسلتے اب میری کنپٹی پر آ رہی تھیں۔ ایک گرم تپش میرے وجود میں اتر رہی تھی۔ وہ ایسا کم کم ہی کرتی تھی..... خود سے محبت کی شروعات..... نہ جانے ہماری عورتیں کیوں یہ سمجھتی ہیں کہ آغاز مرد ہی کا حق ہے۔ میری خوش قسمتی کہ کیتھرین ایسا نہیں سوچتی تھی اور ایسے موقعے پر میں سمجھ جاتا تھا کہ اس کی شدت مجھ سے بڑھ کر ہے۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا..... میاں بیوی کی زندگی میں اور ہوتا ہی کیا ہے۔ اگر قربت نکال دی جائے تو وہ محض ایک ادھورا رشتہ رہ جاتا ہے اور ہماری قربت تو اس قدر دل نشین ہوتی تھی کہ میں دنوں اس کے حصار سے نکل نہ پاتا تھا۔ کیتھرین ایسی لڑکیوں میں سے تھی جو مرد کے زیر تسلط نہیں ہوتیں بلکہ اسے اپنے تسلط میں کر لیتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا کمرا دنیا کا شاندار ترین کمرا تھا۔ اگر وہاں سچے دل سے میاں بیوی پیار کرتے ہیں تو وہ کسی بھی جنت سے بڑھ کر ہے..... وہاں کے در و دیوار میں بھی وہ چاشنی اور شانتی ہوتی ہے جو کسی میٹھے ڈیزرٹ اور کسی بدھ مت کی عمارت میں بھی نہیں ہوتی..... دوسری صورت میں وہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل کا کمرا ہی کیوں نہ ہو..... دوزخ سے بڑھ کر ہوتا ہے۔"

سینٹ پھر سے چپ ہو گیا۔ وہ جیسے اپنی بیوی کے ساتھ خیالی قربت میں مصروف ہو گیا تھا..... کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ کوئی اسے ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کس میں اتنی جرأت ہی کب ہوتی ہے کہ کسی کے کمرے میں جھانکے..... کمرے میں بے چینی بڑھنے لگی تھی اور مجھ میں تو کچھ زیادہ ہی.....

"ہر سال ہم ریڈ وڈ کے جنگلات جایا کرتے تھے۔ وہاں سرسبز و شاداب دیو قامت درختوں کے بیچوں بیچ اپنی محبت کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔ کیتھرین مجھے چوما کرتی۔ ریڈ وڈ کا ایک ایک درخت ہماری سات سالوں کی محبت کا گواہ ہے۔ ہم نے وہاں سات قسمیں کھائی ہیں اور سچے دل سے کھائی ہیں۔"

"پھر..... کیا ہوا؟" سب بری طرح سے بے چین ہو چکے تھے کہ اتنی محبت کے بعد پھر کوئی کیسے الگ ہو سکتا ہے۔

"پھر.....؟ پھر کیتھرین نے ماڈلنگ کے ساتھ ساتھ اداکاری بھی شروع کر دی۔ میرے مشورے پر ہی..... شروع میں اس کو بس سائڈ رول ملے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے لیڈ رول میں کاسٹ کیا جانے لگا۔ اس کے ڈرامے خوب ہٹ ہونے لگے۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہی ہیں۔ وہ خوب محنتی تھی۔ گھر پر وہ ان مکالموں کی مشق کرتی رہتی جو اس نے اگلے دن جا کر بولنے ہوتے تھے۔ وہ اداکاری کر کر کے مجھے دکھاتی، مجھ سے پوچھتی..... سینٹ! میں ٹھیک کر رہی ہوں کہ نہیں.....؟ میں اس کی خامیاں نکالتا اور اس کے جملے کی ادائیگی کو درست کرتا۔ اس نے میرے ناولوں پر بننے والے دو سیریل میں بھی کام کیا اور وہ اپنی ان ڈراموں کی کامیابی کا ذمے دار مجھے کہتی ہے کہ اگر میں ہیروئن کی اصل خوبصورتی، حساسیت، اس کا تشخص ہیرا بن اس پر واضح نہ کرتا تو وہ کبھی بھی یہ کردار ادا نہیں کر سکتی تھی۔

"ہم دونوں ہمیشہ ساتھ رہتے تھے۔ ہر ایک فنکشن اکٹھے اٹینڈ کرتے..... اس کے باوجود یہ باتیں گردش کرنے لگی تھیں کہ وہ آج کل جس لڑکے "شون" کے ساتھ ڈرامے میں ہیروئن ہے، اس کے ساتھ اس کا افیئر چل رہا ہے۔ میں نے ان باتوں کو ہمیشہ اخبار کی خبریں سمجھا اور کبھی کیتھرین پر شک نہ کیا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ اول اور آخر میری ہے اور اگر اسے وہ لڑکا شون پسند بھی آ جاتا ہے تو وہ بڑی آسانی سے مجھ سے الگ ہو سکتی ہے کیونکہ ہم یہ سب اپنی محبت کی پہلی سالگرہ کے موقعے پر ریڈ وڈ کے جنگلات کی پہلی قسم کے وقت ہی طے کر چکے تھے کہ اگر ہمیں زندگی میں کوئی اور پسند آتا ہے تو ہمیں اختیار نہیں ہو گا کہ ہم اسے اس کے پاس جانے سے روکیں..... تب ہم خوشی خوشی ایک دوسرے کو الوداع کہہ دیں گے۔ اس شرط پر ہم دونوں ہی کاربند تھے۔"

"یعنی معاملہ ہر طرف سے اطمینان بخش تھا۔ آپ نے اپنی زندگی کو بحرانوں میں جانے سے پہلے ہی بند باندھ دیے تھے؟"

"جی..... بالکل ٹھیک کہا آپ نے..... لیکن میں یہ بھول گیا تھا کہ جب بحران نے آنا ہوتا ہے تو بند خود بخود ہی اکھڑنے شروع ہو جاتے ہیں....." سینٹ ایک لمحے کو پھر خاموش ہو گیا۔ اس کا گلاس خالی ہو چکا تھا جسے رائن نے پھر سے بھر دیا۔

"پھر ایک دن وہ گھر آئی تو بہت الجھی ہوئی تھی جیسے ہواؤں سے لڑ رہی ہو....."

"کیا ہوا.....؟" اس کی پریشانی میں کیسے نہ نوٹ کرتا..... ٹائپ رائٹر سے سر اٹھا کر میں نے اس سے پوچھا۔

"کوئی بات نہیں ہے۔ ویسے ہی تھکن ہو رہی ہے۔" اس نے بات ٹالی۔ میں نے مزید کوئی سوال نہ کیا کیونکہ میں اس کی طبیعت کو جانتا تھا کہ وہ کوئی بھی بات زیادہ سے زیادہ چوبیس گھنٹے ہی مجھ سے پوشیدہ رکھ سکتی ہے اور ایسا ہی ہوا۔ اگلے دن شام تک وہ اس بات کو خود تک رکھ نہ سکی.....

"ڈرامے میں شون کے ساتھ ایک سین ہے جسے کرنے سے میں ہچکچا رہی ہوں۔"

"کیسا سین.....؟" میں کچھ کچھ سمجھ کر بولا۔

"قدرے کلوز سین..... قربت کا سین....." اس نے نمناک خیزی سے کہا اور خاموش ہو گئی۔ بات کو وہ آہستہ آہستہ بتا رہی تھی۔

"پورے دو منٹ کا سین ہے۔ میں نے ڈائریکٹر سے کہا ہے کہ وہ اس سین کو نکال دے لیکن وہ آمادہ نہیں ہو رہا....."

میں ناول کے کرداروں میں الجھ کر باہر نکلا..... وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"تو ڈائریکٹر کی بات مان لو..... کر لو..... اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے خاموشی توڑی۔

"کیا سچ میں.....؟" وہ اچھلی۔ "تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا؟"

"اعتراض کیسا.....؟" میں نے بے حد آرام سے کہا۔ "اداکاری تمہارا پیشہ ہے اور کیا..... اور تم وہاں اداکاری ہی تو کرو گی۔"

وہ میری اجازت سے اس قدر خوش ہوئی کہ میرے اوپر چڑھ دوڑی۔

"مجھے لگا تم مجھے ہرگز اجازت نہ دو گے سینٹ....."

"جیسے تم میرے پیشے میں نہیں بولتیں، ایسے ہی میں بھی تمہارے پیشے میں نہیں بولنا چاہتا..... تمہیں میری اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اچھا..... پھر مشق تو کروا دو....." اس نے خمار آلود آواز سے کہا اور میں قہقہہ مار کر ہنسا..... اور پھر تھوڑی دیر کے بعد اس کے لمس سے سیر ہونے لگا۔ اس کا وہی دل ربا اندازِ الفت..... اپنی انگلی کو میری بھوؤں سے لے جاتے ہوئے کنپٹیوں تک لے کر جانا..... میرے چہرے کو بغور دیکھنا اور پھر مجھے چوم لینا..... اس وقت وہ سلطنت بھی مانگتی تو میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔

"جس ڈرامے میں وہ ان دنوں کام کر رہی تھی، میں وہ ڈراما ہی سرے سے نہیں دیکھ رہا تھا اسی لیے اس میں شون کے ساتھ اس کا وہ سین بھی نہیں دیکھ سکا اور نہ ہی مجھے اس کے کسی اور لڑکے کے ساتھ اس طرح کے سین دیکھنے کا شوق تھا۔ اس ڈرامے کی خاصی تعریف کی جا رہی تھی۔ یہ کسی مرے ہوئے مصنف کے ناول پر مبنی ڈراما تھا جسے ناظرین بہت اہمیت

ماڈرن ڈکشنری

ماسٹر: بالغوں کے درمیان نابالغ۔
زبان: جو بغیر پیٹرول کے میلوں چلتی ہے۔
محبوبہ: پہلے بل بعد میں دل۔
سمجھوتا: مینجنگ ڈائریکٹر کی یونین کی جنرل سیکریٹری سے شادی۔
پرانی کار: جس میں پیٹرول کے بجائے خونِ دل جلتا ہے۔

مرسلہ: خلیل احمد لودھی، راولپنڈی

سگریٹ اور نوشی

سگریٹ نوش کو جتنا نقصان سگریٹ نوشی سے ہوتا ہے اس سے کئی گنا نقصان سگریٹ نوشی کے نقصانات پڑھ کر ہوتا ہے۔ میں جب بھی سگریٹ نوشی کے نقصانات پڑھتا ہوں تو مجھے اختلاج قلب کی بیماری تو اسی وقت ہو جاتی ہے، سانس میں رکاوٹ بھی محسوس ہونے لگتی ہے۔ بلڈ پریشر بھی ہائی ہو جاتا ہے چنانچہ کینسر ہونے سے پہلے میں اخبار لپیٹ کر پرے رکھ دیتا ہوں میرا ایک دوست تو سگریٹ نوشی کے نقصانات پڑھ کر اس قدر خوفزدہ ہوا کہ اس نے سگریٹ بھی چھوڑ دی اور نوشی بھی چھوڑ دی حالانکہ بے چاری نوشی کا کوئی قصور نہیں تھا۔

(عطاالحق قاسمی)

☆☆☆

بارش میں چلتے ہوئے پتا نہیں کیوں مجھے اپنے بچپن کا دوست شیخ رضا مہدی عرف جوجی یاد آ گیا۔ اس کا سر بھی میری طرح بالوں سے تقریباً ہاتھ دھو چکا ہے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگا۔ "یار یہ قدرت نے ہمارے بال اڑائے ہمارے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔"

"کوئی بات نہیں یار جوجی اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"فرق کیوں نہیں پڑتا یار۔ صبح سویرے جب میں دانت صاف کرنے کے لیے باتھ روم میں بیسن کے آگے کھڑا ہوتا ہوں تو سامنے لگے شیشے میں اپنی صورت دیکھتا ہوں تو خود میرا موڈ آف ہو جاتا ہے۔ دوسروں سے ہم کیا توقع کر سکتے ہیں۔"

(امجد اسلام امجد)

(مرسلہ: وزیر محمد خان..... بلل، ماسکہ)

دے رہے تھے۔ میں جہاں جہاں گیا، اس ڈرامے اور ان سینز کی بے حد تعریف ہوئی۔ سب نے میری اس فراخ دلی اور آزاد طبیعت کو سراہا۔ ساتھ ساتھ میری بیوی کی تعریف بھی کی..... جس کی مجھے بے حد خوشی ہوئی..... ایک مصنف بھی اگر زمانے کے قدیم اصولوں کے ساتھ بندھا رہے گا تو وہ اپنی تخلیق کو کیسے آزاد کرے گا۔

"وہ بلاشبہ ایک اچھی اداکارہ تھی۔ اس کا مجھے اعتراف تھا اور ہے۔ میں اپنے انٹرویوز میں اس بات کا... برملا اظہار بھی کرتا تھا۔ وہ ناقدین جو بڑے بڑے ایکٹر کو بھی نہیں بخشتے، وہ بھی میری بیوی کی اداکاری پر خاموش تھے۔ یا یوں کہہ لیں کہ ان سینز کے بعد تو سب کی بولتی بند ہو گئی تھی۔ کیتھرین کو جیسے آسکرمل گیا۔ اس پر پہلے اس بات کی تنقید ہوتی تھی کہ اس کا شوہر چونکہ ایک ناول نگار ہے، یعنی میں..... تو میری ہی وجہ سے اسے ڈراموں میں کاسٹ کیا جاتا ہے لیکن اس ڈرامے کے بعد چاروں طرف ایسی بے دلیل باتوں کی بندش ہو گئی۔ اس پر ہونے والی مدھم تنقید بھی تھم گئی۔

"زندگی میٹھے چشمے کی طرح بہتی رہی۔ ہم دونوں کے معمولات اور محبت میں ذرہ برابر بھی کمی نہ آئی۔ پتا ہی نہیں چلا اور ایک سال مزید گزر گیا۔ ہماری محبت اور قربت کو آٹھ سال ہو گئے۔ ہم دونوں کی محبت میں وہ ہندسہ آ گیا جسے منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ آٹھ کا ہندسہ.....

"اور مارچ کے مہینے کا وہ دن بھی آ گیا جب ہم دونوں ریڈ وڈ کے جنگلات جا کر اپنی محبت کی قسم کو دہراتے رہے تھے۔

"کیتھرین رات سے ہی تیاریاں کر رہی تھی۔ وہ بیکری سے جا کر کھانے کی چیزیں لائی تھی اور اس کا گھر میں بھی بہت کچھ بنانے کا ارادہ تھا۔ وہ اپنے اور میرے ..... کپڑے نکال کر انہیں پریس کر رہی تھی اور ہر طرح کی وہ تیاری جو جنگلوں میں جاتے وقت کی جاتی ہے، کر رہی تھی۔

"اسی وقت میرے پبلشر کی کال آئی کہ میں اسے جانے سے پہلے ایک ناول پر اپنی رائے دے دوں جس کا میں نے اس سے وعدہ کیا ہوا تھا۔ میری رائے تیار تھی لیکن میرے کمپیوٹر میں مسئلہ ہو رہا تھا۔ میں نے کیتھرین کا لیپ ٹاپ آن کر لیا۔ پبلشر کو ناول پر تبصرہ بھیجا اور تب ہی میری نظر ایک فولڈر پر پڑی جو ڈیسک ٹاپ پر ہی موجود تھا۔

"بے ارادہ ہی میں نے فولڈر اوپن کر لیا۔ اندر وہ ویڈیو موجود تھی جس میں اس کے شون کے ساتھ ڈرامے میں قربت کے سینز تھے۔

"سینٹ میں نے کئی آئٹم تیار کر لیے ہیں اگر تمہیں کچھ اور بھی کھانا ہے تو بتاؤ....." میری بیوی مجھ سے پوچھ رہی تھی اور مجھ سے کوئی جواب نہیں بن رہا تھا۔ میری نظروں کے سامنے وہ سینز تھے جس کی میں ایک ایک سے تعریف سن چکا تھا۔ کیتھرین اور شون..... ایک ساتھ، ایک بستر پر، ایک دوسرے کے بے حد قریب.....

"سینٹ! کیا میں تمہیں چاکلیٹ کیک بنا دوں؟ تمہیں بہت پسند ہیں۔ وہاں بازار سے تو کچھ ملتا نہیں....." کیتھرین کچن سے بول رہی تھی اور میں لیپ ٹاپ پر وہ سینز ایک بار پھر سے دیکھ رہا تھا۔"

سینٹ ایک بار پھر سے خاموش ہو گیا۔ کمرے میں آتش دان کی جلتی آگ کے سوا اور کوئی آواز نہ تھی۔ سب خاموش تھے۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

"بس اسی دن میں نے فیصلہ کر لیا کہ ہمیں اب الگ ہو جانا چاہیے۔" سینٹ نے کہہ کر جام سے ایک گھونٹ بھرا اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

"سینٹ! میں سوچ رہی ہوں چکن نگٹس بھی بنا ہی لیتی ہوں۔ ذرا بازار سے جا کر مجھے بریڈ کرمز لا دو۔"

"میں باہر نکلا اور پھر کبھی گھر واپس نہیں گیا۔"

سب دم بخود سینٹ کو دیکھنے لگے۔ اکیلی آگ بہت دیر تک سلگتی رہی.....

"لیکن جناب! ہم سمجھے نہیں..... ان سینز کی اجازت تو آپ نے خود ہی انہیں دی تھی اور ان کی کیا نوعیت تھی، یہ بھی آپ جانتے تھے پھر قصوروار آپ کی بیوی کیسے ہوئی؟ آپ ہوئے..... آپ کا اسے چھوڑ دینا کچھ سمجھ میں نہیں آیا؟" سب کے دل میں یہی سوال تھا جو میں نے پوچھا تھا۔

"ہاں..... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں نے ہی اسے اجازت دی تھی کہ وہ شون کے ساتھ وہ سینز کر لے..... نوعیت کا بھی مجھے پتا تھا اور میں ان سینز کو جانتا بھی تھا۔ مشق تو اس نے میرے ساتھ ہی کی تھی لیکن تقریباً نو ماہ بعد جب میں نے وہی عمل شون کے ساتھ ہوتے دیکھا تو میں سمجھ نہ سکا کہ....."

"کہ کیا.....؟"

"کہ وہ اداکاری کہاں کر رہی ہے، کس کے ساتھ.....؟ سیٹ پر شون کے ساتھ..... یا آٹھ سال سے میرے ساتھ....."

سینٹ نے کہا اور کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

وہ اس دوران مسلسل اس تعجب خیز واقعے پر غور کرتے رہے تھے لیکن جیسے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام بیدار ہوئے حضرت یوشع کے ذہن سے یہ واقعہ نکل گیا۔

(شاید شیطان نے انہیں بھلا دیا)

"یوشع! ہم بہت سو لیے۔ اب آگے چلتے ہیں۔ ابھی دن کا کچھ حصہ باقی ہے۔ اگر رات ہو گئی تو ہمارا آگے جانا مشکل

حضرت موسیٰ علیہ السلام

رضوانہ ساجد

بادشاہت کو خطرہ ہمیشہ سے رہا ہے اور ہمیشہ ہی رہے گا... یہ دور مختلف انبیا، کے آنے کا اور تبلیغی کام کرتے رہنے کا تھا... ان میں مصریوں کے بادشاہ فرعون کا قصہ سرفہرست ہے... حیرت ہے قدرت بھی کیسے کیسے نظارے دکھاتی ہے۔ نجومیوں نے ایک انتہائی طاقتور بادشاہ کے لیے نومولود بچے کو خطرے کی علامت بنا کر اشارہ دے دیا تھا اور انہی اندیشوں میں اس وقت پیدا ہونے والے تمام نومولود بچے قتل کر دیے گئے ماسوائے ایک کے... جسے اللہ نے فرعون کی ہلاکت کا سبب اور اپنا پیغمبر بنا کر دنیا میں اتارا تھا۔ اس دور کی تمام مائیں خوف و دہشت کا شکار تھیں۔ ایسے میں موسیٰ کی ماں کو غیبی آواز آئی "اس کو دودھ پلا... پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ غم اور خوف نہ کر کہ ہم اسے تیرے ہی پاس لوٹائیں گے اور اسے پیغمبروں میں شامل کریں گے۔" سبحان تیری قدرت، یہ وعدہ پورا ہوا۔



PakiBooks.com

ہوجائے گا۔ خدا نے چاہا تو رات سے پہلے پہلے ہم اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔"

حضرت یوشع نے اللہ کے رسول کا حکم سنتے ہی جلدی جلدی سامانِ سفر سمیٹا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ مچھلی کا خیال اس وقت بھی نہیں آیا۔

دونوں کنارے کنارے خشکی پر چلتے رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تعجب ہو رہا تھا کہ ابھی معمولی سا فاصلہ طے کیا ہے اور تھکن سے پاؤں جلنے لگے ہیں۔ آگے بڑھنے کی ہمت ہی نہیں رہی۔

"یہی حال میرا بھی ہے۔"

"تعجب تو یہ ہے کہ سینا سے یہاں تک آ گئے مگر اتنی تھکن نہیں ہوئی تھی۔ ہم آرام کر کے چلے ہیں پھر بھی اتنے تھک گئے۔"

"آپ بہتر جانتے ہیں یا آپ کا اللہ۔"

"شاید یہ حال بھوک کی وجہ سے ہو۔ تھیلے سے مچھلی نکالو تاکہ ہم بھوک رفع کر لیں۔"

مچھلی کا نام سنتے ہی حضرت یوشع کی یاد تازہ ہو گئی۔ انہیں وہ واقعہ یاد آ گیا جسے اب تک وہ بھولے ہوئے تھے۔

"یا اللہ کے رسول! میں آپ کو بتانا ہی بھول گیا۔ مچھلی تو غائب ہو چکی۔ ہم جس جگہ آرام کرنے کے لیے لیٹے تھے، میں نے بیدار ہونے کے بعد یہ منظر دیکھا تھا کہ مچھلی میں جان آ گئی تھی اور وہ سمندر میں اتر گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا جب آپ بیدار ہوں گے تو یہ قصہ آپ کو سناؤں گا۔ پھر شیطان نے مجھے بھلا دیا۔"

"یوشع! مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ جہاں مچھلی گم ہو جائے گی، وہیں اس اللہ کے بندے سے میری ملاقات ہو گی جسے وہ علم سکھایا گیا ہے جو علم میرے پاس نہیں۔"

"اب کیا ہو سکتا ہے، مچھلی تو ہاتھ سے گئی۔"

"ہمیں اسی مقام پر پہنچنا ہو گا۔ اب تھکنے کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی منزلِ مقصود تک پہنچنے میں کوئی تھکن نہیں ہوئی تھی لیکن جونہی منزل سے آگے غلطی سے نکل گئے تو اب تھکن محسوس ہونے لگی۔"

اتنی دور نکل آئے تھے کہ واپسی میں رات بھر چلنے کے بعد صبح کے وقت اس مقام پر پہنچے۔ وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سمندر میں وہ جگہ دیکھی جہاں مچھلی راستہ بناتی ہوئی گئی تھی۔

"مجھے بتایا گیا تھا کہ ہمیں اس مردِ صالح کو تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ وہ خود ہمارے سامنے آ جائے گا۔"

انہوں نے دور دور تک دیکھا۔ اس ویرانے میں کسی آدمی کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ وہ اسی پتھر پر بیٹھ گئے جسے سر کے نیچے رکھ کر لیٹے تھے۔

"یہی وہ مقام ہے۔" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ "وہ مردِ خدا ہم سے یہیں آ کر ملے گا۔"

حضرت یوشع نے دور دور تک دیکھنے کی کوشش کی۔ کوئی آتا جاتا دکھائی نہیں دیا تو وہ بھی ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی پانی کی طرف دیکھ لیتے تھے کبھی خشکی کی طرف۔ پھر انہیں دور سے ایک آدمی آتا نظر آیا۔ یہ سمجھنے کے لیے زیادہ تگ و دو کی ضرورت نہیں تھی کہ مطلوبہ شخص یہی ہے کیونکہ اس ویرانے میں اس کے سوا کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ یہ بھی اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ آس پاس کوئی بستی نہیں۔ یہ شخص اچانک سامنے آیا تھا۔ اس کے بدن پر شاندار لباس تھا۔ ایک چادر اس کے کندھے پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ ابھی قریب نہیں آیا تھا لیکن اس کا چہرہ چاند کی طرح چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے استقبال کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی اتباع میں یوشع بن نون بھی کھڑے ہو گئے۔

وہ شخص نزدیک آیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے سلام کیا۔ "السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام بنی اسرائیل کے نبی اور عمران کے بیٹے۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے، میں صحیح شخص سے مل رہا ہوں۔ آپ بے شک عالمِ بے بدل ہیں۔ میں نے اپنا تعارف بھی نہیں کرایا اور آپ نے مجھے بنی اسرائیل کے نبی کی حیثیت سے پہچان لیا۔"

"علم تو آپ کو بھی خوب دیا گیا ہے، بس نوعیت جدا جدا ہے۔ آپ کو شرعی علوم سے واقف کیا گیا ہے جبکہ مجھے علمِ تکوین بخشا گیا ہے۔ جو آپ جانتے ہیں وہ مجھے نہیں معلوم، جو مجھے معلوم ہے وہ آپ نہیں جانتے۔"

"کیا میں آپ کے ساتھ رہ کر وہ علم حاصل کر سکتا ہوں جو خدا نے صرف آپ ہی کو بخشا ہے؟"

"کیوں اپنی زندگی اجیرن کرنا چاہتے ہو۔ یہ وہ علم ہے کہ اگر اسے عام کر دیا جائے تو زندگی گزارنا مشکل ہو جائے۔"

"میں اسے عام کرنے کے لیے حاصل نہیں کروں گا۔ یہ تو مجھ تک محدود رہے گا۔"

"مجھے اس علم ہی سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ تم زیادہ دن میرے ساتھ رہ نہیں سکو گے۔"

"میں اس وقت تک آپ کے ساتھ رہوں گا جب تک اس علم کے بنیادی نکات حاصل نہ کر لوں۔"

"تم میرے ساتھ رہ کر ان معاملات پر صبر نہ کر سکو گے جو پیش آتے رہیں گے۔"

"انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے۔"

"تو پھر شرط یہ ہے کہ تم میرے معاملات میں قطعی دخل نہیں دو گے اور مجھے اپنے سوالات سے پریشان نہیں کرو گے۔"

"میں تو بس اس علم کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا ہوں جو آپ کو عطا کیا گیا ہے۔"

"میں یہ ابھی سے آگاہ کر دوں کہ میں تمہارے صرف تین سوالوں کو برداشت کروں گا۔ تیسرے سوال کے بعد ہمارے راستے جدا ہو جائیں گے۔ اس کے بعد ہم ویسے بھی اس علم کے مفہوم کو سمجھ چکے ہوں گے۔"

"میں کبھی یہ نہیں پوچھوں گا کہ آپ نے یہ کیوں اور کیسے کیا۔"

"ایسا ہو گا نہیں، بہرحال تم میرے ساتھ ساتھ چلو۔"

یہ حضرت خضر علیہ السلام تھے جن کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا نے بھیجا تھا۔

جب حضرت خضر علیہ السلام نے انہیں اپنے ساتھ چلنے کو کہا اور انہیں لے کر سمندر کے کنارے کنارے چلنے لگے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے پوچھنے ہی والے تھے کہ وہ انہیں کہاں لے جا رہے ہیں لیکن فوراً خیال آ گیا کہ انہیں سوال کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیا اور خاموشی سے چلتے رہے۔ شرط یہی تھی کہ وہ کوئی سوال نہیں کریں گے۔

"مجھے معلوم ہے کشتی کہاں سے ملے گی۔" حضرت خضر علیہ السلام نے شاید حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں ابھرنے والے سوال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہا۔

ابھی کچھ دور چلے ہوں گے کہ سامنے سے ایک کشتی آتی ہوئی نظر آئی۔ یہ تینوں اس جگہ رک گئے۔ کشتی جونہی کنارے پر آئی حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی میں پاؤں رکھ دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور یوشع بن نون بھی سوار ہو گئے۔

ابھی کشتی کچھ ہی دور گئی ہو گی کہ حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کے سامنے والے حصے کا ایک تختہ اکھاڑ کر کشتی میں سوراخ کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ سب دیکھ رہے تھے۔ انہیں بڑا غصہ آیا۔ یہ شخص تو سب کو ڈبونے پر تلا ہوا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں کشتی میں پانی بھر جائے گا اور کشتی ڈوب جائے گی۔ کشتی میں جس جگہ سوراخ ہوا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہاں اپنا پاؤں رکھ دیا تاکہ کشتی میں پانی نہ بھرے اور وہ بہ حفاظت کنارے پر اتر جائیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو سرزنش کی۔

"آپ نے یہ کیا حرکت کی۔ کشتی والے نے تو ہم پر احسان کیا کہ اپنی کشتی میں بٹھایا اور آپ نے اس احسان کا یہ بدلہ دیا کہ کشتی میں سوراخ کر دیا کہ ہم سب ڈوب ہی جائیں۔"

حضرت خضر علیہ السلام نے کہا۔ "میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ میرے کاموں پر صبر نہ کر سکیں گے اور سوال کر بیٹھیں گے۔ آخر وہی ہوا۔ میں نے بھی کہہ دیا تھا کہ تین سوالوں تک برداشت کر سکوں گا۔ آپ نے ایک موقع ضائع کر دیا۔"

"مجھے اپنا کہا یاد نہیں رہا تھا۔ امید ہے آپ میری بھول چوک کو معاف کر دیں گے اور میرا مواخذہ نہیں کریں گے۔"

اسی وقت ایک چڑیا کشتی کے کنارے آ کر بیٹھی اور پانی میں چونچ ڈال کر ایک قطرہ پانی کا پی لیا۔

حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا۔ "تم نے اس چڑیا کو دیکھا؟ علمِ الٰہی کے مقابلے میں میرا اور تمہارا علم ایسا ہی ہے جیسے سمندر کے سامنے یہ قطرہ جسے یہ چڑیا لے اڑی۔"

اسی اثنا میں کشتی کنارے پر جا لگی۔ یہ تینوں کشتی سے اترے اور ایک جانب روانہ ہو گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پھر یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ انہیں کہاں لے جایا جا رہا ہے اور کیوں؟ لیکن کچھ پوچھنے سے قاصر تھے کہ کہیں یہ بھی سوال میں شمار نہ ہو جائے اور ان کے پاس صرف ایک سوال باقی رہ جائے۔

"تمہارے خیال میں چڑیا کے پانی پی لینے سے سمندر کے پانی میں کوئی کمی آئی ہو گی؟"

''سمندر کے پانی کے سامنے دو چار قطروں کی کیا حیثیت۔''

''بس یہی حال علم کا ہے۔ علم بھی سمندر جیسا ہے۔ اگر دو چار قطرے چرا بھی لیے جائیں تو بھی علم کے سمندر میں کوئی کمی نہیں آتی۔ اس لیے یہ سوچنا بھی نادانی ہے کہ مجھ جیسا عالم دنیا میں نہیں یا میں نے علم کے مراحل طے کر لیے۔ ہم اگر ساری عمر بھی سیکھتے رہیں تو بھی علم کے ہزار ہا شعبے ایسے ہوں گے جو ہم نے نہیں سیکھے ہوں گے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ انہوں نے جو یہ کہا تھا کہ صاحب علم میرے سوا کوئی دوسرا نہیں ہم گفتگو اس کا جواب ہے۔

یہ تینوں اب چلتے چلتے ایک میدان میں آ گئے تھے۔ یہاں بہت سے بچے دنیا کی ہر فکر سے بے نیاز کھیل کود میں مشغول تھے۔ لگتا یہی تھا کہ کوئی گاؤں قریب ہے۔ اسی گاؤں کے یہ بچے ہیں۔

حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ چھوڑا اور ایک لڑکے کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ یہ لڑکا تمام لڑکوں میں سب سے زیادہ خوب صورت اور معصوم نظر آ رہا تھا۔ اپنی عمر سے بڑی عمر کے آدمی کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر اس نے بچوں کو چھوڑا اور ایک طرف سہم کر کھڑا ہو گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جہاں تھے وہیں کھڑے رہ گئے۔ وہ یہی سمجھے کہ یہ لڑکا حضرت خضر علیہ السلام کا کوئی واقف کار ہے۔ اس سے کوئی بات کر رہے ہوں گے۔ حضرت خضر علیہ السلام باتیں کرتے ہوئے اس لڑکے کو میدان سے باہر لے گئے۔ دوسرے لڑکوں نے اپنے ساتھی کو جاتے ہوئے دیکھا اور پھر کھیل میں لگ گئے۔

کچھ دیر بعد کچھ لڑکے بھاگتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے۔

''تمہارے ساتھی نے ہمارے بھائی کو جان سے مار دیا۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''تم خود جا کر دیکھ لو۔ ہمیں تو ڈر لگ رہا ہے، کہیں وہ ہمیں بھی نہ مار دے۔ ہم تو بھاگ رہے ہیں۔''

لڑکے بھاگ گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس طرف گئے جہاں حضرت خضر علیہ السلام اس لڑکے کو لے کر گئے تھے۔ دیکھا کہ لڑکا مرا پڑا ہے، حضرت خضر علیہ السلام نے اسے گلا گھونٹ کر مار دیا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تعجب بھی ہوا کہ ایسے شستعلیق آدمی نے ایسا گھناؤنا جرم کر ڈالا اور غصہ بھی آیا پھر حضرت خضر علیہ السلام سے سوال کر بیٹھے۔

''یہ لڑکا معصوم بھی تھا اور خوبرو بھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ بے قصور تھا۔ اس نے آپ سے کوئی بدتمیزی بھی نہیں کی تھی پھر آپ نے ایسا گھناؤنا کام کیا کہ اسے قتل کر دیا۔''

''اے موسیٰ! میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم مجھ سے سوال نہیں کرو گے۔ میں تمہیں جواب دینے کا پابند نہیں۔ تم دو سوال کر چکے ہو۔ اگر تم نے تیسرا سوال کیا تو ہماری جدائی لازمی ہو جائے گی۔''

''میں خود بھی کوئی سوال کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس بچے کی ہلاکت کا منظر دیکھ کر بے چین ہو گیا۔ اب مجھے آپ یہ بتائیں کہ آپ نے اسے ہلاک کیوں کیا؟''

''میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ تم مجھ سے بار بار سوال کرو گے اور میرے کام میں دخل اندازی کرو گے۔ میں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ مجھے علم تکوین حاصل ہے۔ میں بعد کے حالات جان لیتا ہوں اور اسی کے مطابق کام کرتا ہوں۔ تم اس علم سے بے خبر ہو اس لیے خاموش ہی رہو تو بہتر ہے۔''

''میں اس مرتبہ کے لیے پھر معذرت کرتا ہوں۔ اس کے بعد بھی اگر مجھ سے صبر نہ ہو سکا اور سوال کر بیٹھا تو بے شک آپ مجھ سے علیحدہ ہو جائیے گا۔''

یوشع بن نون ان سوال و جواب کو بڑے غور سے سن رہے تھے لیکن انہیں بولنے کی اجازت نہیں تھی اس لیے خاموش ہی رہے تھے۔

حضرت خضر علیہ السلام یہاں سے بھی روانہ ہو گئے۔ چلتے چلتے ایک بستی میں پہنچے۔ انہوں نے گاؤں کے لوگوں سے درخواست کی کہ وہ انہیں ایک رات کے لیے اپنا مہمان بنا لیں۔ لوگ اپنے گاؤں کے سردار سے بہت ڈرتے تھے۔ انہوں نے اپنی جانب سے کوئی جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور انہیں اپنے سردار کے پاس بھیج دیا۔ وہ عجیب بدتمیز آدمی تھا۔ ان کی

طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ گیا اور نہایت درشتی سے مخاطب ہوا۔

''تم بھوکے ننگے لوگ معلوم ہوتے ہو۔ اجرت میں کچھ بھی نہیں دو گے۔ الٹا چلتے وقت یہاں سے کچھ اٹھا کر لے جاؤ گے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ یہاں سے چلتے بنو۔''

''اگر ہم اجرت میں کچھ دے دیں تو تم ہمیں ٹھہرنے دو گے؟''

''ہرگز نہیں۔ تم شکلوں سے چور لگتے ہو۔ جلدی ہمارے گاؤں سے نکل جاؤ۔''

''ہم چور نہیں۔ ہم تو مسافر ہیں اور مسافروں کی مہمان نوازی ہماری بستیوں کا دستور ہے۔ تم کیسے انسان ہو کہ ہماری مدد نہیں کر سکتے۔''

''اس سے پہلے کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے، ہم وہ بھی لوٹ لیں..... یہاں سے نکل جاؤ۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''اس بے عزتی سے تو بہتر ہے ہم کسی اور گاؤں کا رخ کریں۔'' حضرت خضر علیہ السلام نے ان سے اتفاق کیا اور انہیں لے کر سردار کے گھر سے باہر آ گئے۔

اس بستی کے لوگ بھی فتنہ انگیز تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ سردار نے انہیں مہمان بنانے سے انکار کر دیا ہے تو وہ ان تینوں سے نہایت بدتمیزی سے پیش آئے۔ اگر یوشع ان کے سامنے تن کر کھڑے نہ ہوتے تو شاید وہ لوگ ہاتھا پائی پر اتر آتے اور لوٹ مار کرتے۔

حضرت خضر علیہ السلام ان لوگوں پر افسوس کرتے ہوئے بستی سے نکلنے لگے۔ ابھی بستی سے گزر ہی رہے تھے کہ وہ ایک مکان کی جانب تیزی سے بڑھے۔ اس مکان کی دیوار کچھ جھکی ہوئی تھی اور گویا گرنے ہی والی تھی۔ انہوں نے دیوار کو ہاتھ کا سہارا دیا اور اسے سیدھا کر دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ابھی تک گاؤں والوں کی بے مروتی پر غصہ آ رہا تھا۔ انہوں نے جب حضرت خضر علیہ السلام کی اس نیکی کو دیکھا تو خود کو بغیر نہ رہ سکے۔

''ہم اس بستی میں مسافر وارد ہوئے مگر یہاں کے لوگوں نے ہمیں ٹکنے کی جگہ تک نہ دی اور آپ نے اسی گاؤں کے ایک باشندے کی دیوار کو بغیر اجرت کے درست کر دیا۔ اگر کرنا ہی تھا تو کچھ اجرت طلب کرتے کہ بھوک پیاس مٹانے کا بندوبست تو ہو جاتا۔''

''تم نے پھر ایک سوال کر دیا۔ اب تم مزید میرے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اللہ کو یہی منظور ہے کہ تم میرے ساتھ یہیں تک رہو۔ جن باتوں پر تم سے صبر نہ ہو سکا، ان کی حقیقت اب میں تمہیں بتلائے دیتا ہوں۔ سب سے پہلے کشتی کا معاملہ لو۔ وہ کشتی چند مسکینوں کی ہے جو سمندر میں محنت مزدوری کرتے ہیں۔ وہ جس طرف بڑھ رہے تھے وہاں ایک بادشاہ ہے۔ جس کسی کی کشتی دیکھتا ہے زبردستی لے لیتا ہے۔ میں نے چاہا کشتی کو عیب دار کر دوں تاکہ یہی سمجھ کر اس کو چھوڑ دے۔ یہ کشتی بعد میں مرمت کر کے دوبارہ کام میں آ سکتی ہے۔ میرا علم کہہ رہا ہے کہ کشتی والے نیچے تختے اور کوتار لگا کر کشتی کو ٹھیک کر چکے ہیں۔ اب بتاؤ، یہ میری غلطی تھی یا کشتی والوں کے ساتھ بھلائی۔

''اس لڑکے کا جہاں تک تعلق ہے جسے میں نے قتل کیا تو میرے علم نے مجھے بتایا کہ اس کے ماں باپ مومن ہیں لیکن یہ بڑا ہو کر کفر میں مبتلا ہو گا اور ماں باپ کو سرکشی اور کفر اختیار کر کے اذیت پہنچائے گا۔ اس کے ماں باپ بھی اس کی محبت میں کفر اختیار کر لیں لہٰذا میں نے اسے قتل کر دیا۔ اللہ نے چاہا تو اس کے والدین کو اس سے بہتر لڑکا ملے گا۔ دینداری میں بھی اور محبت میں بھی۔

''جو دیوار میں نے درست کر دی، اس کے بارے میں بھی جو تم نہیں جانتے وہ میں جانتا ہوں۔ وہ دیوار دو یتیم لڑکوں کی ہے۔ اس کے نیچے ان کا خزانہ گڑا ہوا ہے۔ ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا، پس تمہارے پروردگار نے چاہا دونوں لڑکے اپنی جوانی کو پہنچیں اور اپنا خزانہ محفوظ پا کر نکال لیں۔ اگر دیوار گر جاتی تو ان لڑکوں کے ہاتھ کچھ بھی نہ لگتا اور سب ان کے بھائی بند لوٹ کر لے جاتے۔ تم بتاؤ کیا میں یہ مہربانی نہ کرتا؟

''اے موسیٰ! میں نے جو کچھ کیا اپنے اختیار سے نہیں کیا، اللہ کے حکم سے کیا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے ملاقات کرنے کے بعد جن راستوں سے گئے تھے، انہی راستوں سے لوٹ آئے۔

اس سلسلے میں ایک حدیث بھی بیان کی جاتی ہے جس کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔ ''ہمارا جی تو یہ چاہتا تھا کہ

موسیٰ علیہ السلام تھوڑا صبر اور کرتے اور ہم کو اللہ تعالیٰ کے اسرار اور تکوینی علوم کی مزید معلومات ہو سکتیں۔''

قرآن عزیز میں (سورۃ کہف میں) جب یہ قصہ بیان ہوا تو کہیں ان کا (خضرؑ) نام یا لقب نہیں لیا گیا بلکہ اپنے بندوں میں سے ایک بندہ کہا ہے جسے خدا نے اپنی رحمت سے نوازا تھا اور اسے ایک خاص علم عطا کیا تھا۔

☆☆☆

سینا کے اس میدان میں قیام کرتے ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ دوسرے لفظوں میں مصر سے نکلے ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے باپ دادا کی سرزمین دیکھنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحٰق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے خدا کا وعدہ تھا کہ تمہاری اولاد پھر اس سرزمین کا مالک بنائیں گے جو یہاں پھلے پھولے گی اور امن کی زندگی بسر کرے گی۔ بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی وعدے کے ساتھ یہاں لائے تھے اور قدم قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ آخر خدا نے اپنے وعدے کا اظہار کیا۔ خدا کا حکم ہوا کہ اپنی قوم سے کہو ارضِ مقدس میں داخل ہو اور وہاں کے جابر و ظالم حکمرانوں کو نکال کر عدل و انصاف کی زندگی بسر کرو۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ فتح تمہاری ہوگی اور تمہارے ظالم دشمن ناکام ہوں گے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لشکر کی تیاری کے لیے مردم شماری کا فیصلہ کیا تاکہ ان کی عمروں کے حساب سے ایسے افراد کی فہرست تیار کی جائے جو جنگ کرنے کے قابل ہوں۔ انہوں نے ہر قبیلے کے سرداروں کو اپنے پاس بلایا۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے۔ ان کے بارہ سردار ان کے پاس آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے ذمے یہ کام لگایا کہ وہ اپنے اپنے قبیلوں سے ایسے افراد کا شمار کروائیں جو بیس برس یا اس سے اوپر کے ہوں۔

ہر فرد اپنے گھرانے اور آبائی قبیلے کے حساب سے گنا گیا۔ ہر قبیلے کے شمار کو گنا گیا تو کُل تعداد چھ لاکھ تین ہزار پانچ سو پچاس نکلی۔

جب یہ کام مکمل ہو گیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکمِ خداوندی کے مطابق قوم کو حکم دیا کہ اپنے اپنے ڈیرے اپنے اپنے جھنڈے کے پاس اور اپنے اپنے آبائی خاندان کے علم کے ساتھ خیمۂ اجتماع کے مقابل اور اس کے گرد اگرد لگاؤ۔

یہوداہ اپنے جھنڈے مشرق کی جانب لگائیں جدھر سے سورج نکلتا ہے۔ ان کے قریب اشکار قبیلے کے لوگ ڈیرے ڈالیں۔ پھر زبولون کا قبیلہ ہو۔

اسی طرح انہوں نے دوسرے قبیلوں کے لیے ان کی سمتوں کا تعین کیا۔

کوچ کے وقت یہوداہ پہل کریں گے اس کے بعد روبن کا قبیلہ ہوگا۔

مغرب کی جانب افرائیم کے جھنڈے کے لوگ ہوں۔ کوچ کے وقت تیسرا نمبر ان کا ہو۔

تمام قبیلوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم کے مطابق اپنے اپنے جھنڈے کے پاس اور اپنے آبائی خاندانوں کے مطابق اپنے اپنے گھرانے کے ساتھ ڈیرے لگائے۔

خداوند نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا۔ ''ہارون اور اس کے بیٹوں سے کہو کہ تم بنی اسرائیل کو اس طرح دعا دیا کرنا۔

خداوند تجھے برکت دے اور تجھے محفوظ رکھے۔

خداوند اپنا چہرہ تیری طرف متوجہ کرے اور تجھے سلامتی بخشے۔

خداوند اپنا چہرہ تجھ پر جلوہ گر فرمائے اور تجھ پر مہربان رہے۔

اسی طرح وہ میرے نام کو بنی اسرائیل پر رکھیں اور میں ان پر برکت بخشوں گا۔''

اب کوچ کا وقت آنے کو تھا۔ خیمۂ شہادت نصب ہوا۔ ایک ابر اٹھا اور خیمۂ شہادت پر چھا گیا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا دیکھو جب تک یہ ابر چھایا رہے گا تمہیں یہاں رہنا ہوگا۔ جب یہ ابر اٹھے گا تو تمہیں بھی یہاں سے اٹھنا ہوگا اور یہ ابر تمہارے ساتھ ساتھ چلے گا یہ ابر جہاں رکے گا، ہمیں بھی وہیں قیام کرنا ہوگا۔ وہیں ہم خیمے لگائیں گے۔''

خداوند نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اپنے لیے چاندی کے دو نرسنگے بنواؤ تو ان کو جماعت کے بلانے اور لشکروں کے کوچ کے لیے کام میں لانا۔ جب دو نرسنگے پھونکے جائیں تو ساری جماعت خیمۂ اجتماع کے دروازے پر تیرے پاس اکٹھی ہو جائے۔ جب تجھے صرف سرداروں ہی کو بلانا ہو تو ایک نرسنگا پھونکنا۔ جب تم دوبارہ سانس باندھ کر زور سے پھونکو تو ان لشکروں کو جو جنوب کی طرف ہیں کوچ ہو۔

جب تم اپنے ملک میں ایسے دشمن سے جو تم کو ستاتا ہو، لڑنے کو نکلو تو تم نرسنگوں کو سانس باندھ کر زور سے پھونکنا اس حال میں اپنے دشمنوں سے نجات پاؤ گے۔

پھر جب کوچ کا وقت آیا یعنی ابرِ شہادت کے مسکن سے اٹھ گیا اور نرسنگے پھونکے گئے۔ سب سے پہلے یہوداہ کا جھنڈا روانہ ہوا۔ پھر جو ترتیب مقرر ہوئی تھی، قبیلے روانہ ہوتے رہے۔ عہد کا صندوق ان کے ساتھ ساتھ آگے چل رہا تھا۔

انہوں نے تین دن کی مسافت طے کی تھی کہ ان کے ساتھ چلنے والا ابر دشتِ فاران میں جا کر ٹھہر گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا فرمائی۔

''خداوند تیرے دشمن پراگندہ ہو جائیں اور جو تجھ سے کینہ رکھتے ہیں وہ تیرے آگے سے بھاگ گئیں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ارضِ مقدس میں داخل ہونے سے پہلے ضروری سمجھا کہ کچھ لوگوں کو جاسوس کے طور پر وہاں بھیج کر وہاں کے حالات معلوم کر لیں تاکہ ان حالات کے مطابق ہی جنگ کی حکمتِ عملی تیار کی جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارہ قبیلوں میں سے ایک ایک آدمی لے کر بارہ آدمیوں کو تفتیش کے لیے بھیجنے پر رضامند کیا۔ ان میں یوشع بن نون اور کالب بن یفنہ بھی تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو روانہ کیا تاکہ ملک کنعان کا حال دریافت کریں اور ان سے کہا کہ تم ادھر جنوب کی طرف سے جا کر پہاڑوں میں چلے جانا اور دیکھنا کہ وہ ملک کیسا ہے اور جو لوگ وہاں بسے ہوئے ہیں، وہ کیسے ہیں۔ زور آور ہیں یا کمزور اور تھوڑے سے ہیں یا بہت اور جس ملک میں وہ آباد ہیں، وہ کیسا ہے۔ وہ خیموں میں رہتے ہیں یا قلعوں میں۔ وہاں کی زمین کیسی ہے، زرخیز ہے یا بنجر اور اس میں درخت ہیں یا نہیں اور تم اس ملک کے کچھ پھل لیتے آنا۔

یہ بارہ کے بارہ آدمی فلسطین کے قریبی شہر اریحا میں داخل ہوئے اور تمام حالات کو بغور دیکھا۔ چالیس دن کے بعد اس ملک کو خوب اچھی طرح دیکھ بھال کر واپس آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سب احوال سنایا۔

''وہاں واقعی دودھ اور شہد بہتا ہے لیکن وہاں کے لوگ بہت زور آور، قوی ہیکل اور تن و توش کے زبردست ہیں۔ ہماری تو ان کے سامنے کوئی حیثیت ہی نہیں لگتی تھی۔ ہم اگر تلوار سے انہیں ماریں تو بمشکل پنڈلیوں تک جائیں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ احوال سنا تو خیال ہوا کہ کہیں کم ہمت قوم یہ حالات سن کر خوفزدہ نہ ہو جائے اور جہاد سے انکار کر بیٹھے لہٰذا انہوں نے ان افراد کو تنقید کی کہ دشمن کے زور آور ہونے کی تفصیل قوم کو نہ بتائیں۔

یوشع بن نون اور کالب بن یفنہ نے تو اس حکم کی مکمل پیروی کی لیکن باقی لوگوں نے اس کی پاسداری نہیں کی اور وہاں کے حالات کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔

بنی اسرائیل ڈر گئے کہ ہم ایسے لوگوں سے لڑنے کیوں جائیں۔ خوامخواہ لقمۂ اجل بننے کا کیا فائدہ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام بے خبر تھے کہ وفد کے کچھ لوگوں نے قوم کو کم ہمت بنا دیا ہے۔ انہوں نے خیمۂ اجتماع کے سامنے قوم کو جمع کیا اور انہیں جنگ کرنے کی تلقین کی۔

''اے قوم! تم پر جو خدا کا احسان رہا ہے، اسے یاد کرو کہ اس نے تم میں نبی اور پیغمبر بنائے اور تم کو بادشاہ اور حکمران بنایا اور وہ کچھ دیا جو جہانوں میں کسی کو نہیں دیا۔ اے قوم! اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض کر دیا ہے اور پشت پھیر کر نہ لوٹو کہ تم خسارہ اور نقصان اٹھانے والوں میں ہو جاؤ۔''

بنی اسرائیل میں سے بہت سوں نے چیخنا شروع کر دیا۔ ''وہاں تو بڑے ظالم لوگ رہتے ہیں۔ ہم تو اس وقت تک ہرگز وہاں داخل نہیں ہوں گے جب تک وہ لوگ وہاں سے نکل نہیں جاتے۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ وہ لوگ وہاں سے نکلیں۔ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں جہاد کے لیے نکلو اور انہیں وہاں سے نکال دو۔ نادان لوگو! تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ جب تک تم انہیں نکالو گے نہیں، وہ لوگ وہاں سے نکلیں گے کیسے۔''

''جب تک وہ قد آور لوگ وہاں ہیں، ہم داخل نہیں ہوں گے۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہاں ایک جگہ ایسی ہے جہاں لوگ انسانوں کو کھا جاتے ہیں۔ وہاں تو انگور بھی ایسے ہیں کہ ایک دانے کو ایک آدمی اٹھا بھی نہیں سکتا۔ پھر وہاں کے انسان کیسے ہوں گے۔''

''تمہیں یہ کس نے بتا دیا؟''

''یوشع اور کالب تو خیر تیرے دستِ راست ہیں۔ وہ کیوں بتاتے۔ انہوں نے تو چھپایا لیکن دوسرے تمام لوگوں نے

یہی بتایا ہے۔"

"انہوں نے شیخی بگھاری ہے۔ ہرگز خوفزدہ نہ ہو۔ اگر ایسا ہے بھی جو تم بیان کر رہے ہو تو بھی مت ڈرو کیونکہ خدا تمہارے ساتھ ہے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہمارے درمیان رہے گا۔ اسی پر بھروسا رکھو۔ تم تو ایمان والے ہو۔ تمہاری تعداد بھی کم نہیں۔ پھر کیوں ڈرتے ہو۔"

ان گستاخوں نے بے ہودگی کی حد کر دی، کہنے لگے۔ "اگر یہ بات ہے تو تم چلے جاؤ اور اپنے رب کے ساتھ مل کر لڑو۔ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ جب ان لوگوں کو وہاں سے نکال دو تو ہمیں بلا لینا۔"

ایسا سخت جواب سن کر یوشع بن نون اور کالب بن یفنہ آگے بڑھے اور انہیں سمجھانے لگے۔ "اس ملک کے لوگوں سے مت ڈرو، خدا ہمارے ساتھ ہے۔ تم ان جابروں پر دروازے کی جانب سے داخل ہو جاؤ۔ انشاء اللہ غالب رہو گے۔"

اس قوم نے وہ بات کہہ دی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نہیں کہہ سکتے تھے۔

"یہی ہیں وہ دو جو موسیٰ کو بھڑکاتے رہتے ہیں۔ انہیں سنگسار کر دو تاکہ جنگ کا خوف ہمیشہ کے لیے جاتا رہے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ حال دیکھ کر بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا۔

"اے پروردگار! میں اپنے اور اپنے بھائی کے سوا کسی کا مالک نہیں۔ کسی پر اختیار نہیں رکھتا۔ میں ہر طرح انہیں سمجھا چکا۔ تو ہم میں اور ان نافرمان لوگوں میں جدائی ڈال دے۔"

اس دعا کے جواب میں اسی وقت خیمۂ اجتماع میں سب بنی اسرائیل کے سامنے خدا کا جلال نمایاں ہوا اور خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا۔

"میں کب تک اس خبیث گروہ کے مقابل جو میری شکایت کرتا ہے، صبر کروں؟ بنی اسرائیل جو میرے برخلاف شکایتیں کرتے ہیں، میں نے ان کی شکایتیں سنیں۔ ان سے کہہ دو خداوند کہتا ہے، مجھے اپنی حیات کی قسم..... جیسا تم نے مجھے سنا کے کہا ہے، میں تم سے ویسا ہی کروں گا۔ تمہاری لاشیں اسی بیابان میں پڑی رہیں گی اور تمہاری ساری تعداد میں سے یعنی بیس برس سے لے کر اس سے اوپر اور بڑی عمر کے تم سب جتنے چنے گئے اور مجھ پر شکایت کرتے رہے، ان میں سے کوئی اس ملک میں جس کی بابت میں نے قسم کھائی تھی کہ تم کو وہاں بساؤں گا، جانے نہیں پائے گا۔ سوا یفنہ کے بیٹے کالب اور نون کے بیٹے یشوع اور تمہارے لڑکوں کو جن کے حق میں تم کہتے ہو کہ وہ تو لوٹ کا مار ٹھہریں گے، ان کو میں وہاں پہنچاؤں گا اور جس ملک کو تم نے حقیر جانا، وہ اس کو پہچانیں گے اور تمہارا حال یہ ہوگا کہ تمہاری لاشیں اسی بیابان میں پڑی رہیں گی اور تمہارے لڑکے بالے چالیس برس تک بیابان میں بھٹکتے پھریں گے۔ ان چالیس دنوں کے حساب سے جن میں تم اس ملک کی جاسوسی کرتے رہے تھے، ایک دن ایک سال کا ہوگا اور تم چالیس برس تک اپنے گناہ اٹھائے ہوئے رہو گے۔ تب تم جانو گے کہ عہد شکنی کیا ہوتی ہے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پیغام سے اپنی قوم کو آگاہ کر دیا اور بتا دیا کہ تمہاری نافرمانیوں کی وجہ سے تمہیں یہ سزا دی گئی ہے کہ تم اب چالیس سال تک اس بیابان میں بھٹکتے پھرو گے۔ تم میں سے کوئی بھی وہ شخص جو اس وقت بیس سال سے اوپر کی عمر کا ہے وہ ملک نہیں دیکھ سکے گا جس میں تمہیں بسانے کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے کیا تھا اور وہ لوگ جنہوں نے جاسوسی سے واپس آنے کے بعد تمہیں خبریں پہنچائیں اور تمہیں کم ہمت بنایا، انہیں خداوند وبا کا شکار کر کے مار ڈالے گا۔

بنی اسرائیل اس انجام کے بارے میں سن کر سخت پریشان ہوئے۔ اس رات ان کی بستیوں میں کوئی نہیں سویا۔ ہر گھر سے آہ وزاری کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہر زبان پر ایک ہی شکایت تھی۔ "خدا ہم کو اس ملک میں لے جا کر قتل کرانا چاہتا ہے۔ کیا موسیٰ ہمیں اس لیے مصر سے نکال کر لایا تھا کہ اپنے خدا کے ہاتھوں اس بیابان میں مروا دے۔ اگر ہم جنگ پر گئے تو ہمیں تو دشمن قتل کر دے گا اور ہماری بیویاں ان کی باندیاں بنیں گی۔ اگر انہیں باندیاں بنانا ہی مقصود تھا تو ہم مصر میں کیا بُرے تھے۔ اس سے تو اچھا تھا کہ وہ فرعون کی باندیاں بن کر رہتیں۔ ہم تو موسیٰ سے مل کر صاف صاف کہہ دیں گے کہ ہم مصر واپس جا رہے ہیں۔"

انہوں نے اسی رات ایک وفد بھی ترتیب دے لیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملیں گے کہ وہ اپنے خدا سے کہہ کر ہمیں معافی دلائے یا ہمیں مصر واپس جانے دے۔ ہمیں یہ گوارا نہیں ہوگا کہ ہم اسی بیابان میں بھٹکتے پھریں اور ہماری لاشیں یہاں گل سڑ جائیں۔

ادھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تمام رات عبادت میں گزری۔ وہ خدا سے بنی اسرائیل کے لیے معافی کے طلب گار تھے۔

"اے میرے معبود! میں نے تیرا فرمان سن لیا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میری قوم ہرگز معافی کے لائق نہیں۔ اتنے معجزے اگر کسی قوم کو دکھائے جاتے تو وہ کب کی راہِ راست پر آ جاتی لیکن میری قوم ہدایت کے راستوں سے دور بھاگتی ہے۔ ان کے بزرگوں کو ابھی تک مصر کی یاد ستاتی رہتی ہے۔ تو انہیں گردن کش بھی کہتا رہا ہے۔ اب تو کہہ رہا ہے تو انہیں وبا سے مارے گا اور انہیں ان کے باپ دادا کا ملک کبھی نہیں دکھائے گا۔

"تیرے فیصلے اٹل ہیں لیکن مجھے تو اہلِ مصر کے طعنے یاد آ رہے ہیں جو وہ تجھے اور مجھے دیں گے۔ انہیں معلوم ہے کہ تُو ہی بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لایا تھا۔ ان تک یہ شہرت بھی پہنچی ہوگی کہ تو بنی اسرائیل کے درمیان رہتا ہے تو دن کو ابر کے ستون میں اور رات کو آگ کے ستون میں ہو کر ان کے آگے آگے چلتا ہے۔ اب اگر تو اس قوم کو بیابان میں بھٹکا دے اور انہیں مرنے کے لیے چھوڑ دے تو وہ یہی کہیں گے کہ تُو اس قوم کو اس ملک تک نہ پہنچا سکا جسے ان کو دکھانے کی قسم کھائی تھی۔

"تیرا ہی قول ہے کہ تُو قہر کرنے میں دھیما اور شفقت میں غنی ہے۔ سو تُو اپنی رحمت کی فراوانی سے اس امت کا گناہ جیسے تُو مصر سے لے کر یہاں تک ان لوگوں کو معاف کرتا رہا ہے، اب بھی معاف کر دے۔"

خدا کی جانب سے شفقت آمیز جواب آیا۔

"میں نے تیری درخواست کے مطابق معاف کیا لیکن جس ملک کا میں نے ان سے وعدہ کیا تھا، یہ اسے دیکھنے نہیں پائیں گے لیکن یوشع اور کالب نے میری پوری پیروی کی ہے، میں انہیں پہنچاؤں گا اور ان کی اولاد ان کی وارث ہوگی۔ وہ آدمی جنہوں نے ملک کی بری خبر سنائی تھی اور بنی اسرائیل کو کم ہمت کیا تھا، وہ میرے سامنے وبا سے مریں گے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک مرتبہ پھر تمام سرداروں کو طلب کیا اور انہیں خدا کے عذاب سے ڈرایا۔

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ کسی جدوجہد کے بغیر ہی تمہیں زمینوں کا مالک بنا دیا جائے گا۔ یوشع بن نون اور کالب بن یفنہ تمہاری سپہ سالاری کریں گے تو تمہیں خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔ تم اپنے اپنے قبیلے والوں سے کہو کہ وہ جنگ کی تیاری کریں۔"

اس موقع پر یوشع بن نون نے بھی انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"اگر ہم ہمت کریں تو یہ زمین ہمیں مل سکتی ہے۔ عمالیق اور دوسرے طاقتور ضرور ہیں لیکن وہ خدا کے وعدے کی تردید نہیں دے سکتے۔ وہ کچھ بھی کر لیں، خدا کو شکست نہیں دے سکتے۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔"

اسی وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی بتایا گیا کہ یہ لوگ کبھی نہیں مانیں گے کیونکہ یہ مصر واپس جانے کی تیاری کر رہے ہیں، ان کے دلوں میں کھوٹ ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں اس پہلو سے بھی سمجھایا۔ "تم جو مصر واپس جانے کے ارادے باندھ رہے ہو تو اس سے باز آ جاؤ کیونکہ تم خدا کی مہربانی سے مصر سے نکلے تھے ورنہ فرعون تمہیں خشکی سے بھی روکتا اور پانی سے بھی۔ اب اگر تم واپس جانے کی کوشش کرو گے تو نہ خشکی سے جا سکو گے، نہ پانی سے کیونکہ اب خدا تمہارے ساتھ نہیں ہے۔ اسی لیے خدا کے کہے پر عمل کرو اور جہاد کے لیے تیار ہو جاؤ۔ جس طرح تم مصر سے بہ حفاظت نکل آئے تھے اسی طرح اس بیابان سے بھی نکلو گے اور بیت المقدس تک پہنچ جاؤ گے۔

"مجھے ڈر ہے کہ اگر تم نے خدا سے سرکشی کی تو تمہارے لوگ وبا سے مریں گے اور مجھ سے کہہ دیا گیا ہے کہ اب تم چالیس سال تک بیت المقدس نہیں پہنچ سکو گے، ہاں تمہاری اولاد اس سرزمین کو ضرور دیکھے گی۔"

"بس موسیٰ بس!" وہ سردار ایک دم چراغ پا ہو گئے۔ "تم ہمیں مصر سے نکال لائے اور اب ایک طاقتور قوم کے مقابلے کے لیے بھیج رہے ہو تاکہ ہم سب مرکھپ جائیں۔ ہم اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہیں ڈالیں گے۔"

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو یوشع بن نون کی حمایت میں کہنے لگے۔ "اللہ ہماری مدد کرے گا۔ ہم سب یوشع کے ساتھ مل کر حملہ کریں گے۔"

ان اسرائیلیوں نے یوشع کے ان حامیوں کی مخالفت کرتے ہوئے صاف کہہ دیا۔ "ہم اپنے فیصلوں پر اٹل ہیں۔ جب تک سرکش قومیں اپنے شہر خالی نہ کر دیں، ہم ان کے شہروں میں داخل نہیں ہوں گے۔"

"خدا پہلے ہی فیصلہ کر چکا ہے کہ تم یہیں بھٹکتے رہو گے۔ اب تم نے اپنی باتوں سے خدا کو مزید ناراض کر دیا۔ اب تم میں وبا پھیلے گی اور تم ہلاک ہو گے۔"

ان نمائندوں کے ذریعے جب یہ خبر بنی اسرائیل تک پہنچی تو وہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر برس پڑے۔ ان کا کہنا

بھی یہی تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہمیں زور آوروں کے مقابلے میں قتل کرا دینا چاہتے ہیں۔

ان میں سے ایک نے راہنمائی کا وعدہ کیا اور نہایت خاموشی سے اسرائیلیوں کی بستیوں میں جا جا کر لوگوں کو مصر واپسی کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا۔ ہزاروں بوڑھے لوگ جو مصر کی پُرتعیش زندگی کو یاد کرتے رہتے تھے، اس کی باتوں میں آ گئے۔

بنی اسرائیل کی بستیاں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں لہٰذا یہ پیغام پہنچانے میں کئی مہینے لگ گئے۔ اس کے باوجود وہ تمام بنی اسرائیل کو آمادہ نہ کر سکے لیکن پھر بھی جو لوگ واپسی کے لیے تیار ہوئے، وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ ان سب نے یہ غور کرنا شروع کیا کہ واپسی کے لیے کس راستے کو اختیار کیا جائے اور پھر یہی طے ہوا کہ خشکی کا صحرائی راستہ اختیار کیا جائے۔

آہستہ آہستہ سامانِ سفر رات کے اندھیرے میں خیموں سے دور پہنچا دیا گیا۔ مویشی بھی الگ کر لیے گئے اور ایک رات خاموشی سے عورتوں اور بچوں کو لے کر کھلے صحرا میں آ گئے۔ جو لوگ تھوڑے بہت راستوں سے واقف تھے، آگے آگے چلے اور قافلہ روانہ ہو گیا۔

راستوں سے اچھی طرح واقفیت نہیں تھی اس لیے دن میں سفر کیا جاتا اور رات کے وقت پڑاؤ ڈال کر بیٹھ جاتے۔

راتیں ان اندیشوں میں کٹ جاتیں کہ مصر کے لوگ انہیں قبول بھی کریں گے یا نہیں۔ عرصہ دراز کے بعد جا رہے ہیں نہ جانے ان کا ردِعمل کیا ہو۔ وہ غرقِ فرعون کا ذمے دار ہم ہی کو سمجھیں گے، کہیں بدلہ لینے پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ ان میں سے بعض کو اب خوف محسوس ہونے لگا تھا اور وہ یہ سوچنے لگے تھے کہ انہوں نے وادیِ سینا چھوڑ کر غلطی کی۔ دوسرے لوگ ان کی ہمت بندھا رہے تھے۔

کئی راتیں گزر گئیں۔ پانی کا ذخیرہ بھی ختم ہو گیا۔ جانور بھی تھکنے لگے۔ پانی کی تلاش میں اب وہ پرندوں کی اڑان پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ جس طرف پرندوں کو اڑتا ہوا دیکھتے، کسی چشمے کی امید میں اسی طرف چل پڑتے۔ یوں انہیں یقین ہو گیا کہ وہ راستہ بھٹک چکے ہیں۔

ان مشکلوں نے انہیں دو گروہوں میں بانٹ دیا۔ ایک گروہ کہتا تھا واپس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس چلا جائے۔ دوسرا گروہ کہتا تھا بس چلتے رہو۔ کبھی نہ کبھی ہم مصر واپس پہنچ ہی جائیں گے۔

انہوں نے پھر آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ وہ آگے بڑھ رہے ہیں یا دائرے میں سفر کر رہے ہیں، اس سے وہ بے خبر تھے۔

ایک جگہ پہنچ کر زمین میں ایسی دراڑیں پڑی ہوئی دیکھیں کہ آگے بڑھنا ممکن نہیں تھا۔ انہوں نے ان دراڑوں کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا تاکہ جہاں یہ دراڑیں ختم ہوں وہاں سے آگے بڑھا جائے۔ اسی دوران انہوں نے پرندوں کو جاتے ہوئے دیکھا تو خوش ہو گئے کہ چلو پانی بھی مل جائے گا۔ دور سے انہیں چشمے کے آثار نظر بھی آنے لگے۔ پرندے بھی یہیں اتر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی رفتار کو تیز کر دیا لیکن چشمے کے قریب پہنچتے ہی ان پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔

''ارے کیا یہ وہی چشمہ نہیں جہاں سے پانی بھر کے ہم اپنے خیموں تک جاتے تھے؟'' کئی افراد ایک ساتھ چیخ اٹھے۔

''ہم نے کئی راتوں کا سفر طے کر لیا ہے اور اپنے خیموں سے بہت دور جا چکے ہوں گے۔ یہ وہ چشمہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

''بالکل وہی چشمہ ہے اور وہ دیکھو سامنے خیمے نظر آ رہے ہیں۔''

''تو کیا ہمارا سفر اکارت گیا؟ ہم لوٹ کر اپنے خیموں تک آ گئے۔''

''ہم راستہ بھٹک گئے تھے اس لیے اسی جگہ آ گئے۔ ان چشموں سے پانی بھرو اور پھر اپنا سفر شروع کر دو۔ ہم اس مرتبہ ضرور مصر پہنچ جائیں گے۔ جب موسیٰ مدین سے مصر آئے تھے تو انہی راستوں سے ہو کر گئے تھے۔ تو کیا ہم نہیں پہنچ سکتے؟''

اسی وقت ایک اسرائیلی کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کہا یاد آ گیا۔

''موسیٰ نے کہا تھا تم لوگ نہ خشکی کے راستے سے جا سکتے ہو نہ پانی کے راستے سے۔ خداوند نے مصر میں تمہارا داخلہ ممنوع کر دیا ہے..... تو کیا اس نے ٹھیک نہیں کہا تھا؟''

یہ قول سن کر اسرائیلیوں کی اکثریت نے مصر جانے کا ارادہ منسوخ کر دیا۔

''ہماری بستیاں قریب ہیں۔ ہمیں اپنے لوگوں میں جانا ہے۔ ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ ہم پوری زندگی بھی چلتے رہیں تو مصر نہیں پہنچ سکیں گے۔ ہم تھک بھی اتنا گئے ہیں کہ مزید چلنے کی سکت نہیں۔''

بہت تھوڑے لوگ رہ گئے تھے جو ان سے اختلاف کر رہے تھے۔ انہیں بھی اکثریت کی رائے مانتے ہوئے خیموں کی طرف چلنا پڑا۔

اس عرصے میں وہ تمام لوگ جو تفتیشِ حال کے لیے فلسطین کی سرزمین کی طرف گئے تھے اور واپس آ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے منع کرنے کے باوجود قوم کے سامنے وہاں کے حالات بتا دیے تھے، کسی انجانی وبا کا شکار ہوئے اور مر گئے اور کسی ایسی جگہ مرے تھے کہ عام اسرائیلیوں کی نظر وہاں نہیں جا سکتی تھی۔ جب ان کی لاشیں گلنے سڑنے لگیں تو لوگوں کو پتا چلا۔ انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کہا یاد آیا کہ یہ لوگ خداوند کے کہنے کے مطابق وبا کا شکار ہوں گے اور ان کی لاشیں صحرا میں گلنے سڑنے کے لیے پڑی رہیں گی۔

بھٹکا ہوا قافلہ جب دوبارہ اپنی بستیوں میں پہنچا تو اسرائیلیوں پر خوف طاری تھا۔ ان لوگوں نے بھی بتایا کہ وہ کئی راتیں چلتے رہنے کے باوجود گھوم کر یہیں آ گئے تو انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یاد آئی۔ انہیں یقین آنے لگا کہ خدا ان سے خوش نہیں ہے۔

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔

انہیں معلوم تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے اس لیے ناراض ہیں کہ انہوں نے جنگ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اب اگر جنگ کرنے کے لیے آگے بڑھیں اور مقامی لوگوں کو شکست دیں تو شاید آنے والا عذاب رک جائے اور ان کے باقی لوگ وبا سے نہ مریں۔

ان لوگوں نے اپنے جنگجو ساتھ لیے اور لاکھوں کی تعداد میں بنی اسرائیل اپنے ہتھیاروں کے ساتھ پہاڑ پر چڑھنے لگے۔ ان کے کچھ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اطلاع دینے کے لیے پہنچے۔

''اے موسیٰ! ہم حاضر ہیں... ہم حاضر ہیں۔ ہم سے خطا ہوئی تھی کہ ہم نے جنگ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اپنے رب سے کہہ کہ ہم پر عذاب نازل نہ کرے۔ جس جگہ کا وعدہ خدا نے کیا ہے، ہم وہاں جائیں گے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں روک دیا۔ ''تم کیوں خدا کی حکم عدولی کرتے ہو۔ اب تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا کیونکہ خدا نے تم پر سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ اب وہ تمہارے درمیان نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ شکست کھاؤ۔ عمالیقی اور کنعانی تمہاری تاک میں بیٹھے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تلوار سے مارے جاؤ۔''

ان لوگوں نے اسرائیلی لشکروں کو جب یہ بتایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس جنگ سے روک رہے ہیں تو انہیں سخت غصہ آیا۔

''موسیٰ بھی عجیب ہیں۔ پہلے ہمیں جنگ کا حکم دیتے ہیں اور اب ہم تیار ہیں تو روک رہے ہیں۔ وہ تو یہی چاہتے ہیں کہ ہم ان کا حکم مانتے رہیں۔ اپنی مرضی سے کوئی کام کر ہی نہیں سکتے۔''

جن بنی اسرائیل کو جنگ سے روکا جا رہا تھا، وہ یہ بات سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ اب بھی وہ حکم عدولی کر رہے ہیں۔ جب خدا ان سے کہہ رہا تھا تو انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ اب خدا نے کہہ دیا کہ وہ چالیس سال تک اپنے آباؤ اجداد کی زمین پر نہیں جا سکتے تو بضد تھے کہ جا کر دکھائیں گے۔

وہ یہ بات ماننے کو تیار ہی نہیں تھے کہ خدا ان کے ساتھ نہیں ہے یا نہیں ہو گا تو انہیں شکست ہو جائے گی۔

ان کے ساتھ عہد کا صندوق بھی نہیں تھا جسے اٹھاتے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام دعائیہ کلمات کہا کرتے تھے۔ ''اٹھ اے خداوند تیرے دشمن پراگندہ ہو جائیں اور جو تجھ سے کینہ رکھتے ہیں وہ تیرے آگے سے بھاگیں۔'' حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ساتھ نہیں تھے۔

عمالیقی اور کنعانی جو اس پہاڑ پر رہتے تھے، ان پر آ پڑے تھے۔ بنی اسرائیل بھی یہ دکھانے کے لیے پہاڑ پر چڑھے تھے کہ خدا اب بھی ان کے ساتھ ہے۔ اس لیے انتہا کی بہادری سے لڑے۔ اس کے باوجود انہیں شکست ہو گئی۔

وہ دشمن کے علاقے فتح کرنے چلے تھے مگر اب خود اپنے علاقے خطرے میں پڑ گئے۔ جو بنی اسرائیل اس جنگ میں شریک نہیں تھے، انہیں بھی پیچھے ہٹنا پڑا۔

''میں نے تم لوگوں سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم اس جنگ میں کامیاب نہیں ہو گے لیکن تم نہیں مانے۔ تمہاری وجہ سے اب ہمیں بھی پیچھے ہٹنا پڑے گا۔ ابھی تو چند سال ہی گزرے ہیں ابھی تو نہ جانے کتنے سال تمہیں یوں ہی بھٹکتے ہوئے گزارنے ہوں گے۔''

جب بنی اسرائیل نے ارضِ مقدس میں داخل ہونے سے انکار کر دیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے ان کو اطلاع کر دی تھی کہ چالیس سال تک اب تم کو اسی سرزمین میں بھٹکنا پڑے گا۔ اسی کے ساتھ انہیں یہ بھی بتا دیا گیا

تھا کہ موسیٰ اور ہارون بھی تمہارے پاس ہی رہیں گے کیونکہ بنی اسرائیل کی آنے والی نسل کی ہدایت کے لیے ان کا یہاں ہونا بہت ضروری ہے۔

بنی اسرائیل کے ایک گروہ نے عمالیقیوں اور دوسروں سے دشمنی مول لے لی۔ ان خونخوار دشمنوں نے اسرائیلیوں کا یہاں رہنا دوبھر کر دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ وہ قوم کی راہنمائی کریں اور ان لوگوں کو لے کر بحرِ قلزم کی طرف جائیں۔

''میں نے تمہیں پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ خدا تمہارے ساتھ نہیں، تمہیں شکست ہوگی لیکن تم نہیں مانے۔ جب تک ہم یہاں امن وسلامتی کے ساتھ تھے، کوئی ہماری راہ میں حائل نہیں تھا۔ اب تمہاری وجہ سے تمام بنی اسرائیل کی جانوں کو خطرہ ہو گیا ہے۔ مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تمہیں لے کر بحرِ قلزم کی سمت سفر کروں۔''

بنی اسرائیلوں کو یہ فکر پریشان کر رہی تھی کہ ان کا پیچھا کیا جا رہا ہے اور ان کے ساتھ ساتھ سب کی جانیں خطرے میں ہیں لہٰذا وہ اس سفر کے لیے فوراً تیار ہو گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں لے کر نکلے اور کوہِ شعیر کے باہر باہر چلتے رہے۔ یہ خطرہ برابر لگا ہوا تھا کہ ان کا پیچھا کیا جا رہا ہوگا۔ جو بے قصور تھے انہیں تو بچانا ضروری تھا۔ وہ برابر دعا کرتے چلے جا رہے تھے کہ اے خدا، میری قوم کو محفوظ بنا دے۔ ان کے لیے تو یہ فیصلہ تو کر چکا ہے کہ ان کے بڑے بیت المقدس کو نہیں دیکھ سکیں گے لیکن جو نوجوان ہیں، انہیں تو زندہ رکھ کہ یہ بیت المقدس میں داخل ہوں اور تیرا نام بلند رہے کہ تو نے انہیں منزل تک پہنچا دیا۔

یہ دعا قبول ہوئی اور خدا نے انہیں راستہ دکھایا اور حکم دیا کہ شمال کی طرف مڑ جاؤ۔ کوہِ شعیر میں تمہارے بھائی بنی عیسو رہتے ہیں۔ تمہیں ان کی سرحد کے پاس سے ہو کر گزرنا ہے۔ وہ تم سے ہراساں ہوں گے سو تم خود احتیاط رکھنا۔ میں ان کی زمین میں پاؤں دھرنے تک کی جگہ تم کو نہیں دوں گا۔ اس لیے کہ کوہِ شعیر میں نے عیسو کو میراث میں دیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ شعیر سے شمال کی طرف مڑ گئے۔

''جانتے ہو ہم کس علاقے میں سفر کر رہے ہیں؟''

''آپ ہی بہتر جانتے ہوں گے کیونکہ آپ ہی ہمیں مصر سے نکال کر لائے ہیں اور ہم برسوں سے ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ شاید اب تو اڑتیس سال ہونے کو آئے۔''

''تم ادومی نسل سے تو واقف ہو گے؟''

''تم کیوں ایسے مشکل سوال ہم سے پوچھ رہے ہو۔ ہمیں تو صرف اتنا معلوم ہے کہ ہم مصر میں بہت آرام سے تھے۔''

''نادانو! اس وقت تو فضول بحث سے گریز کرو۔ کیا تمہیں اللہ کے احسانات یاد نہیں کہ ان بیابانوں میں اس نے تمہیں کیسے کیسے انعامات سے نوازا۔ چالیس سال کی پابندی تم پر لگائی گئی تو وہ بھی اس کے غضب سے نہیں، تمہارے اعمال کی بدولت۔ اب پھر اس کی ناشکری کرتے ہو اور مصر کو یاد کرتے ہو۔''

''موسیٰ ہم تو تمہاری روز روز کی ہدایتوں سے تنگ آ چکے ہیں۔''

''میں جو کچھ کہتا ہوں، اللہ کا پیغام ہوتا ہے جو میں تمہیں پہنچاتا ہوں۔ اب یہ پیغام پہنچا رہا ہوں کہ تم اس وقت اپنے چچا کے علاقے میں داخل ہو رہے ہو۔ تمہارے جدِ اعلیٰ ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے اسحاق علیہ السلام کے دو بیٹوں میں سے ایک کا نام عیسو دوم تھا اور تم سب کا تعلق ان کے چھوٹے بیٹے یعقوب کی نسل سے ہے۔ یہاں تمہیں اپنی قرابت داری کا خیال رکھنا ہوگا۔ ان لوگوں سے لوٹ مار نہیں کرو گے۔ جو چیز خریدنی ہو قیمت دے کر خریدو گے۔''

''قرابت داری کا خیال انہیں بھی تو ہو۔'' بنی اسرائیل نے کہا۔ ''انہیں چاہیے کہ وہ ہماری مدد کریں۔ اگر وہ نہیں کریں گے تو ہم ضرور لوٹ مار کریں گے۔''

(جاری ہے)

ماخذات

قصص القرآن، مولانا محمد حفظ الرحمن۔ قصص الانبیاء، ابن کثیر۔ توریت..... ارض القرآن، سلیمان ندوی۔ ترجمان القرآن، ابو الکلام آزاد۔ انبیائے قرآن، جمیل احمد۔

کسی اور کے لیے گڑھا کھودنے والا ہمیشہ بھول جاتا ہے کہ وہ خود بھی تو اس گڑھے کا مہمان بن سکتا ہے اور اکثر ایسا ہی ہوتا ہے' اس حوالے سے جب قسمت اس کی خوب خاطر تواضع کرلیتی ہے تو اسے آگاہی کی لاٹھی کے سہارے چھوڑ دیتی ہے... ایسے میں شاید اس کے پاس پچھتانے کا وقت بھی نہیں رہتا۔

خطرناک منصوبہ سازی اور بے ساختہ پیش گوئی کی حیرت انگیز مماثلت

پیش گوئی

شاہ زین رضوان



''بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ میں ہفتے کے روز مر جاؤں گا اور اس کے ایک ہفتے بعد اتوار کو بے چاری مسز تھامسن کی بھی موت واقع ہو جائے گی یا پہلے اس کی باری آ جائے اور میرا نمبر بعد میں ہو۔'' جنرل برونس وک نے ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا جو انتونیا کو اچھا نہیں لگا۔

''یقیناً ایسا نہیں ہوگا۔'' اس کے پاس اس سے بہتر الفاظ نہیں تھے۔

''تمہارا خیال ہے کہ میں کوئی احمقانہ بات کر رہا ہوں لیکن میری نواسی کریسی نے اپنی ڈائری میں من وعن یہی لکھا ہے۔ وہ اپنی میز پر اسے کھلا چھوڑ گئی تھی۔ اتفاقاً

میری نظر اس پر چلی گئی۔ تم اس سے ملٹری کلب میں مل چکی ہو۔ میں اسے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ تم سے ملنے کے بعد وہ بہت پُرجوش تھی۔"

"ہاں، مجھے یاد ہے۔" انتونیا مسکراتے ہوئے بولی۔ "تمہارا خیال ہے کہ میں نے یہ باتیں اس کے دماغ میں ڈالی ہیں؟"

"نہیں لیکن تم نے قتل اور اس سے ملتے جلتے جرائم کا تذکرہ بڑے دلچسپ انداز میں کیا تھا۔ مثلاً دھوکا، لوگوں کو خوش اسلوبی سے قتل کرنا اور فریب وغیرہ شامل ہیں۔"

"میں تصوراتی قتل کی بات کر رہی تھی۔"

"یقیناً تم نے ایسا ہی کہا ہوگا لیکن کریسی نوجوان اور جلد متاثر ہوجانے والی لڑکی ہے۔ وہ حالیہ دنوں میں بہت زیادہ سوچ بچار میں دکھائی دے رہی ہے۔ میں نے غور کیا ہے کہ وہ مجھے بڑے عجیب انداز میں دیکھتی ہے جیسے کفن کے لیے میری پیمائش لے رہی ہو۔ بظاہر یہ احمقانہ بات لگتی ہے اور وہ تمہاری کتابیں بھی پڑھتی رہتی ہے تو میری پیاری البرٹینا....."

"انٹونیا....." اس نے تصحیح کی۔

"میرا یہی مطلب تھا۔ یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں الزام دے رہا ہوں۔ اگر ایسی بات ہوتی تو میں ڈیسمنڈ کا نام لیتا۔ تم جانتی ہو کہ وہ میرا بھتیجا ہے اور وہی میرا وارث ہوگا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کریسی اس کی محبت میں گرفتار ہوگئی ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو معصوم لوگوں کو خراب کر کے خوش ہوتے ہیں۔ آج کل وہ فرویڈینال، میں آرام کر رہا ہے۔ کریسی بری طرح اس پر مرمٹی ہے۔ کم از کم لیویا میرا مطلب ہے کہ مسز تھامسن کا یہی خیال ہے۔ اس طرح کے معاملات میں عموماً اس کا اندازہ درست ہوتا ہے۔"

"کیا ڈیسمنڈ اداکار بھی ہے؟"

"ہاں لیکن تم نے کیسے اندازہ لگایا؟ وہ اتنا مشہور نہیں ہے، گو کہ اس کی شکل اچھی ہے لیکن اس میں صلاحیتوں کی کمی ہے۔ اس نے تاریخی ڈراموں میں چھوٹے موٹے رول کیے ہیں البتہ لوگوں کی آواز کی نقل بہت اچھی اتار لیتا ہے۔ اس نے کریسی کو نہ جانے کیا سبز باغ دکھائے ہیں کہ وہ اس پر جی جان سے فدا ہوگئی ہے۔ اس نے کریسی کو یہاں تک کہہ دیا کہ وہ لیڈی برونس وک بننے کے لیے پیدا ہوئی ہے لیکن ان کی شادی میرے مرنے کے بعد ہی ہوسکتی ہے۔"

"کیا اس نے اسے پرپوز کیا ہے؟"

"مجھے اس بارے میں شبہ ہے۔" جنرل برونس وک نے کہا۔ "میں اسے کریسی کے شوہر کے روپ میں نہیں دیکھ سکتا۔ بہرحال وہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔ اس کے علاوہ وہ دونوں کزن بھی ہیں۔ میں قریبی رشتے داروں میں شادی کے خلاف ہوں اور وہ یہ بات اچھی طرح جانتا ہے۔ میں اس شادی کو روکنے کی حتی المقدور کوشش کروں گا۔ شاید میں ڈیسمنڈ کو عاق کردوں۔ اس سے پہلے کہ بہت دیر ہوجائے۔ ایک منٹ، آج کیا دن ہے..... بدھ؟"

"جمعرات....."

"واقعی۔ اس کا مطلب ہے کہ میری یا مسز تھامسن کی زندگی کا صرف ایک دن باقی رہ گیا ہے۔" جنرل نے مسخرے پن کے ساتھ قہقہہ لگایا اور اچانک ہی خاموش ہوگیا پھر اس نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم اور پائن ہفتے کے روز فرویڈینال ہال آؤ اور ہماری گارڈن پارٹی میں شرکت کرو۔ یہ آئیڈیا مسز تھامسن کا ہے۔ وہ اس طرح کی تقریبات کا انتظام کرنے کی ماہر ہے۔ میں اس کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا۔ میں جانتا ہوں کہ بہت مختصر نوٹس پر تمہیں دعوت دی جارہی ہے لیکن مجھے امید ہے کہ تم کوئی بندوبست کرلوگی۔"

"اوہ ڈیئر مجھے یقین نہیں کہ ہم آسکیں....."

"سچ تو یہ ہے کہ میں تھوڑا سا گھبرایا ہوا ہوں۔ ویسے تو ہم سب کو موت آنی ہے لیکن میری موت بڑی واضح ہے اور یقینی ہے تاہم میں....."

"کیا تمہیں شبہ ہے کہ وہ تمہیں مارنے کا منصوبہ بنا رہی ہے؟"

"میری نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ شاید تم سمجھ رہی ہو کہ میں اپنے حواس کھو بیٹھا ہوں۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ پچھلے دنوں میں بہت زیادہ دباؤ میں رہا۔"

"کیا تم نے اس سے پوچھنے کے بارے میں سوچا کہ اس نے ڈائری میں کیا لکھا ہے اور کیوں؟"

"خیال اچھا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ خطرناک حد تک پرائیویٹ اور حساس ہے۔ اگر اسے معلوم ہوگیا کہ میں نے اس کی ڈائری پڑھی ہے تو وہ میرا جینا دوبھر کردے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اپنے سے زیادہ مسز تھامسن کے لیے پریشان ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کے ساتھ کچھ برا ہو۔"

"یہ مسز تھامسن کون ہے؟" انتونیا اپنے اندر ابھرنے والے تجسس کو نہ دبا سکی۔

"کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں؟ وہ میرے یہاں کام کرتی ہے اور کریسی کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ ہم

شادی کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ بلکہ ایسا ہو چکا ہے اور یہ بات ڈیسمنڈ نے اس کے دماغ میں بٹھائی ہے۔ وہ دونوں اس بارے میں مجھ پر طنز کرتے رہتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ میں لیویا پر ضرورت سے زیادہ مہربان ہوں۔"

"کیا مسز تھامسن فرویڈینال میں رہتی ہے؟"

"ظاہر ہے۔" جنرل نے کہا۔ "اس نے کچھ عرصے سے وہاں رہنا شروع کیا ہے۔ وہ بہت ہی باصلاحیت عورت ہے اور تم جانتی ہو کہ وہ کتنی بڑی جگہ ہے اور اس نے ہر لحاظ سے اپنے آپ کو کارآمد ثابت کیا ہے۔ ان کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ یہ میرا گھر ہے۔ لیویا کو لائبریری کے کام کا تجربہ ہے۔ اس نے مجھ سے فرویڈینال ہال کی تاریخ لکھنے کی اجازت مانگی۔ اب وہ میری سیکریٹری ہے۔ وہ بہت ہی ہوشیار اور سوئی کی طرح تیز ہے۔ لہٰذا میں نے اسے پرانا ریکارڈ کھنگالنے کی اجازت دے دی اور تمام کاغذات اس کے حوالے کردیے جو ایک بڑی غلطی تھی۔ وہ اپنے آپ کو ناگزیر سمجھنے لگی لیکن کریسی نے اپنی ڈائری میں جو لکھا ہے، وہ محض بکواس ہے۔"

"اس نے کیا لکھا ہے؟"

"یہی کہ میں لیویا سے بچہ پیدا کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں جس کے بعد وہ اور ڈیسمنڈ وراثت سے محروم ہوجائیں گے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم دونوں مرجائیں۔"

"کیا مسز تھامسن [illegible] کے بارے میں جانتی ہے؟"

"نہیں۔ میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ میں اسے کیوں پریشان کروں؟ وہ آدھے سر کے درد کی مریضہ ہے اور ذہنی تناؤ سے اس میں اضافہ ہوسکتا ہے۔"

"کیا تمہارے دماغ میں یہ بات نہیں آئی کہ تمہاری نواسی نے کسی اور وجہ سے یہ تحریر لکھی ہو۔ ممکن ہے کہ وہ اپنی کہانی کے لیے نوٹس لکھ رہی ہو۔"

"ہوسکتا ہے۔" جنرل نے تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ "وہ تمہارے مختصر لیکچر سے بہت متاثر ہوئی تھی اور اس کا کہنا ہے کہ وہ مسٹری رائٹر بننا چاہتی ہے۔"

"اب تم نے صحیح بات کہی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ یہی وضاحت کرے گی۔"

"لیکن اس نے ہمارے نام کیوں استعمال کیے؟ کیا یہ عجیب بات نہیں۔ کیا تم اپنی تحریروں میں جاننے والوں کے نام استعمال کرتی ہو؟"

"بعض اوقات اتفاقاً ایسا ہوجاتا ہے۔ تم یہ کیوں سمجھتے ہو کہ مسز تھامسن کو کاغذات دینا ایک بڑی غلطی تھی؟"

"کیا میں نے ایسا کہا؟ اوہ ہاں۔ تم بھی کوئی بات نظر انداز نہیں کرتی ہو فیلیڈا؟"

"میرا نام انتونیا ہے۔"

"معاف کرنا۔ میری یادداشت کمزور ہوگئی ہے۔ اکہتر سال کا ہوگیا ہوں اور اس کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہوگئے ہیں۔ دراصل کریسی اور ڈیسمنڈ کو معلوم ہوگیا کہ میں نے لیویا کو خاندانی کاغذات تک رسائی دے دی ہے جس سے وہ یہ سمجھے کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی چکر چل رہا ہے۔ بہرحال میں اپنی بات کی طرف واپس آتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ تم ہفتے کے روز پارٹی میں آؤ۔"

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی....."

"مجھے احساس ہے کہ دعوت دینے میں دیر ہوگئی لیکن میں معاملے کی تہ تک پہنچنا چاہتا ہوں اور تم اس کام کے لیے بہت موزوں ہو۔ پلیز! مجھے بات پوری کرنے دو۔ تم اور پائن انسانی نفسیات کے ماہر ہو۔ تاریک اور بگڑے ہوئے جذبات کے علاوہ ان دیکھے مقاصد کو بھی سمجھتے ہو۔ میں نے یہ بات اعلیٰ سطح پر سنی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تم ایک خوش مزاج مبصر ہو۔"

"تم نے ہماری کچھ زیادہ ہی تعریف کردی۔"

"مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تم کریسی اور ڈیسمنڈ کو دیکھتے ہی سمجھ جاؤ گی کہ ان کے دل میں کیا ہے۔ کریسی ابھی صرف سترہ سال کی ہے اور ڈیسمنڈ بندر کی طرح چالاک ہے لیکن کریسی اس پر فدا ہے۔ وہ بڑے غور سے اس کی باتیں سنتی ہے اور لگتا ہے کہ وہ کوئی سازش کر رہے ہیں۔"

"تمہیں اور مسز تھامسن کو نقصان پہنچانے کے لیے؟"

"اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ ہم سے جان چھڑائی جائے۔ تبھی وہ فرویڈینال پر قبضہ کرکے کریسی کو لیڈی پرنس وک بنا سکتا ہے۔ شاید اس کے لیے وہ کوئی جال تیار کر رہے ہوں یا پھر مسلح ڈکیتی کا ڈراما رچائیں۔"

"تمہاری نواسی نے اپنی ڈائری میں کیا لکھا تھا؟"

"ٹھہرو۔ مجھے دیکھنے دو۔ اس نے لکھا تھا، نانا ..... ہفتے کو اور مسز تھامسن اگلے اتوار کو مرجائیں گی یا اس کے برعکس بھی ہوسکتا ہے۔ یہی ایک راستہ ہے۔ ان کی شادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والا بچہ ساری جائداد کا وارث ہوگا، ہم نہیں اور یہ نہیں ہونا چاہیے اس لیے انہیں مار دینا ہی بہتر ہے۔"

☆☆☆

"کیا کہہ رہا تھا؟" میجر پائن نے اپنی بیوی کو ٹیلی فون رکھتے ہوئے دیکھا تو بولا۔ "کیا وہ بوڑھا برونس وک تمہیں پرپوز کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ اپنے زمانے میں ایسی حرکتوں کا عادی تھا۔"

انٹونیا نے اسے پوری بات بتادی۔ پائن نے جھک کر اپنا پائپ اٹھایا اور بولا۔ "تو اب وہ ہم سے تحفظ چاہ رہا ہے۔ کوئی ایسا سوچ سکتا تھا۔"

"اس کا کہنا ہے کہ ہفتے کو پارٹی میں ہماری موجودگی اس کے لیے باعثِ تسکین ہوگی۔"

"تم وہاں جانا چاہو گی؟"

"خاص طور پر تو نہیں لیکن اسے یقین ہے کہ کرسٹوبیل (کریسی) مجھ سے اس مرڈر مسٹری پر ضرور بات کرے گی جو وہ لکھ رہی ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس طرح اس کے دماغ کو سکون مل جائے گا۔"

"تم نے اس امکان پر غور نہیں کیا کہ کریسی اور ڈیسمنڈ بوڑھے جنرل اور اس کی دل آرام کو راستے سے ہٹانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں؟"

"میں نہیں جانتی ڈارلنگ..... میں اپنا ذہن بنانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ جنرل برونس وک اس سے انکاری ہے کہ مسز تھامسن اس کی محبوبہ ہے۔ وہ بار بار مجھے غلط نام سے پکار رہا تھا۔ وہ پاگلوں جیسی باتیں کر رہا تھا۔ میں نہیں جانتی کہ اس پر کیا کہوں۔ شاید وہ ایک بے بنیاد بات کو اچھال رہا ہے اس لیے کہ وہ جنرل لارڈ برونس وک ہے۔"

"ہاں لیکن وہ اپنے ساتھ لارڈ کا خطاب لگانا پسند نہیں کرتا۔ اسے جنرل کہلوانا پسند ہے۔" پائن نے کہا۔

"کیا وہ بہت امیر ہے؟"

"ہاں بہت زیادہ۔ فرویناں ہال کے علاوہ پارک لین میں ایک فلیٹ، چیلسی میں ایک عالی شان مکان، سینٹ ٹروپنر میں ایک ولا اور بہت بڑی زرعی زمین کا مالک ہے۔ ممکن ہے کہ اب وہ ایک بوڑھا احمق نظر آتا ہو لیکن وہ ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ اسے جوا کھیلنے کی عادت تھی اور ستر کی دہائی میں وہ باقاعدگی سے کلیرمونٹ کلب جایا کرتا تھا۔ عورتوں کا رسیا تھا۔ اس نے تین شادیاں کیں لیکن ان دنوں وہ تنہا ہے۔ وہ مشکوک مالی سرگرمیوں میں ملوث رہا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ مشتبہ معاملات ہیں۔"

"وہ کیا؟"

"میں نے اس کے بارے میں افواہ سنی تھی کہ اس کے خلاف ٹیکس چوری اور منی لانڈرنگ کی تحقیقات ہوئی تھیں تاہم کوئی بے قاعدگی سامنے نہیں آئی۔ اس کی بیٹی کار کے حادثے میں ہلاک ہوگئی تھی۔ یہ لڑکی کریسی اسی کی بیٹی ہوگی۔ اس کا کوئی مرد وارث نہیں ہے۔ چھوٹا بھائی دو برس قبل مر چکا ہے۔ دونوں بھائیوں میں کسی خاندانی تنازعے کی وجہ سے کبھی نہیں بنی اسی لیے وہ شدت سے اپنے بھتیجے ڈیسمنڈ کو ناپسند کرتا ہے۔"

"اس نے پوری طرح یہ بات واضح کر دی تھی۔" انٹونیا نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے اسے ڈیسمنڈ پر شبہ ہے کہ اس منصوبے کے پیچھے اس کا ذہن کام کر رہا ہے..... ممکن ہے کہ یہ محض ایک مذاق ہی ہو اور ڈیسمنڈ نے کریسی سے یہ تحریر لکھوائی ہو۔ اس کا مقصد صرف جنرل کو خوفزدہ کرنا ہو....." وہ بولتے بولتے رک گئی۔

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا پھر اس نے کہنا شروع کیا۔ "جنرل نے اپنی گفتگو میں کسی بڑی غلطی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ نہ جانے کیوں میں اس بارے میں مسلسل سوچ رہی ہوں۔ اس کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ ہماری گفتگو اچانک ہی ختم ہوگئی۔ مجھے یقین ہے کہ کمرے میں کوئی آیا تھا۔ میں نے ایک آواز سنی تھی لیکن یہ نہیں بتا سکتی کہ وہ کوئی عورت تھی یا مرد تھا اور ان کے درمیان کیا بات ہوئی لیکن میں نے جنرل کے ہڑبڑانے کی آواز سنی۔ ممکن ہے کہ میں غلطی پر ہوں لیکن وہ مجھے خوفزدہ لگ رہا تھا۔"

☆☆☆

جب وہ فرویناں ہال پہنچے تو آسمان صاف اور سورج پوری طرح چمک رہا تھا۔ انٹونیا نے کار سے باہر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ "موسم بہت اچھا ہے۔ مسز تھامسن کی گارڈن پارٹی زبردست طریقے سے کامیاب ہوگی۔"

"بشرطیکہ کوئی اسے یا جنرل کو مارنے کی کوشش نہ کرے۔" پائن نے کہا۔ "کیا یہ پارٹی مسز تھامسن کی طرف سے ہے؟"

"نہیں لیکن جنرل نے واضح کر دیا تھا کہ مسز تھامسن ہی اس پارٹی کی روحِ رواں ہے۔"

ہال کے مرکزی دروازے پر بٹلر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے سیاہ جیکٹ، سیاہ ویسٹ کوٹ، سیاہ پتلون اور سیاہ جوتے پہن رکھے تھے جبکہ اس کے کالر، قمیص اور دستانوں کا رنگ سفید تھا۔ مہمان ہاتھوں میں دعوت نامہ لیے بیرونی دروازے کے ذریعے عمارت میں داخل ہو رہے تھے۔

"آپ دونوں کو دعوت نامہ نہیں بھیجا گیا تھا۔" بٹلر نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ کو دیکھ کر کہا۔ "مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کے نام مہمانوں کی فہرست میں نہیں ہیں۔"

انٹونیا نے اسے بتایا کہ انہیں جنرل نے بذاتِ خود پارٹی میں شرکت کی دعوت دی تھی اور یہ کہ ان کی آمد ایک خاص کام کے سلسلے میں ہے۔

"آپ لوگ ایک سیکنڈ انتظار کریں۔ میں مسز تھامسن کو آپ کی آمد کی اطلاع دیتا ہوں۔"

"کیا ہم جنرل برونس وک سے بات کر سکتے ہیں؟" انٹونیا نے کہا۔

"مجھے افسوس ہے میڈم۔ اس وقت وہ بہت مصروف ہیں۔ میں مسز تھامسن کو آپ کی آمد کی اطلاع دیتا ہوں۔ اس میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

"واقعی مسز تھامسن ہی اس وقت یہاں کی انچارج ہے۔" بٹلر کے جانے کے بعد انٹونیا نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد مسز تھامسن خود وہاں آگئی۔ اس نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور تھوڑا سا سر خم کرتے ہوئے بولی۔ "میں نہیں سمجھتی کہ ہم پہلے بھی ملے ہوں۔"

"نہیں۔ ہم جنرل برونس وک سے اس کی درخواست پر ملنے آئے ہیں۔" انٹونیا نے کہا۔

"ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے۔ تمہارے نام ہماری فہرست میں نہیں ہیں۔"

"جنرل برونس وک اور میں ایک ہی لندن کلب سے تعلق رکھتے ہیں۔" پائن نے کہا۔

"لارڈ برونس وک کا تعلق تو لندن کے کئی کلبوں سے ہے۔" مسز تھامسن نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"جنرل برونس وک نے ہمیں اس گارڈن پارٹی میں شرکت کرنے کے لیے کہا تھا۔" انٹونیا بولی۔ "وہ ہم سے کسی فوری نوعیت کے معاملے پر بات کرنا چاہتا ہے۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تم کسی غلط جگہ پر نہیں آئے؟"

"پورا یقین ہے۔"

"لارڈ برونس وک نے تم سے کب رابطہ کیا تھا؟"

"تین دن پہلے۔ اس نے بدھ کے روز مجھے فون کیا تھا۔"

مسز تھامسن کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "تین دن پہلے؟ یہ ناممکن ہے۔ تین دن پہلے تو وہ بول بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے گلے میں شدید تکلیف تھی اور وہ اشاروں کی زبان میں بات کر رہا تھا۔"

انٹونیا مضبوط لہجے میں بولی۔ "مجھ سے بات کرتے وقت وہ بالکل ٹھیک تھا، ہمارے درمیان تقریباً بیس منٹ تک گفتگو ہوئی۔"

"مجھے یقین نہیں آرہا۔ ہوسکتا ہے کہ تم نے بدھ کے روز کسی اور جنرل سے بات کی ہو۔"

"میں نے جنرل برونس وک سے ہی بات کی تھی اور اسی نے ہمیں اس پارٹی میں شرکت کے لیے مدعو کیا تھا۔"

"تمہارے ساتھ کسی نے مذاق کیا ہوگا۔ آج کل یہ بہت عام ہوگیا ہے۔ اوہ... لارڈ برنس وک بھی آگئے۔ وہی بتائیں گے کہ انہوں نے بدھ کے روز تمہیں فون نہیں کیا تھا۔"

"لارڈ برونس وک ....." مسز تھامسن نے ہال کے دوسرے سرے پر کھڑے ہوئے ایک بھاری بھرکم شخص کو آواز دی۔

برونس وک قریب آتے ہوئے بولا۔ "کیا بات ہے لیویا؟ تم ہمیشہ کی طرح مصروف نظر آرہی ہو۔" پھر وہ انٹونیا کی طرف متوجہ ہوا۔ "مجھے یقین ہے کہ ہم پہلے مل چکے ہیں لیکن مجھے یاد نہیں کہ کب اور کہاں؟"

"ہماری ملاقات ملٹری کلب میں ہوئی تھی۔" انٹونیا بولی۔ "مئی کے مہینے میں۔ میں انٹونیا ڈورسی ہوں۔"

"بالکل۔ اب مجھے یاد آگیا۔ تم نے ہمارے لیے کچھ کتابوں پر دستخط کیے تھے۔ یہ دو مہینے پہلے کی بات ہے۔ میری نواسی تمہاری بہت بڑی پرستار ہے۔ میں نے تمہاری سراغ رسانی پر مبنی کہانیاں پڑھی ہیں اور یہ تم ہو پائن۔ کیا عجیب اتفاق ہے۔"

وہ گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ "تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ یہ بھی اچھی بات ہے کہ تم ایک دوسرے کو جانتے ہو۔"

"دراصل ہماری شادی ہو چکی ہے۔"

"کیا؟ تم دونوں کی شادی ہو چکی ہے۔ مبارک ہو۔ ہم بہت عرصے بعد مل رہے ہیں۔"

"ہماری ملاقات مئی میں ہوئی تھی۔" پائن نے جواب دیا۔ "ملٹری کلب میں!"

"تم وہاں تھے؟ معافی چاہتا ہوں۔ شاید مجھے بھولنے کا مرض ہوگیا ہے۔"

"ہماری بدھ کی سہ پہر بات ہوئی تھی۔ تم نے مجھے فون کیا تھا۔" انٹونیا بولی۔

جنرل نے کہا۔ "میں نے تمہیں فون کیا تھا؟ تمہیں یقین ہے کہ وہ میں ہی تھا؟"

"تم نے اپنی نواسی کے بارے میں بات کی تھی۔ وہ تین بچے کا وقت تھا۔"

"میں نے تم سے بات کی تھی..... کریسی کے بارے

Pak Books.com

میں؟'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''خاتون! آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں بدھ کے روز فون نہیں کرسکتا تھا۔ اس دن میرے گلے میں شدید تکلیف تھی۔ مجھ سے تو بولا بھی نہیں جارہا تھا۔''

''میں نے یہی بات انہیں بتائی تھی۔'' مسز تھامسن بولی۔ اس کا چہرہ زرد ہونا شروع ہوگیا تھا۔ اس نے اپنا بیگ کھولا اور اس میں کچھ ٹٹولنے لگی۔

جنرل برونس وک نے نرمی سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے لیویا؟''

''ہاں، وہی منحوس بیماری۔ میرے دماغ میں سوئیاں چبھ رہی ہیں۔'' اس نے اپنا ماتھا پکڑتے ہوئے کہا۔ ''میں بہت تکلیف میں ہوں۔ ہنری، مجھے ایک ساشے لینا ہوگا لیکن وہ.....''

ہنری..... گویا وہ ایک دوسرے کو پہلے نام سے مخاطب کرتے ہیں۔ انتونیا نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا لیکن وہ جانسن کی جانب متوجہ تھا جس کے ہونٹ بھنچ گئے تھے اور وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو مسل رہا تھا۔

''مسئلہ یہ ہے کہ تم کام بہت زیادہ کرتی ہو۔'' برونس وک نے کہا۔

جانسن بولا۔ ''میں نے ایک ساشے تمہارے کمرے کے باہر میز پر چابیوں کے گچھے کے برابر میں رکھا دیکھا ہے۔ اگر تم کہو تو میں جا کر لے آؤں؟''

''اچھا۔ وہ میں نے وہاں چھوڑ دیا اور چابیاں بھی۔ نہیں نہیں..... شکریہ جانسن! میں خود چلی جاتی ہوں، مجھے تازہ دم ہونے کی ضرورت ہے۔''

''میگرین۔ بے چاری لیویا دردِشقیقہ کی مریضہ ہے۔'' جنرل برونس وک نے وضاحت کی۔ ''اسے باقاعدگی سے دورے پڑتے ہیں۔ یہ مرض بڑھتا جارہا ہے۔ یہ بہت زیادہ کام کرتی ہے۔ بالکل بھی آرام نہیں کرتی۔ چاہتی ہے کہ ہر چیز بالکل صحیح حالت میں ہو۔ یہ گھر بہت بڑا ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ہم ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں رہ رہے ہوتے۔ بہرحال میں تم لوگوں کو ایک ڈرنک تو ضرور پلاؤں گا۔ آؤ میرے ساتھ۔ اس وقت مجھے بھی ڈرنک کی ضرورت محسوس ہورہی ہے۔''

اس نے انتونیا کا بازو پکڑا اور اسے ہلکے سے دباتے ہوئے بولا۔ ''اچھا تو میں نے تمہیں فون کیا تھا۔ ہمارے درمیان کیا باتیں ہوئی تھیں؟''

''تمہاری نواسی نے اپنی ڈائری میں جو کچھ لکھا تھا، تم اس کے بارے میں پریشان تھے۔'' انتونیا نے کہا۔

''تمہیں وہ تحریر پڑھنے کا موقع مل گیا۔ اس نے لکھا تھا کہ تم اور مسز تھامسن یکے بعد دیگرے اس ہفتے اور آنے والے ہفتے میں مرجاؤ گے۔''

''میں نے کہا تھا کہ کرسی کی ڈائری پڑھی ہے اور یہ بات میں نے تمہیں فون پر بتائی؟''

''بس پوری ڈائری نہیں، صرف وہی ایک خاص تحریر۔''

''مجھے معلوم ہے کہ میری نواسی ڈائری لکھتی ہے لیکن میں اسے پڑھنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ وہ ڈائری اس کے لیے بہت مقدس ہے۔ اگر اسے ذرا سا بھی شبہ ہوگیا کہ میں نے اس کی ڈائری پڑھی ہے تو وہ غصے سے آگ بگولا ہوجائے گی اور مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ کیا تم نے یہ کہا کہ میں اور مسز تھامسن مرنے والے ہیں؟ کتنی غیر معمولی بات ہے جبکہ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہم دونوں میں سے کسی کا بھی مرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ کیا یہ کوئی مذاق تو نہیں؟''

''تم نہیں سمجھتے کہ یہ کوئی مذاق تھا۔''

''کیا تم بتاسکتی ہو کہ میں نے کیا الفاظ کہے جو میری نواسی نے استعمال کیے تھے؟''

اس سے پہلے کہ انتونیا جواب دیتی، کسی اور کی آواز بہت قریب سے آئی۔ ''تمہیں نہیں معلوم کہ ان کا مرنا بہت ضروری ہے۔''

انہوں نے جو آواز سنی وہ جنرل برونس وک کی تھی لیکن بولنے والا جنرل نہیں تھا۔ انتونیا نے اسے ہانپتے ہوئے دیکھا۔ وہ بدحواس نظر آرہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں طشتری کی طرح پھیل گئی تھیں۔ وہ تینوں لمحہ بھر کے لیے منجمد ہوگئے پھر جنرل نے کہا۔

''وہ میری ہی آواز تھی لیکن بولنے والا میں نہیں تھا۔ یہ کیسی فضول بات ہے؟''

پائن نے بائیں جانب دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہاں کوئی ہے۔''

''وہ میری لائبریری ہے۔'' جنرل نے جواب دیا۔

پائن نے آگے بڑھ کر دروازہ پورا کھول دیا۔ انہوں نے دیکھا کہ کتابوں سے بھری الماریوں کے درمیان ایک لڑکی کریم رنگ کا لباس پہنے بیٹھی ہے۔ انتونیا نے فوراً پہچان لیا کہ وہ جنرل برونس وک کی نواسی کرسی ہے۔ اس کے سامنے..... کرسی پر ایک نوجوان شخص آف وائٹ سوٹ میں ملبوس بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر پچیس کے لگ بھگ ہوگی۔ یقیناً وہ ڈیسمنڈ ہی تھا۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں چمڑے کی جلد والی ایک نوٹ بک پکڑی ہوئی تھی۔

اگلے ہی لمحے انتونیا کو اس کے بارے میں ایک بات یاد آگئی۔ وہ لوگوں کی آوازیں بنانے میں ماہر تھا اور اسے نقالی کا فن آتا تھا۔

''تو یہ تم تھے؟ مجھے پہلے ہی اندازہ تھا۔ میری آواز میں بولنے سے تمہارا کیا مقصد تھا؟'' جنرل برونس وک نے غصے سے کہا۔

''میں کیوں نہ نقل اتاروں۔ ایسا کوئی قانون نہیں جو مجھے ایسا کرنے سے روکتا ہو۔ میں اسے ایک مفید مشق سمجھتا ہوں۔'' ڈیسمنڈ نے نوٹ بک نیچے کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک اداکار ہوں اور ہمیں نت نئے تجربے اور مشقیں کرنا پڑتی ہیں۔ ورنہ ہمارا فن ایک جگہ رک جائے گا۔''

''تم اس ڈائری میں سے کیا پڑھ رہے تھے؟''

''تمہیں معلوم ہوگا کہ یہ کرسی کی ڈائری ہے۔ اس نے ایک بہت ہی شاندار مرڈر اسٹوری لکھنا شروع کی ہے جو کہ ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت دلچسپ ہوگی۔''

''مس ڈوری! تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔'' کرسی اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے بولی پھر مزید کہا.....

.....''میں بہت خوش ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم آرہی ہو۔ اوہ ڈارلنگ! اس سے پہلے کہ میں بھول جاؤں۔'' کرسی اپنے نانا کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ مسز تھامسن کا رویہ ہمارے ساتھ ٹھیک نہیں تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ ہم کہیں باہر چلے جائیں اور ایک ساتھ وقت گزاریں لیکن جب ہم نے یہیں ٹھہرنے کے لیے کہا تو وہ ناراض ہوگئی۔''

''کوئی بات نہیں کرسی۔'' جنرل برونس وک نے غصے سے کہا۔ ''تمہاری کہانی کس کے بارے میں ہے..... وہ کون ہے جس کو مرجانا چاہیے؟''

''اس کا فیصلہ ابھی نہیں ہوا۔'' کرسی نے کہا۔

''فی الحال اس کے دو امیدوار ہیں۔'' ڈیسمنڈ نے کہا۔ ''ان میں ایک پُرشکوہ شخص جس کے پاس اس کی ضرورت سے زیادہ دولت اور جائداد ہے اور دوسری اس کی منظورِنظر سیکریٹری۔ تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو انکل..... میں نے ایسا کیا کہہ دیا؟ یہ صرف ایک کہانی ہے۔''

''صرف ایک کہانی؟'' جنرل برونس وک چلایا۔

''کیا تمہیں پورا یقین ہے؟''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں غصہ ہونے والی کیا بات ہے۔'' ڈیسمنڈ بولا۔ ''یہ محض کہانی کا ایک بے ضرر موڑ ہے۔''

''ہم یہی دیکھنا چاہ رہے ہیں۔'' میجر پائن نے کہا۔ ''کیا تم نے ہی بدھ کی سہ پہر کو جنرل برونس وک بن کر میری بیوی کو فون کیا تھا؟''

ڈیسمنڈ نے تردید کرنے کے لیے منہ کھولا لیکن فوراً ہی بند کرلیا اور اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہوگئے اور وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''پھر کیا ہوا..... اگر وہ میں تھا؟''

''اگر وہ تم تھے۔'' انتونیا نے کہا۔ ''تو میں کہوں گی کہ تم بہت جینئس ہو اور تمہیں آسکر ایوارڈ ضرور ملنا چاہیے۔ تم نے بڑی مہارت سے اپنے انکل کی نقل اتاری۔''

''شکریہ۔''

''میری نقل اتارنا سراسر گستاخی ہے۔ تمہیں اس کا کوئی حق نہیں۔'' جنرل برونس وک غصے میں بولا۔ ''یہ انتہائی شرمناک حرکت ہے۔''

''میں لوگوں کی نقلیں اتارنے کی مشق کرتا ہوں۔ یہ میرے کام کا لازمی حصہ ہے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا اور نہ ہی کسی کو قتل کیا ہے۔''

ابھی ڈیسمنڈ کے منہ سے یہ الفاظ ادا ہوئے ہی تھے کہ لائبریری کا دروازہ کھلا اور جانسن اندر داخل ہوا۔ اس نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''مداخلت کے لیے معذرت خواہ ہوں مائی لارڈ لیکن ایسا لگتا ہے کہ مسز تھامسن کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔''

''مجھے معلوم ہے کہ وہ بیمار ہے۔'' جنرل نے اپنے بھتیجے کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''اسے دردِشقیقہ کی شکایت ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ کام کرتی ہے اور بالکل بھی آرام نہیں کرتی۔ اس گارڈن پارٹی کی وجہ سے بھی اس کی مصروفیت بڑھ گئی ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ اس کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔'' جانسن نے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔

''اگر یہ بات ہے تو ہیکٹ کو بلاؤ۔ وہ اسے کوئی دوا دے گا۔''

''ڈاکٹر ہیکٹ، مسز تھامسن کے پاس ہی ہیں۔ لوسی نے انہیں فوراً ہی بلالیا تھا۔ جب اس نے مسز تھامسن کو کمرے کے فرش پر لیٹا ہوا دیکھا۔''

''فرش پر لیٹا ہوا دیکھا؟'' جنرل کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''اوہ میرے خدا! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ جانسن! مجھے فوراً اس کے پاس جانا چاہیے۔''

جانسن نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر ہیکٹ کو ڈر

ہے کہ مسز تھامسن کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی ہے۔''
درحقیقت وہ مرچکی تھی۔
اس کی لاش ڈریسنگ ٹیبل کے برابر میں پڑی ہوئی تھی جیسے اچانک گرگئی ہو۔ اس نے ابھی تک دستانے اور ہیٹ پہن رکھا تھا۔ اس کا چہرہ نیلا پڑگیا تھا۔ ہونٹ اور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس کے برابر میں فرش پر کرسٹل گلاس کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے اور اس کے سیدھے ہاتھ میں ایک کھلا ہوا ساشے تھا۔ ڈاکٹر ہیکٹ اس کی لاش کے برابر میں اس طرح کھڑا ہوا تھا جیسے اس کی حفاظت کررہا ہو۔
جنرل نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم غلطی پر ہو۔ لیویا نہیں مرسکتی۔ اسے سر درد کی شکایت رہتی ہے اور بعض اوقات یہ درد اتنا شدید ہوتا ہے کہ وہ بے ہوش ہوجاتی ہے۔ کیا تم اسے دوبارہ چیک کرسکتے ہو؟''
''میں اچھی طرح معائنہ کرچکا ہوں۔ مسز تھامسن مرچکی ہے۔ مجھے افسوس ہے لارڈ برونس وک۔''
جنرل نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے اور بولا۔ ''ہوا کیا تھا؟ کیا اسے دل کا دورہ پڑا ہے؟''
''میں ایسا نہیں سمجھتا۔''
''اس کے ہاتھ میں کیا ہے؟ یہ تو وہی ساشے ہے جو وہ استعمال کرتی ہے اور یہ اس کی ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں رکھے ہوئے ہیں۔ یہ کوئی بہت ہی طاقتور پین کلر ہے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ اسے آدھے سر کا درد ہوتا تھا۔''
''میں نے ہی اسے یہ دوا دی تھی اور یہ آخری ساشے تھا۔ اس کے بعد میں اسے دوسری دوا تجویز کرتا، بہرحال.....''
''اب تم یہ مت کہنا کہ اسے الرجی ہوگئی کیونکہ وہ یہ دوا کافی عرصے سے استعمال کررہی تھی۔''
ڈاکٹر نے کہا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ مسز تھامسن نے جو ساشے لیا، اس میں پین کلر تھا۔ اس میں سے کڑوے بادام کی بو آرہی تھی جس سے زہر کی موجودگی ظاہر ہوتی ہے۔ ہم پوسٹ مارٹم کے بعد ہی اس بارے میں زیادہ جان سکیں گے۔ بہرحال مجھے یقین ہے کہ مسز تھامسن کو زہر دیا گیا ہے۔''
جنرل نے تیوری چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو میں نہیں مان سکتا کہ اس نے خودکشی کی ہے۔ اس کے پاس سب کچھ تھا اور وہ اپنی زندگی سے مطمئن تھی کیونکہ اب وہ مسز تھامسن نہیں بلکہ میری بیوی تھی۔''
''اوہ..... مجھے یہ معلوم نہیں تھا۔''
''کسی کو بھی یہ بات معلوم نہیں۔ ہم نے اسے خفیہ رکھا ہوا تھا۔''
عین اسی وقت انٹونیا نے اپنے عقب میں کسی مرد کی موجودگی محسوس کی۔ وہ ڈیسمنڈ تھا یا پھر جانسن؟
''ہم نے گزشتہ ہفتے لندن کے رجسٹری آفس میں شادی کی تھی۔ لیویا اس کی تشہیر نہیں چاہتی تھی لیکن ہم جلد یا بدیر اس شادی کا اعلان کرنے والے تھے۔'' اس نے بلند آواز میں کہا۔ ''اس میں شرم والی کوئی بات نہیں۔ ہم ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔''
''مسز تھامسن تمہاری بیوی تھی؟'' میجر پائن نے آہستہ سے کہا۔
''ہاں لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ لوگوں کو یہ بات معلوم ہو۔ چند وجوہات کی بنا پر اس کی خوبیوں کو کبھی نہیں سراہا گیا۔ لوگ اس سے حسد کرتے تھے۔ نوکروں کا سلوک بھی اس کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان سب کو فارغ کرکے نئے ملازم رکھوں۔ کریسی اور ڈیسمنڈ بھی اس سے نفرت کرتے تھے۔ کریسی کی ڈائری میں قتل کا ذکر ہے۔ یہ انہی کا منصوبہ لگتا ہے۔''
''ان کا اصرار ہے کہ یہ صرف ایک کہانی ہے۔'' انٹونیا بولی۔
''وہ تو یہی کہیں گے۔ ہمیں فوراً وارنیڈر سے بات کرنی چاہیے۔ سر بروس وارنیڈر کاؤنٹی کا چیف کانسٹیبل ہے۔ وہ اور اس کی بیوی آج اس پارٹی میں مدعو ہیں۔ اسے اس ڈائری کے بارے میں ضرور بتانا چاہیے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس قتل میں میرے بھتیجے اور نواسی کا ہاتھ ہے۔ تم نے سنا نہیں کہ ڈیسمنڈ نے کیا کہا تھا..... ایک پُرشکوہ شخص اور اس کی سیکریٹری۔ اس کا اشارہ میرے اور لیویا کی جانب تھا۔ وہ ہمیں مارنا چاہتا تھا اور اب لیویا مرگئی ہے۔ یہ محض اتفاق تو نہیں ہوسکتا۔ وہ دونوں کہاں ہیں؟''
انٹونیا نے پیچھے مڑکر دیکھا۔ کریسی اور ڈیسمنڈ غائب ہوچکے تھے۔
پون گھنٹے بعد جنرل برونس وک کو چکر اور متلی کی شکایت ہوئی۔ اسے اس کے کمرے میں لے جایا گیا۔ ڈاکٹر ہیکٹ اس کے ساتھ تھا۔ اس نے ہائی بلڈ پریشر تشخیص کیا اور اسے ایک گولی دے دی۔ کئی پولیس والے کریسی اور ڈیسمنڈ کی تلاش میں نکل گئے جو پارک میں کسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ سر بروس وارنیڈر اور انسپکٹر اسمتھ نے لائبریری میں بیٹھ کر تفتیش شروع کردی۔ انٹونیا اور پائن کو بھی جنرل کے اصرار پر اس میں شامل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ اس کا کہنا تھا کہ انٹونیا ایک اہم گواہ ہے۔
گھر کی خادمہ لوسی جس نے مسز تھامسن کی لاش دریافت کی تھی، اس نے اپنے بیان میں کہا۔
''میں نے اسے ڈریسنگ ٹیبل کے برابر میں لیٹے ہوئے دیکھا۔ پہلے تو میں سمجھی کہ وہ گرمی یا سردرد کی وجہ سے بے ہوش ہوئی ہے لیکن جب میں نے دیکھا کہ وہ سانس نہیں لے رہی اور مجھے کڑوے بادام کی بو آئی تو میں فوراً سمجھ گئی کہ کچھ گڑبڑ ہے۔''
''تم نے محسوس کیا کہ اس نے زہر نگل لیا ہے؟''
''مسز تھامسن کا درد اتنا شدید ہوگا کہ اس نے ناگوار بو کو محسوس کیے بغیر وہ ساشے نگل لیا۔ زہر یقیناً ساشے کے اندر ہوگا۔ کسی نے اس کی دوا میں زہر ملادیا۔''
''کیا تمہارے علم میں ہے کہ اس گھر میں کسی جگہ زہر رکھا ہوا ہے؟''
''ہاں۔'' لوسی نے فوراً جواب دیا۔ ''وہ نیلے رنگ کی بوتل مسٹر جانسن کی الماری میں ہے۔''
''کیا؟ بٹلر کی الماری میں؟ کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ زہر ہی ہے؟'' سر بروس کو یقین نہیں آیا۔
''ہاں۔ اس کے لیبل پر زہر لکھا ہوا ہے اور سرخ رنگ کا کھوپڑی اور ہڈیوں والا نشان بھی۔ مسٹر جانسن ہمیشہ الماری کو تالا لگا کر رکھتے تھے لیکن ہر ایک کو اس بارے میں معلوم تھا۔ پرانا مالی اسے بھڑوں کے چھتے کو تباہ کرنے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ میں نہیں جانتی کہ مسٹر جانسن نے اتنی خطرناک چیز اپنی الماری میں کیوں رکھی ہوئی تھی۔''
''تمہارے خیال میں کون مسز تھامسن کی موت کا خواہش مند تھا؟''
''میں نہیں جانتی۔ کسی مرے ہوئے شخص کے بارے میں ایسی بات نہیں کرنی چاہیے لیکن تم سچ جاننا چاہتے ہو تو کوئی بھی اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے قد سے اونچی باتیں کرنے لگی تھی۔ اس کا انداز حاکمانہ تھا۔ ہر وقت لوگوں پر حکم چلاتی رہتی تھی کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ یہاں تک کہ اس نے ڈیسمنڈ کو بھی لیکچر پلادیا۔''
''کس بارے میں؟''
''منشیات کے نقصانات پر حالانکہ وہ نشے کا عادی نہیں ہے لیکن سننے میں آیا تھا کہ وہ اس کا تجربہ کرنا چاہتا ہے۔ مسز تھامسن کو کوئی حق نہیں تھا کہ وہ اس سے اس انداز میں بات کرے۔ وہ اس طرح ظاہر کررہی تھی جیسے وہ ڈیسمنڈ کی آنٹی ہو۔ میں نے راہداری سے گزرتے ہوئے ان کی باتیں سنی تھیں۔''
''مسز تھامسن نے کیا کہا تھا؟''
''اس نے کہا، اب یہ تمہارے اوپر ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ تم غربت اور جیل کا مزہ چکھنا پسند کرو گے۔ تمہاری پوزیشن کے آدمی کے لیے یہ ایک سنجیدہ قسم کی بے قاعدگی بلکہ جرم ہے۔ تمہارا نام اخباروں میں آئے گا اور تمہاری شہرت داغدار ہوجائے گی۔''
''ڈیسمنڈ نے کیا جواب دیا؟'' انٹونیا نے پوچھا۔
''وہ میں نے نہیں سنا کیونکہ میں نے کسی کے قدموں کی آواز سنی اور وہاں سے چل دی۔''
لوسی کے جانے کے بعد سر بروس نے انسپکٹر اسمتھ سے کہا کہ وہ جانسن کی الماری چیک کرنے کے لیے اپنے کسی آدمی کو بھیجے پھر اس نے جانسن کو پوچھ گچھ کے لیے بلالیا۔ جب وہ اندر آیا تو سر بروس یا انسپکٹر اسمتھ سے پہلے میجر پائن نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ مسز تھامسن کبھی تمہاری بیوی تھی؟''
جانسن کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔ وہ چند لمحے ایک مجسمے کی طرح ساکت کھڑا رہا پھر بولا۔ ''یہ درست ہے جناب! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟''
''جب مسز تھامسن نے جنرل کا پہلا نام لیا تو تمہارا دایاں ہاتھ بے اختیار بائیں ہاتھ کی انگلی پر گیا جبکہ تم نے شادی کی انگوٹھی نہیں پہن رکھی تھی۔ تمہارے چہرے پر غصے اور ناراضگی کے ساتھ حسد کا شائبہ بھی نظر آیا۔''
''اسی لیے تم نے اپنی الماری میں زہر کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔'' سر بروس نے کہا۔ ''کیا تمہیں معلوم ہوگیا تھا کہ تمہاری سابقہ بیوی نے لارڈ برونس وک سے شادی کرلی ہے؟''
''نہیں۔'' بٹلر نے کہا۔
''تمہارے مالک نے مسز تھامسن کی خواہش پر اس شادی کو خفیہ رکھا۔'' بروس بولا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ لوگ اسے پسند نہیں کرتے تھے۔''
''نہیں جناب۔''
''تم اپنی الماری میں زہر کی بوتل کیوں رکھنا چاہتے تھے؟ تمہیں یہ اعتراف تو کرلینا چاہیے کہ یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔''
''اس کی وضاحت کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ بہت ہی ذاتی معاملہ ہے۔ میں کئی دفعہ ذہنی دباؤ کا شکار ہوچکا ہوں اور میری زندگی کا بڑا حصہ اداسی میں گزرا ہے۔''
''تم نے اپنا علاج نہیں کروایا؟''

''بہت کروایا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کئی مرتبہ میں نے خودکشی کے بارے میں سوچا، گو کہ میں نہیں سمجھتا کہ کبھی اس پر عمل کر سکوں گا لیکن مجھے یہ اطمینان تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو میری الماری میں زہر کی بوتل موجود ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے استعمال کی مدت ختم ہوگئی ہے اور وہ مکمل طور پر غیر موثر ہے۔''

''اس کے باوجود تم نے اسے رکھا ہوا تھا؟''

''اس کی موجودگی سے مجھے سکون ملتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ لیویاز ہر خورانی کے نتیجے میں ہلاک ہوئی ہے۔''

''ہاں یہی وجہ تھی۔ بیٹھ جاؤ، تم خود بھی موت کے قریب پہنچ گئے ہو۔''

''شکریہ جناب۔''

وہ دروازے کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے دھیمی آواز میں بولنا شروع کیا۔ ''میں اس سے بہت محبت کرتا تھا لیکن وہ سمجھتی تھی کہ میں اس کے لیے مناسب نہیں ہوں۔ اسی لیے ہمارے درمیان طلاق ہوگئی۔ یہ دس سال پرانی بات ہے۔ مجھے بالکل بھی امید نہیں تھی کہ اسے دوبارہ دیکھ سکوں گا۔ میں نے اخبار میں اشتہار دیکھ کر بٹلر کے لیے درخواست دی اور مجھے یہاں ملازمت مل گئی۔ اس کے کوئی تین ماہ بعد وہ بھی یہاں آگئی اور اس نے لائبریری میں کام شروع کر دیا۔ اب وہ مسز تھامسن تھی۔ لگتا ہے کہ اس نے دوسری شادی کی اور بیوہ ہوگئی۔ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ مجھے نہیں جانتی۔ جب میں نے ایک دفعہ اس سے بات کرنے کی کوشش کی تو اس نے مجھے جھڑک دیا۔ پھر میں نے دوبارہ ایسی کوشش نہیں کی۔ ویسے بھی میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے اور مالک کے درمیان قربت بڑھتی جا رہی ہے۔''

''تمہاری الماری کی کتنی چابیاں ہیں؟''

''میں ٹھیک طرح نہیں بتا سکتا۔ البتہ لیویا کے پاس ایک چابی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ایک مرتبہ مس کریسی نے بھی اس سے یہ چابی لی تھی لیکن واپس کر دی۔''

''کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ مسز تھامسن کے پاس اس الماری کی چابی تھی؟''

''ہاں۔ اس کے پاس فرونیال کے ہر دروازے کی چابی ہوتی تھی اور یہ اس کی عادت میں شامل تھا کہ وہ ہر الماری کا تالا کھول کر اس میں رکھی ہوئی چیزیں چیک کرتی جیسے وہ یہاں کی مالکن ہے۔''

انسپکٹر اسمتھ نے پوچھا۔ ''کیا تم نے حال ہی میں اس بوتل کو ہاتھ لگایا تھا؟''

''ہاں، آج صبح..... میں اکثر صبح میں انگلیوں سے بوتل کو چھوتا ہوں۔ اس طرح مجھے یاد رہتا ہے کہ اگر حالات بہت ہی خراب ہو جائیں تو میرے پاس ایک راستہ ہے۔''

پائن نے کہا۔ ''کیا تم نے اس سامنے کو بھی ہاتھ لگایا تھا جو مسز تھامسن کے کمرے کے باہر میز پر رکھا ہوا تھا؟ تم نے بتایا کہ وہ چابیوں کے گچھے کے ساتھ دیکھا تھا۔''

''ہاں۔ میں وہ دونوں چیزیں نیچے لانے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ شاید لیویا اسے پسند نہ کرے۔ وہ ویسے ہی چند دنوں سے اکھڑی ہوئی تھی اور میرے ہر کام میں غلطیاں نکال رہی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ لارڈ برونس وک سے کہہ کر مجھے نوکری سے نہ نکلوا دے۔''

''ٹھیک ہے جانسن! مجھے تمہارے دکھ پر افسوس ہے لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمہارے پاس اپنی سابقہ بیوی کو قتل کرنے کے لیے ایک محرک اور عمدہ موقع موجود تھا۔'' سر بروس نے کہا۔

''میں فرض کر لیتا ہوں کہ یہ درست ہے۔ البتہ میں نے اسے قتل نہیں کیا۔''

''کیا تم ہمیشہ یہ دستانے پہنے رہتے ہو؟''

''جی ہاں۔''

اسی وقت وہاں ایک شور سنائی دیا۔ لائبریری کا دروازہ کھلا اور ایک باوردی کانسٹیبل اندر داخل ہوا۔ ''ہم نے انہیں پکڑ لیا۔ یہ جھیل کے کنارے ایک درخت کے نیچے کوئی کتاب جلا رہے تھے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ جل کر راکھ ہوگئی ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے ڈیسمنڈ اور کریسی کو اندر دھکیل دیا۔ انٹونیا نے دونوں کو باری باری دیکھا اور بولی۔ ''تو تم نے وہ ڈائری جلا دی؟''

ڈیسمنڈ نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''مانتا ہوں کہ یہ احمقانہ حرکت تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہم نے ایسا کیوں کیا۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایک ردِعمل تھا۔ مسز تھامسن کی لاش دیکھنے کے بعد ہم ایک خلافِ عقل احساسِ جرم سے مغلوب ہوگئے۔''

کریسی بولی۔ ''ڈائری میں جو لکھا تھا، وہ ہمارے خلاف ثبوت بن جاتا۔ وہ محض ایک کہانی تھی لیکن حقیقت میں ایسا ہوگیا۔''

''اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے۔'' میجر پائن نے کہا۔ ''کہ ڈیسمنڈ نے اپنے آپ کو جنرل برونس وک ظاہر کر کے میری بیوی کو فون کیا اور اسے بتایا کہ وہ تمہاری ڈائری میں لکھی ہوئی تحریر کے بارے میں کتنا پریشان ہے۔''

ڈیسمنڈ نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اعتراف ہے کہ میں نے فون کال کے بارے میں جھوٹ بولا تھا بلکہ میرے اصل الفاظ یہ تھے..... کیا ہوا، اگر وہ میں تھا؟''

''پھر وہ فون کس نے کیا تھا؟'' سر بروس نے پوچھا۔

''ظاہر ہے کہ انکل نے۔ میں نے خود انہیں مس ڈوری سے فون پر بات کرتے ہوئے سنا تھا۔ وہ اسے فرونیال آنے کی دعوت دے رہے تھے۔ بدھ کی سہ پہر میں اس کی اسٹڈی کے دروازے کے آگے سے گزر رہا تھا۔ اس کے علاوہ مسز تھامسن نے بھی اسے فون پر باتیں کرتے سنا۔ وہ تیزی سے نیچے آئی اور اس نے فوراً فون بند کرنے کے لیے کہا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ تم فرونیال آؤ۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' انٹونیا بولی۔

''ہم تمہاری بات پر کیسے یقین کر لیں؟'' انسپکٹر اسمتھ نے کہا۔ ''اب تک تمہارا رویہ انتہائی غیر ذمے دارانہ رہا ہے۔ اپنے انکل کی نقل اتارنا، جھوٹ بولنا اور ڈائری جلانا۔''

''اب میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ میں نے تمہیں انکل کی فون کال کے بارے میں اس لیے نہیں بتایا کیونکہ میں جاننا چاہتا تھا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مسز تھامسن کے کچھ راز تھے اور اسے ان کے ظاہر ہونے کا ڈر تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی پرائیوٹ سراغ رساں یہاں آ کر پوچھ گچھ کرے۔''

''ہم پرائیویٹ سراغ رساں نہیں ہیں۔'' انٹونیا بولی۔

''وہ ایسا ہی سمجھتی تھی۔ وہ بہت محتاط لگ رہی تھی۔''

''کیا یہ سچ ہے کہ مسز تھامسن نے تمہیں منشیات کے نقصانات سے آگاہ کیا تھا؟''

''ہاں۔ اس نے مجھے ایک ایسے بگڑے ہوئے نوجوان کی کہانی سنائی جو نشہ کر کے ویسٹ منسٹر پل کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ وہ مجھے نشہ کرنے سے باز رکھنا چاہ رہی تھی۔''

''کیا اس نے دوبارہ بھی تمہیں منع کیا تھا؟ جب وہ تمہارے پیچھے لائبریری میں گئی اور کچھ اس طرح کے الفاظ کہے۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ غربت اور جیل کی زندگی کیا ہوتی ہے۔ درحقیقت یہ ایک جرم ہے۔ تمہارا نام اخباروں میں آئے گا اور تمہاری شہرت داغدار ہو جائے گی۔''

''اس نے یہ الفاظ مجھ سے نہیں بلکہ انکل سے کہے تھے۔ ہوا یوں تھا کہ چند روز بعد وہ میرے پیچھے لائبریری میں آئی۔ انکل نے مجھے دیکھا تو ناراض ہوئے اور مجھے فوراً باہر جانے کو کہا۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ جب میں

خواہش

تین حبشی دوست ایک جنگل سے گزر رہے تھے کہ اچانک ایک پری ان کے پاس آئی اور کہا۔ ''میں آپ تینوں کی ایک ایک خواہش پوری کر سکتی ہوں۔ اپنی اپنی خواہش بتاؤ۔''

پہلا دوست۔ ''اچھی پری! مجھے گورا چٹا اور خوبصورت بنا دو۔''

پری نے اپنی چھڑی لہرائی اور وہ خوبصورت ہوگیا۔

دوسرا دوست۔ (اپنے خوبصورت دوست کو دیکھتے ہوئے) ''مجھے بھی اسی کی طرح خوبصورت بنا دو۔''

پری نے پھر چھڑی گھمائی اور وہ بھی گورا چٹا اور خوبصورت بن گیا۔

تیسرا دوست ہنس رہا تھا۔ پری نے کہا۔ ''ہنسو مت، مجھے اپنی خواہش بتاؤ۔''

تیسرا دوست۔ (اپنے دونوں خوبصورت دوستوں کو دیکھتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے) ''ان دونوں کو پہلے کی طرح کالا بنا دو۔''

(غلام حسین اختر سرگودھا)

ذرا سوچیے

ہاتھی کے بچے کو پیر میں زنجیر ڈال کر پالا جاتا ہے۔ وہ کافی دن تک زنجیر توڑنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ہمت ہار کے چھوڑ دیتا ہے۔ جب وہ بڑا اور طاقتور ہو جاتا ہے تو وہی زنجیر ہوتی ہے جو ہلکی سی کوشش سے ٹوٹ سکتی ہے مگر ہاتھی کے دماغ میں وہی ہوتا ہے کہ زنجیر نہیں ٹوٹے گی اور وہ ساری زندگی غلام بنا رہتا ہے۔

پہیلی

ایک عورت نے ہرنی کا گوشت پکایا مگر اپنے بچوں سے اس کا ذکر نہیں کیا کہ یہ کس کا گوشت ہے لیکن ایک اشارہ دیا اور بولی۔

''یہ وہ ہے جو تمہارے پاپا پیار سے مجھے کہتے ہیں۔''

اچانک ایک بچہ زور سے بولا۔ ''اوئے نہ کھاؤ..... کھوتی پکی ہے..... کھوتی۔''

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

کھڑکی کے پاس سے گزر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ آنٹی لیویا کمرے کے وسط میں کھڑی انکل سے کچھ کہہ رہی تھی۔ یہی وہ الفاظ تھے جو اس نے انکل سے کہے تھے۔"

جب ڈیسمنڈ اور کریسی لائبریری سے چلے گئے تو سر بروس نے کہا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ اس شخص کی باتوں پر یقین کیا جاسکتا ہے تاہم میں بٹلر پر شبہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"تم نہیں سمجھتے کہ یہ ڈیسمنڈ اور کریسی کا کام ہے؟" انسپکٹر اسمتھ نے کہا۔

"کیا وہ لڑکی پہلے سے ڈائری میں لکھ کر رکھے گی؟ اگر وہ واقعی جنرل اور مسز تھامسن کو مارنا چاہتے تھے تو کیا وہ اس کی تشہیر بھی کریں گے؟"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں جلد از جلد جنرل برونس وک سے بات کرنی چاہیے تاکہ اس کے گلے کی تکلیف کا معما حل ہوسکے۔ اسے بتانا ہوگا کہ کیا واقعی اس نے مس ڈوری کو فون کیا تھا۔"

اس دوران یہ تمام گفتگو سننے کے بعد انٹونیا ڈوری ایک نتیجے پر پہنچ چکی تھی۔ وہ یقین سے کہہ سکتی تھی کہ مسز تھامسن کو کس نے مارا اور کیوں؟ اس نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ مسز تھامسن کے پاس کوئی راز تھا۔"

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ لائبریری کا دروازہ کھلا اور جنرل برونس وک اندر داخل ہوا۔

"تم نے انہیں پکڑ لیا؟"

"ہاں لیکن بدقسمتی سے انہوں نے وہ ڈائری جلادی۔"

"اس سے انہیں کوئی مدد نہیں ملے گی۔ اس میں جو لکھا تھا وہ میں مس ڈوری کو بتا چکا ہوں لہٰذا وہ بھی اس بارے میں جان گئی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کریسی کے ذہن میں کیا تھا لیکن ایک بات یقینی ہے کہ یہ سب ڈیسمنڈ کا کیا دھرا ہے۔" اسی نے سائے میں زہر ملایا تھا۔ مجھے یاد آگیا کہ گزشتہ کرسمس میں بھی اس نے لیویا کے سائے میں کچھ ملانے کی کوشش کی تھی۔ لیویا نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تو اس نے مذاق میں ٹال دیا۔ لیویا نے یہ بات مجھے بتائی البتہ وہ کرسمس کے موقع پر کوئی ہنگامہ کھڑا کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن یہ ایک قتل ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم اسے فوراً حوالات میں بند کردو گے۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے مارنے کی کوشش کرے۔"

انسپکٹر اسمتھ نے کہا۔ "تمہارا کہنا ہے کہ تم نے مس ڈوری کو ڈائری کے بارے میں بتایا، یعنی وہ تم ہی تھے جس نے اسے فون کیا؟"

"ہاں۔ پہلے میں نے جھوٹ بولا تھا۔ صرف لیویا کی خاطر۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مس ڈوری اور میجر پائن یہاں آئیں۔"

"اسے ان کی موجودگی پر کیا اعتراض تھا؟"

"شاید وہ ڈرتی تھی کہ اس کی اصلیت ظاہر نہ ہوجائے۔ اس نے مجھے بھی نہیں بتایا کہ وہ میرے بٹلر کی بیوی رہ چکی ہے۔ اسے ڈر تھا کہ اگر یہ لوگ یہاں آئے تو پوچھ گچھ کے دوران بٹلر انہیں یہ بات نہ بتادے۔"

"تم جانتے تھے کہ وہ جانسن کی بیوی رہ چکی ہے؟"

"ہاں، کسی نے مجھے ایک گمنام خط کے ساتھ ان کے میرج سرٹیفکیٹ کی کاپی بھیجی تھی۔ ہوسکتا ہے وہ جانسن ہی ہو لیکن میں نے لیویا کو یہ بات نہیں بتائی۔"

انسپکٹر اسمتھ نے انٹونیا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم نے اسی راز کی طرف اشارہ کیا تھا؟"

"نہیں۔" انٹونیا نے کہا۔ "مسز تھامسن جس وجہ سے ہمیں یہاں آنے سے روکنا چاہ رہی تھی، وہ اس سے بالکل مختلف ہے اور بٹلر کی سابقہ بیوی ہونے سے کہیں زیادہ سنجیدہ نوعیت کی ہے۔"

"وہ کیا وجہ ہے؟" سر بروس نے پوچھا۔

"مسز تھامسن بلیک میلر تھی۔" انٹونیا نے کہا۔

جنرل برونس وک نے دائیں کان پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ میں نے ٹھیک طرح نہیں سنا۔ شاید تم نے بلیک میلر کہا ہے۔"

"ہاں۔ وہ تمہیں بلیک میل کر رہی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اسے تمہارا کوئی راز معلوم ہوگیا تھا۔ جب وہ فرونیال ہال کی تاریخ لکھ رہی تھی تو اس کی نظر سے چند ایسے کاغذات گزرے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم ٹیکس چوری اور منی لانڈرنگ میں ملوث ہو۔ یہ رقم تم فرضی نام سے ٹرکس اینڈ کیکوس، نامی جزیروں کے ایک بینک میں جمع کر رہے تھے۔ یہ جزیرے ٹیکس چوروں کے لیے جنت ہیں اور یہاں پوری دنیا سے منی لانڈرنگ ہوتی ہے اور تمام فنڈز خفیہ رکھے جاتے ہیں۔ مسٹر برونس وک! تمہیں بھی اعتراف کرلینا چاہیے کہ وہاں تمہاری بھاری رقم جمع ہے۔"

جنرل خاموشی سے میز پر رکھے ہوئے گلدستے کو دیکھتا رہا۔

انٹونیا نے اپنی بات جاری رکھی۔ "جب مسز تھامسن نے یہ کاغذات دیکھے تو وہ سوچنے لگی کہ انہیں کس طرح اپنے مفاد میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ اس کے لیے سونے کی کان تھی۔ مجھ سے گفتگو کے دوران جنرل کی زبان سے بھی نکل گیا کہ مسز تھامسن کو تمام کاغذات دینا ایک بڑی غلطی

تھی۔ وہ ہم سے اسی لیے خوفزدہ تھی کہ ہمیں اس کے بلیک میلر ہونے کا پتا چل جائے گا اور اس کے نتیجے میں ہم جنرل برونس وک کی حقیقت بھی جان جائیں گے۔"

"کیا یہ غلط ہے کہ دو سال پہلے ٹیکس چوری کے بارے میں تم سے تحقیقات بھی ہوئی تھی؟" میجر پائن نے کہا۔ "ان دنوں ملٹری کلب میں یہ افواہ زوروں پر تھی۔"

اس بار بھی جنرل برونس وک خاموش رہا۔

انٹونیا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "غالباً مسز تھامسن کے ساتھ تمہارا عشق بھی شروع ہوگیا تھا۔ تاہم مجھے شبہ ہے کہ اگر وہ تمہیں بلیک میل نہ کرتی تو تم کبھی اس سے شادی نہ کرتے۔ خادمہ لوسی نے ایک ماہ قبل لائبریری میں مسز تھامسن کو جو کہتے ہوئے سنا، وہ ڈیسمنڈ سے نہیں بلکہ تم سے مخاطب تھی اور وہ الفاظ ریکارڈ پر آچکے ہیں۔ مسز تھامسن واضح طور پر تمہیں دھمکی دے رہی تھی کہ اگر اس نے تمہاری ٹیکس چوری اور دیگر مالی بے قاعدگیوں کے بارے میں حکام کو آگاہ کردیا تو اس کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔"

"معاف کرنا....." جنرل اچانک ہی بھڑک اٹھا۔ "میں اس وقت کوئی کہانی سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ تمہیں یہ احساس ہونا چاہیے کہ اس گھر میں ایک موت ہوچکی ہے۔"

"تم مجبوری کے عالم میں مسز تھامسن سے شادی کرنے پر تیار ہوئے۔" انٹونیا نے کہا۔

"لیکن تم اس سے خوفزدہ تھے اور نفرت بھی کرتے تھے۔ اس نے تم پر حکم چلانا شروع کردیا تھا اور سب کچھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ صحیح معنوں میں اس گھر کی ملکہ بن گئی۔ تم اس سے جان چھڑانا چاہ رہے تھے۔ اتفاق سے تمہارے ہاتھ کریسی کی ڈائری لگ گئی جس میں ایک کہانی کا خاکہ لکھا تھا۔ اسے پڑھتے ہی تمہارے ذہن میں مسز تھامسن کو مارنے کا منصوبہ آیا جس کا الزام کریسی اور ڈیسمنڈ پر لگنا تھا۔"

"تم نے مجھے قربانی کا بکرا بنایا۔ فون کرکے ڈائری میں لکھی تحریر سنائی اور پارٹی میں آنے کی دعوت دی۔ پارٹی شروع ہونے سے پہلے ہی تم مسز تھامسن کے سائے میں زہر ملا چکے تھے۔ تمہیں یقین تھا کہ مسز تھامسن کو کسی بھی وقت سردرد کی شکایت ہوسکتی ہے اور اسے دوا کی ضرورت ہوگی۔ بالکل ایسا ہی ہوا۔ تم اپنے بھتیجے سے نفرت کرتے ہو۔ اس لیے اسے قتل کے الزام میں گرفتار کروانا چاہتے ہو۔"

کچھ دیر خاموشی رہی پھر سر بروس نے کہا۔ "یہ بہت ہی سنگین الزام ہے مس ڈوری۔ میں نہیں سمجھتا کہ تم اس کا کوئی واضح ثبوت دے سکو گی؟"

"مجھے اندیشہ ہے کہ ایسا کوئی ثبوت نہیں دے سکوں گی گو کہ مجھے پورا یقین ہے کہ حقیقت یہی ہے۔" انٹونیا بولی۔ "شاید تمہیں وہ کاغذات مل جائیں۔ میرا خیال ہے کہ مسز تھامسن نے انہیں کسی محفوظ جگہ یا اپنے وکیل کے پاس رکھوا دیا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جنرل نے پہلے ہی وہ کاغذات اپنے قبضے میں کرکے انہیں ضائع کردیا ہوگا۔ ورنہ وہ مسز تھامسن کو قتل کرنے کی ہمت نہ کرتا۔"

جنرل برونس وک اپنی کرسی سے اٹھا اور باوقار انداز میں بولا۔ "میں چاہوں گا کہ تم دونوں فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ مجھے اپنی پیاری بیوی کا سوگ منانے کے لیے وقت چاہیے۔"

جب ڈیسمنڈ سے پوچھا گیا تو اس نے سختی سے اس بات کی تردید کی کہ اس نے کبھی مذاق میں بھی مسز تھامسن کے سائے میں کچھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ انکل نے ہی وہ زہر آلود سائے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا ہوگا۔ اس پر کسی کی انگلیوں کے نشانات نہیں تھے۔

سرکاری طور پر دو دن تک مسز تھامسن کی موت کی تحقیقات ہوتی رہی لیکن کسی پر الزام عائد کیا گیا اور نہ ہی کوئی گرفتاری عمل میں آئی۔ سر بروس پوری کوشش کے باوجود ایسا کوئی سراغ یا ثبوت حاصل نہیں کرسکا جس سے قاتل کی نشاندہی ہوسکتی۔ انٹونیا نے جو حقائق بیان کیے، وہ ثبوتوں کے بغیر بے کار تھے۔

ڈیسمنڈ کو ایک ڈرامے میں اداکاری کی پیشکش ہوئی اور وہ فرونیال ہال سے چلا گیا۔ آنے والے جمعے کو مسز تھامسن کی تجہیز و تکفین ہوئی۔ اس موقع پر جنرل برونس وک دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ اس کے ٹھیک دو دن بعد وہ بھی اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

جب یہ حادثہ ہوا تو کریسی اس کے ساتھ تھی۔ اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا کہ سیڑھیاں اترتے ہوئے جنرل کا پاؤں پھسلا اور کوشش کے باوجود میں اسے نہ پکڑ سکی اور جنرل کی گردن ٹوٹ گئی۔

"دونوں اموات اسی طرح واقع ہوئیں جیسے اس ڈائری میں لکھی گئی تھیں۔" میجر پائن نے اخبار میں اموات کا کالم دیکھتے ہوئے کہا اور انٹونیا سوچنے لگی کہ جنرل نے اپنے بھتیجے کے لیے جو گڑھا کھودا تھا، وہ خود اس میں گر گیا۔ کریسی نے اپنی کہانی میں جو پیش گوئی کی تھی، وہ پوری ہوگئی۔ مسز تھامسن کے قتل کی طرح جنرل برونس وک کو پیش آنے والے حادثے کا بھی کوئی گواہ نہیں تھا۔

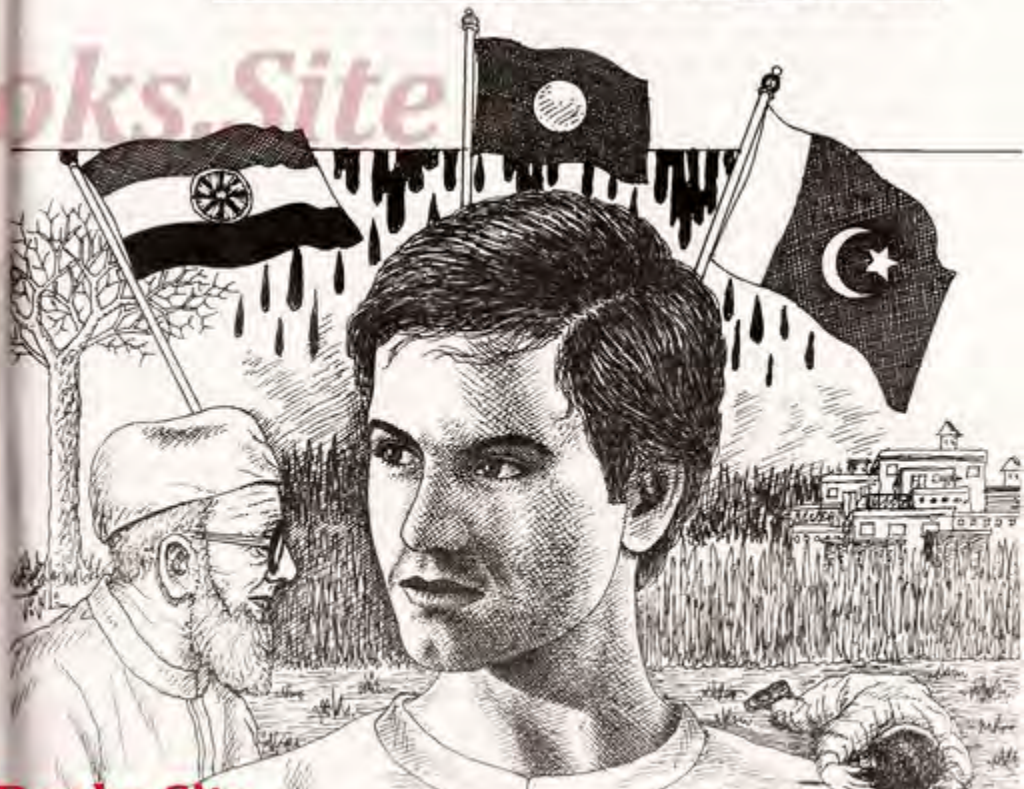


ایک کہانی بڑی پرانی

زویا اعجاز

یوں تو واقعہ کوئی بھی ہو رونما ہو جانے کے اور زندگی گزر جانے کے بعد کسی داستان میں ڈھل کر دوسرے لوگوں کے لیے دلچسپی کا سبب بنتا ہے ..... یہی حال ان کرداروں کا بھی تھا جو بظاہر زیست کی بساط پر الجھی چالوں سے نبرد آزما کٹھن مراحل سے گزر رہے تھے لیکن... درحقیقت وہ دھیرے دھیرے ایسی کہانی کو بھی ترتیب دے رہے تھے جو آنے والی نسلوں کے لیے لمحۂ فکریہ کو دعوت دے رہی تھی... جی ہاں "ایک کہانی بڑی پرانی" مگر جب جب پڑھی جائے گی قارئین کو نئے نظریات اور انجام کی طرف راغب کرے گی۔ وہ جو اپنے گھر کو دیواروں سے نہیں بلکہ رشتوں سے مضبوط کرنا چاہتا تھا... محبتوں، روایتوں کا امین تھا اور یہ امانت اپنی اگلی نسل تک پہنچانا چاہتا تھا مگر... بہت آخر میں احساس ہوا کہ جو سچائی اور محبت وہ لے کر چلا تھا ان کی تو کسی کو ضرورت ہی نہیں تھی۔ بس یہی نامرادی اس کہانی کے انجام کو لرزا گئی۔

مفکر و دانا لوگوں کی رگوں میں لہو گرماتی اور خوفناک انجام کی نشاندہی کرتی عبرت اثر داستان



Pakistanibooks.Site

"بس یہ آخری نوالہ لے لیں..... اس کے بعد بس۔" وہ بڑی محبت سے انہیں کھانا کھلا رہا تھا۔

"نہیں! اب مزید دل نہیں چاہ رہا بیٹا!" انہوں نے کپکپاتے ہاتھوں سے چمچہ پیچھے دھکیلا۔

"دل کیوں نہیں چاہ رہا؟ چڑیا جتنی خوراک رہ گئی ہے پہلے ہی آپ کی۔" اس نے مصنوعی خفگی دکھائی۔

"ارے! تو کیا اس بڑھاپے میں بھولو پہلوان جتنی خوراک کھاؤں میں؟" پوپلے منہ پر ہنسی نے بہار دکھائی۔

"تو آپ کسی بھولو پہلوان سے کم ہیں کیا؟ میرے لیے تو سپرمین ہیں آپ۔" وہ انہیں باتوں میں لگائے شوربے میں ڈوبی نرم سی روٹی بالکل مائع حالت میں کھلا رہا تھا۔ ان کے چہرے پر اپنی باتوں سے ابھرنے والے تاثرات اسے بہت بھاتے تھے۔

"اب وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی بیٹا! اب تو چل چلاؤ کا وقت ہے۔ زندگی اپنے خاتمے سے قبل سارے کس بل نکال کر موت کے حوالے کرتی ہے اور اپنی اس کاریگری پر بہت اترائی پھرتی ہے۔" وہ حسبِ سابق فلسفیانہ موڈ میں آچکے تھے۔

"آپ نے پھر سے وہی سب باتیں شروع کر دیں نا! بہت مزہ آتا ہے آپ کو یوں کر کے۔"

"حقیقت بیان کرتا ہوں میرے بچے! اسی سے متجاوز ہو چکا ہوں، اس پر مستزاد آنکھوں میں سفیدی غالب ہے..... ہاتھ، جن سے میں اکیلا ہی دس پر بھاری ہوتا تھا ایک پیچ تک تھامنے کے قابل نہیں رہے..... ایسے میں جینے کی آرزو رہے بھی کیوں؟"

وہ خاموش ہو رہا۔ انہوں نے بھی اس کی خفگی بھانپ لی اور دھیرے سے بولے۔

"میری بڑی خدمت کی ہے بیٹا تُو نے اِرب تیرا حامی وناصر رہے ہمیشہ۔ میری لاٹھی بن کے رہ رہا ہے تُو۔"

تو کوئی احسان نہیں کر رہا ہوں میں۔ آپ کو حق حاصل ہے مجھ پر..... اور یہ حق آپ مجھ سے چھین نہیں سکتے علی عبداللہ صاحب!" یہ اندازِ تخاطب اس کی ناراضگی کا نقطۂ عروج ہوا کرتا تھا۔

"اچھا بابا! چھوڑ دے نا غصہ! اچھے موڈ میں دفتر جا۔" انہوں نے اس کے چہرے کو دائیں ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"میں شام کو جلدی آجاؤں گا..... پھر ہم باہر چلیں گے۔ بڑے دن ہو چلے ہیں اکٹھے وقت نہیں گزارا۔"

"جیسے تیری خوشی میرے چاند! میں انتظار کروں گا۔" انہوں نے پوتے کے ہاتھ پر الوداعی بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

سرمد انہیں بستر پر لٹا کر کمبل درست کرتا ہوا دفتر کے لیے نکل گیا۔

اب کمرے میں علی عبداللہ نے اپنی سماعت کی فریکوئنسی کے ذریعے بیرونی دنیا سے ناتا جوڑ لیا۔ کچھ سالوں سے آنکھوں میں موتیا آجانے کے سبب ان کی بینائی بالکل ختم ہو چکی تھی۔ اعضا میں رعشہ ہونے کے باعث کپکپاہٹ طاری رہتی تھی۔

سرمد بلا ناغہ انہیں ناشتا اور رات کا کھانا اپنے ہاتھوں سے کھلاتا تھا اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے ان کا دل بہلائے رکھتا۔ اس کی روانگی و آمد کے درمیانی عرصے میں ان کا محض ایک ہی مشغلہ ہوتا تھا صوتی لہروں کے ذریعے پردۂ تصور پر نت نئی شبیہہ بناتے رہنا۔

بہار کی آمد آمد تھی۔ بچے آج کل فراغت کے لمحات سے اپنے گھروں میں ہی لطف اندوز ہو رہے تھے جن کی آوازیں سن کر ان کا دل مچلنے لگتا تھا کہ پنکھ لگائے اپنی اسی عمر میں واپس لوٹ جائیں مگر یہی حقیقت ہے کہ وقت کی چادر اپنے دامن میں زندگی کا ہر دور چھپا کر آگے بڑھ جاتی ہے۔

باہر صحن میں بچوں کے کھیلنے کی آوازیں بلند تر ہونے لگی تھیں۔ وہ ہار اور جیت کے فیصلے پر بحث میں مصروف تھے۔

سرمد کا بیٹا دوسرے بھائی سے کہہ رہا تھا۔

"جو ہار جاتا ہے، وہ جیت جاتا ہے..... اور جو جیت جاتا ہے، وہ ہار جاتا ہے۔"

علی عبداللہ کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ عود آئی۔ ایک بھرپور روشن منظر نے بصارت کی تاریکی میں کچھ جگنو چمکا کر رنگ و روشنی کا ایک نیا جہان آباد کر دیا۔ ذہن کی کسی کال کوٹھری میں برسوں سے مقید لب و لہجے کسی بازگشت کی طرح گونجنے لگے۔

☆☆☆

سرما کا ٹھٹھرا ہوا سورج اپنی کرنیں شیر پور کے کچے گھروں کی منڈیروں پر پھیلا رہا تھا۔ آٹھ سالہ علی اور دس سالہ نبیل اپنے آنگن میں ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ قہقہوں اور بھرپور مستی کا دور تھا۔

بھاگتے دوڑتے وہ صحن عبور کر کے گلی میں جا نکلے۔ نبیل کے ہاتھ میں مٹی کا ایک کھلونا تھا جسے علی کسی بھی جتن سے واپس لینا چاہتا تھا۔ جب کافی تگ و دو کے بعد بھی وہ بڑے بھائی کی دوڑ کا مقابلہ نہ کر سکا تو گھٹنوں کے بل وہیں بیٹھ کر رونے لگا۔

نبیل کے قدم اس کے آنسوؤں نے جامد کر دیے اور وہ کچھ خفا سے انداز میں بھائی کو دیکھنے لگا۔

"بہت سیانا ہے علی تو ویسے! ہر بار یونہی کرتا ہے۔"

"میں نے کیا کیا ہے بھیا؟ آپ اتنا تیز بھاگتے ہو۔ مجھ سے ہر بار آگے نکل جاتے ہو۔ میری ٹانگوں میں درد ہونے لگتا ہے..... لیکن آپ پکڑ میں ہی نہیں آتے۔" اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

"ہاں! اور پھر تُو جان بوجھ کر وہیں بیٹھا رونے لگتا ہے..... جانتا ہے نا میں تیرے آنسو برداشت نہیں کر سکتا۔"

"نہیں! میں جان بوجھ کر تو نہیں روتا۔ آپ دور جانے لگتے ہو تو مجھے رونا آجاتا ہے کہ میں آج کی دوڑ پھر سے ہار گیا۔ میں کبھی جیت ہی نہیں پاتا۔"

"ارے پگلے! بھائیوں میں کیسی ہار اور جیت بھلا؟ اور تجھے کیا پتا... جو جیت جاتا ہے، وہ ہار جاتا ہے..... اور جو ہار جاتا ہے، وہ جیت جاتا ہے۔" نبیل نے اسے پچکارتے ہوئے فلسفہ بگھارا۔

علی کی آنکھوں میں ستارے جگمگانے لگے۔

"سچی بھائی!"

"مچی!" نبیل نے کہا۔

دونوں ایک بار پھر اسی مشغلے میں مصروف ہو گئے۔ ان کے اس کھیل کا اختتام مسجد سے ابھرتی موذن کی صدا سن کر ہوا۔ اذان کا احترام تو گویا ان کی گھٹی میں شامل تھا۔ وہ دونوں موذن و مولانا عبداللہ کے سپوت تھے۔ عقیدت و احترام ان کی رگوں میں دوڑتا تھا۔

وہ نیم کے درخت تلے سر جھکائے بیٹھے ان مقدس کلمات کا بہ زبان خاموشی جواب دے رہے تھے۔ اس روز بھاگ دوڑ میں وہ گھر سے کافی دور نکل آئے تھے اس لیے واپسی اور وضو کے مراحل سے گزر کر مسجد میں پہنچتے ہوئے اک ذرا سی تاخیر ہو گئی تھی۔ آج انہیں خلافِ معمول تیسری صف میں جگہ ملی تھی۔

نماز مکمل ہونے کے بعد وہ دونوں عبداللہ کا انتظار کرنے لگے۔ ظہر کی نماز کے بعد وہ گھر میں قیلولہ کیا کرتے تھے اور پھر تازہ دم ہو کر بچوں کو کلام پاک کا درس دیتے۔ واپسی پر عبداللہ کا مزاج قدرے برہم محسوس ہو رہا تھا۔ نبیل اس خاموشی و خفگی کی وجہ سمجھ چکا تھا اس لیے شرارتوں میں مشغول علی کو کن انکھیوں سے سنجیدہ رہنے کے متواتر اشارے کر رہا تھا۔

گھر پہنچ کر اس نے دونوں بیٹوں کو اپنے پاس طلب کر لیا۔

"آج مسجد میں تاخیر کی کیا وجہ تھی نبیل؟" انہوں نے نرمی سے استفسار کیا۔

"ہم کھیل میں مصروف ہو گئے تھے بابا جان۔" اس نے سر جھکا کر کہا۔

"میں نے کبھی کھیل سے منع تو نہیں کیا بیٹا! لیکن میری بس ایک ہی خواہش رہی ہے۔ جانتے ہیں نا آپ دونوں۔"

"جی بابا جان! آئندہ ہم پہلی صف میں ہی نماز کی ادائیگی کیا کریں گے۔" اس نے ادب سے کہا تو عبداللہ نے دونوں کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

کھانے اور قیلولے کے بعد ان کی والدہ انہیں اسلامی کتب کا مطالعہ کرواتی تھیں۔ غیر محسوس طریقے سے وہ انہیں اسلامی اقدار سے روشناس کرایا کرتی تھیں۔

زندگی ایک بہت سہانے دور سے گزر رہی تھی۔ والدین کی بے لوث محبت، پڑھائی، ہم جولی اور بچپن کی بھرپور مستیاں..... علی خود کو راضی جنت میں محسوس کرتا تھا۔

☆☆☆

گھر میں اچانک ہی خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ علی عبداللہ کو اس سناٹے سے بہت الجھن ہوتی تھی۔ ان کا دل چاہتا تھا کہ ساعتوں میں ہمہ وقت زندگی کی چہکاریں گونجتی رہا کریں۔ انہوں نے بڑھاپے کو اپنے اعصاب پر کبھی بھی حاوی نہیں ہونے دیا تھا۔

کمرے میں اس وقت صرف دیوار پر لگے کلاک کی مدھم ٹک، ٹک سنائی دے رہی تھی۔ گھڑیال کا یہ مخصوص سفر انہیں ہمیشہ اپنی جانب بڑھتی ایک ہم جولی کی سنگت کا احساس دلاتا رہتا تھا۔ وہ سچائی کے دلدادہ تھے اور موت سے بڑا سچ اس کائنات میں کوئی اور نہیں۔

تھوڑی دیر بعد گھڑی کے الارم نے دوپہر کے ایک بجنے کی منادی دی تو وہ اپنے خیالات سے چونک گئے۔ بستر کے ساتھ مخصوص مقام پر ان کی لاٹھی موجود رہتی تھی جسے تھام کر وہ واش روم تک پہنچ کر بہت پُرسکون انداز میں وضو کیا کرتے تھے۔ سرمد نے ان کے لیے خصوصی طور پر ایک سینیٹری کٹ نصب کروا رکھی تھی جس کے استعمال میں اپنی بصارت سے محرومی کے باوجود وہ کبھی کسی تنگی کا شکار نہ ہوئے تھے۔ وضو سے فراغت کے بعد وہ ٹٹولتے ہوئے واپس کمرے میں آئے اور بستر کے پاس ہی موجود اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ کر نماز کی ادائیگی کی۔

دعا کے لیے بارگاہِ الٰہی میں ہاتھ پھیلاتے ہی جانے کتنی گم گشتہ ہستیوں کا تصور کسک بن کر دل میں درد بڑھانے

لگا۔ آنکھوں میں نمی نے چادر تان لی۔ دعا مانگتے ہوئے حلق میں آنسوؤں کا پھندا سا بن گیا۔ تھرتھراتے لبوں اور ہچکیاں لیتے وجود سے آج عجز کے نئے سوتے پھوٹ رہے تھے۔

دعا کے بعد وہ ہتھیلیوں میں چہرہ رکھے گھر پر چھائے اس سناٹے کی توجیہات تلاشتے رہے۔ کوئی گھنٹا بھر گزرنے کے بعد بیرونی دروازے پر ابھرتی آہٹوں نے سماعت میں رس گھول دیا۔

بچے لوٹ آئے تھے اور اب ان کی چہکاریں ہر سو پھیلنے لگی تھیں۔ ٹی وی لاؤنج میں ملی جلی آوازوں کے شور سے انہیں صورتِ حال سمجھ میں نہیں آرہی تھی پھر اندازہ ہونے لگا کہ وہ سب کسی خاص وجہ سے بہت پُرجوش تھے۔

اولاد کے معاملے میں علی عبداللہ زیادہ فراخ نہ رہے تھے۔ ان کا صرف ایک ہی بیٹا تھا عبدالمنان..... وہ ایک فوجداری وکیل تھا جس کی صوبے بھر میں خاصی شہرت تھی۔ پیشہ ورانہ فرائض کے معاملے میں وہ بہت جنونی واقع ہوا تھا اس لیے شب و روز اپنے کام میں جتا رہتا تھا۔ عبدالمنان بھی کثیر اولاد نہ تھا۔ اس کے دو ہی بچے تھے، سرمد اور ثمن۔ سرمد ان کی بوڑھی آنکھوں کی ہی نہیں بلکہ پورے وجود کی ٹھنڈک تھا۔ ثمن سے بھی وہ والہانہ محبت کرتے تھے۔

سرمد کی شادی اس کی رضامندی سے ..... ایک پرانی ہم جماعت سے ہوئی تھی اور اب تو اس کے بچے بھی اسکول جانے لگے تھے۔ ثمن کی شادی دو سال قبل سرمد کے سسرالی رشتے دار سے ہوئی تھی لیکن ابھی تک اولاد کی کوئی نوید نہ تھی۔

علی عبداللہ اپنے اس مختصر سے کنبے کے لیے سراپا محبت و شفقت تھے۔ ان کی سلامتی و ترقی کی دعائیں ہمہ وقت ان کے لبوں پر رہتی تھیں۔

لاؤنج میں بڑھتے شور میں اب ٹی وی کی بلند آواز بھی شامل ہوگئی تھی۔ اگلے ہی پل ان کے کمرے کا دروازہ کھلا اور سرمد کی بیوی نے انہیں مخاطب کیا۔

''ابا جان کھانا لائی ہوں آپ کے لیے.. بعذرت خواہ ہوں آج تاخیر ہوگئی مجھے۔''

وہ جانتی تھی کہ ان کے کھانے کے اوقات میں کبھی اونچ نیچ نہیں ہوا کرتی تھی۔

''کوئی بات نہیں دُلہن! انسان کوئی مشین تو نہیں جو گھڑی کی سوئیوں کے مطابق چلتا رہے۔'' وہ اتنا عرصہ گزر چکنے کے بعد بھی بہو کو اسی محبت بھرے تخاطب سے پکارتے تھے۔ کھانے کے دوران وہ بات چیت کم ہی کیا کرتے تھے۔ دلیا کھلانے کے بعد بہو نے ان کے ہونٹ اور ٹھوڑی گیلے نیپکن سے صاف کی تو انہوں نے گھر میں ہلچل کی وجہ پوچھ ہی لی۔

''آج گھر میں کوئی خاص بات ہے کیا؟ پہلے سب کہیں غائب تھے اور اب ماشاء اللہ سب کی آوازوں میں خوشی کی یہ کھنک ہے۔''

''جی ابا جان! ولید اور سمید کا سالانہ نتیجہ تھا آج۔ وہیں گئے تھے سب۔ ابھی لوٹے ہیں۔''

''ماشاء اللہ ماشاء اللہ..... کوئی خوشخبری بھی لائے ہیں کیا؟'' انہوں نے متجسس ہوکر پوچھا۔

''جی! دونوں بھائیوں نے ہی پوزیشن حاصل کی ہے۔ اب بضد ہیں کہ انہیں کھانا باہر کھلایا جائے اور نئی فلم دکھائی جائے۔''

وہ پل بھر کے لیے خاموش ہوئے پھر دھیرے سے بولے۔

''اللہ پاک مزید ترقیاں نصیب فرمائے لیکن آپ سب نے شکرانہ ادا کیا کہ نہیں؟''

''جی وہ بس ذرا تھکے ہوئے تھے اس لیے آتے ہی آرام کرنے لگے ہم سب..... میں کہہ دوں گی انہیں۔'' گلنار عجلت میں کہتی برتن سمیٹتے ہوئے باہر چلی گئی۔

ان کی نابینا آنکھوں نے بھی اس کی کوفت اور لٹھ مار انداز کو بخوبی دیکھ لیا تھا۔ دل پر اداسی کا غلبہ حاوی ہوگیا۔

☆☆☆

سہ پہر کا وقت تھا۔ علی عبداللہ عصر کی نماز سے فراغت پا چکے تھے اور اب مغرب تک انہیں کچھ درود اذکار میں مشغول رہنا تھا۔ شام سے کچھ دیر قبل سرمد اپنے دفتر سے لوٹ آیا تھا اور حسبِ وعدہ انہیں اپنے ساتھ گھر کے قریب ہی ایک پارک میں لے آیا تھا۔ فضا میں رچی بہار کی مخصوص مہک طبیعت پر بہت خوشگوار اثر ڈال رہی تھی۔ اپنے آشیانوں کی طرف لوٹتے پرندوں کی چہکار ان کے اعصاب کو سکون بخشنے لگی تھی۔ دوپہر سے چھائی کلفت اور اداسی اس خوشبودار فضا میں تحلیل ہوتی محسوس ہونے لگی لیکن طبیعت میں قرار اب بھی نہ تھا۔

''کیا بات ہے بابا جان..... آپ اتنے مضمحل کیوں ہیں؟''

''کچھ نہیں! بس یونہی دل مضطرب سا ہے۔''

''مگر کیوں؟ کیا کسی ادھوری خواہش کی تکمیل درکار ہے آپ کو؟''

انہوں نے جواب میں خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بتائیے نا! کیا بات ہے؟'' وہ وہیل چیئر روک کر ان کے قدموں کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

''مجھے فجر کی نماز باجماعت ادا کرنے کی بہت خواہش ہوتی ہے۔ اپنے ساتھ مجھے بھی صبح لے جایا کرو نا مسجد۔'' انہوں نے حسرت سے کہا۔

''جی..... اچھا..... ضرور۔'' سرمد کے ہاتھوں کی گرفت کمزور پڑ گئی۔

''تم نماز کے پابند نہیں رہے نا؟'' انہوں نے وثوق سے پوچھا۔

''تھکاوٹ ہو جاتی ہے تو بس ..... آنکھ نہیں کھلتی..... لیکن آپ کو کیسے علم ہوا؟''

''تمہارے بچوں کی عادات سے..... اگر تم پابندی سے اس فریضے کی ادائیگی کر رہے ہوتے تو وہ بھی اس سے مانوس ہوجاتے..... آج ان کے طور طریقوں نے دل بہت دکھایا ہے۔''

''میں کوشش تو کرتا ہوں بابا جان! لیکن بس میری آنکھ ہی نہیں کھل پاتی۔'' وہ شرمسار تھا لیکن اضطراب سے اب بھی کوسوں دور تھا۔

''دین اور دنیا کو ساتھ لے کر چلنے کے لیے اپنے نفس کی باگیں مضبوطی سے تھامنا پڑتی ہیں بیٹا! تمہارے بچے تو ایک خالی سلیٹ ہیں، ان پر تم جو بھی نقوش ابھارو گے وہ اسی میں ڈھلتے جائیں گے۔ کچی عمر کے نقوش ساری زندگی کے ہمدم ہوتے ہیں۔'' انہوں نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

''وہ شہر کے سب سے مہنگے اسکول میں پڑھ رہے ہیں بابا جان! میں انہیں بہترین تعلیم فراہم کر رہا ہوں۔'' سرمد نے فخر سے کہا۔

''اور تربیت؟ ان کی تربیت کون کر رہا ہے؟''

''ان کے اسکول کا نظام بہت لاجواب ہے۔ وہ بچے کو کندن بنا دیتے ہیں۔''

''اچھا! تو وہ والدین کے فرائض بھی نبھانے لگے ہیں۔''

''آپ خود دیکھ لیجیے گا۔ ان کی تعلیم کے متعلق کوئی بھی سوال پوچھ لیجیے گا..... آپ کو ان کی ذہانت کا اندازہ ہوجائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ آج رات کھانے کے بعد انہیں میرے کمرے میں بھیجنا..... لیکن اکیلے۔ کوئی اور ساتھ نہ ہو ان کے۔''

''جی ضرور! آپ کو ان کی قابلیت حیران کر دے گی۔'' سرمد پُرجوش تھا۔

تھوڑی دیر وہاں مزید ٹھہرنے کے بعد وہ گھر آگئے۔ رستے بھر سرمد کی باتوں کے جواب میں وہ محض ہوں، ہاں کرتے رہے۔ دل عجب سی گھٹن تلے دبا جا رہا تھا۔

رات کو عشا کی نماز سے فراغت کے بعد انہوں نے بچوں کو اپنے کمرے میں بلا بھیجا۔ سرمد پُرجوش تھا تو اس کی بیوی قدرے جز بز محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے بچوں کو ان کے بوڑھے وجود سے زیادہ مانوس ہونے ہی نہ دیا تھا۔ وہ دوپہر کو اسکول سے واپس آتے تو بھاگ دوڑ میں کھانا کھلا کر انہیں کوچنگ سینٹر روانہ کر دیا جاتا تھا۔ شام کے اوقات میں ایک مولانا صاحب انہیں دس منٹ کے لیے ''قرآن ناظرہ'' کی تعلیم دینے آتے تھے۔ اس کے بعد انہیں ٹی وی اور کمپیوٹر کی جادوئی دنیا کی دریافت کے لیے اکیلے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ سائرہ جدید وقت کے تقاضوں کے مطابق چلنے کی قائل تھی۔ اس لیے بچوں کو بھی اس نے ایک مخصوص نظام الاوقات کا پابند بنا رکھا تھا۔

علی عبداللہ کی سوچ اور نظریات اسے روزِ اول ہی سے نہیں بھائے تھے لہٰذا بچوں کی ان سے انسیت نا قابلِ برداشت امر تھا۔ تاہم اس وقت شوہر کا جوش و خروش دیکھ کر وہ کچھ نہ کر پائی اور اپنے جڑواں بیٹوں کو ان کے کمرے میں روانہ کر دیا۔

بچے اس ہنگامی طلبی سے بیزاری و تجسس کی ملی جلی کیفیات میں مبتلا تھے۔ اپنے پسندیدہ کارٹون کرداروں سے ملاقات میں تعطل سے بیزار تھے تو اپنے ''اولڈ بڑے پاپا'' سے ملاقات کا تجسس بھی انہیں بے حال کیے ہوئے تھا۔

''مے آئی کم ان بڑے پاپا؟'' ولید نے دروازے پر دستک دے کر شائستگی سے پوچھا۔

''آجاؤ میرے بچو! میں تو کب سے منتظر ہوں آپ دونوں کا۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے پکارا۔

''ہیلو بڑے پاپا! ہاؤ آر یو؟'' سمید نے بھی بہت مہذب انداز میں پوچھا۔

وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئے اور پھر ہلکی سی مسکراہٹ لیے بولے۔

''السلام علیکم میرے ننھے شہزادو!''

''وعلیکم السلام بڑے پاپا۔'' وہ دونوں کھلکھلائے۔

''بھئی! مجھے علم ہوا تھا کہ میرے شہزادوں نے بہت اچھا رزلٹ دیا ہے تو میں آپ کو انعام دینا چاہتا تھا۔''

''سچی بڑے پاپا! کیا انعام دیں گے آپ ہمیں؟'' وہ خوشی سے اچھل پڑے۔

''بہت قیمتی چیز تو نہیں بچو!'' انہوں نے ڈرامائی انداز

میں کہا۔ علی عبداللہ نے اپنے کُرتے کی جیب سے چند نوٹ نکال لیے۔ ''ان میں سب سے بڑا نوٹ پکڑیے آپ۔''

بچوں نے سو روپے تھام لیے۔

''آپ جانتے ہیں اس پرکس کی تصویر بنی ہے؟'' انہوں نے خدشات سے دھڑکتے دِل سے پوچھا۔

''جی! یہ قائداعظم ہیں۔'' ولید نے سرسری انداز میں کہا۔

''قائداعظم کون تھے بھلا؟''

''انہوں نے پاکستان بنایا تھا بڑے پاپا۔'' بچے اس کسوٹی نما عمل سے بور ہونے لگے تھے۔

''ان کا اصل نام جانتے ہیں آپ؟'' ایک توقف کے بعد انہوں نے پوچھا۔

''ان کا نام قائداعظم ہی تھا بڑے پاپا۔ ہم نے ان کا کوئی نک نیم نہیں پڑھا۔''

اس جواب پر ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ انہوں نے گلا کھنکھارتے ہوئے ایک اور آس کے تحت پوچھا۔ ''آپ کو دعائیں آتی ہیں بیٹا؟''

''دعائیں ہمارے سلیبس میں ابھی شامل نہیں ہیں۔ اگلی ٹرم میں پڑھائیں گے تو ہم قاری صاحب سے یاد کر لیں گے۔'' ولید نے متانت سے کہا۔

''آپ بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں بیٹا؟''

''میں تو بڑا ہو کر ''ڈوریمون'' بنوں گا۔'' سمید نے فوری جواب دیا۔

''اور آپ ولید؟''

''میں ''بیٹ مین'' یا ''سپر مین'' بنوں گا۔'' اس نے اتراتے ہوئے کہا۔

''اب ہم جائیں بڑے پاپا! ٹی وی پروگرام کا وقت گزر رہا ہے نا.....'' سمید نے بے تابی سے کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! جاؤ آپ۔'' انہوں نے میکانکی انداز میں چند نوٹ انہیں تھما دیے۔

''او کے! گڈ نائٹ۔'' وہ اچھلتے کودتے کمرے سے باہر چل دیے۔

علی عبداللہ اس وقت خاموشی اور سناٹوں کی زد میں تھے۔ انہیں سرمد کی آمد کی بھی بالکل خبر نہ ہو سکی تھی۔ وہ اس کی آواز سے چونک گئے تھے۔

''دیکھا آپ نے بابا جان! اس عمر میں بھی انہیں ہر بات کے اینٹی کیٹس آتے ہیں۔''

''ہاں سرمد! آج میں نے بہت کچھ دیکھ لیا۔ ٹھیک ہی کہا تھا تم نے..... ان کی قابلیت مجھے حیران کر دے گی۔''

انہیں اپنی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

''تو کیسا مستقبل دیکھتے ہیں آپ ان بچوں کا؟''

''غلامی.....'' وہ منہ میں بدبدا کر رہ گئے۔

''کیا ہوا؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' وہ پریشانی سے بولا۔

''مجھے بلڈ پریشر کی دوا لا دو..... میرا سر چکرا رہا ہے۔'' نقاہت ان کے ہر انداز سے عیاں تھی۔

اس نے فوراً ایک گولی ان کی زبان تلے رکھی اور بستر پر لٹا کر چلا گیا۔ دو آنسوؤں نے پلکوں کی منڈیر سے جست لگائی اور ان کے تکیے میں جذب ہو گئے۔

☆☆☆

کچے آنگن میں خوشیاں بال بکھیرے رقص میں مگن تھیں۔ نبیل عبداللہ کسی دُلہا کی شان لیے مرکزِ نگاہ تھا۔ آج مولوی عبداللہ کی خوشی سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ نبیل نے مکمل قرآن حفظ کر لیا تھا تو دوسری طرف اس کا مڈل امتحان کا نتیجہ بھی آ گیا تھا۔

حافظ نبیل عبداللہ نے اپنی جماعت میں سب کو پچھاڑ کر وظیفہ حاصل کیا تھا۔ شیر پور میں آج اس کی قابلیت ہی موضوعِ گفتگو تھی۔ عبداللہ نے بیٹے کی کامیابی کی خبر سنتے ہی نوافل ادا کیے تھے اور دونوں بیٹوں کو بھی اس کی خاص تاکید کی تھی۔ والدہ کی خوشی کا بھی کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

شیر پور بہ مشکل آٹھ سو نفوس پر مشتمل گاؤں تھا جہاں ہندو مسلم آبادی اپنے روایتی تعلقات کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ مسلم آبادی اقلیت میں تھی جن کی ضروریات کے لیے صرف ایک ہی مسجد تھی۔ اسکول البتہ سب کا سانجھا تھا۔

اسکول میں عبداللہ دینیات کے علاوہ... مسلم بچوں کو اردو زبان و ادب کی خصوصی تعلیم بھی دیتے تھے۔ شیر پور کی نئی نسل کا اپنی روایات سے ناتا قائم رکھنے میں مولوی عبداللہ نے ہمیشہ ایک ''پل'' کا سا کردار ادا کیا تھا۔ گاؤں بھر کے بچوں کی زندگیوں کو نئی جہت عطا کرنے والے اس درویش صفت انسان نے اپنی اولاد کی تربیت پر بہت کڑی محنت کی تھی۔ نبیل کی جماعت کے سبھی لڑکوں کے والدین انہیں فرداً فرداً مبارک باد دینے چلے آ رہے تھے۔

''نبیل کے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے آپ نے اب مولوی جی؟ حفظ مکمل ہو گیا ہے۔'' مزارع بابر نے پوچھا تھا۔

''ابھی تو اسے بہت سا علم حاصل کرنا ہے۔ دینی بھی دنیاوی بھی۔ کلام پاک حفظ کر لینا ہی تو ایک مسلمان پر واجب

JBD

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ 550/-
جب سومنات کے بڈھے برت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔ اس کے خون کے پیاسے سومنات نے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا پیغام سنتے ہی تخت الخواص نے جواب دیا۔ میں بت فروش نہیں بت شکن کہلوانا چاہتا ہوں۔ نسیم حجازی کی ایک اور لاجواب تاریخی

اندھیری رات کے مسافر 475/-
اندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے گرد گھومتا ہوا پر سوز، پُرجوش اور پُرجوش اور جوانوں کی الفت و رسوائی کی الم ناک داستان

ثقافت کی تلاش 300/-
تاریخ اسلام سے قبل عرب، عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی تہذیبی اور مذہبی حالات زندگی اور فرزندان اسلام کے ابتدائی تعارف کی داستان

قیصر و کسریٰ 625/-

اور تلوار ٹوٹ گئی 550/-
شیر میسور (نیو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، مجدد و خدا نوری کے جاوہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی

گمشدہ قافلے 500/-
انگریز کی اسلام دشمنی، یہودیت کی عیاری اور مکاری اور مسلمان کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کے خون میں نہلانے کی لرزہ خیز کہانی

داستانِ مجاہد 300/-
فتح دہلی کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی ایک فوج بنائی، فاتح سندھ کی معرکۃ الآرا داستان

پردیسی درخت 450/-
اسلام دشمنی پر مبنی ناولوں اور مسلمانوں کے خود ساختہ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے اپنے اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

یوسف بن تاشفین 500/-
اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آخر دم تک جدوجہد کرنے والے عظیم سپاہی کی داستان

جہانگیر بکس 91

انسان اور دیوتا 450/-
برصغیر کی تاریخ کے عظیم اور بدترین کرداروں کی داستان، جس نے اچھوتوں کو راہِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

پاکستان سے دیارِ حرم تک 300/-
تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفر نامہ حجاز

آخری چٹان 450/-
سیف الدین سیف، عزالدین خوارزمی کی داستان شجاعت جو تاتاریوں کے سیلاب روکنے کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

سو سال بعد 225/-
کانگریس کی مہاتما نیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

سفید جزیرہ 325/-
بحرالکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

شاہین 475/-
اندلس میں مسلمانوں کے نجیب و فراز کی کہانی

معظم علی 475/-
آزاد و کلایئر کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک جاہ و عظیم طوفان کی داستان شجاعت

خاک اور خون 550/-
سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

کلیسا اور آگ 450/-
فرڈی ننڈ کی عیسائی مسلمان جنگوں کی تباہ کاریوں کی عکاسی، سقوط غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

قافلۂ حجاز 599/-
راوحق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

محمد بن قاسم 425/-
عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور ہمت علی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

پورس کے ہاتھی 300/-
1965ء کی جنگ کے پس منظر میں ہندو ذہنیت اور رسموں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنہیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی

سبق آموز کتب سلسلہ
دو رنگی طباعت اور تصویر



اقوالِ حضرت علی المرتضیٰؓ 165/-
اقوالِ آئمہ کرامؒ 165/-
حکایاتِ گلستانِ سعدیؒ 195/-
اقوالِ شیخ سعدیؒ 140/-
حکایاتِ رومیؒ 180/-
دلچسپ و عجیب حقائق 170/-
حکایاتِ بوستانِ سعدیؒ 199/-
دلچسپ و حیرت انگیز باتیں 180/-
ایمان افروز و سبق آموز سچے واقعات 180/-
بڑے لوگوں کے روشن واقعات 165/-



جہانگیر
اُردو لغت
(جامع ترین)
ملفوظی طریقے سے تلفظ کے اندراج کے ساتھ اردو زبان کی پہلی لغت

جہانگیر بک ڈپو
022-2780128
042-37220879
042-35757086
051-5539609
021-32765086

نہیں ہے۔اس انمول کتاب میں جو خزانے اور موتی پوشیدہ ہیں،ان کی دریافت ہی اصل معراج ہے۔"

"لیکن یہ دہری ذمے داریاں نبھائے گا کیسے؟ یہاں شیر پور میں تو اعلیٰ تعلیم کے لیے کوئی ادارہ ہی نہیں۔"

"محمد آباد بھیجوں گا میں اسے اب۔ وہاں قرآن کا ترجمہ،تفسیر پڑھانے کے ساتھ دنیاوی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔" انہوں نے جذب سے کہا۔"دین کے بغیر دنیا محض گمراہی ہے۔ ہمیں اپنی نسل کو گمراہی میں نہیں دھکیلنا..... کسی صورت بھی نہیں..... ہمیں تو اپنی میراث واپس حاصل کرنی ہے۔"

"اللہ آپ کی زبان مبارک کرے مولوی جی!" ادھیڑ عمر کسان رفیق نے کہا۔"تعلیم اور ہنر ہی کی کمی نے تو ہمیں حاکموں سے مزارع بنا ڈالا تھا۔اب مستقبل اس نئی نسل کے ہاتھوں میں ہے۔"

"ہمارے پُرکھوں نے تو جانے کیا سوچ کر ہمیں اپنی اس میراث سے محروم کر ڈالا۔" بابر اداسی سے بولا۔"مگر اب ہم اپنے بچوں کو اپنے جیسی زندگی جینے نہیں دے سکتے۔"

"بالکل درست کہہ رہے ہو۔" رفیق نے لقمہ دیا۔"ہم اس زیور سے محروم رہے..... کیونکہ ہمارے باپ دادا کو مولوی صاحب جیسا روشن خیال راہنما نہ ملا تھا۔اس وقت تو ہمارے بزرگوں نے ایک ہی بات پر ایکا کر لیا تھا کہ فرنگی تعلیم پڑھنے سے ہم بھی کافر ہو جائیں گے۔"

"انہوں نے تو جانے کس بہتری کے تحت یہ فیصلہ لیا تھا لیکن نہ پڑھ کر بھی ہماری زندگیوں میں کون سے سدھار آ گئے؟ اپنی ہی جاگیر پر ملازم بن کر زندگیاں گزاری ہیں۔" ایک اور مزارع نے کہا۔

☆☆☆

نبیل نماز عصر کے بعد ایک بار پھر اہلِ علاقہ کے نرغے میں تھا۔وہ سبھی اسے مبارکباد دے کر اپنی دلی خوشی کا اظہار کر رہے تھے لیکن اس کے بشرے سے پریشانی اور بے اطمینانی جھلک رہی تھی۔علی نے اس کے ساتھ ہی نماز ادا کی تھی لیکن اب وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

وہ سب کی دعائیں سمیٹتا دل میں خدشات لیے گھر کے عقب میں واقع کھیتوں کی طرف جا نکلا۔تھوڑی دور ہی وہ اسے ایک منڈیر پر بیٹھا نظر آ گیا تھا۔پچھم کی جانب ڈوبتے سورج کی اداس کرنوں میں گھرا وہ بہت بے کل اور اداس دکھائی دے رہا تھا۔نبیل نے قریب جا کر دھیرے سے اپنا بازو اس کے شانوں کے گرد حمائل کر دیا اور محبت سے پوچھا۔

"یہ اداسی کیوں؟"

"کچھ نہیں..... بس یونہی۔" وہ نروٹھے لہجے میں بولا۔

"میری کامیابی سے خوشی نہیں ہوئی کیا تمہیں؟"

"یہ کیسے سوچ لیا آپ نے بھلا؟"

"تمہارے اس گم صم رویے سے!"

"میں تو آپ کے جانے کی خبر سن کر اداس ہوں۔"

"لیکن جانا بھی تو ضروری ہے نا..... محمد آباد کے ہائی اسکول میں پڑھنے کے بعد غازی پور کے کالج میں داخلہ لوں گا۔"

"بس مجھ سے دور ہوتے جانا آپ! کتنے آرام سے کہہ رہے ہو یہ سب۔" وہ چیخ سا گیا۔

"یہی تو زندگی ہے میرے مٹھو! کچھ پانے کے لیے بہت کچھ خلافِ طبیعت بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔"

"لیکن میں آپ سے دور نہیں رہ سکتا۔ مجھے تو آپ کے بغیر کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔" وہ رونے والا تھا۔

"ایک حل ہے میرے پاس اس مسئلے کا۔"

"کیا بھلا؟ جلدی بتائیں۔"

"تم اپنی پڑھائی پر زیادہ وقت صرف کرو..... پھر جلدی سے میرے پاس آ جانا۔"

"بچ سمجھ کر بہلا رہے ہیں آپ مجھے؟ میں آپ سے دو جماعتیں پیچھے ہوں..... جب تک آپ کے پاس محمد آباد آؤں گا..... آپ غازی پور چلے جائیں گے۔"

"اگر تم اپنی پڑھائی پر سنجیدگی سے توجہ دو تو ایک ہی سال میں میرے پاس آ سکتے ہو۔"

"یہ کیسے ممکن ہے بھلا؟"

"ابا جان کی مدد سے اپنا نصاب جلدی ختم کر لو۔ایک سال میں دو جماعتیں پاس کر کے میرے ساتھ محمد آباد چل سکو گے تم۔"

"لیکن یہ سب ہوگا کیسے؟" علی متذبذب تھا۔

"اس میں کیا مشکل ہے بھلا؟ یاد نہیں پچھلے سال ساتھ والے گاؤں سے راجو بھی اسی طرح ہائی اسکول میں گیا تھا..... تم بھی محنت کرنا بس۔"

"ٹھیک ہے! میں بھی یہی کروں گا۔حفظ مکمل ہونے میں بھی بس تین سپارے باقی ہیں..... میں دن رات محنت کروں گا..... اور انشاء اللہ اگلے سال آپ کے پاس موجود ہوں گا۔"

"وعدہ؟" نبیل نے مسکراتے ہوئے اپنی ہتھیلی اس کے سامنے بڑھائی۔

"جی..... پکا وعدہ۔" علی نے بھی جواب میں اپنی ہتھیلی

اسے تھما دی۔

☆☆☆

علی نے بڑے بھائی سے کیا ہوا اپنا قول نبھانے کے لیے اداسی اور اضطراب ہی کو اپنا ہتھیار بنا لیا تھا۔کھیل کود اور شرارتیں تو گویا یکدم ہی نابود ہو گئی تھیں،وہ بھائی ہی نہیں،اس کا بہترین دوست بھی تھا جس کی غیر موجودگی میں اسے اپنا وجود ادھورا محسوس ہوتا تھا۔

شیر پور میں مذہبی اختلافات سے قطع نظر انہوں نے اپنی اولاد کے ذہنوں میں تفرقات کا بیج نہیں بویا تھا۔بچے... بلاامتیاز ایک دوسرے کے گھروں میں جاتے اور محبتیں وصولتے۔ علی،رمیش،اشوک،نہال سنگھ اور کرن سنگھ کی دوستی بھی بچپن سے قائم تھی۔وہ مولوی عبداللہ کے دھیمے لہجے سے بہت متاثر تھے اور کسی پروانے کی طرح ان کے گرد منڈلایا کرتے تھے۔نبیل اور علی بھی بہت مان اور محبت سے ان کے گھر چلے جایا کرتے۔ لالہ چندی مل کے ہاں بننے والے دیوالی کے لڈوؤں کی مٹھاس زبان پر سارا سال مچلتی۔

علی ایک تخیل پرست انسان تھا۔کم عمری ہی سے اسے موسموں کی رعنائیاں اور فطری مناظر بے خود کر دیا کرتے تھے۔شیر پور پر اترنے والا ہر موسم اپنی مثال آپ تھا۔کہر آلود جاڑے میں کھیتوں پر چھائی دھند کی چادر میں کھو کر ایک دوسرے کو ڈھونڈنے کا مشغلہ انہیں بہت بھاتا تھا۔ زندگی کیف و سرور سے گندھی تھی۔

لیکن اب..... اب تو ہر سو اداسی کا موسم غالب تھا۔نبیل کی عدم موجودگی اس کے دل میں کسک بن کر اسے بے تاب رکھتی۔ دیگر دوست اس کی ان کیفیات سے بخوبی واقف تھے۔ اس روز اشوک کے صبر کا یارا نہ رہا تو وہ بے اختیار شکوہ کر بیٹھا۔

"نبیل کے جانے سے ہم بھی اداس ہیں مگر تُو نے تو بالکل ہی جوگ لے لیا ہے۔"

"تو اور کیا؟ اس کی حالت دیکھ کر گاؤں کے باہر دھونی رما کے بیٹھا سنت بابا یاد آنے لگتا ہے۔" نہال سنگھ کلس کر بولا۔"ہم تیرے کچھ نہیں لگتے کیا؟ نبیل تیرا سگا ویر تھا لیکن ہمارا بھی کوئی ادھیکار ہے تجھ پر۔"

"اگر ہم سے ملنا نہیں چاہتا تو کہہ دے کہ مت آیا کرو میرے پاس..... یوں خاموشی اور بے نیازی دکھا کر ہماری دوستی کی تذلیل نہ کیا کر علی میاں!" کرن سنگھ اداسی سے گویا ہوا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے یارو! میری پڑھائی بہت مشکل ہو چلی ہے نا۔اس لیے ذرا الجھا ہوا رہتا ہوں مگر تم لوگ خفا مت ہو۔ہم سب اس گرمیوں میں خوب دھمال کریں گے۔" اس نے خلوص سے کہا۔

"ہم تیری پڑھائی میں بالکل اڑچن نہیں ڈالتے۔ ہمیں کیا جانکاری نہیں کہ مولوی جی نے کتنے سپنے سجا رکھے ہیں تم دونوں بھائیوں کے لیے....." رمیش نے سنجیدگی سے گفتگو میں پہلی بار حصہ لیا۔"ہم تو بس یہ چاہتے ہیں کہ پڑھائی تیرے لیے بوجھ نہ بنے اور تو کچھ سمے کے لیے تازہ دم بھی ہو جایا کرے۔"

"تم لوگوں کی دوستی تو میرا مان رہی ہے ہمیشہ۔انجانے میں اگر میری وجہ سے دل دکھا ہو تو مجھے معاف کر دینا۔" وہ اداس ہو گیا۔

"تیرے کان کے نیچے دوں گا ایک میں..... یاری دوستی میں کیسی معافی تلافی؟" نہال مصنوعی غصے سے بولا۔ وہ حقیقتاً اس سے بہت محبت کرتے تھے۔

☆☆☆

پڑھائی کے لیے اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا تھا اور وہ نبیل کے پاس جانے کے لیے شدید بے تاب تھا۔عبداللہ نے بھی اس کی راہنمائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رکھا تھا۔

لیکن..... ایک مقام ایسا بھی تھا جہاں وہ خود کو قدرے کمزور تصور کرتے تھے..... اور وہ مقام تھا..... انگریزی زبان۔

استاد کی کوئی بھی کمزوری متعلم کے لیے بہت مہلک ثابت ہوا کرتی ہے۔اس لیے وہ علی میں بھی یہ کمزوری منتقل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ پہلے تو نبیل اس سے "سینئر" ہونے کی بدولت اس مضمون میں بھرپور اعانت کر دیا کرتا تھا لیکن اب یہیں اصل امتحان درپیش تھا کہ نبیل اپنی نئی منزل کی جانب اڑان بھر چکا تھا اور علی کی قوتِ پرواز میں تا حال وہ "دم" پیدا نہ ہوا تھا۔

اضطراب بڑھنے لگا تھا۔ جماعت میں اس کی خاموشی اور بے چینی بھی کسی سے پوشیدہ نہیں تھی۔اس روز وہ برگد کے درخت تلے اپنی کتابیں کھولے، کچی زمین پر تنکے سے بے معنی لکیریں کھینچ رہا تھا جب پرویز عالم چپکے سے اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

"کیا بات ہے علی؟ کچھ الجھے ہوئے دکھائی دیتے ہو۔"

"امتحان کے متعلق سوچ رہا تھا۔" وہ گہری سانس لے کر بولا۔

"سوچنے کی کیا بات ہے بھلا؟ ہم کوئی پہلی مرتبہ تو

امتحان نہیں دے رہے۔'' پرویز بے پروائی سے کہنے لگا۔ وہ اس جماعت کا ہوشیار ترین لڑکا تھا اس لیے یہ بے نیازی اس کا خاصہ تھی۔

''پہلی مرتبہ تو واقعی نہیں دے رہے..... لیکن مجھے اس بار کچھ مسائل درپیش ہیں۔ بس اسی وجہ سے الجھن میں ہوں۔ بس یوں سمجھو کہ انگریزی سے مجھے ایک جنگ درپیش ہے۔''

''میں تمہاری کوئی مدد کرسکوں تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔''

''تمہاری انگریزی تو بہت اچھی ہے یار! بالکل نبیل بھائی کے جیسی۔''

''میں اپنے ابا جان سے روزانہ دو گھنٹے پڑھتا ہوں۔ اگر تم چاہو تو ہم ساتھ ہی پڑھ لیا کریں گے۔''

''اگر ایسا ہو جائے تو مجھے اور کیا چاہیے؟'' وہ یکدم... پُرجوش ہوگیا۔ ''میں اپنے بابا جان سے اجازت لے کر آج ہی تمہیں اطلاع دیتا ہوں۔''

''میں منتظر رہوں گا۔'' پرویز خیر مقدمی مسکراہٹ اچھالتا ہوا واپس چل دیا۔

علی نے گھر پہنچتے ہی اس پیشکش سے والدین کو آگاہ کر دیا۔ اس کی توقع کے برعکس عبداللہ کچھ خاموش سے ہو گئے تھے۔ خاموشی کے اس وقفے میں اسے اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا محسوس ہو رہا تھا۔

''تبریز عالم کے سوا کسی اور سے پڑھنے کی راہ نہیں نکل سکتی کیا؟'' وہ سنجیدگی سے بولے۔

''اگر اور کوئی راہ ہوتی بابا جان تو میں اس کی مسافت اختیار کر چکا ہوتا۔''

''اس کے اسکول کے استاد صاحب سے بات کر کے دیکھیے..... اگر وہ زائد وقت دے دیا کریں۔'' عالیہ نے مجازی خدا کو ادب سے مشورہ دیا۔

''ان کے لیے بھی ممکن نہیں یہ.....'' عبداللہ ان کی مصروفیات سے بھی آگاہ تھے۔ ''وہ روزانہ کئی میل سفر کر کے شیر پور آتے ہیں پڑھانے۔ یہاں زائد وقت کے لیے رکنا ان کے اختیار میں ہی نہیں۔''

''تو پھر تبریز عالم کے پاس بھیجنے میں کیا مضائقہ ہے؟'' عالیہ سے اپنی اولاد کی اداسی دیکھی نہ جا رہی تھی۔

''اس کی ذات سے منسوب داستانوں سے تم خوب واقف ہو پھر بھی یہ سوال.....'' وہ خشمگیں انداز سے بولے۔

''بھروسا رکھیں مولوی جی!..... ہماری تربیت کے رنگ اتنے کچے تو نہیں کہ اس قدر آسانی سے مُدھل جائیں گے۔''

''ہوں..... ٹھیک ہے بیٹا! آپ چلے جایا کرنا وہاں کچھ دیر..... لیکن مجھ سے ایک وعدہ بھی کرنا ہوگا۔'' وہ علی سے مخاطب ہوئے۔

''جی بابا جان!..... میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

''پرویز کے گھر کا ماحول آپ اپنی ذات کے کسی بھی پہلو پر اثر انداز نہیں ہونے دیں گے۔''

''ٹھیک ہے بابا جان! میں آپ کو کسی بھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔'' اس نے سر جھکا کر کہا۔

''جیتے رہو۔'' وہ مطالعے کی غرض سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

علی خوشی خوشی یہ اطلاع پرویز کو دینے چل دیا۔ وہ شیر پور کے سنجیدہ طبع افراد کی تبریز عالم کے خاندان سے وابستہ سوچ سے سرسری طور پر واقف تھا۔ آکسفورڈ سے تعلیم یافتہ تبریز مذہبی معاملات سے کوسوں دور تھا۔ اس ''روشن خیال'' گھرانے سے وابستہ دیگر کہانیوں کی گہرائی اس نے اپنی بے نیاز طبیعت کے باعث کبھی ماپی ہی نہ تھی۔

پرویز کے گھر میں اس کی خوب آؤ بھگت ہوئی تھی۔ مولوی عبداللہ کا سپوت ہونے کی وجہ سے وہ وہاں مرکزِ نگاہ بن چکا تھا۔

''بھئی کیا کہنے! آج تو بہت اعلیٰ مرتبت ہستیاں ہمیں ملنے آئی ہیں۔'' تبریز نے ذومعنی انداز میں کہا۔

''علی بھی میرے ساتھ آپ سے انگریزی سیکھے گا ابا جان۔ یہ اسی سال مڈل کا امتحان دینا چاہتا ہے۔'' پرویز نے اس کی آمد کا مدعا بیان کیا۔

''لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے..... یہ تمہاری جماعت میں تو نہیں پڑھتا تھا۔''

''جی چچا جان! میں نے اس سال دو جماعتوں کے امتحان دینے ہیں۔'' علی نے اعتماد سے کہا۔

''اس فیصلے کی کوئی خاص وجہ؟''

''جی! میں جلد از جلد محمد آباد کے ہائی اسکول میں داخلہ لینا چاہتا ہوں۔''

''رستہ آسان نہیں ہوگا..... بتائے دیتا ہوں۔''

''کوئی مضائقہ نہیں..... ہر مشکل کے بعد آسانی ہے..... یہ وعدہ میرے رب نے کیا ہے۔''

''ہاں بھئی! مولوی عبداللہ کے صاحبزادے ہو آخر۔ تم سے باتوں میں کون جیتے؟''

''آپ میرے استاد ہیں چچا جان!..... آپ سے ہار اور جیت کی گستاخی کی تاب مجھ میں کہاں؟''

''بہت خوب! تمہیں پڑھا کے مجھے واقعی لطف آئے گا۔'' تبریز عالم مسکرائے۔

''پروردگار مجھے آپ کی توقعات پر پورا اترنے کی استطاعت نصیب فرمائے۔''

☆☆☆

پرویز اور علی کی مشترکہ تعلیم کے سلسلے کا آغاز اسی دن سے ہو گیا تھا۔ تبریز عالم کی انگریزی تعلیم میں مہارت... لاجواب تھی اور وہ اپنا تمام تر علم بڑے مشاق انداز میں دھیرے دھیرے ان دونوں میں منتقل کر رہے تھے۔ ان کی بڑی سی حویلی کی شان و شوکت بھی نرالی تھی۔ اپنے دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ وہ بڑے ٹھاٹ سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کی اولاد میں بس پرویز اور رعنا ہی تھے۔ پرویز نے اس سال مڈل کا امتحان دینا تھا اور رعنا محمد آباد کے ایک انگریزی تعلیمی ادارے کی طالبہ تھی۔ وہ پرویز سے صرف سال بھر ہی بڑی تھی۔

گرمیوں کی چھٹیاں ہوتے ہی نبیل سب سے ملنے چلا آیا۔ اس کی سنجیدگی و متانت میں کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔ بھوری آنکھوں میں اک گہری سوچ اور بے چینی عیاں رہنے لگی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب ایک شاعر کے دیکھے گئے خواب کی بازگشت ہر ذی شعور مسلمان کے دل کی صدا بن گئی تھی۔ خاموشی اور بے بسی کو بالائے طاق رکھے چند دردمندانِ ملت نے علیحدگی کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔ سرفروشوں کا قافلہ اپنے راہنماؤں کی آواز پر لبیک کہتا خونِ جگر سے آزادی کی ایک داستان رقم کرنے چلا تھا۔

اپنی شناخت اور شخصی وقار کے حصول کی اس جنگ نے حاکم اور محکوم کو ایک نئی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ ماضی کے برعکس یہ جنگ توپ و تفنگ کے بل پر نہیں لڑی جا رہی تھی۔ اس انوکھی جنگ کے ہتھیار تو ذہانت، علم اور یقینِ محکم تھے۔ جسمانی طور پر ایک دھان پان سے مردِ مجاہد نے اپنی خداداد ذہانت کے بل بوتے پر غاصبین کے قلعوں میں نقب لگا دی تھی۔ وہ ایک ایسا سپہ سالار تھا جسے اپنی فوج میں محض تعلیم یافتہ نوجوان درکار تھے۔ اس کے جانثار سپاہی اپنے سپہ سالار کا پیغام ہر تعلیمی ادارے میں پہنچانے لگے۔ شمع در شمع جلنے لگیں۔ دلوں میں سلگتے آزادی کے جذبے کی روک اب کہیں بھی ممکن نہ تھی۔ آتشِ طلب بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

نبیل نے بھی اپنے اساتذہ اور ساتھی طلبہ کے زیرِ اثر اس ''وادیِ عشق'' میں قدم رکھ دیے۔ شیر پور جیسے دور دراز اور مضافاتی گاؤں میں ''انقلاب'' دبے پاؤں در آیا تھا۔ نبیل کے دل میں روشن اس آتشِ عشق کی حدت سب سے پہلے اس کے اہلِ خانہ تک پہنچی تھی۔

اس کے گم صم رویے اور ہمہ وقت سوچتی نگاہوں نے عالیہ کو اس کے اندرونی اضطراب سے باخبر کیا۔ اس شام بھی وہ کچھ الجھا ہوا سا دکھائی دے رہا تھا۔ انہوں نے بیٹے کے سر پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے استفسار کیا۔

''کیا بات ہے میرے چاند؟ کس سوچ میں غرق ہو؟''

''وقت کے اس سمندر تلے ایک طوفان کروٹ لیتا نظر آتا ہے اماں! جانے کیوں ایسا لگتا ہے کہ زندگی میں بہت بڑی تبدیلی آنے والی ہے۔''

''زندگی تبدیلیوں ہی سے عبارت ہے بیٹا! جمود تو موت کی علامت ہے۔'' عبداللہ بھی وہیں چلے آئے۔

''ہجرت کا حکم کب کب آیا ہے بابا جان؟'' وہ آج کسی حتمی نتیجے پر پہنچنا چاہتا تھا۔

''جب اللہ کی زمین اس کے پیروکاروں کے لیے تنگ ہو جائے اور ان کے ایمان کو خطرات لاحق ہونے لگیں۔''

''تو اس صورت میں ہجرت تو واجب ہو چکی ہم پر۔'' وہ اضطراب سے گویا ہوا۔

''ہاں بیٹا! غلامی کے آداب ہمیں ودیعت کیے ہی نہیں گئے۔ جانے کب ہم ان بندشوں سے آزاد ہوں گے؟''

''بہت جلد..... وہ وقت اب بہت جلد آتا دکھائی دیتا ہے۔ آپ نے علی کو تبریز چچا کے یہاں بھیجنے کا بہت اچھا فیصلہ کیا۔ اس وقت ہماری قوم کو تعلیم کے ہتھیاروں سے لیس نوجوان لہو درکار ہے..... اور محفوظ نہتا نہیں رہنا چاہیے۔'' اس پر ایک وجد کی کیفیت طاری تھی۔

''تمہاری تعلیم کی کیا صورتِ حال ہے بیٹا؟'' عالیہ نے اس کا ذہنی ارتکاز بدلنے کی کوشش کی۔

''بہتر سے بہترین کی جانب گامزن ہوں۔'' اس کا اعتماد دیدنی تھا۔

''اپنے ذہن کو کسی بھی قسم کی الجھن سے مبرّا رکھو! سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ انہیں شاید سمجھا ہی نہ پا رہا تھا کہ وہ الجھن میں نہیں بلکہ ایک بہت بڑی حقیقت سے دوچار ہو چکا ہے۔ ایک انوکھے جذبے سے سرشاری نے اس کی اڑان کا رخ بدل دیا تھا۔ زندگی اب انفرادی مفاد کے بجائے ایک وسیع تر اجتماعی مفاد سے وابستہ ہو گئی تھی۔

☆☆☆

والدین ہی کی طرح علی بھی بڑے بھائی کے اس رویے کی گہرائی جان نہ پایا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر محض نبیل کے پاس جانے کا سودا سمایا تھا۔ تبریز عالم سے پڑھائی میں بھی اس نے کوئی کوتاہی نہ برتی تھی لہٰذا وہ بھی بہتر سے بہترین کی جانب گامزن تھا۔

گرمیوں کی چھٹیاں ہوتے ہی رعنا بھی محمد آباد سے آگئی تھی۔ تبریز عالم کا گھرانا خاصا روشن خیال تھا۔ خواتین میں پردے کا کوئی تردد نہیں کیا جاتا تھا۔ پرویز اور علی کے نظام الاوقات میں رعنا بہت دھڑلے سے اپنی کتابیں لیے وہیں آجاتی۔ تبریز جب ان دونوں کو انگریزی کے بنیادی کلیے سمجھاتے تو وہ بھی گاہے بگاہے لقمے دینے لگتی۔ اس کی قابلیت و ذہانت میں بھی کوئی دورائے نہ تھی۔ اس لیے ان پر اپنی تعلیمی برتری کی خوب دھونس جماتی۔

علی ان دونوں بھائی بہن سے کم عمر تھا لیکن اپنے قد کاٹھ اور مضبوط جسامت کے باعث بڑا لگتا تھا۔ رعنا تو اس کے شانوں تک بمشکل آپاتی تھی۔ اس کی موجودگی میں وہ بہت بے آرامی محسوس کرتا تھا۔ کسی بھی لڑکی کے ساتھ یوں دو بدو بیٹھ کر پڑھائی اس کے لیے ایک انوکھا تجربہ تھی۔

اور لڑکی بھی کون بھلا؟ ..... رعنا تبریز عالم۔ جس کی خوبصورتی و نزاکت کے چرچے تو اب شیر پور کی حدود بھی پار کر چکے تھے۔ پرویز کی زبانی اسے کئی بار علم ہوا تھا کہ دوسرے گاؤں سے اس کے کئی بار شادی کے پیغامات آئے تھے تاہم تبریز اسے دورانِ پڑھائی کسی بھی بندھن میں باندھنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اپنے دونوں بچوں کو مستقبل میں بیرونِ ملک بھیجنے کے خواہشمند تھے۔

رعنا کی موجودگی میں محسوس ہونے والی انوکھی لذت آمیز سنسنی اسے غائب دماغ بنا دیا کرتی تھی۔ اس روز بھی اس کا لاشعور دباؤ کا شکار تھا اور چند غلطیاں بار بار دہرا رہا تھا۔ وہ اس کی کیفیت اور "نالائقی" سے خاصی محظوظ ہو رہی تھی۔ کچھ لمحوں بعد تھکے چتون لیے والد سے کہنے لگی۔

"آپ تو بہت تعریفیں کرتے تھے اس کی..... لیکن یہ تو مجھے قدرے غبی سا معلوم ہوتا ہے۔"

"نہیں! غبی تو خیر علی بالکل بھی نہیں ہے..... اس وقت یہ شاید کسی الجھن میں ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ورنہ ذہانت تو مولوی عبداللہ کی خاندانی میراث رہی ہے۔"

"جی! بس سر ذرا سا بھاری ہو رہا ہے۔" علی نے فوری بات بنائی۔

"ہونہہ! ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا....." رعنا نے اپنی لکھنؤ کی رہائشی والدہ سے سیکھی ہوئی اردو کا رعب جھاڑتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو لگتا ہے انگریزی ان کی سمجھ سے کوسوں دور ہے..... اس لیے ان پر وقت ضائع نہ ہی کیجیے۔"

"سب سے بڑی رکاوٹ تو آپ خود ہیں ہماری پڑھائی میں آپا!" پرویز نے لب کشائی کی۔

"لو خوامخواہ بھلا!" رعنا نے تنک کر کہا۔

"جی ہاں! ہم مانے لیتے ہیں کہ آپ ہم سے کہیں زیادہ ذہین اور "باعلم" ہیں..... اس لیے ہماری بے چارگی پر ترس کھایئے اور ہمیں بار بار ٹوکنا چھوڑ دیجیے۔" وہ آج تمام ادھار چکتا کر دینا چاہتا تھا۔

چھوٹے بھائی کی یہ صاف گوئی اس کی طبع نازک پر بہت ناگوار گزری اور وہ تن فن کرتی وہاں سے چلی گئی۔

علی کو اس کا یوں چلے جانا کچھ اداس کر گیا۔ جانے کیوں وہ اس کی اپنے آس پاس موجودگی کا "عادی" ہونے لگا تھا... نامحسوس طریقے سے اس کی زندگی میں بھی ایک تبدیلی در آئی تھی۔ نبیل کے علاوہ وہ اب رعنا کی قابلیت "سر کرنا" چاہتا تھا۔ ایک صنفِ نازک کی یہ معمولی سی برتری بھی اس کی "انا" کے لیے بارِ گراں تھی۔ اس نئے مقصد میں کامیابی کے لیے اس نے پہلے سے کہیں زیادہ سنجیدگی اختیار کر کے خود کو ان متلاطم موجوں کے سپرد کر دیا۔

رعنا سے اگلی ملاقات سرما میں ہوئی تھی۔ وہ اپنی والدہ کی عیادت کرنے چند دن کے لیے شیر پور آئی تھی اور آتے ہی ان دونوں کی کھنچائی کا اپنا محبوب مشغلہ اپنا لیا تھا۔ تختۂ مشق اس بار بھی زیادہ تر علی ہی بنا تھا۔ پرویز بڑی بہن کے احترام میں جز بز رہتا لیکن اسے یوں اپنے دوست کی ہرزہ سرائی بہت ناگوار گزرتی۔ اس مختصر وقت میں وہ دونوں بہت قریبی دوست بن چکے تھے۔

پڑھائی کی روزانہ مشقوں نے علی کو بہت اعتماد بخشا تھا۔ اس بار وہ رعنا کو اس کے مقصد میں قطعی کامیاب نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ وہ تبریز عالم کے پوچھے گئے ہر سوال اور تفویض کردہ ہر کام کا بہترین نتیجہ دیتا۔ رعنا نے دو ہی دن میں اس کی قابلیت تسلیم کر لی اور برملا اظہار بھی کرنے لگی۔

"آپ کا یہ نیا شاگرد تو بہت ہونہار ثابت ہونے لگا ہے ابا جان!"

"بھئی بٹیا رانی! ہم نے تو آپ سے تب بھی کہا تھا۔ علی میاں کی ذہانت کے ہم معترف ہیں۔"

"لیکن اتنی جلد اس زبان پر دسترس نے تو مجھے بھی

حیران کر دیا۔ کیسے کیا بھئی یہ سب آپ نے؟" وہ براہِ راست علی سے مخاطب ہوئی تو پل بھر میں اس کے بدن میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔

"صرف ایک بنیادی نکتے کی مدد سے....." وہ دھیرے سے بولا۔ تینوں نفوس اسے اپنی مشتاق نگاہوں کی زد میں لیے ہوئے تھے۔ "میں نے اپنے خوف اور گھبراہٹ پر خود کو ایک ہی بات سمجھا کر قابو پایا..... اگر انگریزی سیکھنے سے ڈرتا رہا تو ہمیشہ کے لیے کمزوری کا شکار ہو کر اس کا غلام بن جاؤں گا..... اور اگر اپنے خوف پر غالب رہوں گا تو پھر یہ زبان میری غلام ہو گی..... میں اسے جب چاہوں اور جس طرح چاہوں، برتوں گا۔"

"بہت خوب! پڑھائی کے لیے آپ کی سنجیدگی قابلِ ستائش ہے۔" وہ اس کے جذبات سے کافی متاثر ہوئی تھی۔

علی کا چہرہ اور کان کی لویں سرخ ہو گئیں۔ رعنا کی یہ توجہ اور توصیف اسے بہت اچھی لگی تھی۔ اس کی رنگت میں گھلی گلابیاں اور گھور سیاہ آنکھوں میں چمکتے جگنو اس کے دل میں عجیب میٹھا میٹھا سا درد جگاتے تھے، حواس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگتی، حلق خشک ہو جاتا اور ذہن میں سنسنی سی بیدار ہو جاتی۔

رعنا کی غیر موجودگی میں وہ اپنی ان کیفیات کا اکثر تجزیہ کرتا لیکن اپنے محسوسات کو کوئی بھی پیرہن عطا کرنے سے قاصر رہتا..... وہ ایک ازلی جبلی کشش کا شکار ہو رہا تھا مگر اس کی نوعیت سے بے خبر تھا۔ لاعلمی کی اس نعمت سے مستفید ہوتا وہ بھائی سے کیے ہوئے عہد کی تکمیل کے بہت قریب آچکا تھا۔

منزل اب چند ہی قدم دور تھی۔ جذبے مزید مہمیز ہو چلے تھے۔

☆☆☆

مڈل کے امتحانات ہونے تک اس نے بھی اپنا حفظ مکمل کر لیا تھا۔ مولوی عبداللہ اور عالیہ کے آنگن میں ایک بار پھر سے بہاریں لوٹ آئیں۔ خصوصی شکرانہ کی ادائیگی کے بعد انہوں نے گاؤں بھر میں شیرینی بانٹی تھی۔

عبداللہ نے تبریز عالم کے لیے جالی دار سرپوش سے ڈھکی پلیٹوں میں شیرینی کے ساتھ گز سے بنے میٹھے چاول علیحدہ سے نکال رکھے تھے۔ اپنے بیٹے کی کامیابی کی خوشی میں وہ یہ تحفہ بنفسِ نفیس انہیں پیش کرنا چاہتے تھے۔ مولی مالک کر بظاہر ان کی خوب آؤ بھگت ہوئی تھی لیکن کہیں میں پنہاں تکلفات اور آنکھوں میں ایک سرد مہری [illegible]

کر سکتا تھا۔ یہ صورتِ حال اس کے ذہن میں کئی سوالات پیدا کر رہی تھی جس کا سر دست کوئی جواب اسے میسر نہ تھا اور خاموشی اختیار کیے بنا کوئی چارہ نہ تھا۔

گھر واپسی کے بعد بھی وہ بہت خاموش اور بے کل تھے۔ عالیہ نے ہی بالآخر ان سے استفسار کیا۔

"کیسے تھے سب حویلی میں؟"

"ویسے ہی، جیسے ہمیشہ سے ہوا کرتے ہیں۔" عبداللہ نے دانستہ ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

"تبدیلی تو اس کائنات کا خمیر قرار پائی ہے، مگر جانے کیوں وہاں سب اس اصول سے تاحال مبرا ہیں؟"

"جب بشر قدرت کی طرف سے ملتی ڈھیل پر بھی اپنے اعمال کی درستگی کی جانب توجہ نہ دے تو وقت بڑی بے رحمی سے اسے اپنی ٹھوکروں میں رکھ کر بھولے بسرے اسباق یاد دلایا کرتا ہے۔ دعا گو رہنا کہ ان سب پر ایسی کوئی نوبت کبھی نہ آئے۔"

"میں تو ہمیشہ ہی انہیں دعاؤں میں یاد رکھتی ہوں۔" عالیہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"رب بھلی کرے گا۔" عبداللہ نے آنکھوں پر بازو رکھ کر کروٹ بدل لی۔

علی کو اس مبہم گفتگو نے مزید الجھا دیا تھا۔ وہ کچھ دیر تو یونہی بیٹھا رہا پھر اپنے یار بیلیوں سے ملنے چل دیا۔ ان سب نے فصلو کے باغ میں ملنے کا منصوبہ تیار کر رکھا تھا۔ درختوں کی شاخوں پر جھولتے اور سب سے اونچی ٹہنی کا پھل توڑنے کی شرطیں لگاتے وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چلے تھے لیکن علی کے دل میں ایک کسک اب بھی اسے مضطرب کر رہی تھی۔

عصر کی نماز کے بعد وہ کھیتوں کی... منظر پر خاموشی سے جا بیٹھا اور ڈوبتے سورج کی کرنوں کو خالی الذہنی کے عالم میں دیکھنے لگا۔ کئی پل خاموشی سے سرک گئے۔ اسے یکدم اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا حساس ہوا۔ کندھے پر ایک مانوس لمس نے صبح سے دل پر چھائی اداسی ایک لمحے میں کسی سیاہی چوس کاغذ کی طرح جذب کر لی۔

نبیل عبداللہ اپنے بھائی کی کامیابی پر اس سے ملنے آن پہنچا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر اسے اپنی بانہوں میں بھینچے کھڑا رہا۔ ان گزرے چند ماہ میں نبیل کا قد کاٹھ بھرپور ہو چلا تھا۔ وہ اپنے مضبوط ہاتھوں سے اسے تھپکتے ہوئے بولا۔

"تو میرے منھو نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔"

"آپ کے لیے تو میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔" اس نے مسکراتی آنکھوں سے کہا۔

"اب منزل مزید کٹھن ہوتی جائے گی..... ہمت تو نہ ہاروگے؟"

"آپ ساتھ ہوں گے تو پھر کاہے کی فکر؟ میری ہمت تو آپ ہیں۔"

وہ دونوں چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے گھر کی جانب چل دیے۔

نبیل وقت کے کسی بھی زیاں کا قائل نہ تھا۔ اس نے دو دن بعد ہی عبداللہ سے ..... علی کے داخلے کے لیے اصرار شروع کر دیا تھا جس پر فی الفور عمل کر دیا گیا۔ علی یہاں آمد کے بعد بہت خوش تھا۔ ہاسٹل میں رہائش نے کچھ مسائل پیدا کیے تھے لیکن اسے نبیل کی موجودگی سے بہت تقویت ملتی تھی۔

محمد آباد کے اس اسکول کے بالمقابل ایک انگریزی اسکول بھی قائم تھا جہاں گورا صاحب کی مکمل راجدھانی قائم تھی۔ اس اسکول کا برطانوی طرزِ تعلیم جدیدیت کے دلدادہ مقامی افراد کو بہت پسند تھا۔ تبریز عالم نے رعنا کے بعد پرویز کو بھی وہیں بھیج دیا۔ وہ دونوں ہاسٹل کے بجائے اپنی رشتے کی ایک خالہ کے گھر رہتے تھے۔ رعنا کی بے باک فطرت میں والدین کے لاڈ پیار اور آزادی کے علاوہ اس ادارے کی تربیت کا بھی بہت عمل دخل تھا..... اور اب پرویز نے بھی وہی ڈگر اختیار کر لی تھی۔

علی کے لیے ان دونوں کی وہاں موجودگی بہت خوش کن تھی۔ فارغ اوقات میں پرویز سے گپ شپ اسے بہت تازہ دم کر دیتی تھی۔ وہ اس کے اصرار پر کئی بار اس کی خالہ کے یہاں جا چکا تھا جہاں رعنا سے ملاقات اور گفتگو اسے انہی ناقابلِ فہم کیفیات سے دو چار کر دیتی۔ رعنا کو بھی یہ سادہ لوح، شرمیلا سا لڑکا بہت اچھا لگنے لگا تھا۔ عمروں میں دو سال کے تفاوت کے باوجود علی عبداللہ کا مہذب اندازِ گفتگو اور موجودگی اس کے دل و دماغ پر غلبہ پانے لگے۔ رعنا تبریز عالم اب لاشعوری طور پر علی عبداللہ کی آمد کی منتظر رہتی تھی.....

اپنے جذبات میں امڈنے والے اس ہیجان کی توجیہات سے وہ دونوں ہی انجان تھے۔ انہیں علم ہی نہ تھا کہ ان کے قلب پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو رہی ہے۔ وہ کائنات کے اس انوکھے جذبے کا شکار ہو چکے تھے جو بیک وقت قابلِ تعظیم اور قابلِ نفرین قرار پایا ہے۔

☆☆☆

آج ہاسٹل میں خلافِ معمول چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ نمازِ جمعہ کے بعد اسکول میں ایک خصوصی اجتماع طلب کیا گیا تھا۔ نبیل کی جماعت کے لڑکے اس طلبی سے پُرجوش تھے تو علی کے ہم عمر کسی قدرے الجھن کا شکار۔ وہ اس اچانک بلاوے کے سیاق و سباق ہی سے ناواقف تھے۔ علی سے تجسس برداشت نہ ہو سکا تو اس نے نبیل کو گھیر لیا۔

"ہمیں کیوں بلایا گیا ہے بھائی؟"

"کچھ حقائق اور سچائیوں سے روشناس کروانے کے لیے۔"

"کیسے حقائق اور کیسی سچائیاں؟"

"اب چل تو رہے ہو۔ خود ہی دیکھ لینا۔" نبیل نے مصروف سے انداز میں کہا۔

اسکول کے ہال میں سبھی لڑکے جمع ہو گئے۔ یہ سبھی لڑکے محمد آباد اور مضافاتی دیہاتوں سے یہاں آئے تھے اور سبھی کے پیشِ نظر صرف ایک ہی مقصد تھا..... اپنی روایات سے جڑے رہ کر جدید تعلیم کے ہتھیاروں سے بھی خود کو لیس کر لیا جائے۔

نبیل کی جماعت اور فریق کے سبھی لڑکے داہنی رو میں بیٹھے تھے اور علی کے ہم جماعتوں کو بائیں جانب بٹھایا گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ان کے ہیڈ ماسٹر صاحب اسٹیج پر معمول سے کہیں زیادہ سنجیدگی لیے موجود تھے۔ گلا کھنکھارتے ہوئے انہوں نے گہری متانت سے طلبہ کو مخاطب کیا۔

"فلک پر چمکتے ستاروں سے زمین کی خاک بننے کا کرب ہماری ملی زندگی کا ایک ناسور بن چکا ہے۔ صدیوں تک طمطراق سے حکومت کرنے کے بعد یہ زندگی دینی حمیت کے منافی ہے میرے بچو! ہم جبلی طور پر آزاد قوم ہیں۔ غلامی کی بیڑیاں ہمیں زیب نہیں دیتیں۔

جان لو میرے بچو! کہ ہم غلامی کے لیے پیدا ہی نہیں کیے گئے۔ ہمیں ایک بار پھر فلک کا سب سے چمکدار ستارہ بننا ہے..... اپنا وہ مقام حاصل کرنا ہے جو ہماری کوتاہیوں نے ہم سے چھین لیا ہے۔" انہوں نے ایک طائرانہ نگاہ دائیں جانب سب لڑکوں پر ڈالی جو دم سادھے بیٹھے تھے۔ "ہمارے کچھ راہنماؤں نے جابرین کے سامنے الگ وطن کا اہل مطالبہ پیش کیا ہے..... اور میں اپنے اساتذہ کی اس ٹیم کے ساتھ آپ سب کے روپ میں ان کے لیے ایک سپاہ تیار کرنا چاہتا ہوں..... آپ کے ان "سینئرز" نے ہمارا بہت ساتھ دیا ہے ..... مگر اب اس سال سے ہم نے ایک نیا لائحہ عمل تیار کیا ہے۔"

انہوں نے دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ لڑکوں کے چہروں پر سنسنی اور آنکھوں کی چمک ان کے حالِ دل کی داستان واضح طور پر سنا رہی تھی۔

"ہمارے پاس ایک بہترین ہتھیار موجود ہے لیکن افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ ہم بھی اس کے استعمال سے ناواقف ہیں اور اغیار اس سے خوب مستفید ہو رہے ہیں..... آج انہوں نے اپنی درسگاہوں میں ہماری الہامی کتاب کی تدریس کے ذریعے بہترین طرزِ فکر کے حامل افراد تیار کر لیے ہیں..... اور ہم..... ہم اپنی بقا کی جنگ میں الجھے ہیں۔ اس ہتھیار سے ہی آپ کو اس طرح لیس کرنا ہے کہ آپ سب بہترین شہری بننے کے بعد نئی ریاست کے لیے مثالی منتظم بھی بن سکیں۔"

ان کا تجسس اب حد سے سوا ہو چکا تھا لیکن ہیڈ ماسٹر صاحب کے احترام میں زبان بندی پر مجبور تھے۔

"ہم اپنے اس ادارے میں خصوصی کلاسز کا اجرا کر رہے ہیں جن میں آپ سبھی کو..... خصوصی تعلیم دی جائے گی جس میں آپ سائنسی اندازِ فکر سیکھیں گے..... ہماری الہامی کتاب کا ایک حصہ سائنس ہے..... اس کے علاوہ مستقبل ریاست کے آفاقی اصول کا ذکر الگ ہے ..... مگر ہم ان سب سے لاعلم ہیں....." انہوں نے لمحاتی توقف کے بعد مسکراتے ہوئے سلسلۂ کلام بحال کرتے ہوئے کہا۔ "ایک خوش خبری اور بھی ہے آج میرے پاس..... انٹر کا آغاز بھی انشاء اللہ اگلے تعلیمی سال سے کر دیا جائے گا۔ ہمارا ساتھ ابھی برقرار رہے گا..... اور ہم انشاء اللہ بہت جلد اپنے مقاصد حاصل کر لیں گے۔"

ان کی خطابت اور خوابیدہ لہجے سے وہ اپنے وجود میں ایک ناقابلِ فرحت حرارت محسوس کر رہے تھے۔ جوشِ حدت ستاروں پر کمند ڈالنے کی ہمت پیدا کرنے لگا۔ عجیب سے ولولے نے قلب و روح کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس نئی سرگرمی کے تصور ہی نے ان کے ارادوں میں چٹانی کیفیت پیدا کر دی۔

☆☆☆

ہر گزرتا دن حیرت، افسوس اور تجسس کے ایک نئے جہان سے روشناس کروانے لگا۔

افسوس اس امر پر کہ وہ صدیوں سے اپنے پاس امانت کی طرح محفوظ اس تحفے کی افادیت سے کیونکر محروم تھے؟ حیرت تو یہ تھی کہ صدیوں ہی کی مسافت کے بعد اس تحفے کی تازگی میں رتی بھر بھی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔

تھوڑا وقت اور گزرا تو انہیں آزادی کی قدر و قیمت کا احساس دلانے کے لیے ارد گرد ہونے والے جلسے جلوسوں میں شرکت کے لیے بھیجا جانے لگا۔ علی کے لیے یہ سب بالکل انوکھا تھا۔ جلسوں میں ہونے والی گفتگو سن کر اس کے ذہن میں بہت سے سوالات ابھرتے تھے۔ جنہیں بالآخر اس نے نبیل کے گوش گزار دیا۔

"یہ سب کیا ہے بھائی؟"

"ہماری نجات اور فلاح کا واحد اور قابلِ عمل ذریعہ ہے..... اور بس۔"

"لیکن علیحدگی کی باتیں بہت زیادہ ہونے لگی ہیں اب تو۔"

"اب نہیں..... بہت عرصے سے ہو رہی ہیں..... بس چنیدہ افراد ہی لاعلم ہوں گے۔ اب تو منزل نزدیک آتی دکھائی دے رہی ہے۔" نبیل کی آنکھیں آنچ دے رہی تھیں۔

"لیکن ان سب کی ضرورت ہی کیا ہے بھائی؟"

"ضرورت کیوں نہیں ہے؟ ذرا سمجھاؤ گے مجھے؟"

"اب دیکھیں نا بھائی! ہم سب کتنے اتفاق سے رہتے آ رہے ہیں شیر پور میں۔ کرن، نہال، اشوک، رمیش، آپ اور میں..... اور ہماری کتنی دوستی ہے..... ایک دوسرے کے گھر آنا جانا ہے۔ ہمارے والدین میں اتنی محبت ہے..... تو کیا ہم سب علیحدہ ہو جائیں گے؟" وہ افسردگی سے بولا۔

"میں بالکل تسلیم کرتا ہوں کہ ہماری بہت دوستی ہے..... لیکن کیا وہ ہمیں اپنے گھر کے برتنوں میں کھانا کھلاتے ہیں؟"

علی کا سر بے اختیار نفی میں ہل گیا۔

"کیا ہم ان کے عقائد اپنا سکتے ہیں؟ ان کے خاندان میں کوئی رشتے داری طے کر سکتے ہیں؟"

علی کے پاس اس بار بھی خاموشی کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔

"ہم تو ان کے تعلیمی اداروں میں پڑھ ہی نہیں سکتے مٹھو! ساری زندگی ساتھ گزارنے کے اثرات سے کیسے فرار حاصل کر پائیں گے؟" نبیل نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "مجھے ہمارے دوستوں کی نیت پر بھی کوئی شبہ نہیں مگر زندگی صرف شیر پور تک ہی محدود نہیں ہے۔ ہم تو خوش قسمت ہیں کہ ہمیں مخلص افراد ملے ہیں۔ انہوں نے ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچایا..... کبھی یہاں کے دیگر طلبہ سے ان کا احوال سننا۔ ہر فرد داستان ہزار رنگ ہے۔ یہ علیحدگی تو ناگزیر ہے۔ پہلے ہی بہت تاخیر ہو چکی..... یہ بیداری تو ایک مدت قبل درکار تھی۔"

"لیکن ہم اس نعمت سے تو پھر بھی محروم ہی رہیں گے۔ مسلم اکثریتی علاقے علیحدہ کیے جائیں گے۔ اس لحاظ سے شیر پور تو کسی صورت بھی اس تبدیلی کی زد میں نہیں آئے

گا۔'' علی نے ایک منطقی توجیہہ پیش کی۔ ''ہم تو اس وقت بھی اسی صورتِ حال میں مقید ہوں گے جہاں آج ہیں۔''

''یہ سب تحفظات میرے ذہن میں بھی موجود رہے ہیں..... اور ہم اس کا کوئی نہ کوئی بہتر حل تلاشیں گے۔'' نبیل پرامید تھا۔

☆☆☆

وقت کا رتھ دلکی چال چل رہا تھا۔ مصروفیت دو چند ہونے کے باعث علی کئی ہفتے پرویز سے ملنے کی فرصت بھی نہیں نکال پاتا تھا۔ پرویز کا خیال آتے ہی رعنا کا تصور بھی ذہن میں چھم سے جلوہ گر ہو جاتا۔ اس طویل غیر حاضری کے دوران اس کی یاد دل و دماغ پر بہت شدت سے قابض رہی تھی۔ اب وہ شیر پور کا نا سمجھ علی نہ رہا تھا، جواب بھی اپنی ان کیفیات کو سمجھ ہی نہ پاتا..... خود سے لڑتے جھگڑتے اس نے بالآخر اپنے جذبات سے نظریں چرانی چھوڑ دی تھیں۔

جب ضبط کا بالکل بھی یارا نہ رہا تو سنیچر کی سہ پہر پرویز سے ملنے چل دیا۔ ان کی خالہ بھی اس سے کافی مانوس تھیں۔ اس کے شائستہ اطوار، فراخ پیشانی اور جھکی ہوئی نظروں نے انہیں اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

چوبی پھاٹک پر دربان سے علیک سلیک کرتا وہ ایک سرسبز باغیچے میں پہنچا تھا۔ باغیچے کے اختتام پر موجود برآمدے میں جانے والی سیڑھیوں پر ہی اسے رعنا بیٹھی نظر آ گئی۔ وہ دایاں ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھے خلا میں کسی نادیدہ نقطے کو تک رہی تھی۔ چہرے پر چھائی مردنی و بیزاری عیاں تھی۔

وہ دبے قدموں چلتا اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور ہولے سے کھنکھار کر بولا۔

''السلام علیکم جی!''

''جی فرمایئے! کیسے آنا ہوا؟'' اس کے روکھے انداز پر علی بھونچکا رہ گیا۔

''مم..... میں علی ہوں جی!'' اس نے ہونق پن سے کہا۔

''جانتی ہوں میں..... یہاں آنے کا مقصد؟'' اس کی بے رخی میں کوئی فرق نہ آیا۔

''مجھے پرویز سے ملنا ہے۔'' وہ ضبط سے بولا۔

''وہ عقبی باغ میں ابا جان کے ساتھ موجود ہو گا..... وہیں تشریف لے جایئے۔'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

اس کی آنکھوں میں پنہاں وحشت اور بے بسی علی کو بھی واضح طور پر محسوس ہوئی تھی لیکن فی البدیہہ وہ خاموشی اختیار کیے عقبی جانب بڑھ گیا۔

پرویز وہاں تبریز عالم کے ساتھ کسی مباحثے میں مشغول تھا۔ اسے دیکھ کر تبریز کے چہرے پر وہی مخصوص مسکراہٹ در آئی تھی جسے وہ اتنا وقت گزر جانے کے باوجود بھی کوئی عنوان نہ دے پایا تھا۔

''آیئے علی عبداللہ صاحب! آج یہاں کا رستہ کیسے بھول گئے؟''

''بھولا تو نہیں ہوں چچا جان! بس ذرا مصروفیات آڑے آ جاتی تھیں..... ورنہ دوستوں اور محسنوں کو بھلایا تو نہیں جا سکتا نا۔''

''مصروفیت کی بھی خوب کہی بھئی تم نے! یہاں ذہانت کے بل بوتے پر ریلوے، موٹر کار اور بجلی جیسی لازوال چیزیں ایجاد ہو رہی ہیں..... اور وہاں تم لوگوں کو ایک ہی دائرے کا قیدی بنایا جا رہا ہے۔'' ان کے لہجے میں فرعونیت نمایاں تھی۔

علی کا چہرہ سرخ پڑتے دیکھ کر پرویز نے انہیں ٹوک دیا۔ ''آپ یہ کیسی باتیں لے کر بیٹھ گئے ہیں ابا جان؟ ہم اتنے عرصے بعد مل رہے ہیں..... میں اس ملاقات میں کوئی ناخوشگوار تاثر نہیں قائم کرنا چاہتا۔'' اس نے التجائیہ کہا تو وہ سر جھٹک کر رہ گئے۔

آج ان باپ بیٹی کا رویہ بالکل ہی ناقابلِ فہم تھا۔ وہ تھوڑی دیر وہاں بیٹھنے کے بعد واپس آ گیا۔ انا پر لگنے والی ضرب بہت کاری تھی۔ اگلے کئی دنوں تک اسے سہلانے کے باوجود درد تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا..... اور مشکل تو یہ تھی کہ زخم دینے والا ہی طبیب تھا.....

افاقہ آتا بھی تو کیونکر؟

☆☆☆

درد کا جب کوئی درماں نہ رہے اور زخمی انا بھی اپنی کسک کی دہائی دیتی پھرے تو بشر کے پاس اپنے وجود کو مصروفیت کی بھٹی میں جھونکنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا..... علی نے بھی یہی راہ اختیار کر لی تھی۔ اساتذہ کی جانب سے انہیں جس منزل کی مسافت کا پروانہ تھما دیا گیا تھا، اس نے ان بھی کو دشتِ جنوں کا راہی بنا دیا۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا، وہ ساتھی طلبہ کے ساتھ گھلنے ملنے لگا۔ اور تب اسے حقیقتاً احساس ہوا کہ وہاں ہر فرد داستان ہزار رنگ تھا۔ فضل الٰہی انتہائی گرمی میں بھی اپنی آستینیں کبھی نہ کھولتا۔ کم گو، گھنٹوں خلا میں تکتے رہنے اور نماز کے طویل سجدوں میں اشک بہانے والا یہ لڑکا کسی بھی جلوس

کے ہراول دستے میں شامل رہتا۔ اس کے خاندان کی بدقسمتی یہ تھی کہ خوبصورتی میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ گاؤں میں ہرن کے شکار کے لیے آئے گورا صاحب، ٹھاکر بلدیو سنگھ کے مہمان تھے۔ اس کی بڑی بہن چندا ایک افسر راجر کی نظر میں آ گئی۔ اس نے بلدیو سنگھ سے اپنی بدنیتی کی تکمیل کا ذکر کیا تو وہ بھی کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ گاؤں کی بہو بیٹیاں سب کی سانجھی سمجھی جاتی تھیں۔ ٹھاکر نے نورالٰہی کو بلا کر اس گمبھیر صورتِ حال سے آگاہ کیا اور چندا کو محفوظ ہاتھوں میں سونپ دینے کا مشورہ دیا۔

نورالٰہی نے بیٹی کو بچپن کی منگ کے ساتھ بیاہنے میں ہر ممکن عجلت سے کام لیا لیکن موت کی برق رفتاری کا مقابلہ نہ کر سکا۔ راجر کے کارندے اس کی تمام سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ منتقم مزاج اس افسر نے عین نکاح سے پہلے چندا کو بزورِ اسلحہ گھر سے زبردستی غائب کروا دیا اور شادی کے موقع پر موجود اس کے بدنصیب خاندان کو نذرِ آتش کر دیا۔ فضل الٰہی نے اپنے پیاروں کو آگ کے شعلوں سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ان کی اس دردناک قضا کو نہ ٹال سکا۔ اس کے بازوؤں، ٹانگوں اور سینے پر بربریت کے یہ نشان ہمیشہ کے لیے ثبت ہو کر اس کے لیے گویا ایک محرک بن گئے تھے۔

کچھ ایسی ہی داستان اس سرخ و سپید پٹھان زادے مجتبیٰ خان کی بھی تھی۔ وہ غازی پور میں ایک چھوٹے بھائی اور والدہ پر مشتمل اپنے مختصر خاندان کے ساتھ بہت خوش باش زندگی گزار رہا تھا۔ سرکنڈوں سے بنی چھوٹی موٹی اشیا بنا کر بیچنا ان کا ذریعۂ روزگار تھا۔

اس روز عثمان سرکنڈوں کی بنی ٹوپیاں فروخت کرنے کے سلسلے میں کافی دور جا نکلا۔ معصومیت اور نادانی میں وہ اپنی طرف بڑھتے ہوس کاروں کو روک ہی نہ پایا اور نتیجتاً ان کی دہشت کی بھینٹ چڑھ گیا۔ گلائی کے لیے اپنے جگر گوشے کی یہ بے حرمتی ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی۔ مجتبیٰ کے لیے وہ وقت بہت کڑا تھا۔ بیمار والدہ کو سنبھالنا، اور اس کی حوائج ضروریات پوری کرنے میں اسے بہت دقت ہو رہی تھی۔ تبھی محمد آباد میں گلائی کی چچازاد بہن انہیں خدا ترسی میں اپنے پاس لے آئی۔

ان کے اسکول میں مجتبیٰ اور فضل الٰہی جیسے لڑکے جوش کے زیرِ اثر ہوش کا دامن کھونے لگتے لیکن اساتذہ انہیں تحمل اور محبت سے پُرسکون رہنے کی تلقین ہی کرتے۔ ان کو دی جانے والی اس خصوصی تعلیم میں اخلاقی اقدار پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ انہیں بار بار رواداری، برداشت اور عدم تشدد کے اصول ذہن نشین کروائے جاتے۔

ادارے کی یہ محنت رنگ لانے لگی۔ طلبہ اپنی پڑھائی میں مزید سنجیدہ ہو گئے۔ علی بھی مستقبل قریب کی اس ممکنہ تبدیلی کے لیے کافی حد تک ذہنی طور پر تیار تھا۔

لیکن..... شیر پور کے مستقبل کے بارے میں ایک بہت بڑا سوالیہ نشان اب بھی اس کے اعصاب پر سوار تھا..... اور ان سب سے قطع نظر اس کے دل پر غالب اداسی و اضطراب کی تپش بھی اپنا اثر گہرا کرتی جا رہی تھی۔

نبیل کے میٹرک کے امتحان مکمل ہونے کے بعد علی کو بھی چھٹیوں کی فراغت مل گئی اور دونوں شیر پور روانہ ہو گئے۔ کچے آنگن کی مٹی، ماں کے ہاتھ کی بنی روٹیوں اور باپ کے پسینے کی مہک ان کے لیے جاں فزا تھی۔

پرویز بھی تعطیلات کے باعث ان دنوں شیر پور میں موجود تھا۔ اس کے رویے کے کسی بھی پہلو میں علی کو کوئی منفی تاثر محسوس تو نہ ہوا تھا لیکن اپنے لاشعور میں چبھی پھانس کی وجہ سے وہ اس سے میل جول میں محدود ہو چلا تھا۔ محمد آباد میں اس کی دوبارہ کوئی ملاقات نہ ہوئی تھی مگر اسے وہاں اپنے سامنے موجود پا کر وہ اپنی تمام خود ساختہ ناراضگی بھول گیا۔ وہ دونوں کتنی ہی دیر ادھر ادھر کی گفتگو کرتے رہے۔ حویلی کا ذکر چھڑا تو وہ بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

''چچا جان کیسے ہیں؟''

''ٹھیک ہیں..... لندن جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔''

''کیوں بھلا؟''

''رعنا آپا کا داخلہ وہاں کروانے کے لیے بضد ہیں۔''

''یہ تو اچھی بات ہے..... وہ اتنی ذہین ہیں..... انہیں یہ موقع ملنا بھی چاہیے..... وہ تو خود بھی بہت پُرجوش ہوا کرتی تھیں وہاں جانے کے لیے۔'' اس کا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔

''اب نہیں جانا چاہتیں وہ۔''

''یہ انقلاب کیسے؟'' علی واقعی حیران تھا۔

''اسی بات پر ابا جان بھی غصے میں ہیں..... اتنا اچھا موقع گنوا رہی ہیں۔'' پرویز نے بے پروائی سے کہا۔ ''تم لگاتا چکر کسی روز..... کچھ کتابیں دکھائی تھیں تمہیں.....''

''میں جلد ہی آؤں گا۔'' بے قراری سے ادا کیے گئے ان الفاظ نے اسے شرمندہ سا کر دیا۔ کن انکھیوں سے پرویز کی جانب دیکھ کر جب اس کے چہرے پر کوئی بھی تاثر نہ پایا تو قدرے پُرسکون ہو گیا۔

''میں منتظر رہوں گا۔'' وہ الوداعی کلمات کے بعد

رخصت ہوگیا۔

اگلے دن وہ دل میں ہزاروں وسوسے لیے زخمی سوچوں میں گھرا جب وہاں پہنچا تو زنان خانے کے باہر ہی کھڑی پرویز کی والدہ نے اسے روک لیا۔

"بڑے عرصے بعد رونق بخشی اس غریب خانے کو۔"

"پڑھائی کی مصروفیات سے آپ واقف تو ہیں چچی بی!" وہ نظریں جھکا کر بولا۔

"والدہ کیسی ہیں تمہاری؟ ان سے کہنا کبھی اپنے حجرے سے نکل بھی آیا کریں..... پردے کی بوبو ہی بنی بیٹھی ہیں۔" ان کے زبان و بیان اور آنکھوں میں بھی تبریز عالم ہی کا عکس جھلک رہا تھا۔

علی کو اپنی والدہ کا یوں تذکرہ پسند نہ آیا اور دبے لفظوں میں کہنے لگا۔

"ان کے پاس گاؤں کی بچیاں درس لینے آتی ہیں..... آپ ہی آجایئے گا کبھی ہمارے یہاں۔"

وہ محض ایک جتلاتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالتی دالان میں موجود پالکی کی طرف چل دیں۔ علی سر جھٹک کر اپنی ناگواری دباتا مہمان خانے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ یہاں کے طور طریقوں سے مکمل آشنا تھا۔ ملازمین بھی اس سے بخوبی واقف تھے اس لیے کسی نے بھی راہنمائی کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔

مہمان خانے میں رعنا کو پہلے ہی سے موجود پا کر وہ بھونچکا رہ گیا۔ وہ وہاں کچھ آرائشی پھول تھامے کھڑی تھی۔

"وہ..... مم..... میں پرویز سے ملنے آیا تھا۔"

"جانتی ہوں میں۔" وہ طنزیہ بولی۔

"اسے بلوا بھیجیے..... مہربانی ہوگی۔"

"ہماری موجودگی اس قدر ناگوار ہے کیا؟" وہ نچلا ہونٹ دانتوں سے کچلتے ہوئے گویا ہوئی۔

"نن..... نہیں..... مناسب نہیں لگتا اس طرح بات کرنا..... کوئی اعتراض نہ کرے۔"

"سب کی فکر کیوں لاحق رہتی ہے تمہیں؟"

اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا تو بات بدلنے کے لیے کہنے لگا۔ "لندن روانگی کے لیے دلی مبارکباد قبول کیجیے۔"

"لندن کون جارہا ہے بھئی؟"

"پرویز نے بتایا تھا کہ آپ....." اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"مجھے کوئی دلچسپی نہیں رہی اب۔" رعنا کا انداز معنی خیز تھا۔

"اتنا اچھا موقع کیوں ضائع کررہی ہیں؟"

"قفس کے اسیر اپنی قید سے فرار نہیں پانا چاہتے..... انہیں اپنے قفس سے ایسی انسیت ہوجاتی ہے کہ رہائی میں گھٹن اور تنہائی کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔"

"آپ کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔" وہ خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔

"اتنے بھی انجان نہیں ہو تم۔" وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

انجان تو اب وہ واقعی بالکل نہ رہا تھا۔ رعنا کی نظروں سے چھلکتے جذبے اس کے دل میں ہلچل مچانے لگے۔ وہ ایک جادوئی لمحہ تھا۔ پل بھر میں ہی ایک حقیقت اس پر فاش ہوئی کہ جس جذبے نے اس کا دل برسوں سے مضطرب کر رکھا تھا، رعنا بھی اس کی آنچ سے بچ نہ پائی تھی۔ وہ بھی اسی کی طرح ایک کشمکش اور تڑپ میں مبتلا تھی۔

اس کا بدن سنسنا گیا لیکن اگلے ہی پل صورتِ حال کی سنگینی نے اس پر گھڑوں پانی ڈال دیا۔ عمروں کے تفاوت اور پرویز کی دوستی کے تصور نے اس کے عرش میں معلق دل و دماغ کو یکدم زمین بوس کردیا اور وہ نظریں چرا کر بولا۔

"پرویز سے کہیے گا مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا تھا..... میں پھر کبھی آؤں گا ملنے۔"

وہ یہ کہہ کر رک نہ سکا اور فوراً واپس پلٹ گیا۔

☆☆☆

کاروانِ عشق نے اپنی منزل کی جانب پیش قدمی تیز تر کردی تھی۔

علی کے لیے سب سے خوش آئند بات تو یہ تھی کہ اس کا عزیز از جان بھائی مزید دو سال کے لیے اس کے ساتھ تھا۔ محمد آباد میں کالج کے آغاز سے انہیں کافی سہولت ہوگئی تھی۔ اسکول میں ہمہ وقت رہنے والا ساتھ اسے یاد تو بہت آیا کرتا بھائی کی کمی بھی بہت کھلتی..... لیکن اب خوشی بھی تھی کہ مزید کچھ ماہ کی محنت کے بعد وہ ایک بار پھر اس کے ساتھ ہوتا۔

پرویز کا وہی معمول برقرار تھا۔ تبریز عالم کے برعکس اس نے رعنا کے بھی محمد آباد کالج میں پڑھنے کا خوشدلی سے استقبال کیا تھا۔ وہ بے نیاز اور اپنے حال میں مگن رہنے والا انسان تھا۔

علی اب بھی کبھی کبھار ان کی خالہ کے یہاں چلا جایا کرتا تھا۔ اس کی آمد رعنا کے چہرے پر شادابی بکھیر دیتی۔ اسے رعنا کے جذبات کی شدت میں اب کوئی بھی ابہام نہ تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے وجود میں وحشت ڈیرے جمانے لگی تھی۔ اس کی گفتگو میں تلخی بڑھنے لگی تھی۔ علی اپنی نادانی میں

ایک معمولی سانکتہ فراموش کر گیا تھا..... دوستی کی حرمت برقرار رکھنے میں وہ ایک "عورت" کا وجود نظر انداز کررہا تھا..... اور عورت سے اپنے وجود کی نفی کیونکر برداشت ہو پاتی ہے؟

رعنا کی وحشت ایک جنون میں ڈھلنے لگی۔

اگلے چند ماہ گویا پر لگا کر گزر گئے تھے۔ سالانہ امتحان کی تیاریاں زور و شور سے ہونے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کے اساتذہ نے انہیں مستقبل قریب کے لیے کچھ پند و نصائح کے سلسلے کا آغاز کردیا تھا۔

"اس ادارے سے باہر ایک نیا جہان، ایک اور آسمان آپ سب کی بلند پروازی کی آزمائش کے لیے موجود ہو گا..... لیکن زندگی میں کبھی بھی، کسی بھی موڑ پر اپنی ان ذمے داریوں سے چشم پوشی مت کرنا۔"

وہ بھی ایک نئے جوش اور ولولے سے لبریز زندگی کی اس نئی دوڑ میں اپنی قوت آزمانے کے لیے بہت... پُرجوش تھے۔

کچھ ہی دنوں بعد امتحانات ختم ہوگئے اور اگلے چند ماہ میں کامیابی کی نوید بھی مل گئی۔ مولوی عبداللہ اور عالیہ کا ایک دیرینہ خواب تکمیل کی ایک اور منزل تک پہنچ گیا۔ نبیل کے بعد اب علی بھی کالج کی سطح پر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

اس ساری رات انہوں نے رب کے حضور خصوصی شکرانہ ادا کیا۔ پروردگارِ دو عالم نے ان کی اولاد کو اپنے اولین حکم "اقرا" کی راہ کا مسافر بنانے کی سعادت بخشی تھی، وہ جس قدر شکرانہ ادا کرتے، کم تھا۔

کالج کی یہ دنیا علی کے لیے ایک نیا امتحان ثابت ہوئی۔ اس اہم ترین موڑ پر اس کا دل اسے رہنمائی دیتا تھا۔ کتاب کی سطروں پر بھی آنکھیں تصور میں کسی کی "خاموش کناں نظروں" کے سامنے اپنی وضاحتیں پیش کرنے لگتیں..... رعنا کی محبت کی طلب اور شدت اسے بے بس کرنے لگی۔ اس کے جذبات سے واقفیت نے اس بے بسی کو دو چند کردیا تھا۔ وہ لاکھ اس کی یاد سے دامن چھڑاتا لیکن بے سود تھا۔ ایک سال کا عرصہ مزید گزر گیا۔ اس نے اپنی ذات پر بہت مضبوط بند باندھ رکھے تھے۔ پرویز سے بھی کبھار پبلک لائبریری میں سرسری ملاقات ہوجایا کرتی۔ وہ ہمیشہ اس سے ملاقات نہ کرنے کا گلہ کرتا اور علی بھی ہمیشہ "اگلی بار" آنے کی ہامی بھر لیتا..... لیکن اس روز دل و دماغ کی جنگ میں اس نے پہلی مرتبہ دل کی بات تسلیم کرلی اور قدم بے اختیار اس کوچے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

پہلی ملاقات حسبِ معمول خالہ بی ہی سے ہوئی جو اسے دیکھ کر نہال ہوگئی تھیں۔

"ارے علی میاں آپ..... آپ تو عید کا چاند ہی ہو گئے ہیں..... آنکھیں ترس گئی تھیں آپ کو دیکھنے کے لیے۔"

"معذرت خواہ ہوں خالہ بی! لیکن آئے روز چلے آنا مناسب بھی تو نہیں لگتا نا۔"

"عالیہ کے بیٹے ہو نا! یہ مروت اور اقدار تو گھٹی میں پڑی ہوں گی۔"

"آپ اماں بی سے کیسے واقف ہیں بھلا؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"ارے میاں! مولوی عبداللہ سے تو واقف ہیں نا... ہم..... اپنی رعنا بٹیا اور پرویز میاں اکثر انہی کی باتیں کرتے ہیں..... تو یونہی روا روی میں آپ کی والدہ کا ذکر زبان پر آگیا..... محسوس نہ کرنا۔" انہوں نے محتاط انداز میں کہا۔

"پرویز کہاں ہے..... اسے خبر نہیں ہوئی شاید میری آمد کی؟"

"اے لو! میں بھی باتوں میں لگ کر بتانا ہی بھول گئی کہ وہ تو کسی جلسے میں گئے ہیں۔"

"ارے واہ! اس نے بھی پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی..... بہت خوشی ہوئی مجھے جان کر۔"

"ہاں میاں! تبریز تو کافی عرصے سے [illegible] کرنے کے لیے کہتے رہتے تھے [illegible] ان کی بات تسلیم کرلی ہے۔"

[illegible]

[illegible] میاں! آپ [illegible] ہے..... میں نماز ادا کرلوں۔"

علی کو ایک شدید بے چینی لاحق ہو چلی تھی۔ وہ بے اختیار اندرونی جانب واقع کمروں کی طرف لپکا۔ رعنا کے کمرے کا اسے علم تھا۔ دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر وہ خود کو اس سے متوقع سامنے کے لیے تیار کرنے لگا۔ رعنا اسے اپنے سامنے موجود پا کر ششدر رہ گئی اور خوابیدہ لہجے میں کہنے لگی۔

"آج تو کچھ اور بھی تمنا کی ہوتی تو شاید پوری ہو جاتی۔" پھر یکدم سر جھٹک کر بولی۔ "پرویز گھر پر موجود نہیں ہے۔"

''میں جانتا ہوں..... وہ موجود نہیں۔''

''تو پھر یہاں رکنے کا مقصد؟''

''آپ سے کچھ ضروری بات کہنی تھی۔'' اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔

''مجھ سے بات..... زہے نصیب۔'' وہ بدلحاظی سے گویا ہوئی۔

''آپ کیوں جا رہی ہیں رعنا؟ آپ نے تو کہا تھا کہ اس قفس سے رہائی نہیں چاہتیں۔''

''جب عزتِ نفس مجروح ہونے کا سلسلہ دراز ہو جائے تو قفس کی دیواروں سے ٹکرا کر پاش پاش ہونے میں ہی عافیت ہوتی ہے..... مجھے اپنی عزتِ نفس پر اب کوئی سمجھوتا درکار نہیں۔'' اس نے رکھائی سے کہا۔ ''اور کس لیے یہاں ٹھہروں میں؟..... آخر کس لیے؟''

''میرے لیے..... صرف میرے لیے رعنا!'' وہ گڑگڑایا۔

''اس ترحم کی وجہ جان سکتی ہوں؟''

''ترحم نہیں ہے یہ..... خدا کی قسم ترحم نہیں ہے..... میں نے اپنے جذبات کے سامنے سپر ڈال دی ہے..... بہت جنگ کی ہے میرے دل اور دماغ نے..... اور میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں..... میں آپ کی محبت سے مزید منکر نہیں ہو سکتا۔'' اس کے لہجے میں برسوں کی نارسائی کراہ رہی تھی۔

رعنا کے وجود پر چھایا گلیشیر ایک ہی پل میں پگھل گیا۔ وہ کچھ دیر اس کی نم آنکھوں میں جھانکتی رہی اور دھیرے سے بولی۔

''میرا ساتھ دے سکو گے زندگی بھر؟''

''آپ میری زندگی کی رعنائی ہیں..... آپ کے تصور کے بنا زندگی مکمل ہی کب محسوس ہوتی ہے مجھے؟'' اس کا شکست خوردہ انداز رعنا کی نظروں میں بھی جوت پھر سے جگانے لگا۔

ایک دوسرے سے وعدے وعید کرتے وہ مکمل بے خود تھے۔ رعنا نے مزید تعلیم کے لیے غازی پور روانگی کا قصد کر لیا اور وہاں قیام کے دوران خطوط کے ذریعے نصف ملاقات کا لائحہ عمل بھی تیار کر لیا۔ اس اقرار کے بعد اب دونوں ہی کے لیے یہ معمولی سی دوری بھی کوہِ گراں تھی۔

وجود میں تکمیل کا احساس لیے وہ ہاسٹل لوٹ آیا۔ رعنا سے کیے گئے عہد و پیمان ایک انوکھے احساس ذمے داری سے سرشار کر رہے تھے۔

''تمہاری زندگی پر اب صرف میرا حق ہے علی! میری ذات اور چاہت اولین ترجیح ہونی چاہیے بس!''

اس کی سماعت میں گونجنے والے ان الوداعی کلمات نے ایک بار پھر لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ کھلا دی۔

''آپ کی چاہت سے بڑھ کر کبھی کچھ نہیں ہوگا۔'' اس نے خود کلامی کرتے ہوئے رعنا سے کیا ہوا عہد ایک بار پھر دہرایا۔

وہ اس بات سے قطعی بے خبر تھا کہ بہت جلد ایک شخص مکمل طمطراق سے اس کی زندگی کی تمام ترجیحات اور سوچ کے زاویے تبدیل کر دے گا۔ بے خبری کے اس عالم نے خوابوں کی افزائش دو چند کر دی۔

☆☆☆

پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بچے، جوان، بوڑھے چہروں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آس کی چمک لیے، بہت... پُرجوش نظر آ رہے تھے۔ ان کے وجود سے چھلکتی اس چمک کے سامنے سورج کی کرنیں بھی پھیکی محسوس ہوتی تھیں۔ وہ سب ایک ہی ہستی کے منتظر تھے جو گویا ان کا نوشتہ تھا۔

علی اور نبیل بھی درمیانی صفوں میں موجود اسی کی راہ تک رہے تھے جو ان جیسے کروڑوں دلوں کی دھڑکن بن چکا تھا۔ وہ ایک ساحر تھا جس کی ہر جنبش، انداز اور زبان سے ادا ہوا ہر لفظ کسی فسوں کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیتا تھا۔

انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ ان کے گوہرِ مقصود کی آمد ہو چکی تھی۔ وہ ساحر ایک بلند اسٹیج پر کھڑا ہزاروں کے اس مجمعے کی نبض اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھا۔ اس کے لبوں سے ادا ہونے والا ہر لفظ سماعت کے رستے دلوں پر نقش ہونے لگا۔ براق لباس، باوقار وجود، چہرے کے نقوش سے جھلکتی سنجیدگی متانت اور استقامت کی نادیدہ لہریں اس کے سامنے موجود ہر شخص کو متاثر کر رہی تھیں۔

وہ ان سے مستقبل میں درپیش خدشات کا ذکر کرتے اپنے کردار کی مضبوطی اور ہمت سے قربانیوں کا عزم طلب کر رہا تھا..... اور وہ سبھی اس کے ایک اشارے پر کٹ مرنے کے جذبے سے سرشار تھے۔ انہوں نے متفقہ طور پر اسے اپنا ''سپہ سالار'' مقرر کیا تھا اور اب اس کی ہر صدا پر لبیک کہتے ہوئے وہ ہر آتشیں سمندر عبور کرنے کے لیے تیار تھے۔

اس مختصر سی تقریب جلسہ میں علی اس ساحر کا ''مرید'' ہو گیا تھا۔ اس کے دل میں ایک چنگاری سلگ اٹھی تھی جس کی دھیمی دھیمی آنچ اسے ان جذبوں سے نہال کر رہی تھی، جو اب تک اس کے لیے قدرے انجان تھے۔ کچھ یہی حال دوسری جانب نبیل کا بھی تھا۔ اس ہجوم میں ان دو لوگوں نے اپنے جذبوں کی تمام تر صداقت اور تن، من، دھن سے شمولیت اختیار کر لی۔

محمد علی جناح بلاشبہ ایک خوش قسمت ترین قائد تھے۔

واپسی کے سفر میں وہ دونوں ہی خاموش تھے۔ چند لمحوں بعد نبیل نے اسے مخاطب کر کے پوچھا۔ ''اگلے ہفتے میں کچھ چھٹیاں لے کر شیر پور جانا چاہتا ہوں..... چلو گے ساتھ؟''

''خیریت؟ یہ اچانک روانگی کا فیصلہ کیوں؟'' علی نے اچنبھے سے کہا۔

''آج جن حقائق سے دوچار ہوئے ہیں، میں یہ سبھی باتیں اور خطرات بابا جان کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں..... میں نہیں چاہتا کہ وہ لاعلمی میں کوئی نقصان اٹھائیں۔'' اس کی سنجیدگی مزید بڑھ گئی۔ ''چل رہے ہو ساتھ کہ نہیں؟''

''ضرور چلوں گا۔''

''ٹھیک ہے، میں اگلی جمعرات غازی پور سے روانہ ہو جاؤں گا تمہیں لینے کے لیے..... تم بھی ادھر تیاری رکھنا۔'' علی کی رضامندی پا کر وہ پرسکون ہو گیا۔

شیر پور کی فضاؤں نے ہمیشہ کی طرح بانہیں کھولے ان کا استقبال کیا۔ بچپن میں انہی گلی کوچوں میں کدکڑے لگانے اور لڑکھڑاتے قدموں سے ایک دوسرے کے پیچھے لپکنے والے ان دونوں بھائیوں کے چہرے اب جوانی کے جوش اور شادابی سے بھرپور تھے۔ مضبوط ارادوں اور پختہ چال کی دھمک شیر پور کی دھرتی کو خوشی سے نہال کر [illegible]۔

عبداللہ اور عالیہ ان کی بے وقت آمد پر حیران تھے۔ اس رات نبیل نے ان سے دوٹوک بات کرنے کی ٹھان لی۔

''بابا جان! مستقبل کی بابت کیا سوچا ہے آپ نے؟''

''یہ باتیں ابھی قبل از وقت ہیں بیٹا! ہمارے ناخداؤں نے کچھ بہتر ہی سوچا ہوگا ہم سب کے لیے؟''

''تقسیم جب بھی ہوئی، اصول توازن کے تحت کی جائے گی بابا جان! شیر پور کے چند سو مسلمانوں کے لیے یہ علاقہ کیونکر پاکستان کے سپرد کیا جا سکتا ہے بھلا؟''

''گاؤں کے لوگوں کی کیا رائے ہے تقسیم کے متعلق؟'' علی نے استفسار کیا۔

''پگڑو اس گل کو جانے دو، وقت کی مکمل ضرورت قرار دے رہے ہیں [illegible] اتفاق تصور خیال کرتے ہیں۔'' عبداللہ نے صاف گوئی سے [illegible]

''آنے والا کل [illegible] جانے کیا [illegible]

کہ مجموعی صورتِ حال کیا رخ اختیار کرنے والی ہے۔'' نبیل نے گہری سانس بھری۔ ''لیکن ایک بات تو اب عیاں ہے اگر اپنی آئندہ نسلوں میں دین زندہ رکھنا ہے تو آج ایک مشکل فیصلہ کرنا ہی ہوگا۔''

''آپ سب سے اس بارے میں واضح اور باقاعدگی سے بات کیجیے۔ ان کے ذہنوں میں پروردہ غلط فہمیوں کو دور کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ اگلے امتحانوں کے بعد میں خود بھی یہاں رہ کر ان کی ذہن سازی کروں گا۔'' علی کے لہجے میں بھی اضطراب کروٹیں لے رہا تھا۔

عالیہ اور عبداللہ بیٹوں کی آنکھوں میں آتشِ عشق کی حدت دیکھ کر مبہوت ہو گئے۔ وہ بخوبی جان گئے تھے کہ ان کے دلوں میں جاگزیں ہونے والا یہ جذبہ زندگیوں میں کئی ایک تبدیلیاں لانے والا ہے۔

اگلے روز جمعے کی نماز کے بعد وہ دونوں محمد آباد روانہ ہو گئے جہاں علی کو ہاسٹل میں چھوڑ کر نبیل اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اپنے کمرے میں پہنچتے ہی سامنے میز پر موجود خط کا لفافہ دیکھ کر وہ لذت آمیز سنسنی سے سرشار ہو گیا۔ رعنا نے دو دن بعد خالہ کے گھر آمد اور اس سے ملاقات کا عندیہ دیا تھا۔

امتحان نزدیک تھے۔ پرویز سے کچھ اہم اسباق میں مدد کے لیے وہ کئی روز سے اسے ملنا چاہ رہا تھا لیکن وہ لائبریری سے بھی مستقل غائب تھا۔ اس کی مصروفیات علی کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ اس کے مزاج میں عجیب دھوپ چھاؤں جیسی کیفیت نظر آنے لگی تھی۔

اس بار پرویز گھر میں موجود تھا۔ اس کی تیاری اور عجلت سے لگتا تھا کہ وہ کسی خاص مقام پر روانگی کا قصد کیے بیٹھا تھا۔ وہ حسبِ معمول اپنے مخصوص بے نیاز انداز میں اسے ملازمہ کی بات چیت کے بعد کھانے کا رخ امتحانات کی طرف موڑ گیا۔

''میں اس بار امتحان کے لیے زیادہ سنجیدہ نہیں ہوں۔'' اس نے بیزاری سے کہا۔

''تمہیں جولت لگ گئی ہے اس کے بعد تم سے اور توقع بھی کیا کی جا سکتی ہے۔'' رعنا نے طنز کر کہا۔

''ایک تو آپ کی بلاوجہ ٹوکنے کی عادت آج تک ختم نہ ہو سکی آپا! مجھے اور بھی بہتیرے کام ہیں..... مگر آپ ایک اسی بات کے پیچھے پڑی رہتی ہیں..... ہونہہ۔'' اس کے لہجے کا تنفر علی کے لیے بہت حیران کن تھا۔

''جلسوں میں جا کر نعرے بازی کرنے کو تم کام کہتے ہو..... آفرین تمہاری اس سوچ پر۔''

Pakistanibooks

"یہ مردوں کی باتیں ہیں..... آپ ان سے دور ہی رہیں۔" اس کے اکھڑ لہجے پر علی کو غصہ تو بہت آیا لیکن وہ خاموش ہی رہا۔

"انہا کی تعلیم نے تمہیں خوب "روشن خیال" اور مہذب بنا دیا ہے ویسے۔" وہ طنزیہ بولی۔

"ان باتوں کی گہرائی آپ نہیں سمجھ سکتیں..... اور "انہا" کا نظریہ تو موجودہ صورتِ حال میں بہترین لائحہ عمل ہے..... اس کے موجد کے تو کیا کہنے..... ہی از اے گریٹ مین۔"

اس کی باتوں سے علی کے دل میں کھلبلی پیدا ہوگئی۔

"چلتا ہوں ابھی..... پھر ملیں گے۔" وہ عجلت میں کہتا ہوا روانہ ہوگیا۔

"یہ کن جلسوں میں جاتا ہے رعنا؟" اس نے اپنے خدشات کی تصدیق چاہی۔

"پکا کانگریسی بن چکا ہے یہ۔" اس نے ہونٹ سکوڑے۔ "جلسوں اور پارٹی میٹنگز کے علاوہ کچھ یاد ہی نہیں رہتا اسے..... اسی لیے تو تمہیں بلایا تھا آج۔" وہ اپنی ہی لے میں کہتی چلی گئی۔

علی کے لیے پرویز کی اس سیاسی جماعت سے وابستگی کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔

"تم یہیں رکو! میں خالہ بی کو کسی طرح مطمئن کر کے کام میں الجھا کے آتی ہوں۔ ورنہ ابھی یہاں چوکیدار بن کے آن بیٹھیں گی۔" وہ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتی ہوئی اندر بڑھ گئی۔

ان کی خالہ اس گھر میں ایک پرانی ملازمہ کے ساتھ رہتی تھیں۔ ملازمہ کا شوہر اوپر کے کاموں کے لیے متعین تھا۔ رعنا کے خالو رنگین مزاجی میں لاثانی تھے۔ ان کے قدم بالا خانوں کی گلیوں میں ہی بھٹکتے رہتے تھے۔ وہیں ایک مغنیہ کی اداؤں کے ایسے اسیر ہوئے کہ نکاح کے بعد اسے ایک الگ گھر میں لیے رہنے لگے..... پہلی بیوی بوسیدہ سامان کی طرح یہیں پڑی رہتی۔ اسے آزاد کرنے کا بھی حوصلہ کہاں تھا ظفر میں؟ ہفتے میں ایک آدھ بار وہ رئیسہ کا احوال پوچھنے اور اپنا ازدواجی حق وصولنے کے لیے ان کی آمد ہو جاتی تھی۔

علی کا ذہن پرویز کے متعلق اس نئے انکشاف کے بعد بہت الجھ گیا تھا۔ اسے رعنا کی واپسی کی بالکل خبر نہ ہو سکی۔ اس نے علی کے دائیں شانے کو جھنجوڑتے ہوئے اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ ہڑبڑا گیا۔

"کیا بات ہے؟ کن خیالوں میں گم ہو؟" وہ پریشانی سے گویا ہوئی۔

"کہیں بھی تو نہیں..... آپ بتائیں..... کیا حکم ہے غلام کے لیے؟" وہ آج بھی اسے اپنی ذات سے بہت بلند مقام دے کر مخاطب ہوتا تھا۔

"میں ایک ضروری بات کرنا چاہتی تھی تم سے..... اصولی طور پر تو تمہیں خود ہی یہ سوچنا چاہیے تھا لیکن بس تمہاری یہ سادگی....." اس نے افسردگی سے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ایسی کیا بات ہے رعنا؟ کھل کر کہیے۔"

"ابا جان میرے یہاں پڑھنے کے فیصلے کے بعد بہت خفا رہنے لگے ہیں..... وہ دانستہ اب میری شادی کے درپے ہیں۔"

"یہ باتیں ابھی قبل از وقت ہیں رعنا..... چچا جان کو سمجھائیے آپ خدارا۔"

"میں تو بہت سمجھا چکی..... لیکن وہ اپنی ضد سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔"

"مجھے بتائیے..... میں کیا کر سکتا ہوں اس رشتے کا مستقبل محفوظ بنانے کے لیے؟"

"حویلی میں سبھی تم سے واقف ہیں..... پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں..... اس لیے اپنے پتے بہت سوچ سمجھ کر کھیلنا۔" رعنا کے پاس بھی کوئی واضح لائحہ عمل نہ تھا۔ کچی عمر کے اس دور میں عملی زندگی کی کٹھنائیاں سنبھالنا اب بہت مشکل ہونے لگی تھیں۔

"ٹھیک ہے! امتحان ختم ہونے کے بعد نبیل بھائی سے بات کروں گا..... کوئی بہتر حل نکال لیں گے۔" علی جذباتی ہونے لگا۔

خوابوں کے جنگل میں بھٹکتے انہوں نے اپنی آنکھیں اس کی تاریکی سے اس قدر مانوس کر لی تھیں کہ زمینی حقائق کی تلخ و کڑی دھوپ سے مکمل ناپینا ہو گئے تھے۔ غفلت کا تاوان پاؤں تلے زمین اور سر سے آسمان چھین کر خلا میں معلق کر دیا کرتا ہے..... وہ نادان فی الوقت انجان تھے اور خوابوں کی مسافت میں بے خود تھے۔

☆☆☆

فراغت ملتے ہی علی شیر پور روانہ ہو گیا تھا۔ ہر طرف انتخابات کا غلغلہ تھا۔ ہندوستان کی جغرافیائی حدود میں تبدیلی کی بازگشت اب کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہ تھی۔ رویّوں میں گریز اور لہجوں میں غیر محسوس سرد مہری جھلکنے لگی لیکن اس کے سبھی دوست تا حال اس سے بہت مخلص تھے۔

رمیش اپنے باپو کے ساتھ کھیتی باڑی میں مشغول رہتا تھا۔ اشوک نے انہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اعلیٰ تعلیم کے حصول کی راہ اپنائی تھی۔ وہ اپنی بوا کے ہاں غازی پور میں رہتا اور ہولی یا دیوالی کے موقع پر ہی شیر پور آیا کرتا تھا۔ نہال سنگھ اور کرن سنگھ کا ذہن کبھی بھی کتابوں کی طرف مائل نہ ہوا۔ وہ دونوں اپنے باپ کی ہٹی سنبھالے بیٹھے تھے۔

علی اور نبیل کی شیر پور میں آمد ہوتے ہی سبھی دوست ..... فضلو کے باغ میں اکٹھے ہو کر بچپن کی سہانی یادیں خوب تازہ کرتے۔ اس بار علی کی بے چینی اور سنجیدگی کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی۔

"علی! کہاں گم ہوتا ہے رے سیاں!" نہال نے اسے مسجد سے واپسی پر ہٹی کے پاس سے گم صم گزرتے دیکھا تو بے ساختہ پکار بیٹھا۔ "یہاں آ کر بھی تیری مصروفیت کم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔"

"ایک امانت ہے نہالے! جس کا حق ادا کرنا ہے..... ایک قرض ہے جو چکانا ہے۔"

"بچپن سے ساتھ رہتے آئے ہیں..... اب اچانک بٹوارے کا شوشا سننے لگے ہیں..... یار دوست سب تتر بتر ہو جائیں گے کیا؟" نہال افسردگی سے بولا۔

"یہ سب بہت ضروری ہو چکا ہے..... اگر ساتھ رہے تو دلوں میں نفرتیں اور رشتوں میں نیلاہٹ آ جائے گی۔"

"جہاں بھی رہو..... واہگرو کی کرپا میں رہو..... زندگی رہی تو رشتے بھی سلامت رہیں گے..... اور میری کسی بھی قسم کی سہائتا کی ضرورت ہوئی تو مجھے بتانا ضرور..... ایک آواز دینا..... نہالا اسی پل تیرے ساتھ کھڑا ہوگا۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر کہنے لگا۔ علی نے فرطِ محبت سے اسے اپنے سینے میں بھینچ لیا۔

عبداللہ کے ساتھ مل کر وہ روزانہ لوگوں کے ساتھ طویل نشست جماتا۔ وہ سادہ لوح دیہاتی وقت کی اس ضرورت کو سمجھ تو چکے تھے لیکن اپنی جمی جمائی زندگی اور روزگار چھوڑ کر کسی نامعلوم اکثریتی علاقے میں منتقلی ان کے لیے ناقابلِ عمل خیال تھا۔ بخت خان نے بڑی اداسی سے انہیں اپنا حال دل کہہ ڈالا۔

"یہاں سے جائیں بھی تو کہاں مولوی جی! اگر بٹوارے والے علاقوں میں رہنے کی سوچیں تو یہ گاؤں کیا، ہمیں اس ریاست کو چھوڑ کر آباد کہنا پڑے گا۔ میلوں کی مسافت، نئی جگہ، نیا ماحول، زندگی کے لالے تو اس صورت میں پڑیں گے جو کہ ہمارے لیے کہ شیر پور میں ہی رہ کر بچی کھچی زندگی گزار لی جائے۔ برسوں کا ساتھ ہے یہاں سب سے ..... دکھ سکھ سانجھے رہے ہیں ہمارے..... بہت سا اچھا وقت ساتھ دیکھا ہے..... ہمارا ضرور خیال کریں گے سب۔"

دیگر افراد بھی اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ ہر بار یہ نشستیں یوں ہی بے نتیجہ ثابت ہوتیں۔ علی کے دل میں مایوسی چھانے لگی۔ رعنا کی طرف سے آخری ملاقات کے وہ خدشات بھی اس کے دل و دماغ پر آسیب کی طرح قابض تھے۔ مزاج پر اداسی اور گھٹن طاری رہنے لگی تھی۔

اسے نبیل کی آمد کا شدت سے انتظار تھا۔ جذباتی طور پر وہ ہمیشہ ہی سے اس پر بہت انحصار کرتا آیا تھا..... اور اب بھی اسے قوی امید تھی کہ اس کے آنے کے بعد سب مسائل چٹکی بجاتے حل ہو جائیں گے۔

اگلے دو ماہ اسی طرح خاموشی سے گزر گئے۔ گاؤں سے چند افراد نے دور دراز ریاستوں میں مقیم اپنے رشتے داروں کو خط کتابت کے ذریعے اپنی منتقلی کی بابت عندیہ دیا۔ ان کی جانب سے مثبت جواب ملتے ہی شیر پور میں ایک نمایاں ہلچل نظر آنے لگی۔ اپنی جڑوں سے دوری بہر حال آسان بھی نہ تھی لیکن دین کی محبت میں ہمیشہ سے کڑے ادوار سے گزرنے والی اس قوم کے سپوت اب بھی قربانیوں کے لیے تیار تھے۔

سیاسی افق پر تبدیلی کے سحاب اور تند و تیز آندھیوں نے برسوں سے ساتھ رہنے والوں کے مابین حائل لحاظ اور محبت کے اشجار کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ ہر طرف انتشار اور خوف کی فضا کا راج تھا۔ نبیل کی آمد کے بعد علی کی طبیعت پر چھایا اضمحلال کم ہونے لگا لیکن اس کے پاس بھی کوئی اچھی خبریں نہ تھیں۔ انگریزوں اور ہندوؤں کا گٹھ جوڑ مستقبل بین نظروں کو کسی بہت بڑے طوفان کی خبر دے رہا تھا۔

ان دونوں بھائیوں نے اپنی رابطہ مہم میں تیزی پیدا کر دی۔ عبداللہ کے مشورے سے وہ شیر پور کے اس اکلوتے اسکول میں ایک جلسے کے ذریعے اپنے خدشات ان سادہ لوح لوگوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ سب لوگوں نے اسکول کے بڑے ہال نما کمرے میں آمد کی ہامی بھر لی۔ وہ دونوں بہت پُرجوش تھے لیکن اس بے ضرر کاوش نے رشتوں پر ایسی شمشیر زنی کی کہ وہ ششدر رہ گئے.....

بظاہر چٹان کی طرح مضبوط نظر آنے والے رشتے حقیقت کا ایک بھی وار سہہ نہ پائے..... اور سب کچھ بکھر گیا۔

☆☆☆

PakBooks.com

"میں نے سنا ہے کہ تم لوگ کوئی جلسہ کررہے ہو اسکول میں۔" رمیش اس دن اچانک ہی ان سے ملنے چلا آیا تھا۔

"ہاں! ٹھیک سنا ہے تم نے..... کچھ ضروری معاملات پر بات چیت کرنی ہے اپنے ان بھائیوں سے۔" نبیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں یہ تو نہیں کہتا کہ غلط کررہے ہو تم..... مگر بہت سادہ دھانی برتنا..... تمہاری سادگی کہیں تمہیں نقصان نہ پہنچا دے۔"

"کھل کر بات کرو رمیش..... کیا کہنا چاہتے ہو؟" نبیل ٹھٹک گیا تھا۔

"دیکھ دیرے! انسان ساری دنیا سے لڑ جھگڑ سکتا ہے..... لیکن اپنوں سے لڑنا ناممکن ہووے ہے..... اور تمہیں تو دودھاری تلوار کا سامنا ہے..... سنبھل کے چلنا بس....." وہ محتاط انداز میں کہہ کر اس کے شانے تھپکتا ہوا چل دیا۔

"یہ کیا جتانا چاہتا ہے بھائی؟" علی بھی حیران تھا۔

نبیل نے بھی ناسمجھی سے محض کندھے اچکا دیے لیکن اگلے ہی روز رمیش کی تنبیہہ نے مجسم روپ دھار لیا۔

نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے بعد ہونے والے اس جلسے میں محض چند افراد کی آمد انہیں دلبرداشتہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ حیرانی تو اس بات کی بھی تھی کہ جوش وخروش سے ان کی ہر بات کی تائید کرنے والے بھی غائب تھے۔ مایوسی، ملال، رنج اور بے بسی نے عبداللہ اور ان دونوں کے صادق جذبے بہت بری طرح مجروح کیے تھے۔

دلبرداشتگی کے عالم میں چنیدہ حاضرین سے بات چیت کرنے کا آغاز ہی تھا کہ ایک عجب طوفانِ بدتمیزی برپا ہو گیا۔ بیرونی جانب سے مغلظات کی گھن گرج سنائی دینے لگی۔ حمید، ماجد اور رشید بہت جارحانہ انداز میں اندر داخل ہوئے اور وہاں موجود افراد پر بری طرح بھڑک اٹھے۔

"اس مولوی اور ان لونڈوں کے پیچھے تم لوگوں نے ہماری بات سے انحراف کیا ہے..... بہت پچھتاؤ گے اپنے اس فیصلے پر۔"

تبریز عالم کے ان بھتیجوں کو دیکھ کر ساری حقیقت ان کی سمجھ میں آگئی۔

"یہ شرفاء کا طریقہ نہیں ہے حمید! آپ تحمل سے بھی اپنا مطمحِ بیان کرسکتے ہو۔" عبداللہ نے شائستگی سے کہا۔

"خاموش رہو بڑے میاں!" رشید زہرخند ہوا۔ "اس گاؤں میں رہنا ہے تو اپنے ان سپولیوں کو لگام ڈال کر رکھو..... ورنہ انجام کے ذمے دار تم ہی ہوگے۔"

اس اندازِ تخاطب پر علی کا خون کھول اٹھا۔ وہ جھپٹ کر آگے بڑھا لیکن عبداللہ نے اس کا بازو سختی سے جکڑ لیا۔

"کوئی فائدہ نہیں ان سے الجھنے کا..... میں ان کے بزرگوں سے خود بات کروں گا۔"

وہ خاموشی سے گھر چلے آئے۔ یہ اہانت علی کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ اس شام کسی سے بھی ذکر کیے بغیر تبریز عالم کی حویلی پہنچ گیا۔ جانے کیوں دل خوش فہم تھا کہ وہ اس قضیے پر ضرور منصفانہ کردار ادا کریں گے۔

وہ حسبِ حویلی کے مردان خانے میں ہی موجود تھے۔ اسے سامنے دیکھ کر ان کی تیوریوں کے بل گہرے ہوگئے۔

"کیوں آئے ہو؟" تبریز نے غراتے ہوئے کہا۔

"آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں..... آج صبح....."

"مجھے علم ہے اس واقعے کا....." انہوں نے قطع کلامی کی۔ "غلطی ان کی نہیں، تم باپ بیٹوں کی ہے..... مزید کچھ کہنا ہے تو بولو۔"

"تو کیا یہ سب آپ کی شہ پر کیا ہے انہوں نے؟" وہ ساکت رہ گیا۔

"اپنی زبان کو لگام دو علی! مجھ سے جواب طلبی کرو گے اب تم؟" وہ بھڑک گئے۔

"میری اتنی مجال کہاں؟ میں تو انصاف کی امید پر چلا آیا تھا۔" علی افسردہ تھا۔

"انصاف یہی ہے کہ تم لوگوں کا ناطقہ بند کر دیا جائے..... شیر پور میں بغاوت کی آبیاری کررہے ہو تم باپ بیٹے..... ساری زندگی جس جگہ کا نمک کھایا، آج اسی زمین سے غداری پر اتر آئے ہو۔"

"یہ غداری نہیں ہے چچا جان! ایک الگ وطن کی ضرورت وقت کا تقاضا ہے..... آپ اس حقیقت کو تسلیم کرلیجیے خدارا! اسی میں ہم سب کی بہتری ہے۔"

"بہت خوب! کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا! اب تو ہمیں سمجھائے گا کہ کیا بہتر ہے؟ ایک مولوی کا یہ لونڈا ہماری اعلیٰ تعلیم کی برابری کرنے چلا ہے۔" پرویز کے ان الفاظ اور انداز پر علی ششدر رہ گیا۔

"میں نے تو اسے جدید انگریزی تعلیم اور تم لوگوں سے گھلنے ملنے کے مواقع دیے ہی اس لیے تھے کہ اس پر جمی عالیہ بیگم کی کائی اتر جائے گی۔ اس کا غرور خاک میں مل جائے گا..... لیکن یہ آج بھی کنوئیں کا مینڈک ہی ہے۔" تبریز عالم نے تنفر سے کہا۔ "میری ایک بات کان کھول کر سن لو علی عبداللہ! شیر پور میں بنوارے کی باتوں کا پرچار کرنا چھوڑ

دو..... ہندوستان کی تقسیم ایک احمقانہ خیال ہے۔ صدیوں سے ایک ساتھ رہنے والے چند دیوانوں کی باتوں میں آکر اپنی زندگیاں برباد نہیں کریں گے..... میں اس گاؤں کے دیگر لوگوں کو یہ خودکشی نہیں کرنے دوں گا..... نعروں اور جذبات کے سہارے نئے ملک صرف خوابوں میں بنتے ہیں..... اور خواب دیکھنا تم جیسے بے وقوفوں کا مشغلہ ہے۔"

"آپ ان سب کی زندگیوں کا فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں؟ یہ تو سراسر زعونیت ہے۔"

"آج کے بعد یہاں بنوارے کی بات کی تو اس دھرتی کو تمہارے ہی خون سے غسل دیں گے ہم....." ماجد نے تیز دھار چاقو اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

علی نے طیش میں اس کا ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیا اور ایک زوردار گھونسا اس کے منہ پر دے مارا۔ پرویز اور حمید دندناتے ہوئے آگے بڑھے اور اسے پیچھے دھکیلتے ہوئے اس پر پل پڑے۔ ماجد نے چاقو کی نوک سے اس کا کرتہ ناف تک چیر ڈالا۔ وہ ان سب کی ٹھوکروں اور گھونسوں کی زد میں تھا۔ کچھ ہی لمحوں میں اس کا وجود خون اگلنے لگا۔ نیم مردہ تن کو بازوؤں سے گھسیٹتے وہ اسے نہر کے قریب درختوں کے جھنڈ میں پھینک آئے۔

جانے کتنی دیر وہ بے سدھ پڑا رہا۔ اپنے لہو کا ذائقہ اسے حلق میں اترتا محسوس ہو رہا تھا۔ غشی کے عالم میں کہیں دور سے کچھ آوازیں سماعت میں آنے لگیں۔ دھندلی بصارت میں مقید آخری منظر میں نبیل، رمیش اور نہال کی جھلک تھی۔

☆☆☆

وہ تینوں اسے کسی نہ کسی طرح گھر لے آئے تھے۔ عالیہ، بیٹے کی یہ حالت دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ اس کی دائیں ٹانگ کی ہڈی اور بائیں بازو کی کہنی ٹوٹ گئی تھی۔ چہرے اور جسم پر لگنے والی ضربوں کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا۔ دائیں پسلی پر لگنے والی ٹھوکریں بھی خاصی کاری تھیں۔

نہال، رمیش اور کرن روزانہ اس کی خبر گیری کے لیے آتے۔ نبیل بھی اسے سنبھالنے میں دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ اس کی ہمسائی تکلیف کو سکون پہنچانے کے لیے کسی نے بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی لیکن درد کے اصل ماخذ سے بھی بے خبر تھے۔ تبریز عالم کی اپنے والدین سے متعلق زہریلی موشگافیاں کسی ناگ کی طرح اس کے دل و دماغ کو ڈستی رہتیں۔ وہ [illegible]

[illegible]

جتلا ہو گیا۔ اس کی حالت کے پیشِ نظر نبیل نے بھی اپنی چھٹیاں بڑھالیں۔ علی اس کے فیصلے سے خوش نہ تھا۔

"آپ چلے جائیں واپس، کیوں قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں؟"

"تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر کیسے جاسکتا ہوں؟" وہ ذرا رعب سے بولا۔

"آپ کی پڑھائی کا بہت حرج ہوگا بھائی۔"

"ایک بات بتاؤ مجھے مٹھو! بالکل سچ سچ..... تم نے کیا بات اپنے دل میں دبا رکھی ہے؟ کون سا کانٹا ہے جس کی چبھن نے تمہیں بے حال کیا ہوا ہے.....؟"

"کوئی ایک ہو تو بتاؤں بھی۔"

"بابا تمہاری اس حالت سے کتنے افسردہ ہیں کچھ اندازہ ہے تمہیں؟" غصے سے اس کی آواز بلند ہوگئی۔ "تم کیوں گئے تھے آخر وہاں؟ مجھ سے تو پوچھا ہوتا۔"

عبداللہ اس کی بلند آواز سے گھبرا کر ان کے پاس ہی چلے آئے۔ علی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بولے۔ "میرا نہیں تو اپنی ماں کا ہی خیال کرلو..... تمہاری اس خاموشی اور اداسی نے اسے ادھ موا کر دیا ہے۔"

"تبریز عالم اور حویلی والوں سے ہمارا کیا رشتہ ہے بابا جان؟ ان کی اس نفرت کی کیا وجہ ہے؟ وہ کیوں آپ کو نیچا دکھانا چاہتے ہیں؟" اس کی آواز میں آنسوؤں کی شدت تھی۔

[illegible]

[illegible]

اس کمرے میں عبداللہ کے [illegible] کی آواز گونج رہی تھی۔ بیٹوں کی آنکھوں میں پگھلے لاوے اور دل ان کے دل و دماغ پر ایک نادیدہ دباؤ بڑھانے لگے۔ [illegible] رہنے کے بعد انہوں نے برسوں سے بند ماضی کی اس کتاب کے چند اوراق پلٹ کر ان کے سامنے کھول دیے۔

"اس گھرانے کے بے باک طریقوں سے تم واقف ہی ہو..... عالیہ بچپن ہی سے اس حویلی میں رہتی تھیں۔ اس کے والدین کی کم سنی میں ہی وفات پا گئے تھے۔ والدہ کی تربیت کے زیرِ اثر وہ اپنے چچا کی سب اولادوں میں سب

PakiBooks.Site

سے مختلف تھی۔ تیرہ سال کی عمر میں والدہ نے بھی ساتھ چھوڑ دیا اور وہ مکمل طور پر چچا کے دستِ نگر آ گئی۔ انہوں نے تبریز عالم سے چھوٹے گل ریز عالم سے اس کی نسبت طے کر دی جو عیاشی اور رنگین مزاجی میں اپنی مثال آپ تھا۔ سونے پر سہاگا اسے ولایت پڑھنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ وہاں اس نے پڑھائی کے علاوہ ہر سرگرمی میں بھرپور حصہ لیا۔ شراب و شباب اور ایسی کونسی علت تھی جس میں وہ مبتلا نہ تھا۔

عالیہ کی زندگی میں گھٹن نے ڈیرے جما لیے۔ وہ حویلی کے کونے کھدروں میں چھپ کر اپنی قسمت کی اس ستم ظریفی پر نیر بہاتی رہتی۔ والدین کا وجود خاک اوڑھ لے تو ہر سایہ پیش دینے لگتا ہے۔ اس سیدھی سادی لڑکی کے لیے شوہر اور گھر کا تصور ایک ایسا جہان تھا جہاں وہ محبت' سکون اور عزت سے دین و دنیا سنوار سکے۔

ایک شوہر..... جو صرف اس کا مونس اور ہمدم ہو..... جس کے کردار کی مضبوطی سے اس کی اولاد کا خمیر وجود میں آئے اور وہ اپنی والدہ سے ملا ورثہ ان میں منتقل کر سکے لیکن ان نازک سوچوں کی حامل اس کومل سی لڑکی کے نصیب میں ایک خاردار وجود لکھ دیا گیا جس کے ساتھ زندگی گزارنے کا محض تصور ہی اس کی روح میں گھٹن اور بے چینی برپا کر دیتا۔ بے بسی اور لاوارثی نے اسے اس رشتے کی زنجیر میں قید کر دیا تھا۔

تبریز کی بیوی عالیہ کی اس حالت سے بے خبر نہیں تھی۔ وہ اس زنداں کی آداب شناسی میں ہمیشہ پیش پیش رہتی۔

''مرد تو حاکم ہوتا ہے..... جو چاہے کر سکتا ہے..... اس گھرانے کے طور طریقوں سے تم بچپن ہی سے آشنا ہو..... گل ریز میاں جو بھی کریں..... خاندانی بیوی تو تم ہی رہو گی نا۔''

''لیکن بھابی بیگم! یہ سب افعال حرام ہیں..... دین میں ممنوع ہیں..... شراب پینے والوں کو ستر کوڑوں کی سزا ہے..... زانی کو سنگسار کرنے کا حکم ہے..... اس گناہ گار زندگی کا تاوان ہمیشہ اولاد کو ادا کرنا پڑتا ہے۔''

''ارے ہٹاؤ بھی! ایسا آج کے زمانے میں کہاں ممکن ہے بھلا؟ ہوگا تو وہی جو یہ سب مرد چاہیں گے۔ تم کیوں... خوامخواہ ہلکان ہو رہی ہو؟''

''میں کیسے ہلکان نہ ہوں بھابی بیگم! میں آئندہ کے حالات کو مدِنظر رکھ کر یہ سب کہہ رہی ہوں۔ دین اور دنیا کا توازن قائم نہ رہے تو ایک مکمل نسل تباہ ہو جاتی ہے اور یہاں محض عدم توازن ہے..... دین کی بنیاد ہی سے آشنا نہیں گل ریز..... آئندہ اپنی اولاد کو کیونکر اس میراث سے آشنا کروا پائیں گے؟'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''ناشکری ہو تم عالیہ بیگم! قدرت نے بیٹھے بٹھائے اتنا اچھا رشتہ عطا کر دیا ہے اور تمہارے عجب چونچلے ہیں..... اپنے ذہن سے یہ سب باتیں نکال دو اور حقیقت تسلیم کر لو۔'' انہوں نے رکھائی سے کہا۔

عالیہ کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ سو وہ صبر کے گھونٹ بھر کے رہ گئیں۔

چند سال بعد گل ریز تعلیم مکمل کیے بغیر واپس لوٹ آیا۔ مغرب کی تمام تر منفی خوبیاں اپنی ذات میں سموئے وہ ایک بگڑا ہوا نواب بن چکا تھا۔ اس کی بوالہوسی اب شیر پور کی بہو بیٹیوں کو میلا کرنے لگی۔ ان کے والد نے بیٹے کے بے لگام جذبات کو نکیل ڈالنے کے لیے اس کی فوری شادی کا فیصلہ کر لیا۔

حویلی میں شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ شہر کی مشہور طوائفیں اور عمدہ ترین شراب کے ذخائر بھی مردان خانے میں پہنچا دیے گئے۔ رات بھر رقص و سرود کی محفلیں جمائی جاتیں اور شراب کا بے دریغ استعمال ہوتا اور نشے میں ایک رات اس نے ایک مغنیہ و رقاصہ کی عزت پامال کر دی۔ وہ پیشہ ور طوائف ہرگز نہ تھی۔ اس لیے اپنی یہ بے حرمتی سہہ نہ سکی اور گل ریز کے پستول سے اپنی جان لے لی۔

عالیہ اس زیادتی پر خاموش نہ رہ سکی۔ اس نے شادی سے انکار کر دیا۔ حویلی ایک بھونچال کی زد میں آ گئی تھی۔ محبت، غصے، جذباتی استحصال سے اسے رام کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی لیکن اس کا مؤقف انتہائی اصولی تھا۔

دباؤ جب حد سے سوا ہوا تو وہ اپنی بپتا لیے مولانا صاحب کی اہلیہ طاہرہ بی بی کے پاس چلی آئی۔ انہی کے مشورے پر مولانا صاحب نے یہ مسئلہ پنچایت کے سامنے پیش کر دیا۔ تبریز عالم کے خاندان نے عالیہ کے اس قدم پر انتہائی سبکی تو محسوس کی لیکن دولت و جائداد کے لالچ میں مولانا صاحب کے بیٹے عبداللہ سے شادی کی مشروط رضامندی دے دی۔

حویلی کے افرادِ خانہ اتنا طویل عرصہ گزرنے کے بعد بھی عالیہ کے اس انکار کو اپنے لیے ناسور بنائے بیٹھے تھے۔

☆☆☆

عبداللہ کے ان انکشافات نے علی کے ذہن میں سوچوں کے کئی نئے در وا کر دیے۔

تربیت اور تہذیب کا جو فرق عالیہ' گل ریز اور تبریز کے مابین حائل تھا' وہ اب ایک گہری خلیج کی صورت میں اگلی نسل تک منتقل ہو چکا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں ایک نئی کشمکش چھڑ گئی۔

کچھ روز بعد کرن سنگھ اس کی عیادت کے لیے آیا تو خاموشی سے ایک پرچہ اسے تھما دیا۔ رعنا کی بے تابیوں اور پریشانیوں نے اسے مزید الجھنوں میں مبتلا کر دیا۔ کرن اور نہال دونوں ان کی محبت کے امین تھے۔

''کیسہ گل اے علی سیاں؟ چٹھی کا جواب نہیں بھیجے گا تو؟''

''نہیں کرن! میں صحت یاب ہوتے ہی تیرے گھر چکر لگاؤں گا۔'' وہ تھکے ہوئے انداز میں بولا۔

''تیرا اپنا گھر ہے وہ..... جس ویلے تیرا دل چاہے تو آ جانا۔'' وہ اس کی بات کا مطمحِ نظر بھانپ گیا تھا۔

کچھ وقت مزید گزرا تو علی نے چھڑی کے سہارے چلنا شروع کر دیا۔ نبیل سے نظر بچا کر وہ نہال اور کرن کے گھر چل دیا۔ رعنا تک بھی اس کی آمد کی اطلاع پہنچ گئی تھی۔ اس نے بھی وہاں پہنچنے میں تاخیر نہ کی اور آتے ہی اس پر چڑھ دوڑی۔

''کیا ضرورت تھی تمہیں اس روز ان سب سے الجھنے کی؟ اپنی بنی بنائی ساکھ تباہ کر لی تم نے۔''

''آپ اب بھی اس ساکھ کے لیے پریشان ہیں بس؟'' وہ گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے بولا۔

''ہاں تو اور کیا..... اب وہاں کوئی بھی تمہارا حامی نہیں رہا..... تمہاری بے وقوفی اور جذباتیت نے سب کچھ ختم کر دیا۔'' وہ تڑخ گئی۔ ''کیوں الجھے تم ان سب سے۔ اب بھی اگر معافی مانگ لو تو حالات پہلے جیسے ہو سکتے ہیں۔''

''تو آپ کے خیال میں غلطی صرف میری تھی؟'' اسے رعنا کی اس بات پر بہت دھچکا لگا۔ ''کیا وہ سب حق بجانب تھے؟''

''نہیں! میں نے ایسا تو نہیں کہا..... مگر ذرا تصور کرو..... اگر اس روز کملا وہاں موجود نہ ہوتی تو میں نہال اور کرن تک تمہاری اس بے وقوفی کی اطلاع کیسے پہنچاتی؟''

''بھلے والی ذات رب کریم کی ہے..... آپ یا کملا نہ ہوتیں تو کوئی اور سبب بن جاتا۔''

''دیکھو علی اب وقت آ گیا ہے کہ تم کچھ سنجیدہ اور سخت فیصلے لو۔'' وہ [illegible]

''[illegible] وقت آ گیا ہے۔'' اس نے [illegible]

ہجرت کا خیال احمقانہ ہے۔'' اس نے نخوت سے کہا۔

''میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتا آنسہ رعنا تبریز عالم صاحبہ!'' وہ ہر لفظ چباتے ہوئے بولا۔ ''کبھی سوچنا بھی مت ایسا۔ میں ایک رشتے کی بقا کے لیے اپنی حمیت اور عزت داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ آپ کے اہلِ خانہ میرے اور میرے والدین کے لیے جتنی نفرت و حقارت پالے بیٹھے ہیں' اس کے خاتمے کے لیے صدیاں درکار ہیں۔''

''تم ان سے معافی مانگ کر اپنی سیاسی وابستگی ترک کر دو گے تو سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے گا۔ باقی سب میں سنبھال لوں گی۔'' وہ اب بھی اسی بات پر بضد تھی۔

''میں بہت عام انسان ہوں رعنا! مخمل میں ٹاٹ کے پیوند لگانے کا تصور مت بنائیے۔ آپ جن آسائشات اور نظریات کی پروردہ ہیں' وہ میرے ذاتی وقار سے متصادم ہیں اور رہی بات سیاسی وابستگی کی..... تو وہ میرا مقصدِ حیات ہے۔ میں اسے ترک نہیں کر سکتا۔'' اس کا انداز دوٹوک تھا۔

''کیا میری محبت اتنی کمزور تھی کہ ایک آزمائش بھی نہ سہہ سکی؟'' وہ صدمے سے بولی۔

''نہیں..... دین کی محبت میرے لیے زیادہ اہم ہے۔''

''تو کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟'' وہ پل بھر میں بکھر گئی۔

''کرتا ہوں..... میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں رعنا! لیکن جناح اور پاکستان میرا عشق ہیں اور میں یہ عشق قربان نہیں کر سکتا۔ ہاں البتہ تمہیں اپنے وعدوں سے آزاد کیے دیتا ہوں۔''

رعنا گنگ رہ گئی۔ علی دھیرے سے اٹھا اور مزید کچھ کہے بغیر وہاں سے چل دیا۔

فضا ساکت تھی۔ صحن میں سکھ چین کے پیڑ تلے محبت سسکیاں لے رہی تھی۔

☆☆☆

علی کے زخم مندمل ہونے میں بہت سا وقت بیت گیا لیکن ہو گھاؤ دل پر لگے تھے ان کی ٹیسیں اور کسک اس کی ایک ساتھی بن گئی تھیں۔ نبیل نے اس دوران اپنی مصروفیات تج دیں۔ اسے اپنے جان سے بھی پیارے بھائی کی صحت اور شفایابی سے بڑھ کر اپنا مستقبل بھی عزیز نہ تھا۔

تقسیم کو دیوانے کا خواب قرار دینے والے اب انتخابات میں واضح مسلم برتری دیکھ کر اپنی انگلیاں دانتوں تلے دابے بیٹھے تھے۔ شیر پور میں تبریز عالم کے خاندان کی من مانیوں سے بیزار کئی ایک خاندان قریبی ریاستوں میں منتقل ہو

PakBooks.com

گئے۔عبداللہ کے رشتے داروں میں محض ایک ماموں تھے جو میر پور کی جامع مسجد میں امام تھے۔

شیر پور کی فضاؤں میں رچی اجنبیت کا کرب ناقابلِ برداشت ہونے لگا تھا۔عبداللہ اس وقت دہری کشمکش میں مبتلا تھے۔جنم بھومی سے دوری کا یارا ان میں بالکل نہ تھا۔گاؤں کے حالات دگرگوں ہونے لگے۔

ان دنوں اشوک چھٹیوں پر گھر آیا ہوا تھا۔علی کو درپیش حادثے کی بابت سنتے ہی وہ اس سے ملنے چلا آیا۔باتوں باتوں میں پرویز کا ذکر چھڑ گیا تو وہ منہ بنا کر بولا۔

''پرویز کی حرکتیں اسے کسی روز بہت نقصان پہنچائیں گی۔''

''کیوں،کیا ہوا اب؟''علی اور نبیل دونوں چوکنا ہو گئے۔

''علاقے کے ہندو مزارعوں پر ان لوگوں کا طنز و تمسخر بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔کرن سنگھ کو خوامخواہ رگید ڈالا اس نے گل ریز عالم کے بیٹوں کے ساتھ مل کر۔''

''اللہ ہی نیکی کی ہدایت دے انہیں۔''علی نے سادگی سے کہا۔

''یہ بھول رہے ہیں کہ بٹوارا ہوتے ہی یہ ہندو ریاست ہو گی جہاں ان کے یہ چھن انہیں بہت مہنگے پڑیں گے۔''وہ کچھ دیر بعد وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اگلے چند روز بعد ممتاز مولوی عبداللہ سے ملنے چلا آیا۔وہ شیر پور میں کافی عرصے سے اکیلا رہتا تھا۔بچے کی پیدائش کے موقع پر بیوی کی وفات کے بعد اب اس کے آگے پیچھے کوئی بھی نہ تھا۔والدین بھی بہت عرصہ قبل داغِ مفارقت دے چکے تھے۔

''مولوی جی!ایک عرض گزارنی ہے آپ سے.....مجھے علم ہوا ہے کہ آپ مسجد کی امامت کے پیشِ نظر ہجرت کرنے میں متامل ہیں۔یہ ذمے داری مجھے سونپ دیجیے اور اپنے بیٹوں کے بہترین مستقبل کے لیے آپ شیر پور چھوڑ دیجیے۔''

''اتنا آسان بھی نہیں یہ ممتاز میاں!لیکن دل پر پتھر رکھے یہ کڑوا گھونٹ پینا بھی ضروری ہے۔''وہ اداسی سے بولے۔

اس رات انہوں نے ہجرت کے حتمی فیصلہ سے اہلخانہ کو بھی آگاہ کر دیا۔عالیہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔وہ حسرت بھری نظروں سے اپنے گھر کی چار دیواری کو تکنے لگیں۔محمد آباد اور غازی پور سے تعلیمی اسناد کی وصولی کے بعد انہیں اپنا ضروری مال و متاع ہی ساتھ لے جانا تھا۔

علی کے سینے میں گھٹن بڑھنے لگی۔اگلی شام وہ خاموشی سے کھیتوں کی مخصوص منڈیر پر جا بیٹھا۔زندگی کے تمام تر کھٹے میٹھے لمحات کی یادیں دل میں اداسی کے نکیلے پنجے گاڑے بیٹھی تھیں۔ڈوبتے سورج کی سرخی میں اسے اپنی ناتمام آرزوؤں کی شکستگی محسوس ہو رہی تھی۔تھوڑی ہی دیر میں رمیش،کرن اور نہال بھی وہیں چلے آئے۔

''علی میاں!میری واہگرو سے پرارتھنا ہے کہ تم دونوں جہاں بھی جاؤ خوش رہو.....اور ہمیں یاد رکھنا۔''نہال نے اداسی سے کہا۔

''تم لوگوں کو کیسے بھول سکتا ہوں میں؟''

شیر پور کے اس ڈوبتے سورج کی اداس کرنوں نے اس الوداعی ملاقات کا کرب اپنے اندر سمو لیا۔

رمیش کاچاچا انہیں اپنے تانگے پر اسٹیشن چھوڑ آیا۔تاریکی میں ڈوبا شیر پور ہر گزرتے پل ان کی نظروں سے اوجھل ہوتا گیا۔ان سب کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔علی کا دکھ ان سب سے سوا تھا۔وہ بچپن کے بیلیوں کے علاوہ اپنی محبت بھی یہیں دفن کیے جا رہا تھا۔زندگی کی کتاب سے ایک حسین باب ختم ہوا۔اندھیری رات میں وہ ایک نئی منزل کی جانب گامزن ہوئے تو مسجد سے ممتاز کی پُرسوز آواز اذانِ فجر ادا کر رہی تھی۔

☆☆☆

مؤذن کی آواز سماعت میں پڑی تو علی کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی۔ساری رات ماضی کے دشت میں بھٹکتے نیند تو ایک پل کے لیے بھی نہیں آئی تھی۔نماز کی ادائیگی اور زبانی تلاوت کے بعد اب وہ سرمد کی آمد کے منتظر تھے۔جسم ..... سے درد کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔آنکھوں میں رت جگے کی جلن اور اپنوں کی یادوں کی تپش تھی۔

''گڈ مارننگ بابا جان!اب طبیعت کیسی ہے آپ کی؟''سرمد کی مسکراتی آواز نے انہیں خیالات سے چونکا دیا۔

''السلام علیکم بیٹا!''وہ پژمردگی سے بولے۔

''تمہاری ذات میں در آنے والی یہ تبدیلیاں میرا دل بہت دکھاتی ہیں سرمد!''

اوہو!یہ کونسا اتنا بڑا مسئلہ ہے۔یہ ادب و آداب تو ایک معمول ہیں ہمارے معاشرے میں.....بس ایک فیشن سمجھ لیں۔''

''دین فیشن کب سے بن گیا بیٹا؟یہ تو زندگی کا ایک لازمی جزو ہے۔اب کیا ہوا ایسا؟''

''چھوڑیں اس بحث کو.....آپ ناشتا کیجیے.....''اس نے ٹالتے ہوئے کہا تو وہ خاموشی سے میکانکی انداز میں شوربے میں ڈوبی نرم روٹی زہر مار کرتے رہے۔

''بہو کو تھوڑی دیر کے لیے بھیجنا ابھی میرے پاس۔''

''وہ تو سو رہی ہے۔جب بھی جاگی میں اسے کہہ دوں گا۔''

دو گھنٹے بعد وہ مصروف سے انداز میں ان کے کمرے میں آئی اور کہنے لگی۔''جی بابا جان!آپ نے بلایا تھا مجھے؟''

''ہاں بیٹا!کچھ ضروری معاملات پر بات کرنی تھی آپ سے۔''انہوں نے گہری سانس لے کر اسے مخاطب کیا۔''بچوں کی تربیت اس دنیا کا کٹھن ترین امر ہے.....بچے مٹی کا وہ برتن ہوتے ہیں،جنہیں کمہار کے مشاق ہاتھ کسی بھی سانچے میں ڈھال لیتے ہیں اور یہی نقوش دائمی ہوتے ہیں.....''

''کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟کھل کر کہیے۔''اس نے قطع کلامی کی۔

''ہمارے وقتوں میں مائیں باوضو ہو کر بچے کو دودھ پلاتی تھیں.....انہیں کم سنی سے ہی اپنی اقدار سے آگاہی دی جاتی۔''

''تو یہ سب مجھے کیوں جتا رہے ہیں آپ؟''وہ بیزاری سے بولی۔

''میں تو بس یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بچوں کی تربیت کے رنگ بہت کچے ہیں،ان پر خصوصی توجہ درکار ہے۔''

''ایسا آپ کو لگتا ہے۔ورنہ ہمارے بچوں کے اخلاق و اقدار اور بہترین تعلیم کی تو ہر کوئی تعریف کرتا ہے۔''

''تعلیم الگ معاملہ ہے اور تربیت ایک بالکل الگ پہلو.....ان کی تربیت اغیار کے ہاتھوں میں دے کر بہت بڑی غلطی کر رہے ہو تم دونوں۔انہیں اپنے مدار سے بھٹکنے سے بچا لو۔''

''وہ بہترین ادارے میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ہم ان کی کارکردگی سے مکمل مطمئن ہیں۔''

''لیکن ان کے ذہنوں میں جو نظریات موجود ہیں.....وہ کسی بھی طور قابلِ قبول نہیں۔میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔''وہ بضد ہو گئے۔

''یہ سب دقیانوسی باتیں ہیں۔بچوں کو جدیدیت سے آشنا کرنے کے لیے انہیں جدید تعلیمی اداروں میں بھیجنا بہت ضروری ہے۔لگتا ہے آپ کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گی۔''وہ کوفت سے بولی۔

نکلے پہ دھلا

☆جوتیوں میں دال کب بٹتی ہے؟

○جب میاں بیوی کی لڑائی میں پلیٹیں ٹوٹ جاتی ہیں۔

☆محبت کی جنگ جیتنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

○ہونے والے سسر صاحب کی مٹھی چاپی۔

☆شاپنگ بیگ کس نے ایجاد کیے تھے.....؟

○جس کے گھر میں دودھ لانے کے لیے برتن نہیں تھا۔

☆رائی کا پہاڑ کب بنتا ہے؟

○بیوی کے سامنے کسی کی تعریف کر کے دیکھ لیں۔

☆ہاتھوں کے طوطے کب اڑتے ہیں؟

○اگر محبوبہ کو کی گئی کال اس کے والدِ محترم اٹھا لیں۔

☆جب دل بہت اداس ہو تو کیا کرنا چاہیے؟

○کسی خاتون سے جوتے کھا لینے چاہئیں۔

☆اگر محبت اور جنگ میں واقعی سب جائز ہوتا تو ؟

○[illegible]

''[illegible]

''وقت خواہ جیسا بھی ہو.....اس کے ہر عرض کا حل الہامی کتاب میں پوشیدہ ہے۔تم بچوں کو تھوڑی دیر میرے پاس بھیج دیا کرو۔میں انہیں خود ان تعلیمات سے آشنا کروا دوں گا۔''انہوں نے تحمل سے کہا۔

''ان کے پاس اتنا وقت ہی کہاں ہوتا ہے؟آپ خوامخواہ ہلکان ہو رہے ہیں۔ہم ان کا بھلا بُرا بہتر سمجھ سکتے ہیں۔''اس کی بیزاری نمایاں ہونے لگی۔''اور رہی مذہبی تعلیمات کی بات.....قاری صاحب روزانہ انہیں پڑھانے آتے ہیں۔جو جیسا چل رہا ہے چلنے دیں۔ابھی ان کی عمر

PakiBooks.Site

نہیں ہے اتنا بوجھ سہنے کی۔ ان کے لیے کیا ضروری ہے اور کتنا ضروری ہے، یہ ہم بہتر جانتے ہیں۔ اس لیے خدارا خود بھی سکون میں رہیں اور ہمیں بھی سکون سے جینے دیں۔'' وہ کسی بھی لگی لپٹی کے بغیر بولی اور اٹھ کر چل دی۔

علی عبداللہ اس اندازِ گفتگو پر ششدر رہ گئے۔ اولین تربیت گاہ قرار دی جانے والی اس ہستی کے ان خیالات، سوچ اور بے حسی نے انہیں گنگ کر دیا۔ ذہن آندھیوں کی زد میں تھا۔ جانے کمرے کے کس خفیہ گوشے سے کچھ آسیب برآمد ہوئے اور چشم زدن میں انہیں نگل کر وقت کی گردش میں سفر کرتے ایک انجانے موڑ پر لے جا پھینکا۔

☆☆☆

وہ سرزمین بہت اجنبی تھی اور اس سے بھی اجنبی وہ سب خود تھے۔

دھول مٹی سے اٹے بال، متورم آنکھیں، چہرے پر برتی وحشت لیے وہ خالی نظروں سے اردگرد کے ماحول سے شناسائی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ دیر قبل ہی وہ سب عبداللہ کے ماموں زاد بھائی شفیق الرحمن کے ہاں پہنچے تھے۔ شفیق کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ سرخ و سپید جہاندیدہ فرد تھے۔

''فیصلہ مشکل ضرور تھا میرے بھائی! لیکن تم اب اپنوں میں موجود ہو۔ پروردگار ضرور تمہارے اس فیصلے میں برکت پیدا فرمائے گا۔'' انہوں نے خوشدلی سے ان کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے دیکھو! میں بھی یہاں کبھی اجنبی تھا مگر ہمارے دین کے پیروکاروں کے دل بہت کشادہ ہوتے ہیں۔ صدیوں پہلے مواخات کے رشتے نے ایک عظیم مثال کی بنیاد رکھی تھی، آج بھی یہی جذبہ سلامت ہے۔''

اور پھر یہی ہوا۔

وقت نے دھیرے دھیرے زخم مندمل کرنے کا آغاز کر دیا۔ میر پور کی اس نواحی بستی میں وہ بھی رچ بس گئے۔ انہی دنوں شفیق کا ایک ہندو پڑوسی ریاست اتر پردیش میں منتقلی کے لیے اپنا مکان فروخت کرنا چاہتا تھا۔ عبداللہ نے اپنی جمع پونجی سے اسے خرید لیا لیکن دل میں سے اس کچے آنگن کی خوشبو نہ جا سکی۔ تعلیمی اسناد اور شاندار ریکارڈ کی وجہ سے نبیل اور علی کا داخلہ ڈھاکا یونیورسٹی میں ہو گیا۔ شفیق نے جوڑوں کے درد کے باعث امامت عبداللہ کو سونپ دی اور عالیہ نے حسبِ سابق محلے کی بچیوں کو قرآن پاک پڑھانے کا آغاز کر دیا۔ زندگی ایک لگے بندھے معمول پر چل نکلی۔

نئی جگہ، نئے لوگ، نئی ذمے داریوں میں بھی وہ اپنے پرانے عہد نہ بھولے تھے۔ وہ قرض تو انہیں بہر صورت ادا کرنا تھا۔ سالہا سال سے آزادی کے لیے جاری وہ جنگ بھی اپنے اختتام تک آن پہنچی۔ بظاہر مہذب اور انصاف پسند قوم نے اس خطے سے اپنے ''اخراج'' کا بہت جان لیوا ''خراج'' وصول کیا۔ پنجاب کے مسلم اکثریتی علاقے جنبشِ قلم سے ہندوستان کے حوالے کرنے کا وہ غیر منطقی فیصلہ کروڑوں افراد کی زندگیوں پر اثر انداز ہوا۔ انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک ہی ملک میں ہزاروں میل لمبی سرحد در آئی۔ اہلبیست کی آشیر باد ... میں موت و بے حرمتی کا رقص دیکھتے لٹے پٹے مہاجر اپنا سب کچھ لٹائے بربادی اور بربریت کا مجسم وجود بنے روح فرسا داستانیں سناتے۔ یہ بٹوارا ایک ایسا خلا بن گیا تھا جس نے ابھی جانے کتنی نسلیں اجاڑنی تھیں۔ شاعر کے نرم و نازک اس خواب کی تعبیر بہت خونیں تھی۔

وہ ان کی قومی زندگی کا کڑا ترین وقت تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں لٹنے والے ان حرماں نصیبوں کے لیے کئی کیمپ لگائے گئے۔ نبیل اور علی جیسے کئی افراد نے ان کی خدمت و بقا کا بیڑا اٹھا لیا۔ اس وقت وہ ایک جسدِ واحد کے مانند ہر عضو کی تکلیف محسوس کر رہے تھے۔

مہاجرین کی یہ حالت دیکھ کر اسے شیر پور کے ان گرد آلود رستوں میں کھوئے چہرے بہت یاد آتے۔ جانے ان پر کیا بیتی؟ تبریزِ عالم کی ہٹ دھرم فطرت نے کیا گل کھلائے؟ وہ انجان تھا اور ہر لمحہ امید و یاس کے ہنڈولے میں جھولتا۔ دل میں اٹھتا درد جب بے حال کرتا تو وہ نہال، کرن، رمیش اور اشوک سے رابطہ کرنے کا عزم پھر سے دہرانے لگتا لیکن کاروبارِ زندگی مکمل طور پر مفلوج تھا۔

اس ہزاروں میل لمبی سرحد اور دوری پر شفیق الرحمن بہت ملول اور افسردہ رہتے۔ انہیں ایک خاموشی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ شفیق کے بھی دو ہی بچے تھے۔ بڑا بیٹا شبیر، نبیل سے برس دو برس ہی بڑا تھا اور بیٹی شگفتہ، علی کی... ہم عمر تھی۔ ان کی والدہ کی وفات کے بعد شفیق نے انہیں اپنے خونِ جگر سے پروان چڑھایا تھا اور دونوں ہی بہت لائق و سعادت مند تھے۔ والد کی اس افسردہ حالت کا اثر لامحالہ طور پر انہی پر سب سے زیادہ ہوا۔

جولائی کی اس گرم ترین شام میں شگفتہ، عالیہ سے ملنے چلی آئی۔ کجرارے نینوں میں بنگال کا سارا حسن اور جادو سمویا محسوس ہوتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چھپی نمی اور اداسی پر عالیہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔

''کیا بات ہے شگو! اتنی افسردگی کاہے کی بٹیا؟''

''چچی جان! یہ رشتے ناتے انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہوتے ہیں۔ ان سے جڑے دل کے تاروں میں افسردگی و خوشی تو آپوں آپ چلی آتی ہے۔'' وہ چولہے کے پاس بیٹھی کچی زمین پر تنکے سے بے معنی لکیریں کھینچنے لگی۔

''کہہ تو ٹھیک رہی ہو بٹیا! اس کڑے وقت میں رشتوں کی اپنے آس پاس موجودگی بھی تو کسی انعام سے کم نہیں ہے۔''

''چچی جان! ایک التجا ہے آپ سے...... چچا جان سے کہیے نا ابا جی کو سمجھائیں۔ انہیں کس بات کا غم کھائے جا رہا ہے؟ ہمارا ان کے سوا آخر ہے ہی کون؟'' اس کے آنسو چھلک گئے۔

''پروردگار انہیں ہمیشہ سلامت رکھے...... میں آج ہی بات کرتی ہوں نبیل کے بابا سے۔''

شگفتہ ممنون نظروں سے اسے دیکھتی چلی گئی۔ بن ماں کے ان بچوں کے کردار، سوچ اور رکھ رکھاؤ نے انہیں بہت متاثر کیا تھا اور اس قلیل مدت میں ہی انہیں بہت عزیز ہو گئے تھے۔ اس رات عشا کے بعد عالیہ نے اس کے خدشات وضاحت سے شوہر اور بچوں کے سامنے رکھ دیے۔

''شفیق چچا کے اندیشے بے جا ہیں بابا جان! دوریاں اگر دلوں میں نہ آئیں تو یہ زمینی فاصلے بے معنی ہوتے ہیں۔'' نبیل نے کہا۔

''بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ چلے چلتے ہیں آج ہی۔'' علی نے فوری تجویز دی۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ شفیق کے پاس موجود تھے جن کے اندیشے لامتناہی تھے۔

''فاصلے بہت بڑے [illegible] ناتوں کو نگل لیتے ہیں لیکن تم لوگ ابھی [illegible] ہو...... اس لیے ان خدشات کو سمجھ نہیں پاؤ گے۔'' انہوں نے دل گرفتگی سے کہا۔

''میں آپ کی ہر بات سے متفق ہوں بھائی شفیق! لیکن ابھی اس قوم کو ہمارے تجربے اور حوصلے کی بہت ضرورت ہے...... اگر حوصلہ ہار بیٹھے تو انہیں کون رستہ دکھائے گا؟'' عبداللہ نے دلاسا دیا۔

''میں اب شبیر کی جلد از جلد شادی کر دینا چاہتا ہوں۔''

''[illegible]...... بسم اللہ کیجیے۔''

[illegible] شبیر ایک مقامی کارخانے [illegible] دوستوں کے ساتھ [illegible] اس کی واپسی کے بعد شفیق [illegible]

اس کا عندیہ لینا چاہا تو وہ یکدم خاموش ہو گیا۔ پھر دھیرے سے بولا۔

''میں آپ کے جذبات کی بھرپور قدر کرتا ہوں ابا جی! لیکن میں ایک عرض کرنا چاہتا ہوں...... ایک سال قبل جب اس قوم پر قیامت ٹوٹی تھی تو کیمپوں میں مجروح انسانیت، بے عصمت زندہ لاشے اور سسکیاں دیکھ کر میں نے اپنے آپ سے ایک عہد لیا تھا کہ میں جب بھی عقدِ نکاح میں بندھنے کے قابل ہوا، تو انہی بدنصیبوں میں سے کسی ایک کا ہاتھ تھاموں گا... اور اس کا سر اپنے نام، عزت اور وقار کی ردا سے ڈھانپوں گا۔ نور فاطمہ بھی ایسی ہی ایک حرماں نصیب ہے۔''

''بہت احسن فیصلہ ہے میاں!'' عبداللہ نے کہا۔ ''ان کے تن پر لگے زخم تو مندمل ہو جائیں گے لیکن ان کی روح میں ناپاک ہاتھوں اور بے حرمتی کے ناسور ایسے اقدام ہی سے مندمل ہو پائیں گے۔''

''میں اس فیصلے میں تیرے ساتھ ہوں بیٹے!'' شفیق نے نم لہجے میں کہا۔ ''رمضان کے فوری بعد یہ نکاح میں خود پڑھاؤں گا۔''

اداس بوجھل لمحوں میں خوشی اور امید کی ایک نئی کرن اجاگر ہو گئی۔ شادی کی رسومات کی ادائیگی سادگی سے کی گئیں لیکن علی کی زندگی سے سکون اور خوشی [illegible] ایک آسیب کی طرح [illegible] اور لاچاری کی [illegible]

[illegible]

''پتا نہیں بھائی! [illegible] سر جھکا لیا۔ ''آپ کو خوف محسوس [illegible] بڑے نقصان کا خوف!''

نبیل اس کی بات پر چونک گیا اور ایک گہری سانس لے کر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''سچ کہوں منو! کچھ ایسے ہی جذبات...... میرے بھی ہیں۔ کسی انہونی کا خدشہ لاحق ہے...... کچھ کھو دینے کا احساس ہے جو ایک پل بھی چین نہیں لینے دے رہا۔''

بھادوں کی اس پرحبس رات میں وہ کتنی ہی دیر اپنے

بچپن اور اسکول کے قصے دُہرا کر اپنے خدشات نظرانداز کرنے کی سعی کرتے رہے۔

☆☆☆

منتشر زندگی دھیرے دھیرے لگے بندھے معمول پر آگئی۔عبداللہ نے امامت کے علاوہ ایک مقامی اسکول میں اردو زبان کی تدریس کا بیڑا اٹھالیا۔نبیل اور علی کی تعلیم بھی اختتامی مراحل میں آن پہنچی تھی۔شفیق الرحمن کے گھر بھی بہو کی آمد نے بہت رونق پیدا کردی۔

ماہ ستمبر کسی شکر کے مانند ایک بار پھر جلوہ افروز تھا۔کچھ عرصہ قبل اسی شکر نے اس کی نوخیز محبت ہمیشہ کے لیے چھینی تھی۔نہال اور کرن سنگھ کو بہتیری چٹھیاں بھیجنے پر بھی اسے... تاحال کوئی جواب موصول نہ ہوا تھا۔بے چینی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔

وہ بھی ایک معمول جیسا روز تھا لیکن سورج کی کرنوں میں اداسی اور فضاؤں میں سناٹے کا راج تھا۔یونیورسٹی میں حاضری بہت کم تھی۔تھوڑی ہی دیر میں انہیں آڈیٹوریم میں طلب کرلیا گیا۔بلند اسٹیج پر لہورنگ آنکھوں اور دھواں دھواں ہوتے چہرہ لیے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ سر نیسوڑائے کھڑے تھے۔

''آج کا دن ہماری قومی تاریخ میں ایک ''سیاہ دن'' ہے۔ہم نے اپنے سپہ سالار اُس قوم کے سب سے بڑے مسیحا اور نجات دہندہ کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہے.....محمد علی جناح اب ہم میں نہیں رہے.....''ان کی آنسوؤں سے بوجھل آواز نے ہال میں موجود طلبہ کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی۔

''یہ بلاشبہ ایک بہت کڑا وقت ہے لیکن صبر کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں.....اپنا وقار بلند رکھیے.....اور یاد رکھیے کہ مرحوم آپ سب طلبہ کو اپنی سب سے قیمتی متاع قرار دیتے تھے۔ان کے ادھورے خوابوں کی تکمیل اب آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔''

وہاں موت کا سناٹا طاری تھا۔علی کے ضبط کا دامن تار تار ہوگیا اور آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک جھڑی لگ گئی۔اس کا عشق جدائی کا ناقابل مندمل زخم دے کر اپنی آخری منزل پر روانہ ہوگیا تھا.....سکون آتا بھی تو کیسے؟ صبر ہوتا بھی تو کیونکر؟

ان دونوں کے جذبات اور دکھ اپنی جگہ لیکن اس سانحے کا سب سے زیادہ صدمہ شفیق الرحمن نے لیا تھا۔نبیل کی زبانی یہ خبر سن کر وہ کتنی ہی دیر بے حس و حرکت بیٹھے رہے اور پھر شکستہ آواز میں بولے۔

''آج یہ قوم یتیم ہوگئی.....نوزائیدگی میں یہ یتیمی کہیں مہلک ثابت نہ ہو جائے.....پروردگار رحم فرمائے اپنا.....'' ان کی ریش آنسوؤں سے تر تھی۔''یہ ریاست دو بھائی ہیں اور بھائیوں کے سر پر جب کوئی سربراہ نہ رہے تو اختلافات کی آندھی ان کا گھر تنکوں کی طرح اڑا لے جاتی ہے۔''

''ایسا کچھ نہ ہو گا بھائی جان! اچھے کی امید رکھیے۔''عبداللہ نے انہیں تسلی دی۔

''جب گھر کے سربراہ نہ رہیں تو ہر موسم آزمائش بن کر اترتا ہے۔مجھے ہولناک اندھیرے ہر طرف چھاتے محسوس ہونے لگے ہیں۔''وہ خود کلامی کرتے ان سب سے بیگانہ تھے۔

اداسی نے بال بکھیرے ہر سو ڈیرے جمالیے۔

☆☆☆

اس سانحے کے بعد شفیق الرحمٰن کے وجود کو خاموشی کے کہر نے ڈھانپ لیا۔وہ زیادہ تر تلاوت قرآن میں مگن رہتے یا زیر لب درود و وظائف پڑھتے چھت کی کڑیوں پر نظریں جمائے لیٹے رہتے۔شبیر اور نور فاطمہ کی ذہنی ہم آہنگی بھی بہت جلد ہوگئی۔رشتوں میں احترام اور گھر میں سکون و برکت تھی۔نبیل اور علی اپنی پڑھائی کی منازل طے کرتے اب اپنی منزل کے بہت قریب آگئے تھے۔

کرن اور نہال کی طرف سے جواب نہ ملنے پر مایوسی کے عالم میں علی نے رمیش کو محتاط انداز میں خط روانہ کیا۔اس کے خدشات ایک پل بھی دل و دماغ سے الگ نہ ہوتے تھے۔نبیل کی تعلیم مکمل ہوتے ہی اسے ایک مقامی کالج میں نوکری مل گئی۔اس روز اس کا جوش دیدنی تھا۔

''میں اپنے ذمے تمام تر قرض چکا دینا چاہتا ہوں۔ بہت خوش نصیب ہوں میں کہ یہ سعادت میسر آگئی ہے۔''وہ چمکتی آنکھوں سے علی کا ہاتھ دباتے ہوئے بولا۔

''پروردگار آپ کے بھی خواب تعبیر سے ہمکنار فرمائے بھائی!''علی نے اسے اپنے سینے سے لگالیا۔

نوکری ملتے ہی عالیہ کے سر پر بیٹے کی شادی کی دھن سوار ہوگئی۔نظرِ انتخاب شگفتہ کے سوا اور کسی پر ٹھہر بھی کیسے سکتی تھی؟ شادی کے ہنگامے جاگے تو روز و شب کے معمول ہی بدل گئے۔علی اپنے عزیز از جان بھائی کی زندگی کے اس اہم ترین موقع پر بہت خوش تھا۔ویسے کے روز وہ مہمانوں کے طعام کا بندوبست کرنے میں مگن تھا کہ ڈاکیے کی آمد اور اپنے نام کی پکار نے اس کا دل بے ہنگم انداز میں دھڑکا دیا۔لرزتے ہاتھوں سے اس نے خط تھاما۔شیر پور کا مانوس نام اور رمیش کا پتا

دیکھ کر اس نے ڈبڈباتی آنکھوں سے وہ لفافہ اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔الفاظ روشنائی اور کاغذ کی مخصوص مہک میں اسے اپنے بچپن کی گم گشتہ خوشبو مجسم دکھائی دینے لگی۔خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے وہ سب مہمانوں سے کنی کتراتا چھت پر چلا گیا۔

رمیش نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اسے تفصیلی خط لکھا تھا۔علی کی نظریں کاپی سے پھاڑے گئے اس کاغذ کی شفاف سطح پر پھسلنے لگیں۔حروف کی انگلی تھامے وہ تصور کی نگاہ سے شیر پور میں پہنچ گیا جہاں اسے ایک ہنگامہ برپا دکھائی دینے لگا۔

تبریز عالم کے بیٹے اور بھتیجوں کی فرعونیت نے سب سے پہلے کرن سنگھ اور نہال سنگھ کو لپیٹ میں لیا۔پرویز اور حمید کی پُرہوس نظریں کملا پر جانے کب سے گڑی تھیں۔موقع پاتے ہی..... انہوں نے اپنی مردانگی کے زعم میں.... اس کا دامنِ عصمت تار تار کردیا۔نہال نے صدائے احتجاج بلند کیا تو تبریز عالم نے انہیں دولت کے بل پر خریدنے کے جتن شروع کردیے لیکن ان کی خودداری اور غیرت نے اس سودے بازی سے انکار کردیا۔

''یہ پیسے سنبھال لے تبریز! کل کو تیری بیٹی کے کام جرور آویں گے.....یہ آگ جو تیرے بیٹے نے جلائی ہے اس کی تپش بہت جلد تم سب کو اپنی لپیٹ میں لے گی۔''نہال دیوانگی میں ہوش کھو بیٹھا۔

پرویز نے ان دونوں بھائیوں کو خاندان سمیت گاؤں سے باہر نکال دیا۔اپنے بوڑھے والدین کے ساتھ وہ جانے کن راہوں کی دھول بن گئے' کوئی نہ جان سکا لیکن ان کی آہیں اور سسکیاں تبریز عالم کے خاندان کے لیے بہت مہلک ثابت ہوئیں۔باپ اور بھائیوں کی عیاشیوں کا قرض رعنا کے کومل وجود نے سود سمیت ادا کیا۔

یہ وہ وقت تھا جب عبداللہ کے خاندان نے شیر پور سے ہجرت کرلی تھی۔رعنا اپنی اولین محبت و جنون کی اس ہیت کذائی پر نیم دیوانگی کی کیفیت کا شکار تھی اور اس کے بارے میں شنید یہی تھی کہ وہ آزادی کے قائدین اور مسلمانوں کی منزلِ مقصود پاکستان کے بارے میں مغلظات بکنے سے بھی گریز نہ کرتی۔اس کی [illegible] پاگل پن حویلی والوں کے لیے بھی اچنبھے کا باعث تھا۔[illegible] اس قضیے سے کبھی نہ رہی تھی لیکن رعنا کا [illegible]

ہوا میں اپنا [illegible] اجنبیت میں [illegible]

آنے لگا جسے محفوظ رکھنے کے لیے انہوں نے انگریز سرکار سے روابط میں تیزی پیدا کردی۔افسران کی خوشنودی کے لیے حویلی میں شراب و شباب کی محفلیں تواتر سے سجنے لگیں۔شیر پور کے غریب گھرانوں کی بہو بیٹیوں کی عزتیں پامال ہونے لگیں۔تبریز عالم نے اپنے بچاؤ کے لیے ایک ایسی آگ روشن کرلی جس کی تپش بالآخر اس کا اپنا نشیمن بھی خاکستر کرگئی۔

ایک ایسی ہی کسی محفل میں وہ سب جام لنڈھائے... مدہوش پڑے تھے جب ایڈورڈ نامی ایک بوڑھا افسر قصبے میں جمعومتابیت الخلا ڈھونڈتے زنان خانے کی طرف جانکلا اور رعنا کو دیکھ کر اپنے ہوش مزید کھو بیٹھا۔دیوار کی اوٹ سے حویلی کی ملازم خواتین' تبریز عالم کی بیوی اور بیٹی کی جھلک اس کے شیطانی دماغ میں چنگاریاں سلگا گئی۔

''نمک حرام.....غدار! اصل خزانہ تو اپنی بغل میں چھپائے بیٹھا ہے اور ہمیں سرانڈر زدہ چیزیں پیش کررہا ہے۔''

اس نے اپنے دیگر ساتھیوں سے اس ساری صورت حال کا ذکر کیا تو وہ بھی اس کے منصوبے سے متفق ہوگئے۔اگلی رات حویلی پر ایک قیامت بن کر اتری۔ان بوالہوسوں نے وہاں سب مردوں کی مشکیں کس دیں اور زنان خانے میں مکافاتِ عمل کا ایک لرزہ خیز وقت شروع ہوگیا۔زمین پھٹی نہ آسمان شق ہوا' مگر کئی انسانی وجود بے مول ہوگئے۔پرویز اور اس کے چچازاد بھائیوں کی مغلظات سے طیش میں آکر انہوں نے موقع پر ہی فائرنگ سے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔تبریز پر موت بھی مہربان نہ ہوسکی۔اس کی ٹانگوں میں لگنے والی گولیاں معذوری کا تحفہ دے گئیں۔گاؤں کے افراد اس سے اس قدر نفرت کرنے لگے تھے کہ کسی نے بھی اس کے اہل و عیال کی تدفین میں معاونت پیش نہ کی۔اپنی بوئی گئی فصل کی کٹائی اس کے بس میں ہی نہ تھی۔شیر پور کی حسرت زدہ نظروں سے بچنے کے لیے اس نے حویلی کو نذرِ آتش کردیا۔ مُردہ مرد اور نیم مُردہ عورتیں انہی نارنجی شعلوں کی خوراک بن گئے۔

تبریز عالم کی اس روز کے بعد کسی کو کچھ خبر نہ تھی۔محض قیاس آرائیوں کا ایک بازار گرم تھا۔وہ اسی آگ میں جل مرا یا اپنے وجود کا بار لیے کہیں روپوش ہوگیا.....شیر پور کبھی نہ جان پایا۔

مقامی افراد کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے جنگل کے پار ایک معذور فقیر دیکھا جو ہو بہو تبریز عالم جیسا دکھتا تھا۔اشوک نے اسے غازی آباد کی سڑکوں پر خاک آلود چہرے اور پھٹے پرانے کپڑوں میں موجود پایا مگر مصدقہ اطلاع تو تادمِ تحریر کسی

کے پاس نہ تھی۔

تکبر انا پرستی اپنوں سے چشم پوشی اور اغیار پر بھروسا ایک مکمل خاندان ملیامیٹ کر گیا۔ تبریز عالم رفتہ رفتہ ماضی کی دھند میں کھو گیا۔

☆☆☆

علی کا وجود شل ہو چکا تھا۔ رعنا پر گزری اس قیامت نے اس کی روح کے ریشے ادھیڑ دیے۔ چھت پر اکیلا بیٹھا وہ شدتِ غم سے بازوؤں میں دانت گاڑے اپنی چیخیں اور کراہیں دبانے لگا۔ میر پور میں آمد کے بعد اسے کم از کم ایک بات کی تسلی تو تھی کہ رعنا بقیہ حیات اپنے خاندان کے ساتھ من پسند زندگی گزارے گی لیکن اب رمیش کے ان انکشافات نے اسے ایک نئے عذاب سے دوچار کر دیا۔ آنکھوں میں چھانے والی آنسوؤں کی دھند اور پارہ پارہ ہوتے دل سے وہ محض ایک ہی بات سوچتا رہا۔

''کاش! مجھے رمیش کا یہ خط کبھی نہ مل پاتا۔ جھوٹی آس میں ہی سہی..... زندگی آسان تو رہ جاتی۔''

اس پل علی عبداللہ کے اندر بھی ایک موت واقع ہو گئی۔ وہ بیگانگی اور خود فراموشی کی کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔ نبیل کی رسم ولیمہ' چند ماہ بعد شفیق الرحمٰن کی موت' یونیورسٹی میں اپنی ڈگری کی تکمیل' والدین اور بڑے بھائی کی خوشی اس کے اندر جمی برف ایک انچ بھی نہ پگھلا سکی۔ وہ اس کی حالتِ زار محسوس تو کرتے لیکن توجیہہ سے بے خبر تھے اور بے خبری کتنی عظیم نعمت ہے..... یہ علی عبداللہ سے بڑھ کر کون جان سکتا تھا؟

عالیہ اب چھوٹے بیٹے کی بھی شادی کرنا چاہتی تھی مگر اس کی زندگی کا یہ روگ فی الوقت کسی بھی نئے رشتے کا متحمل نہیں تھا۔ اس نے مزید تعلیم کے لیے مصر کے معروف ادارے میں داخلہ لے لیا۔ وہ ان فضاؤں سے بہت دور چلا جانا چاہتا تھا جہاں ہواؤں میں اسے کچھ نادیدہ سسکیاں اور کراہیں گھٹن میں مبتلا کر دیتیں۔

لمحوں کا سفر طے کرتے جانے کتنے سال بیت گئے۔ مصر کے بعد اس نے شرعی علوم کے لیے سعودی عرب کے صحراؤں کی خاک چھانی تو سائنسی علوم کے لیے مغربی ممالک کے اداروں سے مستفید ہوتا رہا۔ اپنی روح میں موجود اس خلا کی تکمیل وہ تعلیم کے سمندر سے کرنا چاہتا تھا۔

والدین اور بھائی سے رابطہ صرف خط کتابت تک محدود تھا۔ نبیل کے پہلے بیٹے کی پیدائش پر وہ چند دن کے لیے ان سے ملاقات کرنے آیا۔ بھتیجے کو گود میں لیے سرشاری اور محبت نے اس کا دل گداز کر دیا۔ اس مختصر قیام میں اسے اپنے اردگرد تبدیلیوں کی لہر محسوس ہی نہ ہو سکی۔ شفیق الرحمٰن کے خدشات گزرے وقت میں مجسم ہوتے نظر آنے لگے۔

وقت کبھی کسی کے چلے جانے سے رکا ہے' نہ رکے گا۔ ہاں مگر جینے کے انداز ضرور بدل جایا کرتے ہیں۔ اس قوم کے مسیحا کی رحلت کے بعد بھی سوچ' نظریات' ترجیحات اور محبتوں میں واضح فرق در آیا تھا۔ سربراہ سے محرومی کے بعد گھر کے مکینوں میں سب سے پہلے بے حسی پیدا ہوئی۔ قربانیوں' خونی سفر اور وعدوں کی فصلِ بہار پر خزاں نے ڈیرے جما لیے۔ نفسانفسی اور ذاتی مفاد کی ترجیحات میں ان دونوں ریاستی بھائیوں کی اولاد خودرو پودوں کی طرح پروان چڑھنے لگی۔ اپنی ذات' مقام اور معراج سے اجنبی ہوتے یہ لوگ دانستہ طور پر خودغرضی کی راہوں پر دھکیلے گئے تھے اور المیہ تو یہ تھا کہ جو خواب آنکھوں میں سجائے اپنا آشیانہ تعمیر کیا تھا..... آج اسی کی حفاظت سے غافل ہو چکے تھے۔ ذاتیات کے دائروں میں مقید وہ اندھا دھند آسائشات کے حصول میں کوشاں تھے۔ وقت کی ظالم نظریں یہ سب کچھ دیکھتیں' کوتاہیوں کے تاوان کی وصولی کے لیے تیار تھیں۔

☆☆☆

نبیل عبداللہ اپنی نوکری اور زندگی سے بہت مطمئن تھا۔ اساتذہ سے کیے گئے وعدوں کا قرض وہ نہایت خلوص سے چکانے میں مگن تھا۔ زندگی میں بظاہر کوئی کمی نہ تھی لیکن علی کی خاموشی' غیر فطری زندگی اور ملکوں ملکوں بھٹکنے کی اس روش سے اس کے دل کا ایک کونا سدا ملول رہتا۔ شگفتہ ایک بہترین شریکِ حیات ثابت ہوئی۔ دو بیٹوں کی آمد نے زندگی کی تکمیل تو کر دی مگر چھوٹے بھائی کی زندگی میں ان خوبصورت لطافتوں کی کمی کا احساس نبیل کی خوشیاں بھی گہنائے رکھتا۔ والدین کی سوچ اور پریشانی سے بھی وہ غافل نہ تھا اس لیے علی سے حتمی بات کرنے کی ٹھان لی۔ اسے ایک تفصیلی خط بھیج کر میر پور طلب کیا گیا۔ ماہ ستمبر سے گریزاں علی عبداللہ ایک بار پھر اسی ماہ اپنوں میں لوٹ آیا۔

وہ آغازِ ستمبر تھا۔ عبداللہ' عالیہ' نبیل اور شگفتہ کے علاوہ شبیر اور نور فاطمہ نے بھی اسے گھیر رکھا تھا۔

''کس جرم کی سزا دے رہے ہو خود کو علی؟'' نبیل نے غصے سے پوچھا۔

کیسی سزا بھائی؟ زندگی اچھی خاصی پُرسکون گزر رہی ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''اپنے لیے تم بہت جی چکے..... اب خود سے منسلک رشتوں کے حقوق بھی پورے کر دو۔ تمہاری عمر کے لڑکے

خاصے عیال دار ہیں مگر تم نے جانے کیوں تجرد اختیار کر لیا ہے؟'' نبیل اداسی سے بولا۔

''لڑکا تو میں نہیں رہا اب۔'' وہ اس موضوع سے گریز پا تھا۔

''مجھے کیوں لگتا ہے علی..... کہ تم نے اپنے دل میں کوئی بہت گہرا زخم چھپا رکھا ہے' جس سے آج تک کوئی بھی واقف نہیں۔'' شبیر اسے گہری نظروں سے ٹٹولنے لگا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے..... آپ سب کیوں لٹھ لیے میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔'' وہ مصنوعی خفگی سے بولا۔ اپنے دل میں چھپے اس زخم کا بھید تو وہ مرتے دم تک کسی کو بھی نہیں دے سکتا تھا۔

''شادی کے لیے راضی ہو جاؤ میرے لال۔ اس سنت کی ادائیگی کر کے میرا بار ہلکا کر دو۔ میں روز آخرت اپنے رب کے سامنے تمام تر فرائض سے سبکدوش ہو کر جانا چاہتا ہوں۔'' عبداللہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''میں اب کوئی انکار یا بہانہ نہیں سنوں گی علی! تم اپنی زندگی سے بہت کھیل چکے..... اب مزید نہیں..... میں بہر صورت تیری شادی کروں گی اور اسی ماہ کروں گی۔'' عالیہ نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ان سب نے فرار کے سبھی رستے ختم کر دیے تھے۔

اپنے دل کی ٹیسیں دبا تا وہ اقرار کرنے کے بعد چھت پر تنہا جا بیٹھا۔ برسوں بعد وہ رات ایک بار پھر اس پر بہت بھاری تھی۔

☆☆☆

اپنے اقرار کے بعد اسے گھر میں ایک نئے ہنگامے کی قوی امید تھی لیکن اگلے ہی روز جو طوفان سامنے آیا' وہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

ان کے شر پسند ہمسایہ ملک نے برسوں پہلے لگے ایک زخم کی ٹیسیں سہتے ان ریاستی حدود میں شب خون مارا۔ تمام تر اختلافات بھلائے وہ یکجا ہو کر اپنے ''گھر'' کی حفاظت میں دیوانہ وار جت گئے۔ بچوں' بوڑھوں' عورتوں نے شب و روز اپنی فوج کی خدمت میں وقف کر دیے۔ جوان ابتدائی طبی امداد کے لیے وقف ہو گئے۔ سترہ روز جاری رہنے والی اس جنگ نے انہیں معاشی اعتبار سے برسوں پیچھے دھکیلا تو اخلاقیات میں صدیوں کا خلا پیدا کر دیا۔

اس تاریخی جنگ کے بعد علی کے لیے ایک فیصلہ بہت آسان ہو گیا اور اس نے کسی شہید کی بیوہ سے شادی کی تجویز پیش کر دی۔ عالیہ اور شگفتہ کے لیے اس پر عمل کرنا بہت دشوار

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ' سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ' ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں' اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 900 روپے
امریکا' کینیڈا' آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 9,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: مرزا شہباس فون نمبر: 0301-2454188
سرکولیشن منیجر..... سید منیر حسین 0333-3285269
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35804200-35804300

تھا تاہم نور فاطمہ اس کی سوچ سے مکمل متفق تھی۔علی اپنے خوابوں اور محبت کی موت کے بعد اپنے جذبات واحساسات کو بھی ''بیوگی'' ہی گردانتا تھا۔وہ کسی بھی کنواری اور الھڑ جذبوں کی حامل لڑکی سے ناتا جوڑ کر اپنے ضمیر کی عدالت میں کھڑے ہونے سے بہت خائف تھا۔

تعلیمی قابلیت کی بنا پر ڈھاکا یونیورسٹی میں تقرری اور عدیلہ نامی ایک جوان العمر بیوہ سے شادی نے اس کی زندگی کے نئے رخ متعین کردیے۔جنگ سے متاثرہ افراد نے بھی اپنی زندگیوں کی گاڑی ازسرِنو گھسیٹنی شروع کردی۔

اس کامیاب دفاع کے بعد خود اعتمادی کہیں نہ کہیں فخر و غرور کی حدود سے جاملی تھی۔سادگی میں تو ہمیشہ ہی اپنی مثال آپ تھے۔اس لیے گمان کرلیا کہ اس تازہ ترین ہزیمت کے بعد دشمن اپنے مورچوں سے بھی باہر نہ نکلے گا۔معاش کی فکر نے تن ایسا جکڑ لیا تھا کہ زندگی محض کمانے اور کھانے تک ہی محدود ہوکر رہ گئی۔

علی کی شادی مناسب اور باوقار انداز میں عدیلہ سے کر دی گئی۔اس نے گھرداری کے ساتھ بہت مان اور محبت سے شوہر کا بکھرا وجود بھی اپنی آغوشِ الفت میں سمیٹ لیا۔وہ سراپا محبت تھی۔پہلے شوہر کی شہادت کے بعد ایک خوبرو اعلیٰ تعلیم یافتہ شریک حیات کو پروردگار کا خصوصی انعام سمجھ کر اس کی دلی قدر کی۔اس کی خاموشی' مصروفیت اور لیے دیے رہنے والی فطرت سے بھی گلہ کیا نہ بیزاری کا اظہار۔اطاعت' محبت اور صبر سے وہ شوہر کے وجود کی سرد مہری پگھلانے میں جتی تھی اور قرائن بتاتے تھے کہ کامیابی اسی کا مقدر ٹھہرے گی۔

شادی کے تین سال بعد علی عبداللہ اولاد کی نعمت سے فیض یاب ہوا تو ایک عرصے سے چھایا کہر آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ گیا۔بیٹی جیسی رحمت پاکر وہ خوشی و سرشاری سے نڈھال تھا۔

''کیا نام رکھیں گے اس کا آپ؟'' عدیلہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''جو تم کہو.....اس رحمت کی اصل حق دار تو تم ہی ہو۔''

..... اس نے پہلی بار محبت سے اس کا ہاتھ تھاما۔

''میں اپنی بیٹی کا نام رعنا رکھوں گی۔'' شوہر کے لمس کی محبت دمک اسے ایک ہی پل میں معطر کرگئی۔

''رعن.....نا!''

''جی! رعنا.....آپ کی روح کی گہرائیوں میں بسا وہ نام جو ایک خلش بن کر آج بھی آپ کے وجود میں گڑا ہے.....جسے آپ اکثر چاندنی راتوں' برکھارتوں اور ٹھٹھرے جاڑوں میں من کی گہرائیوں سے پکارتے ہیں.....جو بیداری میں ایک قفل اور نیند میں تڑپ بن کر آپ کے چہرے اور زبان سے جھلکتا ہے۔'' عدیلہ دھیمے لہجے میں بلا تکان بولتی گئی۔''لیکن آپ یہ مت سوچیے گا کہ خدانخواستہ میں آپ سے کوئی گلہ کررہی ہوں۔میں اس داستان سے آگاہی کے لیے بھی کبھی اصرار نہیں کروں گی.....جانتی ہوں آپ اس راز کو کسی مقدس امانت کی طرح سنبھالے جینا چاہتے ہیں.....میں ہمیشہ اس سفر میں آپ کی آسانی کے لیے دعا گو رہی ہوں.....اور آئندہ بھی اپنے وجود سے ایک چھپر چھاؤں کی طرح آپ کے لیے جیتی رہوں گی۔''

علی کے الفاظ گنگ تھے۔اس نے عدیلہ کا ہاتھ تھاما اور اپنی نم آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولا۔''تم واقعی میرے والدین کی دعاؤں اور ریاضتوں کا ثمر ہو.....تمہاری ان محبتوں کا سدا مقروض رہوں گا۔''

عدیلہ کی بے ریا مسکراہٹ نے فرحت بخش کرنوں کی طرح اسے کیف و سرور میں مبتلا کردیا۔

☆☆☆

وہ علی کی زندگی کا ایک یادگار دور تھا۔

والدین کی دعاؤں اور شفقت بھری چھاؤں' بھائی کا مان بھرا ساتھ اور عدیلہ جیسی پُرخلوص شریکِ حیات نے اسے جینے کا ایک نیا طریقہ سکھادیا۔عدیلہ نے تو اس کے وجود میں گڑے کانٹے اپنی پلکوں سے چن لیے تھے۔یونیورسٹی سے فراغت کے بعد وہ اپنی ننھی رعنا کے ساتھ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوجاتا۔

نبیل کی اولاد جوانی کی سرحدیں چھونے لگی تھی۔شبیر کا بھی صرف ایک ہی بیٹا تھا جو ذہانت میں لاجواب تھا مگر آج کل والدین کے لیے خاصا دردِ سر بنا ہوا تھا۔شبیر دلبرداشتگی کے عالم میں ایک روز عبداللہ کے پاس چلا آیا۔

''چچا جان! آپ ہی سمجھایئے اسے۔کیوں اپنا مستقبل تباہ کرنے پر تلا ہے؟''

''کیا ہوا شبیر! عمران تو بہت سمجھدار اور باشعور لڑکا ہے۔'' عبداللہ حیران تھے۔

''خدا جانے کن لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے لگا ہے۔تہذیب اور برداشت تو ختم ہوچکے ہیں اس میں.....ایک ہی بات پر مصر ہے کہ مزید پڑھائی نہیں کروں گا۔''

''پڑھائی نہیں کرنی تو پھر کیا کرنا چاہتا ہے؟''

''چند نمبروں کے فرق سے میڈیکل کالج میں اس کا نام نہ آیا اور اب بھی یہی کہتا ہے پڑھ لکھ کر کونسا منسٹر بن جاؤں

گا؟ اچھی نوکریاں اور تنخواہیں تو مغربی پاکستان والوں کا مقدر ٹھہرتی ہیں.....ہم کیوں خوامخواہ اپنی توانائی ضائع کیے رکھتے ہیں؟'' شبیر کی آواز رندھ گئی۔

''انتہائی افسوسناک سوچ ہے یہ.....میرے پاس بھیجنا اسے شاید میں کچھ سمجھا سکوں۔'' انہوں نے تسلی دی۔

''محنت مزدوری کرنا اسے باعثِ شرم محسوس ہوتا ہے.....خدا جانے کیا مستقبل ہوگا اس لڑکے کا۔آج مجھے ابا جان کے اندیشے بالکل سچ ہوتے نظر آنے لگے ہیں۔'' وہ مایوسی سے بولا۔

''نا امیدی کفر ہے بیٹا.....رب بھلی کرے گا.....تم پریشان مت ہو۔''

شبیر تو مزید تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد چلا گیا لیکن عبداللہ سوچوں کے بھنور میں گھر گئے۔بہت سوچ بچار کے بعد انہوں نے دونوں بیٹوں سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

''بہت گمبھیر مسئلہ ہے بابا جان! عمران اس احساسِ محرومی کا تنہا شکار نہیں.....میرے کالج میں بھی یہ مایوسی ایک وبا کی طرح پھیلنے لگی ہے۔'' نبیل نے والد کی تمام گفتگو سننے کے بعد کہا۔

''مایوسی مرض ہے بیٹا.....ایسا مرض جو روح کو گھن لگائے اندھیروں میں دھکیل دیتا ہے.....تم دونوں بفضلِ الٰہی معلم ہو.....اس کا شافی علاج کرسکتے ہو۔''

''عمران کا مسئلہ میں حل کرنے کی کوشش کروں گا.....میڈیکل کالج سے میرے خصوصی روابط ہیں.....میں اس کا داخلہ کروادوں گا.....اس کی نا امیدی ختم کرنے کا فی الوقت یہی ایک ذریعہ ہے۔'' علی سنجیدگی سے بولا۔

اور پھر اس کی انتھک کوششوں سے اسے اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی۔شبیر اور نور فاطمہ علی کا شکریہ ادا کرتے نہ تھک رہے تھے۔

''بس ایک اور احسان کردینا مجھ پر علی!'' شبیر نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔''کسی سے بھی کہہ سن کر عمران کے ننھیال ساتھیوں کا پتا کرواتے رہنا۔''

''پریشان مت ہوں آپ.....میں اس کی مکمل ذمے داری لیتا ہوں۔'' علی نے دلاسا دیا۔

اس قضیے کا خوش اسلوبی سے اختتام انہیں بہت پُرسکون کرگیا لیکن یہ عافیت بھی وقتی ثابت ہوئی۔نبیل کے بڑے بیٹے کی اپنے دوستوں کے ساتھ اشتہاروں میں دلچسپی نے ان سبھی کو ششدر کردیا۔کل کو ان لوگوں کی تربیتی کورس کے لیے شہر سے باہر تھا اس لیے علی نے خود ہی اس سے بات کرنے کی ٹھان لی۔

''قاسم بیٹا! جن ہاتھوں میں قلم ہوں وہاں ہتھیار نہیں جچتے.....اور قلم سے بہترین کوئی ہتھیار نہیں۔آپ کی یہ غیر ذمے دارانہ روش ہمیں قبول نہیں بیٹا!''

''معاف کیجیے گا چچا میاں! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے.....آپ اس سے الگ رہیے۔'' اس کا لہجہ انتہائی اکھڑ تھا۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے قاسم؟ وہ ہم سے الگ نہیں ہیں.....چچا ہیں تمہارے۔'' شگفتہ سختی سے بولی۔

''زندگی میں پہلے مصائب کیا کم ہیں جو یہ اپنی نصیحتوں کا ٹوکرا اٹھائے چلے آئے ہیں۔اپنے کام سے کام کیوں نہیں رکھتے یہ؟'' اس نے بدلحاظی سے کہا۔

''کون سے مصائب ہیں آپ کی زندگی میں بیٹا؟ ذرا مجھے بھی آگاہ کیجیے۔'' علی دکھی ہونے لگا۔

''بھوکے ننگوں جیسی زندگی بسر کررہے ہیں ہم.....بس کولھو کے بیل کی طرح آپ لوگ ساری زندگی کتابوں کے گرد چکر لگاتے رہے.....اور اب ہمیں بھی اسی بیگار میں دھکیل رکھا ہے.....کیا مل جائے گا ہمیں پڑھ لکھ کر؟ آپ کو کیا مل گیا؟ عہدوں کی بندر بانٹ تو ہمیشہ اس ''حصے'' کے لوگوں کو مل جاتی ہے.....ہم یہاں بے کار مشقت میں جتے ہیں۔'' اس کی زبان سے انگارے برس رہے تھے۔

''تو اس سارے امر میں ان غیر قانونی ہتھیاروں کی کیا توجیہہ پیش کریں گے آپ؟'' علی اب بھی ضبط کا دامن تھامے ہوئے تھا۔

''اپنا حق چھیننے کے لیے۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔''اور آپ میرے معاملات میں آئندہ دخل اندازی سے گریز ہی کیجیے۔''

شگفتہ پھٹی پھٹی نظروں سے اپنے بیٹے کو دیکھتی رہی۔اس کی ذہانت پر فخر کرنے والی اس ماں کو ان منفی رجحانات کی نمو کا اندازہ ہی ہو نہ پایا تھا۔وہ دونوں ایک دوسرے سے نظریں چراتے اپنے آنسو ضبط کرنے لگے۔

اس رات علی کے ذہن میں شفیق الرحمٰن کے اندیشے سرسراتے رہے۔جب ایک ہی چھت تلے رہنے والے قریبی سگے رشتوں میں ایسی بدلحاظی پیدا ہوگئی تھی تو ہزاروں میل کا یہ فاصلہ کس قدر قاتل ثابت ہورہا ہوگا.....اس کی سوچیں جامد ہونے لگیں۔وہ شدت سے نبیل کی واپسی کا منتظر تھا۔

☆☆☆

دو ماہ کے تربیتی کورس سے واپسی کے بعد نبیل بہت خاموش اور مضمحل دکھائی دیتا تھا۔ پیشانی پر ہمہ وقت سوچ کی اَن گنت لکیریں نظر آتیں۔ علی کچھ دن تو اس کی حالت میں تبدیلی کا انتظار کرتا رہا پھر تھک ہار کر خود ہی اس سے بات کرنے کی ٹھان لی۔

''کیا بات ہے بھائی..... کس الجھن کا شکار ہیں آپ؟''

''مجھے خود بھی معلوم نہیں مٹھو! بس دعا گو ہوں کہ یہ الجھن میرا واہمہ ثابت ہو۔'' اس نے بوجھل سانس لی۔

''کیسا واہمہ؟ مجھے کھل کر بتایئے..... آپ کے دل کا بوجھ ہلکا ہوجائے گا۔''

''کالج کے اس تربیتی کورس میں کچھ ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں مٹھو! جو کسی بھی صورت قابلِ برداشت نہیں.....''

''یہ کیا بات ہوئی بھلا؟ ماضی سے ناتا توڑ لیا تو اپنی نئی نسل کو کیا ورثہ دے پائیں گے ہم؟'' علی مضطرب تھا۔

''تم اپنی یونیورسٹی کے معاملات پر بھی نظر رکھو..... تبدیلی کی یہ لہر اعلیٰ ثانوی اداروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے گی..... اور مجھے یہ پابندیاں منظور نہیں..... اگر کوئی دباؤ ڈالنے کی کوشش کی گئی تو میں یہ نوکری چھوڑ دوں گا لیکن اپنے پیشے اور فرائض سے خیانت نہیں کروں گا..... کسی صورت نہیں۔'' نبیل کا لہجہ اٹل تھا۔

اس کے خدشات بے بنیاد ثابت نہیں ہوئے۔ تغیر اب ملک کے سبھی تعلیمی اداروں میں اپنے پنجے گاڑ چکا تھا۔ ڈھاکا یونیورسٹی میں بھی اساتذہ اور نصابی معاملات میں ہنگامی تبدیلیاں ہونے لگیں۔ نئے اور ناتجربہ کار اساتذہ کی بھرتی نے سالوں سے رائج نظام اور بہترین نظم وضبط تلپٹ کردیا۔

وہ دونوں بھائی اپنی ذات میں الجھے اس نئے گرداب سے نمٹنے کی تراکیب سوچتے رہتے۔ وہ عبداللہ سے فی الحال یہ سبھی باتیں پوشیدہ رکھے ہوئے تھے۔ اس کشمکش میں گھرے وہ اپنے والد کو لاحق پریشانیوں سے بے خبر تھے۔

اس روز رعنا کی طبیعت خراب ہونے کے باعث علی نے یونیورسٹی سے چھٹی کرلی۔ ڈاکٹر سے چیک اپ کے بعد جب وہ واپس آیا تو عبداللہ اسے اپنے ساتھ چھت پر لے گئے۔ سرما کی زرد پھیکی سی دھوپ گھروں کی منڈیروں پر اونگھتی دکھائی دیتی تھی۔

''آپ آج گھر پر ہی ہیں بابا جان؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' وہ تشویش سے پوچھنے لگا۔ بڑھاپے کے باوجود وہ اب بھی مقامی اسکول میں اردو پڑھانے کا معمول جاری رکھے ہوئے تھے۔

''حالات عجیب نہج پر چل نکلے ہیں بیٹا! تربیت گاہوں اور اسکولوں میں انتظامی معاملات ایسے افراد کے ہاتھوں میں آگئے ہیں جو سراسر نااہل ہیں۔'' وہ بہت ملول تھے۔

''اوہ خدایا! کیا یہ بھی سننا باقی رہ گیا تھا۔'' علی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ''پتا نہیں یہ کون لوگ ہیں بابا جان؟ اداروں میں نو بھرتی شدہ افراد کی کثرت سامنے آنے لگی ہے لیکن ان کا پس منظر غیر واضح ہے..... ان کی شناخت جانے کیوں مجھے مشتبہ لگتی ہے۔ انہیں دیکھ کر دل کسی بڑے نقصان کا عندیہ دینے لگتا ہے۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا! میں بھی سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ہواؤں نے یہ کیسا رخ اختیار کرلیا ہے۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بھیڑوں کے ریوڑ میں انہی کی کھال پہنے بھیڑیے گھس آئے ہیں۔'' عبداللہ کے انداز میں بے پناہ تھکاوٹ تھی۔

''نئے بھرتی ہونے والے لادینی اور ذات پرستی کی طرف مائل کرنے لگے ہیں بابا جان! دین، وطن، اقدار تو کہیں کھونے لگی ہیں۔ محبت کا آفتاب گہنا رہا ہے..... نفرت و وحشت کے ہولناک اندھیروں کی آمد مجھے بہت بے چین کیے رکھتی ہے۔ کیا کروں میں؟ ان اندھیروں کو اجالے میں کیسے تبدیل کروں؟''

''فی الوقت میں ایک التجا کرنا چاہتا ہوں بیٹا! کچھ سال پہلے تم دونوں بھائیوں نے مجھے ہجرت کے لیے آمادہ کیا تھا۔ آج میری درخواست مان لو۔ یہاں میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ تم مغربی پاکستان میں نوکری حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ میں نبیل کو بھی یہ سب کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی اولاد کی منہ زوری مجھے خائف رکھتی ہے۔ وہ کبھی بھی یہ فیصلہ تسلیم نہیں کریں گے۔ مجھے امید ہے کہ تمہاری نوکری اور گھر بار کا انتظام کرنے تک میں انہیں سمجھا بجھا کر قائل کرلوں گا۔ اپنی زندگی کے اس آخری حصے میں کسی رشتے کو کھونے کی ہمت مجھ میں ہے نہ تمہاری ماں میں۔''

''یہ فیصلہ آسان ثابت نہ ہوگا بابا جان! لیکن میں کوشش ضرور کروں گا۔'' علی نے خلوصِ دل سے کہا۔

☆☆☆

عدیلہ اس کی روانگی کے مضمرات سے مکمل آگاہ تھی۔ عبداللہ نے فی الوقت اسے مزید کسی سے بھی بات کرنے سے منع کردیا تھا۔ یونیورسٹی سے کچھ ماہ کی چھٹیاں مل گئی

تھیں۔ اس پُرسکون انداز میں چھٹیوں کی اجازت پر اسے کوئی حیرانی نہیں ہوئی تھی۔ انتظامیہ علی جیسے ''بنیاد پرست'' اور پاکستان کی سالمیت و قربانیوں کے تذکرے کرنے والے اساتذہ سے یونہی دامن بچانے لگی تھی۔

''میرے گرمیوں کے چند جوڑے بھی رکھ دینا بیگ میں۔ موسم بدلتے دیر نہیں لگتی۔'' وہ رات کو پیکنگ میں مصروف عدیلہ سے بولا۔

''جی بہتر! رکھ دیتی ہوں۔''

''رعنا کا بہت خیال رکھنا..... اور اپنا بھی۔'' وہ بیوی کی اداسی بھانپ چکا تھا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ تم دونوں کو پہلے بلوالوں۔ پھر کسی بڑے گھر کا بندوبست ہوتے ہی باقی سب بھی آجائیں گے۔''

''مجھے خط کا جواب دینا مت بھولیے گا..... میں دل و جان سے منتظر رہوں گی۔''

''انشاء اللہ..... تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'' وہ سوئی ہوئی رعنا کی پیشانی چوم کر کہنے لگا۔ ''یہ جدائی بہت جلد دائمی خوشیوں میں بدل جائے گی۔ یہ میرا وعدہ ہے تم دونوں سے۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر عدیلہ کو بھی آغوشِ محبت میں سمیٹ لیا۔

اگلی صبح بارش کی جھڑی نے دل کا موسم مزید اداس کر دیا۔ وہ سب سے ملتا، عہد و پیمان لیتا اپنی نئی منزل کی جانب کوچ کرگیا۔ اس کی یہ نئی ذمے داری بہت تحمل، سمجھداری اور محنت کی متقاضی تھی اور وہ اسے انجام بالخیر تک پہنچانے کے لیے ذہنی طور پر تیار بھی تھا۔

کراچی ریلوے اسٹیشن پر اسے ایک دیرینہ دوست کرم داد مل گیا۔ کرم داد سے اس کی ملاقات سعودی عرب میں قیام کے دوران ہوئی تھی۔ وہ حج کی ادائیگی کے لیے وہاں آیا تھا اور اپنی رقم والے بیگ سے محرومی کے بعد خاصا پریشان تھا۔ علی کی معاونت کے بعد اس کے مسائل حل ہوگئے اور وہ دونوں دوستی کے بندھن میں بندھ گئے۔ ان کی خط کتابت کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا تھا اور یہاں آمد کے بارے میں علی اسے پہلے ہی اطلاع دے چکا تھا۔

''خوش آمدید سائیں!'' کرم داد گرمجوشی سے بغلگیر ہوا۔ ''میں اور میرا غریب خانہ کب سے منتظر ہیں آپ کے۔''

''کسی ہوٹل میں پڑ گئے ہو کرم داد؟ کسی ہوٹل میں بندوبست کروایا ہوتا۔''

''ہرگز نہیں سائیں! آپ یہاں چاہے ایک دن رہیں یا ایک سال..... میں کسی ہوٹل میں نہیں رہنے دوں گا آپ کو۔''

وہ اسے لیے اپنے مختصر فلیٹ میں آگیا۔ کرم داد کے والدین اور بیوی بچے اندرونِ سندھ میں رہتے تھے۔ وہ کراچی اسٹیل مل میں ملازم تھا اور اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ فلیٹ شیئر کرتا تھا۔ سفر کی تھکان اتار کر وہ رات تک خاصا تازہ دم ہوگیا۔ کرم داد چائے کے دو کپ لیے اس کے پاس بالکونی میں بیٹھ گیا۔ سمندر کی جانب سے چلنے والی ہوا دل میں عجب ترنگ پیدا کرنے لگی۔ اس نے اپنی آمد کے اسباب بلا کم و کاست اس کے گوش گزار کردیے۔

''میں آپ کا دکھ سمجھ سکتا ہوں سائیں! ادھر والوں کے گلے شکوے بے جا بھی نہیں ہیں..... غلطیاں تو ہم سے بھی ہوئی ہیں..... اپنے بڑے پن کے زعم میں ہم ایک نکتہ فراموش کر بیٹھے کہ چھوٹے ہمیشہ زیادہ توجہ و محبت کے طلبگار ہوتے ہیں۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''خیر اب تو آپ یہاں رہو گے تو خود ہی حقیقت آشنا ہوجاؤ گے۔''

اگلے چند ہفتوں میں حقائق کی تلخی علی کے سامنے پوری شدت سے عیاں تھی۔ بے نیازی اور بے حسی نے قومی رشتوں کو کہر زدہ کردیا تھا۔ حالات بدترین تنزلی کی جانب گامزن تھے۔ اس نے پہلی فرصت میں عدیلہ، عبداللہ اور نبیل کو الگ الگ خطوط روانہ کیے اور انہیں واضح طور پر سب کچھ بیان کرڈالا۔

بچپن میں پڑھی جانے والی ایک حکایت اسے بے طرح یاد آئی جب دو بھائی اپنے دشمنوں کا دلیری سے سامنا کر کے اسے دم دبا کر بھاگنے پر مجبور کردیتے۔ پھر دشمن نے جنگ کا لائحہ عمل تبدیل کرلیا اور بظاہر ہمدردی سے ایک کے کان بھرتا کہ اس جنگ میں فتح اور دفاع صرف تمہاری مرہونِ منت ہی تو ہے۔ دوسرا بھائی تمہاری محنت سے تعیش پسند زندگی گزار رہا ہے۔ نتیجتاً ان کا اتحاد پارہ پارہ ہونے سے دشمن انہیں الگ کرنے میں کامیاب ہوہی گیا۔ اس کا عزیز از جان وطن اس حکایت کے کرداروں جیسی صورتِ حال میں مبتلا تھا اور وہ شعور کے باوجود بے بسی سے ہاتھ ملنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

الگ رہائش اور نوکری کا حصول اس کے اندازوں سے کہیں زیادہ کٹھن ثابت ہوا۔ چھ ماہ اسی کشمکش میں گزر گئے۔ گھر سے ملنے والے جوابی خطوط میں حالات سے آگاہی نے اسے کرب مسلسل میں مبتلا کردیا۔ نبیل کا خط پڑھ کر وہ اس رات سو ہی نہ پایا تھا۔ اس کے ہر لفظ سے بے بسی اور درد چھلکتے تھے۔ الفاظ کسی بھوت کے مانند اس کے سامنے رقصاں تھے۔

''اب کوئی معجزہ درکار ہے مٹھو! 23 سال قبل ہمارے

مقابل غیر تھے اب اپنا خون ہم سے باغی ہوگیا ہے۔ آج وہ وقت آن پہنچا ہے کہ بیٹا باپ کے سامنے سینہ سپر ہے اور جب جوان اولاد تن جائے تو والدین بوڑھے اشجار کے مانند خزاں رسیدگی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ لوٹ آؤ..... میں تنہا یہ بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ امانت کا بار بہت جان لیوا ہوتا ہے منھو! لوٹ آؤ..... میرا دل خدشات سے لبریز ہے..... میرے کندھوں کو تمہارے ساتھ کی تقویت درکار ہے۔ اٹھارہ بیس سالہ تمہارے یہ بھتیجے سرخ چہروں اور کف اڑاتے ہونٹوں کو نفرت سے سکوڑ کر ہمارے فیصلوں کو غلط قرار دیتے ہیں۔ انہیں ہماری قربانیاں احمقانہ لگتی ہیں۔ ان کے چہروں کو دیکھ کر مجھے خوف آتا ہے۔ ہم تو معلم تھے میرے بھائی! تم ہی بتلاؤ' وقت کے کس لمحے میں ہم نے غلطی کی جو آج یوں بربادی اپنی طرف بڑھتے دیکھ رہے ہیں۔ بابا جان اور مجھے فرائض سے سبکدوش کردیا گیا ہے۔ ہم سارا دن عضوِ معطل کی طرح پڑے رہ کر فضاؤں کی سرگوشیاں سنتے ہیں۔ یہ سرگوشیاں ہمیں کچوکے دیتی ہیں کہ کچھ ہونے والا ہے..... وقت قیامت کی چال چل گیا ہے۔ اٹھو اور بچاؤ کی تدبیر کرلو..... مگر میری اولاد کی سرکشی نے مجھے بہت کمزور کردیا ہے منھو! ڈرتا ہوں کہ ڈھاکا کے طول و عرض میں رقص کرتے زہریلی آگ کے شعلے ہمارے گھر کی چاردیواری کا تقدس بھی خاکستر نہ کردیں۔ ایسا خوف تو مجھے کبھی نہیں محسوس ہوا..... شاید میں بوڑھا ہوگیا ہوں..... نہیں! شاید اب میں بزدل ہوگیا ہوں۔"

اس خط کے بعد علی نے رہائش گاہ کے لیے اپنی کوششیں فزوں تر کردیں۔ چند ہفتوں بعد دو کمروں اور صحن پر مشتمل ایک بوسیدہ سا کوارٹر اسے کرائے پر مل گیا۔ ملک میں عام انتخابات ہونے والے تھے۔ لیکن ساری امیدیں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئیں۔ نفرت و رنجش کی آگ ایسی بھڑکی کہ حالات بے قابو ہوگئے۔ اس کے بھیجے گئے خطوط کا پھر کبھی جواب نہ ملا۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپتا' اہل و عیال کی سلامتی کے لیے بلک بلک کر دعائیں کرتا رہا لیکن انتظار تھا کہ اسے کرب کی سولی پر مصلوب کیے اس کی روح کو ریشہ ریشہ ادھیڑ رہا تھا۔

اور پھر اندیشوں نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ ان کا ازلی دشمن کلہاڑی کی دھار جیسی تیزی کے ساتھ اس مضبوط شجر کو ڈھانے کی اول کوشش میں اسی لیے ناکام ہوا تھا کہ اس دھار کو تقویت دینے کے لیے کوئی لکڑی ہی نہ تھی۔ قربانیوں کے سفر کے چوبیس سال بعد اسی درخت کے تنے کا ملاپ اس کلہاڑی کے ساتھ ہوا تو شجر دولخت ہوتے دیر نہ لگی۔

جناح کا پاکستان ٹوٹ گیا۔ علی عبداللہ کے مرشد کا یہ عظیم تحفہ بے قدری کی بھینٹ چڑھ گیا۔ صدمے نے اس کے حواس سلب کرلیے۔ وہ جانے کتنے ماہ شدید بخار اور بے ہوشی کی کیفیت میں مبتلا رہا۔ کرم داد نے ماتھے پر شکن لائے بغیر اس کی تیمارداری کی۔ بخار میں پھنکتے وہ ہذیان بکتا۔ کبھی تبریز عالم کے بے تحاشا ہنستے نادیدہ ہیولے پر لپکنے کی کوشش کرتا تو کبھی اپنی ننھی بیٹی رعنا کو گود میں پکڑنے کے لیے بستر سے نیچے آگرتا۔ والدین' بھائی' بیوی اور بھتیجوں کو یاد کرکے اس کی دھاڑیں اور آنسو فلیٹ پر موجود سب لڑکوں کے کلیجے چھلنی کرنے لگتے۔ باہمی مشورے سے اسے اسپتال منتقل کردیا گیا اور آٹھ ماہ بعد وہ بالآخر زندگی و موت کی کشمکش سے باہر آگیا۔

ہوش میں آنا اس کے لیے کرب کی ایک نئی صورت تھی۔ وہ اپنے اردگرد نظر آتے لوگوں کے انداز و اطوار میں دکھ' نوحے اور اشکوں کی برکھا دیکھنے کا متمنی تھا لیکن وہ سب ایک معمول کے مطابق زندگی گزار رہے تھے۔ اپنے "چھوٹے بھائی" سے علیحدگی کا انہیں خاطر خواہ ملال نہ تھا یا وہ علی جیسے "احساسِ زیاں" سے شناسا نہ تھے..... وہ حتمی رائے قائم کرنے سے قاصر تھا۔

اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد کرم داد خود اسے واپس گھر لے جانے کے لیے آیا۔

"تمہارے بہت احسانات ہیں مجھ غریب الوطن پر کرم داد!"

"شرمندہ نہیں کرو سائیں! آپ بس میرے ساتھ چلنے کی تیاری کرو۔"

"میں ایک اور جگہ جانا چاہتا ہوں پہلے..... مجھے لے چلو گے نا وہاں؟" اس نے التجائی انداز میں کہا۔

"کیوں نہیں سائیں! کہاں جانا چاہتے ہیں آپ؟" کرم داد کے استفسار پر اس نے اپنی منزل کا پتا بتادیا۔

☆☆☆

کرم داد نے اسکوٹر ایک جانب روکا اور پلٹ کر علی کی جانب مسکراتے ہوئے دیکھا۔

"لیجیے ہم پہنچ گئے۔ میں اسکوٹر پارک کرلوں' پھر اندر چلتے ہیں۔"

"برا مت ماننا دوست! میں یہاں کچھ دیر تنہا گزارنا چاہتا ہوں۔" اس نے التجا کی۔ "میں شام کو تمہارے فلیٹ پر پہنچ جاؤں گا۔ فکرمند نہ ہو۔"

کرم داد کچھ دیر تذبذب میں مبتلا رہنے کے بعد بوجھل انداز میں روانہ ہوگیا۔ علی کے سامنے موجود وسیع احاطہ دھوپ

میں نہایا ہوا تھا۔ اس نے اپنے جوتے اتار کر ہاتھ میں لیے اور برہنہ پا جھلسے ہوئے فرش پر چلتا اندرونی جانب بڑھ گیا جہاں ایک قبر دیکھ کر اس کے ضبط کا پیمانہ پھر چھلک اٹھا۔ باہر گرمی اور حبس کے باوجود وہاں بہت ٹھنڈک اور سکون تھا۔ اس نے کپکپاتے لبوں اور برستی آنکھوں سے فاتحہ پڑھی اور وہیں ڈھے گیا۔

"میرے سب پیارے ایک ایک کر کے مجھ سے بچھڑتے گئے۔ میں تہی داماں رہ گیا۔ افسوس تو یہ ہے کہ میرے پاس کسی کی بھی آخری نشانی موجود نہیں..... میرے پاس صرف آپ موجود ہیں..... اتنی جلدی کیوں چلے گئے آپ؟ اپنے نادان بچوں کے ساتھ تھوڑا تو وقت گزار لیتے..... تو آج شاید یہ سب نہ ہوتا۔" وہ اپنے بال مٹھیوں میں بھینچے محمد علی جناح کی قبر پر خفگی سے نظریں جمائے بڑبڑاتا رہا۔ اسے یہاں کے ہر گوشے میں سسکیاں اور آہیں گونجتی سنائی دے رہی تھیں۔ آس پاس موجود افراد کی متاسفانہ اور طنزیہ نظروں کی بھی کوئی پروا نہ تھی۔ کچھ لمحوں بعد ایک عمر رسیدہ شخص نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"یہاں کیوں بیٹھے ہو اس طرح؟" اس نے استفسار کیا۔

"فاصلوں نے میرے سب رشتے نگل لیے۔ میرے خاندان پر جانے کیا بیتی؟ ملک اپنی شناخت کھو بیٹھا۔ قبر میں مدفن اس شخص سے میں نے ایک بار عہد کیا تھا' اپنے باپ' بھائی' بیوی اور بچی سے بہت سے وعدوں کے بعد میں یہاں آیا تھا..... لیکن ایک بھی وعدہ ایفا نہ کرسکا۔ تف ہے مجھ پر۔"

"اوہ..... لگتا ہے سقوط کا تم نے کچھ زیادہ اثر لیا ہے۔ یہ سانحہ بے شک بہت بڑا تھا..... جو ہوا اسے بھولنے کی کوشش کرو۔ یہ سب اسی طرح مقسوم تھا۔" اس شخص نے علی کے کندھے کو تھپتھپا کر کہا۔ لیکن علی عبداللہ کو جانے کس منظر کی پیاس تھی؟ وہ خود بھی ناواقف تھا۔

شام کے سائے اندھیرے سے بغلگیر ہونے لگے تو وہ اپنی آئندہ زندگی کا ایک لائحہ عمل بنائے کرم داد کے فلیٹ پر لوٹ گیا۔

اس نے دو مختلف منصوبوں پر فوری عمل کا فیصلہ کرلیا تھا۔

☆☆☆

کرم داد اسے فلیٹ میں موجود پا کر بہت خوش تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت کے سبب کسی بھی انتہائی قدم کا خدشہ اب بھی انہیں لاحق تھا۔ رات کو اس نے کرم داد سے پاسپورٹ آفس میں معاونت کی بات کی تو وہ الجھ گیا۔

"آپ کے پاس تو بہت سے ممالک کے پاسپورٹ موجود ہیں نا..... تو اب کیا کرنے جانا ہے آفس؟"

"تم بھول رہے ہو کرم داد! وہ اس وقت کا پاسپورٹ ہے جب بنگلا دیش نامی ملک وجود میں نہیں آیا تھا۔ تقدیر کی ستم ظریفی تو دیکھو۔ میں نے کچھ عرصہ قبل اپنے ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک سفر کیا تھا اور آج مجھے وہاں پھر سے جانے کے لیے بین الاقوامی قوانین کی پیروی کرنی ہے۔" اس کے بظاہر سپاٹ لہجے نے کرم داد کے دل پر گھونسا لگایا۔

"واپس آئیں گے نا؟"

"ہاں یار! واپس یہیں آؤں گا..... اگر میرے خاندان کا کوئی ایک فرد بھی زندہ ہوا تو اپنے وعدے کے مطابق اسے اپنے ساتھ لے آؤں گا۔" علی کے لہجے میں صدیوں کی تھکن موجود تھی۔

کچھ عرصہ گزرتے ہی روابط بحال ہوئے تو وہ کسی بھی سامان اور تیاری کے بغیر میر پور روانہ ہوگیا۔ اپنے گھر اور محلے کی تلاش میں اسے بہت دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ آنکھوں میں دھند کی طرح چھانے والے اشک اور جگہ جگہ جلے ہوئے مکانات' ویران راہیں اسے رستے سے بھٹکا دیتیں۔

اپنے محلے میں پہنچ کر اس کا بدن اینٹھنے لگا۔ ہر جگہ کچی اور عارضی جھونپڑیاں' ننگ دھڑنگ گھومتے بچے اور غربت کے کچھ مناظر دیکھ کر اسے اندازہ ہونے لگا تھا کہ ارتقا کے لیے ابھی ایک مدت درکار ہوگی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالے اور ان سب لوگوں کو جھنجوڑ کر اپنے خاندان کا احوال پوچھے۔

اس کے گھر کے باہر ایک درخت موجود ہوتا تھا۔ آج وہی بے جان درخت بہ زبانِ خاموشی گمشدہ گھر کی پہچان بن گیا۔ وہاں راکھ اور ملبے کے سوا اب کچھ بھی نہ بچا تھا۔ وہ دکھے دل سے اس کے کھوکھلے تنے کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اس کے بھتیجے بچپن میں ایک دوسرے کے کھلونے اکثر شرارت سے یہاں چھپا دیا کرتے تھے۔ ایک ٹرانس کے عالم میں اس نے لکڑی پر ہاتھ پھیر کر کچھ نادیدہ لمس محسوس کرنے کی کوشش کی۔ انگلیاں بے اختیار رینگتی تنے کے اندر چلی گئیں۔ اسے کچھ ٹھوس چیزوں کی موجودگی کا ادراک ہوا تو فوراً انہیں باہر نکال کر اپنی گود میں رکھ لیا۔

عاصم اور قاسم کی ایک کھلونا پستول' چھوٹی سی کھلونا گاڑی کے سوا وہاں کپڑے کے ایک تھیلے میں رعنا کی جوتی اور فراک موجود تھے۔ اس نے بلکتے ہوئے وہ سب چیزیں اپنے سینے سے لگالیں۔ کپڑوں میں بسی بیٹی کے وجود کی مہک اس کے زخم پھر سے اُدھیڑ گئی۔ کاپی کے چند صفحات پر عدیلہ

نے خطوط کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد یہاں پر بیتنے والی قیامت کا احوال بھی لکھا تھا لیکن علی عبداللہ میں اسے پڑھنے کی تاب ہی نہ تھی۔ وہ اس کرب سے گزرنے کی ہمت پیدا نہ کر پایا۔ اس کے لیے اپنی تمام امیدوں کی موت کا ماتم ہی کم نہ تھا۔ خاندان کا ایک بھی فرد اس کا منتظر نہ تھا۔ اس کے بعد کچھ جاننے کی ہمت کیونکر آتی؟ اس نے کاغذات کو پرزے پرزے کر کے اسی تھیلے میں رکھا اور وہاں سے چل دیا۔

گلی سے باہر نکل کر ایک صدا نے اس کے قدم روک دیے۔ ''علی چاچا! آپ کب آئے؟''

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ عبداللہ کا ایک ننھا شاگرد انتہائی ابتر حلیے میں اس کے سامنے موجود تھا۔

''آج ہی آیا تھا مانی! تمہارے گھر والے.....؟'' اس نے تذبذب سے پوچھا۔

''سب مجھے چھوڑ گئے..... میں جانے کیوں زندہ رہ گیا ادھر؟'' اس کے الفاظ و انداز میں علی کو اپنی جھلک نے ساکت کر دیا اور اگلے ہی پل ایک فیصلہ مزید آسان ہو گیا۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے اپنے ساتھ لیے چلنے لگا۔ مانی بھی اس کی مرضی بھانپ کر خاموشی سے چلتا رہا۔ بہت سے پیچیدہ اور طویل مراحل کے بعد وہ اسے اپنے ساتھ لے آیا۔

کرم داد اس بچے کو دیکھ کر بہت حیران تھا۔

''میں اب مزید تم پر بوجھ نہیں بنوں گا کرم! میری تعلیمی اسناد کے طفیل کسی بھی ملک میں نوکری مل جائے گی..... مانی بھی میرے ساتھ ہی رہ لے گا۔'' اس نے اپنا اگلا منصوبہ آشکار کیا۔

''تو کیا آپ یہاں نہیں رہیں گے سائیں؟'' وہ ششدر تھا۔

''نہیں! یہاں رہوں گا نہ ہی وہاں..... رشتوں کی یوں بے وقت موت نے مجھے بہت کمزور کر دیا ہے..... اگر یہاں رہا تو والدین' بھائی' بیوی' بیٹی اور بھتیجوں کی یاد مجھے پل پل مارتی رہے گی..... میں اب ان فضاؤں میں سانس نہیں لے پاؤں گا۔ میری حرماں نصیبی کہیں مزید تباہی نہ لے آئے۔''

''جیسا آپ مناسب سمجھیں۔'' کرم داد دل گرفتہ تھا۔

علی عبداللہ نے ایک اور بن باس کاٹنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

مانی کے کاغذات بنوانے کے بعد وہ لندن روانہ ہو گیا۔ اپنی بچی کھچی زندگی اس نے جنگ زدہ ممالک میں تعلیمی خدمات انجام دینے کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اپنی قابلیت کی بنا پر اسے ''یونیسکو'' میں ایک شاندار عہدہ مل گیا۔ جنگی ہولناکیوں سے اقدار کی موت اسے بہت خائف رکھتی۔ اس نے دنیا کے طول و عرض میں ہر جنگ زدہ ملک کے لیے اپنا تن من بھلائے رکھا لیکن ایک دہائی بیتنے کے باوجود پاکستان لوٹنے کی ہمت کبھی پیدا نہ کر پایا۔

مانی بچپن کی دہلیز پار کر کے جوانی کی حدود میں داخل ہو گیا۔ اس نے علی کے منع کرنے پر خود پر بیتے حالات کبھی بھی نہ دہرائے۔ وہ جانتا تھا کہ علی اپنے ماضی سے فرار چاہتا ہے۔ ان دونوں میں بات چیت صرف کھانے کی میز پر ہی ہوا کرتی۔ اس کی پروفیشنل ڈگری کی بابت گفتگو ان کے مابین پہلی طویل گفتگو تھی۔

''فیوچر کے کیا ارادے ہیں؟'' علی نے دریافت کیا۔

''وکیل بننا چاہتا ہوں میں۔''

''پہلے تو کبھی تمہاری دلچسپی نظر نہیں آئی وکالت میں۔''

''آپ کی مصروفیت وقت دے گی تو دیکھ پائیں گے نا؟'' عبدالمنان نے شرارت سے کہا۔ مقابل بیٹھے اس شخص نے اسے سگی اولاد ہی کی طرح سب سہولیات فراہم کی تھیں لیکن اپنے وجود کا خلا اس سے بھی پوشیدہ نہ رکھ پایا۔

''کس ادارے سے پڑھنا چاہتے ہو؟'' وہ عجلت میں ناشتا کرتے ہوئے مستفسر تھا۔

''وہی درسگاہ جس نے محمد علی جناح کی صلاحیتیں بھی نکھاریں۔'' مانی کی بات پر اس کا منہ میں نوالہ لے جاتا ہاتھ تھم گیا اور آنکھوں میں نمی در آئی۔

''ٹھیک ہے..... میں داخلہ کروا دوں گا۔'' اس نے بوجھل سانس لی۔ ''اس کے بعد کیا کرنے کا ارادہ ہے؟''

''میں پاکستان واپس جاؤں گا۔ یہاں مشینی زندگی گزارنا میرے لیے بہت کٹھن ہے۔''

''جیسے تمہیں مناسب لگے..... مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' علی کی آواز میں نمی واضح تھی۔

''آپ نہیں چلیں گے واپس؟'' اس کے لہجے میں ایک آس پنہاں تھی۔

''نہیں! میں فی الحال واپسی کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتا۔'' علی نے برتن سمیٹنے شروع کر دیے۔

''میں آپ کا ہر پل انتظار کروں گا..... کیونکہ مجھے یقین ہے کہ آپ لوٹ کر وہیں آئیں گے..... جلد یا بدیر..... یہ آپ کی صوابدید پر ہے۔''

''ناشتا کر لو تو یہ سب برتن دھو دینا..... مجھے ایک ضروری میٹنگ میں پہنچنا ہے۔'' علی نظریں چرا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

''لوٹ آیئے گا جلد..... اس سے قبل کہ اعصاب ہمت ہار جائیں۔'' مانی کی آواز اس کی سماعت میں پڑی۔

☆☆☆

عبدالمنان کا یقین اور گمان درست تو ثابت ہوا لیکن اس کی تکمیل میں کئی عشرے بیت گئے۔ لگن' محنت اور عزم سے ہر مسلم اور غیر مسلم ملک میں کوٹھو کے بیل کی طرح کام کرنے والے علی عبداللہ نے بڑھاپے کی آمد اس وقت محسوس کی جب آنکھوں میں سفیدی اور اعصاب پر لرزش طاری ہونے لگی۔

عبدالمنان نے کراچی میں ہی اپنی وکالت کی پریکٹس کا آغاز کیا تھا۔ اس کی شادی پر وہ بمشکل ایک ہفتہ وہاں گزار کے افغانستان روانہ ہو گیا۔ اپنی ذات وہ بہت پہلے ہی پسِ پشت ڈال چکا تھا۔ سرمد اور ثمن کی پیدائش کے وقت بھی وہ عراق اور فلسطینی کیمپوں میں تھا۔ بچے وقتاً فوقتاً اس کے پاس آ کر رہ جاتے۔ خود عبدالمنان بھی کچھ ماہ گزرتے ہی چند ہفتے علی کے ساتھ ضرور گزارتا۔ سرمد نے اپنی تعلیم اسی کے پاس رہ کر مکمل کی۔

ریٹائرمنٹ کے بعد اس نے کچھ عرصہ اپنے پیشہ ورانہ تجربات پر چند تصانیف میں گزار دیا۔ وقت اس کے وجود کو تختۂ مشق بنائے اپنی چال چلتا رہا اور پھر بڑھاپے و بصری معذوری کے بعد علی عبداللہ بالآخر ''پاکستان'' لوٹ گیا۔

ایک بھرپور مصروف زندگی گزارنے کے بعد فراغت اور بصارت سے محرومی انسانی بے بسی و مجبوری کا احساس تو دلاتی لیکن اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ عبدالمنان انہیں بصد شوق اپنے گھر لے آیا لیکن یہاں کے اطوار' بہوؤں کے نظریات اور نسلِ نو کی ''بے خبری'' نے ایک بار کسی صحرائی بگولے کی طرح ماضی کے تمام نقوش اجاگر کر دیے۔ علی عبداللہ کے ہونٹوں پر خاموشی ٹھہر سی گئی تھی۔

اگلی شام سرمد انہیں پارک میں لے آیا اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے دل بہلانے لگا۔

''عبدالمنان کب لوٹے گا کانفرنس سے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''آج شام ہی کی فلائٹ ہے ان کی۔ میں تو جانا چاہتا تھا انہیں لینے کے لیے [illegible] وہ بضد تھے کہ خود ہی آ جائیں گے۔''

''اسے میرے پاس [illegible]''

''کیسی باتیں کر رہے [illegible]؟ کیا ایسا پہلے ہوا ہے کہ وہ آپ [illegible]''

علی عبداللہ نے [illegible]

نمازِ عشا کے بعد وہ اس کے کمرے میں موجود تھا اور اس کا اضطراب بھانپ چکا تھا۔ ''کیا بات ہے؟ طبیعت کیوں بے چین ہے آپ کی؟'' عبدالمنان نے پریشانی سے پوچھا۔

''یہ سب کیا ہے مانی؟ سب رنگ ڈھنگ ہی نرالے ہیں..... ایسا کیوں ہے؟''

''یہاں کچھ بھی نرالا نہیں ہے۔ ہاں! آپ بس اب دیکھ رہے ہیں۔ عادی ہو جائیں گے دھیرے دھیرے۔'' اس کے اطمینان سے لگتا تھا کہ وہ اس موضوع پر بات کرنے کے لیے خود بھی منتظر تھا۔

''وہی تو پوچھ رہا ہوں..... کیوں ہے سب کچھ نرالا؟''

''گستاخی معاف! لیکن کس بھرم سے یہ جاننا چاہتے ہیں آپ؟'' وہ سابقہ اطمینان سے گویا تھا۔

''کیونکہ یہ میرے بچے ہیں..... میرا ملک ہے..... مجھے فکر ہے ان کی۔'' انہوں نے فوراً ٹوکا۔

''یہ آپ کے بچے ہیں..... آپ کا ملک ہے..... میں اس حقیقت سے منکر نہیں..... لیکن جب اس ملک اور ان جیسے لاکھوں بچوں کو آپ جیسے چھتنار وجود اور تجربے کی ضرورت تھی..... کیا تب آپ ان کی راہنمائی کرنے کے لیے موجود تھے؟'' وہ پرسکون انداز میں پوچھنے لگا۔

''میں اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا مانی!''

''کیا وہ فرائض آپ کی قوم اور ملک سے بڑھ کر تھے؟''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو عبدالمنان؟'' علی کا مزاج یکدم برہم ہو گیا۔

''آپ کے اس سوال کے لیے میں نے برسوں انتظار کیا ہے کہ میں کہنا کیا چاہتا ہوں؟ تو سنیے بابا جان! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے کیوں اپنی نصف زندگی فرار رہ کر گزار دی..... آپ ہمیشہ خائف رہے..... محبتوں سے خائف..... آپ نے مجھے اپنا تو لیا لیکن اپنے نزدیک کبھی ہونے ہی نہ دیا..... مجھے بھی دور کر دیا اور اس ملک کو بھی۔ یہی خدشہ تھا نا آپ کو کہ آپ جن سے محبت کرتے ہیں' وہ آپ سے بچھڑ جاتے ہیں۔''

''ہاں! یہی خوف تھا مجھے۔'' انہوں نے شکستگی سے کہا۔

''ایک آپ پر ہی موقوف نہیں..... ہزارے اور پھر سقوطِ ڈھاکا کے بعد ہر وہ شخص جس نے یہ کرب جھیلا تھا' یونہی اپنی ذات کے خول میں سمٹتا چلا گیا..... ہر پل ماضی کو یاد کرتے کسی نے بھی حال پر توجہ ہی نہ دی..... ماضی کا کرب انہیں حال اور مستقبل سے بہت بیگانہ کر گیا اور نتیجتاً اس گلشن

کے پھول خود رو پودوں کی طرح پروان چڑھنے لگے..... فاصلے بڑھتے گئے..... اور آج اس گلشن کا حال آپ کے سامنے ہے..... آپ نے ہر جنگ زدہ ملک میں کام کیا..... مگر اپنے ہی آشیانے کو کیوں بھول گئے؟''

''یہاں جنگ نہیں تھی مانی! اگر خدانخواستہ ایسا ہوتا تو میں کیوں نہ آتا یہاں..... جنگ ختم ہو گئی تھی مانی..... میرا سب کچھ چھین کر.....''

''کیوں نہیں تھی..... بالکل تھی..... یہ ملک اپنی پیدائش سے آج تک حالتِ جنگ میں ہی تو ہے..... اپنے وجود کے ایک حصے سے محرومی کے بعد یہاں روئے ارض کی مہلک ترین جنگ کا آغاز ہوا تھا..... نظریاتی تبدیلی کی جنگ..... ذہن سازی کے لیے سازگار مواقع کے حصول کی جنگ۔ آج آپ جن تبدیلیوں اور رنگ ڈھنگ کو دیکھ کر مضطرب ہیں ان کی کامیابی میں کہیں نہ کہیں آپ اور آپ جیسے وہ سبھی لوگ بھی ذمے دار ہیں جو شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دبائے اپنا ماضی یاد کرتے رہے۔''

''تو تم نے اپنی بساط بھر کیوں نہ اس آشیانے کو بچایا؟'' وہ دکھ سے بولے۔

''میری جنگ تو اس سے بہت الگ تھی..... اور تکلیف دہ بھی..... میری شناخت' قومیت اور پس منظر تو میرے نقوش اور وجود سے واضح جھلکتا تھا۔ مجھے کبھی بھولنے ہی نہ دیا گیا کہ میں اس ملک کا باشندہ ہوں جو الگ ہو گیا..... کبھی کسی نے یہ نہ سوچا کہ میں ایک ہی قوم کا بیٹا ہوں جو اپنی ریاست کے ''بڑے بھائی'' کے یہاں رہنے آیا ہے۔'' عبدالمنان کی آواز میں برسوں کی نارسائی تھی۔

''میں شاید کمزور تھا مانی! بس فرار میں عافیت تلاش کرتا رہا۔''

''آپ کمزور نہیں تھے بابا جان! میں نے برسہا برس آپ کی ذہنی کیفیت بغور جانچی ہے..... آپ کیوں چاہتے تھے کہ اس سانحے کے بعد کاروبارِ زندگی رک جاتا..... ہر فرد جوگ لے لیتا اور نوحہ کنی کی کیفیت ہر جگہ نظر آتی..... اور جب یہ سب ممکن نہ ہوا تو اپنی ذات کے بعد آپ اس ملک اور اپنے ہم وطنوں سے بھی ناراض ہو گئے۔'' وہ نرمی سے بولا۔

''خوف..... ہر رشتے کے بعد صرف یہ ملک ہی تو بچا تھا میرے پاس..... اسے کھو دینے کا خوف.....''

''اقبال کا خواب، جناح اور لیاقت جیسے قائدین کی محنت اور سب سے بڑھ کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے حاصل کیا گیا یہ ملک کیسے کھو سکتا تھا؟ آپ تو... جانتے تھے کہ انسان ہر دور میں افلاس' اولاد' مال و محبت سے آزمایا جاتا ہے..... تو اس آزمائش میں اتنا خوف کیوں؟ آپ کے سینے میں جو کتاب محفوظ ہے اس کی تاثیر نے صدیوں پہلے ایک وحشی قوم کے قلب موم کر دیے..... اور یہاں تو سب اسی کتاب کے نام لیوا تھے..... اس کے ثمرات سے کیسے فیض یاب نہ ہوتے؟ لیکن ماضی کی تلاش اور ماتم نے سبھی کو اپنے گلشن کی حفاظت اور دیکھ بھال سے غافل کر دیا..... تو اب نئی نسل کے لیے یہ ملال اور حیرانی کیوں؟ اللہ جنت بخشے نبیل چاچا اور مولوی صاحب کو..... بتایا کرتے تھے کہ آپ دونوں کو اپنے تعلیمی ادارے کی جانب سے خصوصی تربیت بھی دی گئی تھی۔''

''اس کے اطلاق کی نوبت ہی کہاں آئی مانی؟ بٹوارے کے خونی سفر نے انسانیت کا درس فراموش کروا کے ہر ایک کو معاشی بقا کے شکنجوں میں جکڑ دیا۔ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت زندگی کی پتوار ہی بدل دی گئی۔'' ان کے تصور میں اپنے اساتذہ کی تربیت اور خواب روشن ہوئے تو کسک مزید بڑھ گئی۔

''اب بھی کچھ نہیں بگڑا..... کوشش و لگن سے حالات میں تبدیلی کٹھن تو نہیں۔''

''کیا اب پھر کسی مسیحا کا انتظار کریں ہم؟'' علی نے اپنا سر بیڈ کی پشت پر ٹکا لیا۔

''انتظار سے بہتر ہے کہ آپ خود کسی کے مسیحا بن جائیں۔'' عبدالمنان سنجیدگی سے بولا۔ ''ٹوٹے ہوئے ساز اور دل سے نکلی آواز میں بہت تڑپ ہوتی ہے..... اپنی یہ تڑپ ان لوگوں تک پہنچائیے..... کیا خبر کوئی آپ ہی کی طرح کسی مسیحا کا منتظر ہو..... آپ کی ایک کوشش سے قافلے بننے لگیں.....''

''کیا ایسا ممکن ہو گا مانی! فصلِ بہار لوٹ پائے گی؟'' علی کی آواز لرزنے لگی۔

''بالکل ہو گا..... ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی..... آپ قدم بڑھائیے..... میں اور سرمد آپ کو کسی جسمانی کمی کا احساس نہیں ہونے دیں گے۔'' وہ عزم سے بولا۔

علی عبداللہ کو اپنے وجود میں ایک نئی قوت پیدا ہوتی محسوس ہونے لگی۔ تاریک بصارت کے عقب میں اپنوں کے کھلکھلاتے چہروں کا تصور، ان کے سپاہیانہ ولولے ایک بار پھر مہمیز کرنے لگا۔

اور فصلِ بہار لوٹنے کی امید لیے ایک نئے سفر کا آغاز ہو گیا۔

☆☆☆

www.PakiBooks.Site